مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ طٰہٰ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب الفرقان

فی

دروس القرآن

قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن مجید سے

سورۂ طٰہٰ

پرویز

زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، ۲۵۔ بی گلبرگ ۲، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب الفرقان فی دروس القرآن
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جولائی 2005ء
مطبع	....	رمضان پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ا کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفیٰؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو

آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

فہرست مشمولات سورہ طٰہٰ

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ

پہلا باب: سورۂ طٰہٰ آیات 1 تا 8

حروفِ مقطعات کی وضاحت 21

لفظ تشقی کا مفہوم 22

لفظ مشاجرت کا مفہوم 22

انسان کی تمام تر مایوسیوں کا علاج 24

قرآنی قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ 24

قرآن زندگی میں آسودہ حالی پیدا کرنے کے لیے دیا گیا ہے 25

قرآن پر عمل نہ ہو تو پھر تشقی کی کیفیت ہو جاتی ہے 25

ذکر کا قرآنی مفہوم 26

معاشرے کی حالت کو رفتہ رفتہ بدلتے چلے جانا 27

قرآن انسان کو خاک کی پستی سے عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے 27

سر و اخفی کا قرآن مفہوم 29

ظالم کو ظلم سے روکنا بھی حسن ہے 30

دوسرا باب: سورۂ طٰہٰ آیات 9 تا 17

ذکر حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی داستان کا 31

حاکم اقوام، محکوم اقوام کے جوہرِ ادراک خرید لیتی ہیں 32

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی 32

آگ بھی ایک حقیقت تک پہنچنے کی علامت ہوتی ہے 33

عقل کا طریق قیاسی ہوتا ہے 34

یہاں آواز کا لفظ وحی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے 35

وحی کا معنیٰ ہوتا ہے: تیز اشارہ اور اشارے میں آواز نہیں ہوتی 35

غیر از نبی وحی کی ماہیت کو جان ہی نہیں سکتا 36

خدا کا نبی بھی خدا سے نہیں پوچھتا 36

نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کا سارا تصور باطل تصور ہے 37

خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہماری طرح کوئی آواز نہیں دی تھی 37

ایک نئی منزل کی طرف سفر کا آغاز 38

عقل کی راہنمائی اور وحی کی راہنمائی میں فرق 38

عقل کے اڑھائی ہزار سالہ سفر کا ماحصل 39

جو کچھ ہو رہا ہے اسی پر مطمئن ہو جانا بت پرستی ہے 39

نبی کی ذات ہر آن تجسس میں ہوتی ہے 40

خضر کا تصور ہی غلط ہے 40

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کا ارشاد 40

اے رسول! تو حقیقت کی تلاش میں تھا خدا نے تجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا 41

علامہ اقبال کے چھ لیکچروں کی اہمیت 42

وحی کے لازوال عمل نے اس مختصر سی عمر کو زندگی کا دوام بخش دیا 42
تسبیح کا مفہوم 44
وحی کرتی کیا ہے؟ 44
حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک نئی منزل کے لیے چن لیا گیا 45
انسانوں کی دنیا میں، انسانوں کا کام انسانوں کے ہاتھوں 45
سرفرازی کا یہ عمل تو ایک عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا 46
پہلے دن سے نبوت تک کا سفر 46
موسیٰ علیہ السلام کو مختلف قسم کی کھٹالیوں سے گزار کر کندن بنایا 47
یہ ساری تیاری، یہ سرفرازی، اور پھر یہ چناؤ: آخر کس لیے تھا؟ 47
علیہ السلام کے مقام پر فائض ہونا پھولوں کی سیج نہیں ہوتا 48
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دیئے جانے والا پروگرام 49
ہمارے ہاں صلوٰۃ کے مفہوم کو کس قدر محدود کر دیا گیا ہے 49
انقلاب راتوں رات نہیں آتا 50
ہر چیز کے مخفی نتائج کو ظاہر ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے 50
قرآنِ حکیم کا انداز بیان 51
انقلاب کے وقت انسان نشۂ قوت میں بدست رہتا ہے 51
آخر اس انقلاب کی شکل کیا ہوگی؟ 52
قرآن میں اجرت مقرر کرنے کا سوال ہی نہیں ہے 53
قرآنی انقلاب میں کوئی سلب ونہب اور کوئی ظلم وحزن باقی نہیں رہتا 53
نظام سرمایہ داری سے شہنشاہت زیادہ خطرناک ہے 54
شہنشاہیت یا ملوکیت سے زیادہ خطرناک شکل مذہبی پیشوائیت کی ہوتی ہے 54
قرآن نے ہامان کے لشکر گنائے ہیں 55
محنت کا ایسا ماحصل جیسے دودھ سے تھن بھرے ہوتے ہیں 55
ساتھیوں کے سلسلہ میں احتیاط ضرور برتنا 56

تیسرا باب: سورۂ طٰہٰ آیات 18 تا 35

ملوکیت کا استبداد اور اس کی حقیقت 58
مذہبی پیشوائیت کی گرفت اور قارونیت کا شکنجہ 58
معاشرتی زندگی کے لیے قرآن کریم کی ایک عظیم رہنمائی 59
قرآن کا اعجاز 59
قرآن میں ربط کا طریق 60
قرآن فہمی کے لیے ایک اہم بات 60
قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا البتہ اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے 61
لفظ ترجموں کے تحت آیات کی تشریح: ایک نقصان رساں انداز 61
تراجم قرآن کے بعد تفاسیرِ قرآن مزید دو ہاتھ آگے ہیں 63
ہر کتاب کو سمجھنے کا ایک اسلوب ہوتا ہے 64
ہر پروگرام کے لیے ہدایات ضروری ہوتی ہے 64
عصا اور ید بیضا کا مفہوم 65
صوفی کے تجربے اور نبوت کی قوت میں بنیادی فرق ہوتا ہے 67
گڈریئے کا عمل اور فریضہ ہی نبوت کا فریضہ ہوتا ہے 68
قرآن کریم اکثر تلمیحات کے انداز میں بات کرتا ہے 68
پورا پروگرام اور راہنمائی دینے کے بعد فرعون کی طرف بھیجا 69
ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے شارٹ کٹ کبھی کارگر نہیں ہوا 71
مذہبی پیشوائیت مذہب میں صورت کو تو نہیں بدلتی البتہ سیرت کو ضرور بدل دیتی ہے 72
ارباب اقتدار کی تبدیلی کا نام انقلاب نہیں ہوتا 73

وحی خداوندی انسان کو تاریکیوں سے نکال کر
روشنی کی طرف لے جاتی ہے 75
نبی اکرم ﷺ سے پیشتر ہر نبی اپنی اپنی قوم کی ہی طرف آیا تھا 75
نبی اکرم ﷺ کی بعثت تو پوری نوع انسانی کے لیے تھی 75
تاریکی کے ختم ہونے پر ہی روشنی کا ظہور ہوتا ہے 76
جسے ہم معراج شریف کہتے ہیں دراصل یہ ہجرت کا بیان ہے 77
70 ہجری سے پہلے دنیا بھر کے اندر کوئی بھی مسجد'
مسجد اقصیٰ کے نام پر موجود نہ تھی 77
نبوت کا مقصد اقتدار کو ساحلوں کے اندر پابند کرنا ہوتا ہے 78
تنگ نظری کا مفہوم اور اس کا نتیجہ 79
شرح صدر کا مفہوم 79
ہمارے ہاں روایت کے تحت شرحِ صدر کے لفظ کا مفہوم 80
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش 80
ہمارے مفسرین کا بیان: ہم نے قرآن کو چیستاں بنا دیا ہے 81
پروگرام کی تکمیل کے لیے بنیادی خصوصیات 82
اصل رشتہ خیالات کی ہم آہنگی ہوتا ہے 83
خون کا رشتہ کسی کو اہل نہیں بناتا 83
تسبیح کا قرآنی مفہوم 84
حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ 85
ذکر کا مفہوم 85

چوتھا باب: سورۂ طٰہٰ آیات 36 تا 52

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو کچھ مانگا انہیں مل گیا 88
دعا کے قبول ہونے کے بعد کا اصل قدم 88
منزل کا ساتھی نہ تو بصیرت سے خالی ہو اور نہ ہی مفاد پرست 89
دیکھنا' اس زادِ راہ کے مل جانے کے بعد کہیں سستی نہ کرنا 90
میدانِ عرفات میں سالہا سال سے مانگی جانے والی
دعائیں آخر کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ 90
مذہب ہمیشہ فریب میں مبتلا رکھتا ہے جب کہ دین کی
نظر حقائق پر ہوتی ہے 91
راہنمائی کی قدر کسی راہ گم کردہ مسافر سے پوچھیے 91
الجھی سوچ اور الجھے جواب 92
وحی کا مفہوم اور دعویٰ نبوت کی کیفیت 92
صندوق کو دریا کے سپرد کر دیا جائے 94
خدا تعالیٰ کی زیرِ نگرانی محلوں میں پرورش 94
اب قرآن کی زیرِ نگرانی' خدا کی زیرِ نگرانی کہلائے گی 95
خدا تعالیٰ سے رابطہ کی کیفیت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا 95
یا اللہ خیر! ہر خانقاہ میں نبی' ہر حجرے میں نبی 96
صندوق میں بچے کا سفر اور خدا کی طرف سے ماں کے جذبات کا خیال 96
وہاں پہنچنے کے بعد ایک مشکل کا سامنا اور خدا کی مشیت 97
فرعون کی کبنٹ کا ایک مردِ مومن اور قرآن 99
پانی پر سرداروں کا کنٹرول اور دو بچیوں کی بے بسی 100
ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ ایک پیغمبر کو کن کن بھٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے 101
خدا اپنے کام بھی براہ راست خود نہیں کرتا 102
قوت اگر ساحلوں میں نہ رہے تو پھر بستیوں کی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں 103
بردباری کے ساتھ تحمل مزاجی کی بھی تاکید 103
لفظ خشی کا مفہوم 104

غار میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی پریشانی اور خدا کی طرف سے سہارا 105
فرعون کا دعویٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی خدا کا پیغام 106
حاکم کے پاس اگر محکوم نہ رہے تو حکومت کا ہے کی؟ 106
مغربی جمہوریت کے خلاف قائداعظم کا مطالبہ 106
مسلمانوں کے علاوہ ہندو نے بے شمار قوموں کو ہضم کر لیا 107
مسلمانوں کے لیے تو ہندو دانت پیستا تھا 107
ہم تو دلیل سے بات کریں گے قانون کی بات کریں گے 108
تکذیب دین کا مفہوم 109
حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا ایک سوال کہ وہ کون ہے
جسے تم رب کہتے ہو؟ 109
پرندوں کی مثال سے لفظ ھدیٰ کا مفہوم 110
کوئی پرندہ اپنے ہم جنس سے اپنی خدمت گزاری کا معاوضہ نہیں مانگتا 111
موسیٰ علیہ السلام نے کہا: سب سے بڑا احسان تو تم بھول ہی گئے 112
فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ڈائیلاگ (مذاکرات) 113
بات کرنے کا طریق کیا ہونا چاہیے؟ 114
فرعون کی ایک خطرناک چال اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُور نگہی 114
ہمارے ہاں مذہبی دنیا میں تمام بحثوں کا رُخ بھی اس طرف ہوتا ہے 115
ہزار سال سے ہماری اجتماعی سوچ کا رُخ 116
مسلمان قوم ہزار سال سے اسی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے 117

پانچواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 53 تا 60

ایک اہم نکتہ کی وضاحت 118
اصل جھگڑا پرستش کے طریق کا نہیں، رب کے ماننے کا ہے 119
مسئلہ تو نظامِ ربوبیت کو اپنانا ہے 119
کیا انسانوں کا اَن داتا نظامِ سرمایہ داری ہے یا نظامِ ربوبیت؟ 120
اے موسیٰ! میرے نظامِ پرورش کو نہ چھیڑو: فرعون کا دعویٰ 121
نظامِ ربوبیت کا مسئلہ فرعون تک ہی محدود نہیں 121
قرآنِ حکیم میں آدم کی تمثیلی داستانِ غم مسئلہ ربوبیت کا حل ہے 121
ہبوطِ آدم کا قرآنی مفہوم 121
بنی اسرائیل فرعون کے ہاں کس قسم کی محکومیت کا شکار تھی 122
قرآن کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان انسان کا رب نہیں ہوسکتا 123
خدا تعالیٰ تو خالق بھی ہے، رازق بھی ہے اور پھر رب بھی ہے 123
اس قسم کی ربوبیت کہ کائنات کی کوئی شے اپنی
راہنمائی کے لیے بھی کسی انسان کی محتاج نہیں 123
ہدیٰ یا راہنمائی کا اصل سرچشمہ کہاں ہے؟ 124
فرعون کوئی بھولا بادشاہ نہ تھا بلکہ وہ میکیاوَلی سیاست کا ماہر تھا 125
عظیم مقصد کو سامنے رکھنے والی قومیں کبھی فروعات میں نہیں پڑتیں 125
پچھلے چودہ سو سال کا فیصلہ آج تک ہو رہا ہے: ایک عجیب منطق 125
مسلمانوں کے اہم ترین مسائل مگر مقصدِ زندگی مفقود: ایک المیہ 126
انگریز نے مناظرے کرانے کیوں شروع کیے؟ 127
بچپن کی کچھ یادیں 128
اصل تعلیم تو یہ تھی کہ یہ سوچیں: ہم کیا کر رہے ہیں 129
کوتاہی تو تیری عقل و فکر کی ہے 130
زمین کے سلسلہ میں ''مہد'' کا لفظ اپنے اندر
ایک عجیب مفہوم لیے ہوئے ہے 130
تم خدا کی کون کون سی قدرتوں کا انکار کرو گے 131

وحی کے ذریعے آدمی کے اندر انسان بننے کی صلاحیت	131
حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اقدام سے فرعون کی پریشانی	133
فرعون کی فرعونیت اور تکبر کا اظہار	135
الفاظ کی ادائیگی کا طعنہ	136
کیا یہ ہے خدا کا سفیر؟ کیا سفیروں کا لباس ایسا ہوتا ہے؟	136
یہ خدا کا کیسا سفیر ہے کہ اس کے ہاتھ میں کنگن بھی نہیں، سواری بھی نہیں	137
لفظ استخاف کا مفہوم	138
حضرت سلیمان علیہ السلام کے پیغام پر ملکہ سبا کا بیان	138
فسق اور فجور کا مفہوم	139
ملوکیت کا مجسمہ صرف سجدے کے سہارے ہی قائم رہتا ہے	140
فکر قرآنی کا آبِ حیات ہی مردہ قوموں کا علاج ہے	141
حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل کا کارنامہ:	
قرآن کے معارف کی حامل زبان کی تیاری	142
تارۃً اخریٰ کا قرآنی مفہوم	142
فکذب اور ابیٰ کی کیفیت	143
سحر کے لفظ کا قرآنی مفہوم	144
رسیوں کے سانپ بننے کا معاملہ کیا تھا؟	144
فرعون کے دربار میں ہونے والے مباحثے کی تیاری	145
چھٹا باب: سورۂ طٰہٰ آیات 61 تا 70	
تجدیدِ یادداشت	147
قرآن میں سابقہ اقوام کے بیان کردہ نتائج	
ہر زمانے کے لیے ہوتے ہیں	149
فرعون کے ذہن کی عیاری	151
دروس کے سلسلہ میں زبان کی اہمیت	151
حقیقی (لغوی) اور مجازی معانی پر فوراً اعتراض	152
ہمارے ہاں قرآن حکیم کے کیے گئے تراجم کی بنیاد	153
میں نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن	
عربی مبین کی بنیادوں پر مرتب کیا	154
لفظ سحر کا تفصیلی مفہوم	156
بادشاہ کی تاج پوشی ہمیشہ برہمن کے ہاتھوں ہوئی ہے،	
جسے ہامان سرانجام دیتا ہے	157
مندروں کے منتری ہوں یا ایران کے آتش پرست:	
یہ سبھی ہامان ہوتے تھے	158
منطق کی یاوہ گوئی (Absurdity) اور ہمارے دارالعلوم	158
منطق میں تصوف کا حصہ اور امام غزالیؒ کا عمل	159
ایک دومسحور کن تشبیہات کی جادوگری	159
بھگتی سازش کی تحریک	160
کیا معاذ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے بڑے جادوگر تھے؟	161
میں منکر حدیث کیسے بنا؟	162
قیامت کے روز بارگاہِ نبوت میں پیش ہو کر کیا جواب دوں گا؟	163
میری سوچ کسی دوسرے کے لیے سند نہیں ہو سکتی	163
آخر فریب انگیز سازش اور خفیہ تدبیروں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟	164
قرآن ابدی حقائق کو ہر موقع پر سامنے لاتا ہے	164
مذہبی پیشوائیت کا مطالبہ کہ پہلے ٹھیکہ کرو کہ ہمیں کتنے پیسے دو گے	165
دنیا میں آج کہیں بھی دین نہیں بلکہ ہر سو مذہب ہی مذہب چھایا ہوا ہے	166
مقربین درونِ خانہ اپنی اپنی قیمت وصول کرتے ہیں	167

میں اپنی قرآن فہمی پر کسی کو مجبور نہیں کرتا 167
عصا کے لغوی اور مجازی معنی 169
ہمارے ہاں مدارس کی حالت:
پیاز کے ہر چھلکے کے نیچے پیاز کے سوا کچھ نہیں ہوتا 169
تَسْعٰی کے معنی 170
مرزا محمود صاحب کی ماڈرن تفسیر 170
قوم کی ذہنی پستی کی ایک جھلک 171
ماڈرن عہد کے مفسرین کی تفسیروں میں کیا ہے؟ 171
مذہب کا خطرناک حربہ یہ ہے کہ انسانی عقل وفکر کی
صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا جائے 172
مجھے تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے: 173
نوع انسانی کے لیے نبی اکرم ﷺ کا ایک لفظ کے اندر آخری پیغام 174
دنیا میں سب سے مشکل کام دوسروں کی سوچ بدلنا ہے 175
ملمع سازی کے علاج کے لیے ایک تاؤ دینے کی ضرورت ہے 176
گھبراؤ نہیں بات تو صرف خورشید درخشاں کے نکلنے کی ہے 177
قرآن کی حقیقت ان سب کو نگل جائے گی 177

ساتواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 71 تا 76

بات تو رسیوں کے سانپ بننے یا عصا کے اژدھا بننے کی تھی ہی نہیں 180
نشۂ اقتدار کے باعث رعایا کی نظروں میں
پست ہو جانے کا خیال ان کے اڑے تھا 180
مروجہ اسلام کا بھی یہی حال ہے 181
حقائق کو ذہنوں میں آنے ہی نہیں دیا جاتا 181
دل تو مان لیتا ہے مگر قوت کا نشہ نہیں مانتا 182
انسانیت کی بقا انہی شخصیتوں کے صدقے ہے 183
یہ ایک سجدہ وہ سجدہ ہے جس سے دنیا کے ہر باطل خدا کو خریدا جا سکتا ہے 184
خوش بختی، دل کی جرأت سے حاصل ہوتی ہے 185
قرآن شاعری نہیں کرتا 185
غصے میں فرعون کی حالت زار 186
خدا پر ایمان لانے سے پہلے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں 186
فرعون کی سیاست: اِدھر کچھ اُدھر کچھ 187
فرعون کی مرضی کے بغیر خدا پر ایمان لانے کا نتیجہ 187
ہمارا تو اب زاویہ نگاہ ہی بدل چکا ہے: ساحرین دربارِ فرعون 188
قلب کی تبدیلی کے بغیر جو کچھ ہو گا فساد ہو گا 188
پہلے ہمارا چہرہ تمہاری طرف تھا اور اب پیٹھ تمہاری طرف ہے:
ساحرین دربارِ فرعون کی للکار 189
ہم خالق کائنات کو ترجیح دیں یا تجھے بڑا جانیں؟ 189
جبر کا ایمان کوئی ایمان نہیں ہوتا 189
تقلید کی روش سے بہتر ہے خودکشی 190
اصل سوال تو یہ ہے کہ اتباعِ سنت ہے کیا؟ 190
آنکھ بھی نہ جھپک کے رنگ تماشا ٹوٹ جائے گا 191
بہتر بہتر فرقے اور ہر فرقے کا ماڈل الگ الگ 191
سنت رسول کے لیے معیار قرآن حکیم کو ہی بنانا ہو گا 191
میں تو سنت کو فرض قرار دیتا ہوں 192
جو ایمان بنیت پر مبنی نہ ہو تو وہ شعبدہ بازی ہے 192
ضد تو وہ کرتا ہے جس کے سامنے بینت نہ ہوں 194
ساحرین دربارِ فرعون کی طرف سے اقرار جرم اور فرعون کا شکریہ 195

فرعون موجودہ تہذیب کے تقاضوں سے واقف نہ تھا 196
جرم کے سلسلہ میں آج کی مہذب دنیا ایسا نہیں کرتی 196
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا ایک طریق یہ بھی ہے 196
اس جہنم میں نہ موت آتی ہے اور نہ زندگی...... 198
قوموں پر عذاب کی غیر محسوس کیفیت 199
تصویر کا دوسرا رخ 199
جنت اور دوزخ کی کیفیات کو تشبیہات سے ہی سمجھا جاسکتا ہے 200
قرآنِ حکیم میں ہمارے ہاں کے کشف والہام وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں 200
انسانی ذات کے تزکیہ کا لفظ اور اس کا مفہوم 201
افلح کا مفہوم اور ذاتِ انسانی پر مادی بوجھ کا انسانی ذات سے تعلق 201
افراطِ زر کے بوجھ سے بھی ذات کا یہ انمول بیج تباہ ہو جاتا ہے 202
لفظ خ آب کا قرآنی مفہوم 203
انسانی ذات کی صلاحیتوں کی عظمتوں کی بلندی 204
فرعون کے ایمان پر قرآن حکیم کا تبصرہ 204
فتے منہ تیرا 205
قرآنِ حکیم ایمان کو عمل سے مشروط کرتا ہے 206
ساحرین کے ایمان لانے میں اور فرعون کے
ایمان لانے میں یہی فرق تھا 207
ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کا انجام 208
بزدل آدمی صرف موت سے ہی نہیں ڈرتا' وہ تو زندگی سے بھی ڈرتا ہے 208

آٹھواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 77 تا 82

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سینا کے صحراؤں کی طرف سفر 211
لفظ عصا کا مفہوم 211
لفظ طریق اور طارق کے معنی 212
قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق 213
خاص راستے کی ضرورت کے لیے اس کی تلاش کیوں؟ 213
مدوجزر کی طرف راہنمائی 215
سمندر کے پھٹنے کا قصہ تورات کا ہے' قرآن کا نہیں ہے 216
تورات کا موجودہ ایڈیشن کیا کہتا ہے؟ 216
لیکن ہم ابھی تک بدستور وہیں کھڑے ہیں 216
ہم آج بھی قرآن کے بیان کردہ حقائق کی بجائے
امام طبری کی تفسیر کو ہی قبول کیے ہوئے ہیں 217
حضور ﷺ کی زبانی اپنے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے
صاحب کے لفظ کا استعمال 219
یارِ غار کے متعلق معی کے لفظ کی بجائے معنا کا استعمال 220
بنی اسرائیل کو نعمتوں کی یاددہانی 221
پاکستان کی شکل میں آزادی کی نعمت 222
قدرت نے ہمارے عذر کو' ہماری مشکل کو' حل کر دیا 223
تحریک پاکستان کے سلسلہ میں مودودی کا کردار 223
علامہ اقبال اور قائداعظم کے اعلانات 224
مودوی کا 1947 میں فرمان 225
جماعت اسلامی کا اگست 1948 کا پرچہ 226
جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہے۔ یاللعجب! 226
پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا: اقبال' مودودی'
اور قائداعظم......ایک نعرہ 227
امیر جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کا بیان 228

منزل انہیں ملی جو رفیق سفر نہ تھے　228
الیکشن میں حصہ لینا بالکل کافرانہ عمل ہے　229
الیکشن کے متعلق فتویٰ　229
دیکھنا تو یہ تھا کہ اس آزادی کے بعد ہم نے کیا کیا؟　231
یہ تو ہماری اپنی داستان معلوم ہوتی ہے　231
من وسلویٰ کیا ہوتا ہے؟　232
''مَنْ'' کے معنی ہی احسان کے ہیں　233
رزقِ حرام اور رزقِ حلال کی تعریف　233
لَا تَطْغَوْا فِيْهِ کا مفہوم　233
تورات کا ایک خوبصورت بیان　234
قرآن حکیم کا معاشی نظام　234
غضب کے معنی　234
ہویٰ کا قرآنی مفہوم　235
اس پستی کا' اس ذلت کا' علاج　235
یہ ہوگا وہ عمل جسے صالح عمل کہا جاتا ہے　236
غلام قوموں کا طرزِ حیات اور روشِ زندگی　236
ہمارے فکر و خیال کے بت کدے　238

نواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 83 تا 95

مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ　241
بچھڑے کا بت بنالیا　242
منصب نبوت اور پیش گوئیاں　243
نبی کے معنی ہی مقام بلند پر فائز ہونا ہے　243
تلاشِ حقیقت میں غاروں میں جانے والی روایت بھی صحیح نہیں ہے　244
تصوف کی آمد' خانقاہوں کی ایجاد اور کشف و الہام کے قصے　244
یہودیوں کے ہاں نبی کا تصور　245
انسان کی خام خیالی اور خدا کا تصور　246
گائے کا ماتا' گنگا کو دیوی' پیپل کو دیوتا' بنا دیا گیا لیکن کیوں؟　247
طغیانیوں کے بچاؤ کے لیے انسانوں کو بھینٹ چڑھانا　247
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توجہ مبذول کروانا　249
سامری کون تھا؟　249
ہمارے ہاں کی یہ وعظیں' یہ داستانیں' پھر یہ قصے: آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟　250
انقلابی تو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کی امانت تصور کرتا ہے　250
نبوت تو استقامت' بلند نگہی' اور بلند ظرفی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے　251
نبوت کی حسرت بھری اداؤں کو لاکھوں سلام　252
مذہبی پیشوائیت کی وعظیں' انسان کی سوچ کو'
عقل کو' اور شعور کی قوت کو' مفلوج کر دیتی ہیں　253
چاندی اور سونے کے ان درازوں پر ایک پیسہ بھی ان کا اپنا نہیں ہوتا　254
جنت کے حصول کا ایک سستا نسخہ　254
زندگی تو بات بات پر رسپانس (جواب) چاہتی ہے　256
خدا تعالیٰ قرآنِ کریم کے ذریعے جواب دیتا ہے　256
نوعِ انسانی کو پہلے خدا کے خط کا جواب دینا ہوگا　257
دراصل انسان کو جواب مانگنے والا خدا منظور نہیں　258
5 سالہ بچی کے ایک استفسار پر اس کے ٹیچر کا ردِ عمل　258
ایک نورانی شکل کی کہانی　259
حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق تورات کا بیان　259
قوم کے اس عمل پر حضرت ہارون علیہ السلام کی خاموشی کیوں؟　260
سامی النسل قوم کے ہاں کا رواج　261

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آپس میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے 261
نبی نے جہالت پر مبنی شرک کو تو قبول کر لیا مگر فرقہ نہیں پیدا ہونے دیا 262
تفرقہ تو دین کو ختم کر دیتا ہے 262
ہر فرقہ اپنے آپ میں ہی مگن رہتا ہے 263
دنیا کی امامت مسلمان کے ہاتھ تو آ سکتی ہے، مگر کس طرح؟ 263
شرک آسانی سے مٹ جاتا ہے، لیکن فرقہ بازی سے توبہ بھلی 263
سلطان محمود غزنوی نے بت شکنی کی،
برہمن نے بت شکنوں کو بت پرست بنا دیا 264
جس نے امت میں فرقے پیدا کیے آپ ﷺ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں 265
خود کو صرف مسلمان کہیے فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے 266
اس موقعہ پر شیطان مدد کرتا ہے 267
کہا گیا کہ یہ فرقے نہیں مکاتب فکر ہیں 267
مکاتب فکر کا شوشہ اور امام کعبہ کے پیچھے باطل نمازیں 267
بنی اسرائیل کے ہاں 72 فرقے تھے اور
ہمارے ہاں 73 فرقے ہوں گے 268
میں کافر کس طرح بنا؟ 268
ابلیس کی فسوں کاری کہ فرقے نہیں، مکاتب فکر ہیں 269
صدیوں سے دھوکا دیا جا رہا ہے 269
استدراک 270
شخصیت پرستی کی تعریف 270
مخالفت نہیں ہے، یہ اختلاف ہے 271

دسواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 95 تا 107

بنی اسرائیل کی نفسیاتی کمزوری اور سامری کی چابکدستی و پرکاری 273
ہمارے ہاں کی تفاسیر میں اثر الرسول کا بیان 274
وقت کی رفتار قبر پرستی کو دوام بخشی ہے 275
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سامری کو معاشرے سے
منقطع ہو جانے کی اذیت ناک سزا 275
بھرے معاشرے میں اذیت ناک سزا انتہائی کا احساس ہے 277
امت کی حیثیت ایک معاشرے کی تھی 277
آج ہمارے معاشرے کا ایک ایک فرد یتیم ہے 278
برادری سے الگ رکھنے کی ایک دلخراش کیفیت 278
سزا یافتہ شخص کو پناہ دینے والے کے خط کا حشر 280
ملت سے جدا ہونے کی سزا اپنی ہستی کے وجود کو ختم
کرنے کے مترادف ہے 281
شجر سے ٹوٹی ہوئی شاخ کبھی ہری نہیں ہو سکتی 282
عام انسانوں میں صرف ذات نبی کو ہی انفرادیت کا حق حاصل ہے 282
آج کا مسلمان افراد کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے، امت کی نہیں 283
امریکہ کے اپنے اہل دانش کی چیخ و پکار 284
اس ذلت و رسوائی کا بنیادی سبب؟ 284
خود ساختہ خدائی تصورات اور اختیارات کو ماننے کا نتیجہ 285
کائنات کے اندر کوئی اور صاحب اقتدار نہیں 286
خلافت کے لیے انسانی ذات بشریت کی حد تک
خدائی صفات کی مظہر ہونی چاہیے 286
قرآن حکیم میں جا بجا بیان کردہ تاریخی واقعات کا اصل مقصد 287
تباہی اور بربادی کا پہلا نشان پسماندگی اور غربت ہوتا ہے 288
قرآنی نظام سے دوری کا نتیجہ امروز و فردا کی تاریکی اور زبوں حالی ہے 289
انبیائے کرام کے مدمقابل: فرعون، ہامان اور قارون 290

قرآن اپنے الفاظ کے مجازی معنی کی بھی سند عطا کرتا ہے 291
اذیت ناکی اور صدمے کے باعث ان کی آنکھیں نیلی ہوجائیگی 292
پریشانی کے عالم میں گزرے ہوئے وقتوں کی یاد 292
قرآن حکیم کے الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت اور کیفیت 293
یہ بڑی بڑی چٹانیں ریت کی شکل اختیار کرجائیں گی 294
یہ بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح کھڑے
سردار ریت کی مانند سرکنا شروع ہوجائیں گے 295
یہ دور باطل نظام کی جگہ ربوبیت عالمینی کا دور ہوگا 296

گیارھواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 108 تا 114

قرآن میں تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا ایک عظیم مقصد ہے 298
ہجرت کے بعد قریش کا مدینہ پہنچ کر حملہ آور ہونے کی وجہ جواز 299
بات کو سمجھانے کے لیے قرآن کریم کا تشبیہی انداز پیش نظر رکھیے 299
پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح مستحکم ان سرداریوں کا
نتیجہ ریت کے ذروں کی طرح ہوگا 300
عربی الفاظ کے مادوں پر غور کرنا بڑا ہی ضروری ہے 301
قرآنی الفاظ کے لغوی اور مجازی معنی متعین کرنے کے لیے
خود قرآنی راہنمائی موجود ہوتی ہے 302
دنیا بھر میں آج کی سیاست گری کی مہرہ بازیوں کا علاج 303
معاشرے کی تباہی کے لیے ابلیس کے دو خطرناک حربے 304
شفاعت کا قرآنی مفہوم سفارش نہیں بلکہ گواہی ہے 306
قرآنِ حکیم کے نزدیک مکافاتِ عمل کا تصور اور خدا کی
عدالت میں پیشی کی حیثیت 307
قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان تو بڑا ہی حکمت والا ہوتا ہے 308
عمل سے محروم قوموں کی حالت خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی 309
میدانِ بدر میں تلواریں چلانے کا مقصد اور خدا کے
ہاں مجاہدین کی عظمت 310
عربوں کے ہاں لفظ 'وجہ' اور لفظ 'عنت' کا مفہوم 310
قرآنِ حکیم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے نفسیاتی
تغیر کا نام ہی انقلاب ہے 311
صاحب علم ہونا کسے کہا جائے گا؟ 312
اصل بات تو انسانی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ہے 312
میری زندگی کی آخری خواہش کہ کاش یہ قرآن کہیں
نصاب کا حصہ بن جاتا 313
لفظ خاب کا قرآنی مفہوم 314
جنتی معاشرے کی بنیادی خصوصیات 316
دین کسے کہتے ہیں؟ آخر یہ ہوتا کیا ہے؟ 317
حکومت الٰہیہ میں صرف قانون کی حکمرانی ہوگی 319
قرآنِ حکیم کے نزدیک سیاست اور معیشت میں
چولی دامن کا ساتھ ہے 320
مزدور کی مزدوری کون متعین کرتا ہے اور کس طرح کرتا ہے؟ 321
خرابی کی اصل وجہ کسی غلام کا آقا کو زیادہ کما کے دینا ہے 322
نظام سرمایہ داری کی بنیادی اینٹ کا مرکزی کردار 322
مطففین کون ہوتے ہیں؟ 323
کسی نظامِ کہنہ کے مرض کا بہترین علاج انسانیت کے
اجتماعی طور پر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں مضمر ہے 324
لفظ الحجارۃ کا قرآنی مفہوم 324
قرآنِ کریم نے ہر بات کو واضح سے واضح تر انداز میں پیش کیا ہے 325

لفظ ذکر اور یحدث کا قرآنی مفہوم 326

قرآنِ حکیم کو نازل کرنے کا بنیادی مقصد و مدعا انسان
کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے 327

حکومت الٰہیہ کی تکمیل، نبی اکرمؐ کی خواہش اور قرآنِ حکیم کی رہنمائی 328

ذاتِ خداوندی کے غیر متبدل قانون انسانی
خواہشات کی تکمیل کی خاطر بدلا نہیں کرتے 328

لفظ تبلیغ کا قرآنی مفہوم 330

کسی معاشرے میں انقلاب لانے کے لیے انقلابی
کو ایک ایک قدم آگے بڑھنا ہوگا 331

قرآنی پروگرام کی تکمیل کا راز 332

کسی بلند ترین مقصد کی کامیابی کا راز نخلِ تمنا کے
ساتھ ساتھ طالب علمانہ ذہنیت میں مضمر ہے 333

بارھواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 115: تمہید قصہ آدم

قصۂ آدم کی حقیقت اور اہمیت 335

بات کو سمجھانے کا قرآنی انداز 336

چیزوں کے سایہ کی مثال 337

فعل اور عمل کا قرآنی مفہوم 338

کائنات میں دو عظیم انقلاب 339

حمل امانت کے سلسلہ میں مروجہ تراجم کی حالت زار 339

مذہب میں انسان مجبورِ محض ہوتا ہے 341

کرۂ ارض پر بنی آدم کے پہلے دو بیٹوں کے قتل کا قصہ 342

انسانی فطرت کی کہانی قرآن کی زبانی 343

کیا خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟ 344

جو چیز بھی فطرت رکھتی ہو اس کی طرف کوئی نبی نہیں آتا 345

انسان کے لیے راستے کے تعین کا طریق 346

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ 346

نزولِ وحی کے سلسلہ میں انسان کا عہد طفولیت 347

ختم نبوت انسانیت کے بالغ ہونے کا اعلانِ عظیم: ایک دوسرا انقلاب 348

آج بھی دنیا کا ہر مذہب ایک آنے والے کی انتظار میں کھڑا ہے 350

زندگی بھر انتظار کرنے والے قومیں ہمیشہ سوئی رہتی ہیں 351

مذہب اور دین کا بنیادی فرق 352

قرآنِ حکیم کے نزدیک عزم کی اہمیت 355

اولوالعزم ہونا انبیاء کرام کا خاصہ تھا 355

صراط کے ساتھ مستقیم کا لفظ کیوں؟ 357

ہمارے ہاں کے اولیاء اللہ 357

جنت کی کیفیت اور محسوسات 358

خدا کی مشیت اور اس کی مرضی کے متعلق مودودی کی تفسیر 359

تیرھواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 116 تا 130

آدم علیہ السلام اور حوا کے تصور کی حقیقت 363

وقت کے ساتھ ساتھ علم انسانی کر پرواز کا ثمر 363

نسل آدم میں نسلی امتیاز اور مفادات کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی؟ 363

تخلیق کائنات کے وقت فطرت کی قوتوں کا ظہور 364

میری اور تیری کے قصے کی ابتدا اور اس کا علاج 365

سب سے پہلا مسئلہ تو معیشت کا ہی مسئلہ تھا 366

قصۂ آدم کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی انداز 367

اس لحاظ سے انسان نے اپنی ذات کو ہی مسلمان کرنا ہے 368

شیطان کی افسوں کاری 369
لفظ وسوسہ کا قرآنی مفہوم 370
شجر کا قرآنی مفہوم 372
بعض چیزوں کو مہذب انداز میں بیان کرنے کا طریق 372
وسوسہ کی تباہ کاریں 373
تورات یا بائبل کے بیان اور قرآن کی تعلیم میں فرق 374
ابدی طور پر راندۂ درگاہ کا قرآنی مفہوم 375
مشاجرت کا نتیجہ مقام بلند سے پستی کی طرف آنا ہے 376
لفظ عدو کا قرآنی مفہوم 377
قوموں کی روزی تنگ ہونے کی اصل وجہ 378
خدا کا مقرب بننے کے سلسلے میں بدحالی کا فریب 379
اک پکھ تے سو عیب: ایک ابدی جہنم 380
تنسیٰ یعنی خدا کو بھلا دینے کا قرآنی مفہوم 381
محنت اور مشقت میں فرق اور اسراف کا مفہوم 382
قرآنی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ: نہ خوف نہ حزن 383
تاریخ ایک سائنس ہے اور علم الانسان کے لیے تاریخی حقائق کا ثبوت 384
نتائج کے لحاظ سے تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے 384
اجڑی ہوئی بستیوں کی ایک ایک ٹھیکری اپنے اندر ایک سبق رکھتی ہے 384
حدود انسانیت کا فارمولہ 385
نظامِ انسانیت میں ساری بات تو نظام کی تبدیلی کی ہے 386
مہلت کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے 387
نبوت کا عزم بلند اور منتہائے مقصود 388
نبوت کا بسیرا حجروں اور خلوت کدوں میں ہوتا ہی نہیں 388
نبی اکرم ﷺ کی شب و روز کی معروف زندگی 389
ہمارے ہاں پیش کیے جانے والے مروجہ اسلام کے خدوخال 390
قصۂ آدم کی کہانی ریڈیو پاکستان کراچی سے
مولانا احتشام الحق تھانوی کی زبانی 391
ہمارے ہاں سلسلہ اسلام کے تین گوشے اور تعلیم یافتہ طبقہ 393

چودھواں باب: سورۂ طٰہٰ آیات 131 تا اختتام

تقویٰ اور متقی کا مفہوم 395
ایک انقلابی کی زندگی کے ابتدائی مراحل 395
بالا طبقے کی ذہنیت 397
مخالفتوں کے برعکس نبی اکرمؐ کا ردِعمل 398
رزقِ طیب کی تعریف 399
قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم 400
صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم 401
نظامِ ربوبیت کی بنیاد 402
خیرات کے سلسلہ میں مروجہ مذہبی سوچ کا نتیجہ 402
کثیر اور کثرت کے بعد کوثر کا اضافہ 403
دین کی ساری عمارت دلائل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے 404
روزِ اول سے مذہب اور دین میں فرق رہا ہے 405
قرآن کریم کو بنیادی طور پر مہیمن کہا گیا ہے 405
بزرگوں کے ہاں بھی دلائل کی بجائے کرامتوں کا ہی ذکر ہے 406
عقل کی تنقیص اور فلسفہ امام غزالی 408
ہمارے ہاں عرسوں اور مقبروں کی شہرت کی وجہ جواز 408
اقبال کی نظر میں ملت اسلامیہ کی زبوں حالی کی وجہ 409
قانونِ خداوندی کا طریق کار 411
حقائق کو سچے کر کے دکھانے کا آخری طریق 412

پیش لفظ

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے درسِ قرآن کریم کا باقاعدہ آغاز 1950ء میں کراچی سے کیا جو بڑے حسین سادہ سے الفاظ میں تھا۔ آپ 1958ء میں 25/B گلبرگ لاہور شفٹ ہوگئے اور یہاں سے از سرنو ہفت روزہ درس قرآن کا آغاز ہوا۔ جو 15۔اکتوبر 1984ء تک جاری رہا۔ ازاں بعد آپ مسلسل بستر علالت پر رہے اور آخر کار 24 فروری 1985ء کی شام چھ بجے فکر قرآنی کے آسمان کا یہ درخشندہ ستارہ جہان فردا کی جانب جادہ پیما ہوا۔

مفکرقرآن علامہ پرویز مرحوم' عمر بھر قرآنی مطالب کو جس انداز سے سامعین کے دلوں میں جاگزیں کرتے رہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ احبابِ قرآنی کے مسلسل اصرار پر 1975ء میں آپ نے مطالب الفرقان کی تالیف کا آغاز بھی کر دیا تھا لیکن اس وقت چونکہ آپ کا رہروِ عمر 72 سے بھی زیادہ منازل طے کر چکا تھا اس لیے وہ اپنے دروس کو تصنیفی انداز میں از سرنو مربوط و منظّم صورت میں پیش کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے تاہم احباب کے تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کی خاطر ان کو املا کرانے کی سعیٔ بلیغ کرتے رہے جس کی تفصیل سورۃ النحل کے تعارف میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مفکرِ قرآن کی وفات کے بعد ان کی رہائش گاہ 25۔بی گلبرگ لاہور سے ماہنامہ طلوع اسلام جاری رہا اور اب تک باقاعدگی سے جاری ہے۔ طلوع اسلام ٹرسٹ قائم کیا گیا' قرآنک ریسرچ کے لیے پرویز میموریل لائبریری بھی قائم کی گئی۔ اس وقت آپ کی آڈیو وڈیو کیسٹس کے علاوہ لاکھوں پمفلٹ اور درجنوں کتب مملکت پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں پہنچ چکی ہیں جبکہ بزمہائے طلوع اسلام دروس قرآن کو بذریعہ وڈیو پوری دنیا میں پہنچانے میں مصروف کار ہیں نیز یہ کہ یہ سارے کا سارا لٹریچر آج ویب سائٹ پر بھی منتقل ہو چکا ہے' جہاں سے زمیلانِ قافلہ قرآنی مستفید ہو رہے ہیں۔ لیکن مفکر قرآن کے پیش کردہ دروس کو مکمل صورت میں مرتب کرنے کا کام شروع نہ ہوسکا تآنکہ ادارہ طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام بزم طلوع اسلام لاہور نے اس عظیم قرآنی اشاعتی پراجیکٹ کا اہتمام کیا اور اللہ کے فضل وکرم اور احباب کے تعاون سے اکتوبر 2003ء سے لے کر اب تک اس سلسلہ کی تین جلدیں' جو سورۃ النحل' سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکھف و مریم کے دروس پر مشتمل ہیں' شائع ہوچکی ہیں جن کا مطالعہ کرنے والے اربابِ فکرونظر نے ان کے حسنِ صوری ومعنوی کی دلی طور پر تحسین کی ہے۔ نیز اس پراجیکٹ کی بحسن وخوبی تکمیل کے لیے اپنی خواہشات کا اظہار بھی کیا ہے۔ بہرحال بزم طلوع اسلام لاہور نے مفکر قرآن علامہ پرویز مرحوم کے ان دروسِ قرآن کو کمپوزنگ کے دشوار گزار مراحل کے بعد' ان کے تقریری متن کو مربوط و منظّم تحریری صورت میں پیش کرنے کی خاطر محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی

خدمات حاصل کیں جن کی شب و روز انتھک محنت و کاوش ہم سب کے لیے لائق تحسین ہے کہ جس کے باعث مذکورہ تفسیری کتب کے مطالعہ میں قارئین کرام کسی قسم کی علمی تشنگی محسوس نہیں کریں گے۔

یہ حقیقت اہل علم سے مخفی نہیں کہ تقریری انداز کو مربوط (جسے عام اصطلاح میں Body Language کہتے ہیں) تحریری انداز میں ڈھالنا اور اس کی نوک پلک درست کرنا بڑا ہی کٹھن کام ہوتا ہے۔ مقرر تو الفاظ کے زیر و بم' ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں' اندازِ بیان' طرزِ تکلم' استدلال و استغراق' برمحل اشعار وضرب الامثال وغیرہ کی مدد سے حاضرین کو مسحور کر سکتا ہے لیکن ان سب حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذوقِ قارئین کے لیے قرآنی فہم وفراست کا سامانِ تسکین فراہم کرنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور پھر مفکر قرآن علامہ پرویز مرحوم کے فکر ونظر کو ہدیہ قارئین کرنا تو اور بھی دشوار ہے۔ ان مراحل سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو علوم طبعی' خاص طور پر علم الحیات' علم الطبیعات و کیمیا' علم بشریات کے ساتھ ساتھ سماجی سائنس کے علوم: تاریخ' فلسفہ' نفسیات' عمرانیات' سیاسیات' معاشیات اور (عربی' فارسی' انگریزی' اردو اور پنجابی) زبان وادب پر گہری نگاہ رکھتا ہو کیونکہ یہ دروسِ قرآن اس شخصیت کے ارزاں فرمودہ ہیں جن کے سامنے 'بقول ناصر کاظمی مرحوم'' الفاظ ہاتھ باندھے ہی کھڑے نہیں رہتے بلکہ لرزاں رہتے ہیں کہ وہ ان کی اصلیت سے واقف ہیں۔'' لہٰذا اس ہستی کے تقریری متن کو تصنیفی طرزِ اسلوب میں ان کی پیش کی گئی تعلیماتِ قرآن کو اسی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہدیۂ قارئین کرنا آسان کام نہیں۔ محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب نے اسی تقریری متن کو مربوط ومنظّم تحریری صورت میں ڈھال کر اور ضروری تحقیقی حواشی' شذرات ومندرجات سے مزین کر کے اس دشوار گزار کام کو ممکن کر دکھایا۔ اس طرح انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں وہ کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ تفسیری کتاب انہی کی شب و روز انتھک محنت اور کاوشِ علمی کا ثمر ہے۔ اس کے لیے وہ قابلِ صد مبارک باد ہیں۔

ہم اس موقع پر محترم ڈاکٹر منظور الحق صاحب کے الفاظ میں جناب محمد علی فارق صاحب کے بھی دلی طور پر ممنونِ احسان ہیں کہ انہوں نے ''(سورۃ طٰہٰ کے) تمام کے تمام مسودہ کو بڑی عمیق نگاہ سے دیکھا اور اس میں پرویزؒ کے فہم قرآن کے سلسلہ میں دیئے گئے شذرات میں مزید ضروری وضاحتوں کی نشان دہی کی''۔

جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ کی دلی خواہش تھی کہ ان کے دروسِ قرآن کو اگر کتابی شکل دے دی جائے تو آگے چل کر یہ ایک تفسیر کی صورت اختیار کرے گی چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر ملک ظہور احمد مرحوم (جن کا تعلق پنڈی بزم سے تھا) نے لبیک کہتے ہوئے دروس کو Shorthand میں لکھ کر Reproduce کرنے کا بیڑا اٹھایا جو ایک بڑا کٹھن کام تھا چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں کافی کام بھی کیا اور ایک کنونشن کے موقعہ پر علامہ پرویز مرحوم نے ملک ظہور صاحب کی اس کاوش کا ذکر کر کے ان کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا تھا مگر افسوس کہ اس قدر محنت سے تیار کردہ یہ ریکارڈ کچھ لوگوں کی غفلت اور لاپروائی سے ضائع ہو گیا۔

مطالب الفرقان کی ایک اپنی اہمیت ہے مگر جو کام محترم اشرف ظفر اور ڈاکٹر منظور الحق صاحب اتنی محنت سے کر رہے ہیں یہ عظیم کارنامہ درحقیقت پرویز مرحوم کے اپنے الفاظ اور ان کے مخصوص انداز میں تیار کردہ ایک ایسی رواں تفسیر قرآن ہو گی کہ جس کی پہلے کہیں مثال نہیں ملتی۔

اب قارئین کرام کی خدمت میں سورۃ **طٰہٰ** جو چودہ دروس پر مشتمل ہے پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں نظامِ ملوکیت کے نمائندہ فرعون اور صاحبِ ضربِ کلیم کے درمیان کشمکش کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ حق و باطل کی اس آویزش میں فرعون، قارون اور ہامان کے کرداروں کو جس وضاحت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے، اس سے نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کے تمام باطل پہلو نمایاں ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

فرعون اور اس کی ہمنوا قوتوں کے لاؤلشکر، باطل پیشواؤں کے ساحرین کی سحرکاریاں ضربِ کلیمی کے سامنے تاب نہ لا سکیں اور آخر کار خود ساحرینِ فرعون (باطل ملوکیت کا نمائندہ) موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ براہین کو تسلیم کرتے ہوئے بے ساختہ **امنا برب العالمین** پکار اٹھے جس پر فرعون نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے انہیں طوق و سلاسل سے خوف زدہ کرنا چاہا لیکن جب نورِ آسمانی کی قندیل ان کے قلوب میں جلوہ گر ہوئی تو فرعونیت کے تمام حربے کسی کام نہ آئے۔ اس سورۃ میں صاحبِ ضربِ کلیم اور فرعون، ہامان اور قارون کی پوری داستانِ حق و باطل نہایت موثر پیرایہ میں حواشی و حوالہ جات کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ اس میں سحر کی حقیقت اور عصائے موسوی کے مفہوم کے علاوہ قرآن کریم کی کئی ایک اصطلاحات کی تشریح بھی ہے، جس کے مطالعہ کے بعد امید کی جاتی ہے کہ قرآن کریم کے سمجھنے کے لیے قارئین کرام کو کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مروجہ تفاسیر کے سلسلے میں علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے جن 7 تفسیری نقائص ❶ کا تفصیلی ذکر کیا ہے، محترم پرویزؔ صاحب مرحوم نے دروسِ قرآن کے دوران ہمیشہ انہیں پیشِ نظر رکھا جس کے باعث ان دروس کی اہمیت ایک نیا اور منفرد فکری انداز لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ کتاب ہذا میں کم از کم ایک سو سے بھی زیادہ ایسے نکات موجود ہیں کہ جن کا مطالعہ قارئین کے علم میں بے پناہ اضافہ کرے گا۔ یہ تفسیری نکات دینی حلقوں اور قرآنی ذوق و شوق رکھنے والوں کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہیں چنانچہ احباب کا تقاضا ہے کہ یہ سلسلہ جاری و ساری رہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اربابِ فکر و نظر کی طرف سے اِن تفسیری کتب کے مختلف زبانوں میں تراجم کرنے کی سعیٔ بلیغ کا سلسلہ چل نکلے گا۔

اس موقع پر محمد ہارون ریاض صاحب، جناب رشید احمد صاحب اور رضا اللہ صاحب کو بھی داد دینی پڑتی ہے کہ جنہوں نے ان ٹیپ شدہ دروس کو کمپوزنگ کے عمل سے گزارتے ہوئے موتیوں کی لڑی میں پرو کر صفحہ قرطاس پر جگہ دی۔

ھی حتی مطلع الفجر۔

محمد شریف لون

چیئرمین، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور

---

❶ ان سات تفسیری نقائص کے مطالعہ کے لیے مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورہ النحل صفحہ 25 شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام 25/B گلبرگ لاہور، ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 1 تا 8)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طٰهٰ ﴿١﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿٢﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٣﴾ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ
الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ﴿٤﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿٥﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿٦﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ
وَاَخْفٰى ﴿٧﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿٨﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1976 کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ سے ہو رہا ہے:(20:1)

حروفِ مقطعات کی وضاحت

حروفِ مقطعات کے متعلق میں نے کئی دفعہ واضح کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ قاعدہ تھا کہ عرب Abbreviations (مخففات) کے اعتبار سے الفاظ کے لیے حروف لایا کرتے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں بھی انگریزی زبان میں (مثلاً) rsvp لکھتے ہیں، جس کے معانی ہیں ''جواب سے مطلع فرمائیے۔'' اِس کے اصل الفاظ یہ ہیں: Respondez's il vous plait یا جیسے خط لکھنے کے بعد PS لکھ دیتے ہیں جسے انگریزی زبان میں Post Script کہتے ہیں۔ پنجابی اچ اوہدے معنی آں پچھوں سُجھی [1] ''یعنی PS اصل میں انگریزی زبان کے الفاظ ہیں، حروف نہیں ہیں۔ [2] عربوں کے ہاں Abbreviations (مخففات) کا یہی انداز تھا۔ عبرانی میں بھی یہی انداز موجود ہے۔ میں نے تورات میں بھی یہ چیز دیکھی ہے اور عربوں کے ہاں تو پوچھو نہیں کہ وہ انہی اشارات اور کنائیات کے ان حروف سے بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتے تھے۔ قرآن چونکہ ان کی زبان میں نازل ہوا، اسلوب بھی انہی کا ہے، اور وہاں ان اشارات

---

1. پنجابی زبان میں اس کے معنی ہیں: بعد میں سوجھی۔
2. انگریزی زبان میں مخففات (Abbreviations) کے دو طریقے مروج ہیں: (۱) صرف پہلا حرف لے لیا جاتا ہے مثلاً North کے لیے N یا پہلا حرف اور اس کے بعد دوسرا اور تیسرا یا آخری سے پہلا حرف لے لیا جاتا ہے جیسے Synonym کے لیے Syn اور (2) درمیان کے حروف کو چھوڑ کر باقیوں کو لے لیا جاتا ہے مثلاً Weight کے لیے Wt اور Hours کے لیے Hrs یا C (on) f (er) کے لیے Cf، اسی طرح ar (oir) d (u) (ois) کے لیے ardp وغیرہم۔

وکنایات کا خوب استعمال ہوا ہے۔ اور جہاں تک میں نے دیکھا اور سمجھا ہے وہ یہی ہے کہ قرآنِ کریم میں خدا کی جو صفات بیان ہوئی ہیں یہ حروف (زیادہ تر) انہی صفات میں سے کسی نہ کسی ایک صفت کے سلسلہ میں آئے ہیں۔

لفظ تشقٰی کا مفہوم

عزیزانِ من! بات پیچھے سے چلی آ رہی تھی کہ معرکہ بڑا سخت تھا' جنگ عالمگیر نوعیت کی تھی' دشمنوں کی قوتیں بڑی صبر آزما تھیں' یہ جماعت بڑی مختصر سی تھی' اس کے سامنے مراحل بڑے صبر آزما تھے۔ کہا کہ طٰہٰ (20:1)۔ ❶ اے مخاطب (رسول)! ان سے کہیے کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ نیا نظام' نیا ضابطہ' اور نیا اعلانِ جنگ تمہیں اس لیے دیا جا رہا ہے کہ خدا تمہیں کچھ مشقتوں میں ڈالنا چاہتا ہے یا جو کچھ اس وقت تمہیں حاصل ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ بھی تم سے چھن جائے۔ ایسا بالکل نہیں' یہ بات ہی نہیں کیونکہ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (20:2)۔ ہم نے قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تجھ پہ زندگی بارِ گراں بن جائے اور تُو سعادتوں سے محروم رہ جائے۔ لتشقٰی کے یہ دونوں معنی ہو جاتے ہیں: مثلاً محرومی بھی ہوتا ہے اور جگر پاش مشقتیں بھی اور یہ دونوں چیزیں اکٹھی بھی ہوتی ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ ہم نے قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تمہارے ہاں کہیں یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ تفصیل کے اعتبار سے تو یہ ''لتشقٰی'' بہت وسیع المعنی ہے۔ اس لفظ میں بے شمار چیزوں سے محرومی ہے اور بڑی تکلیف دہ جگر پاش مشقتیں ہیں۔

لفظ مشاجرت کا مفہوم

عزیزانِ من! اب ہم اس سورۃ میں آگے چلتے ہیں۔ اس میں قصہ آدم کی یہ بات چلی آ رہی ہے کہ اس وقت جس نہج کی زندگی تم بسر کر رہے تھے' اس میں کیفیت یہ تھی کہ نہ تمہیں روٹی کی فکر ستاتی تھی' نہ کپڑے کی (20:118)۔ لہٰذا آدم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم نے آپس میں ''مشاجرت'' اختیار کی تو تم پھر اس سے محروم ہو جاؤ گے اور جگر پاش مشقتوں میں پڑ جاؤ گے۔

''مشاجرت'' عربی زبان میں ''اختلاف'' کو ہی کہتے ہیں۔ یہ اختلاف کس قسم کا اختلاف ہوتا ہے اس کے لیے عربی زبان کی نزاکت دیکھیے' عزیزانِ من! عربی زبان میں ''شجر''❷ کے معنی درخت ہیں۔ درخت کے ابتدائی طور پر ایک تنہ (Stem) ہونے کے

---

❶ قرآنی آیات کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے کہ نمبر کے بائیں (left) جانب سورۃ کا نمبر ہے اور دائیں (Right) جانب آیت کا۔ مثلاً (20:1) سے مراد ہے بیسویں سورۃ (سورۃ طٰہٰ) کی آیت 1۔ چونکہ قرآنِ کریم کے مختلف نسخوں میں آیات کے نمبروں میں دو ایک آیات کا فرق ہے اس لیے اگر زیرِ نظر کتاب میں کوئی آیت حوالہ کے مطابق نہ ملے تو ایک دو آیات آگے پیچھے دیکھ لیں۔ آیات کے نمبر کے لحاظ سے' ساری دنیا کے لیے' قرآن کریم کے ایک اسٹینڈرڈ (Standard) نسخہ کی بڑی ضرورت ہے جو کتابت کی غلطیوں سے بھی بالکل پاک ہو۔

❷ بقول تاج العروس شَجَرَ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہو جائے۔ اسی لیے شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ کے معنی ہیں: باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔ (پرویز: لغات القرآن جلد دوم' 1960' ص۔ 932)

باوجوداس کی شاخیں ''منتشر اور بکھری'' ہوئی ہوتی ہیں۔ یہی شجر کے بنیادی معنی ہیں۔ اسی لیے بقول تاج العروس [1] عرب ہر اس چیز کو جو مجتمع ہوکر پھر کسی وجہ سے متفرق ہوجائے ''شَـجَـرٌ'' کہتے تھے۔ اسی طرح امتِ واحدہ صدرِ اسلام میں تو ایک تھی' اس کے بعد اس میں تفرقے پیدا ہوگئے۔ یہ تھا وہ مشاجرت اور شجر جس سے منع کیا گیا تھا کہ تم کہیں ایسے نہ ہوجانا۔ عالمگیر انسانیت بھی شروع میں ایک تھی: **وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا** (10:19)۔ پوری نوع انسانی عالمگیر برادری تھی' اس کے بعد یہ ان شاخوں کی طرح پھٹ گئے۔ اس لیے اس عمل کو عرب ''شجر'' کہتے تھے جس کے معنی ہوتے تھے ''شاخوں میں بٹ جانا' الگ ہوجانا''۔ قرآن نے اسی لیے مشاجرت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ آدم سے یہ کہا گیا تھا کہ یاد رکھیے! اس وقت تو تمہاری یہ حالت ہے کہ **اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى . وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى** (119-20:118)۔ نہ تمہیں روٹی کی فکر ستاتی ہے' نہ کپڑے کی۔ نہ پیاس کا خوف ہے' نہ سورج کی تپش کا۔ تمہارے لیے کھانے کو روٹی' پینے کو پانی' پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان' سب کچھ بلا مشقت موجود ہے۔ یعنی اب تو جنتی زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ تمہیں نہ بھوک ستا سکتی ہے' نہ پیاس۔ کھانے پینے کو فراوانی سے سب کچھ ملتا ہے۔ موسم کی سردی گرمی کے لیے مکان بھی دیئے ہوئے ہیں۔ تمہیں کپڑے میسر ہیں۔ یہ سارا کچھ ہے۔ بغیر جگر پاش مشقتوں کے یہ سب کچھ مل رہا ہے لیکن اگر تم شیطان کے اس بہکاوے میں آ گئے اور تم نے آپس میں مشاجرت اختیار کر لی' شاخ شاخ میں بٹ گئے تو یاد رکھیے گا **فَـلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى** (20:117)۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنتی زندگی سے نکال باہر کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم زندگی کی ضروریات سے' جو تمہیں اس وقت اس آسانی سے فراواں میسر ہیں' محروم ہوجاؤ گے اور پھر ان کے حصول کے لیے تم جگر پاش مشقتوں میں پڑ جاؤ گے۔ تو یہ تمہیں اس جنت سے نکال دے گا۔ یہاں وہی لفظ ''فَتَشْقٰى'' آ گیا۔ لہٰذا اگلی پہلی چیز محرومی ہے جو ان چیزوں سے ہوگی اور پھر زندگی کا مقصد ہی ان چیزوں کا حصول رہ جائے گا۔ اس نے یہ تینوں چیزیں گنائی ہیں: روٹی' کپڑا' مکان۔ کہا کہ اسی دھندے کے اندر صبح سے شام ہوجائے گی' اور تم زندگی کی بلند خوشگواریوں اور مقاصد سے محروم رہ جاؤ گے' تمہیں انہی کی جگر پاش مشقتوں سے فرصت نہیں ملے گی۔ اس لیے یاد رکھنا کہ کہیں اس کے بہکاوے میں نہ آ جانا۔ یہ فَتَشْقٰى ہے۔ اس سے آگے دیکھیے اسی سورۃ

---

[1] تاج العروس' قاموس کی شرح ہے اور چونکہ لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اس لیے اس میں لسان کی ضروری تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تاج العروس آخری (Lastest) مفصل اور مستند لغت ہے جس میں اِس سے پہلے کی شائع شدہ قریب قریب تمام مستند کتبِ لغت کا خلاصہ آ گیا ہے۔ لسان العرب ابن مکرّم (جنہیں ابن منظور بھی کہا جاتا ہے) کی تالیف ہے۔ ان کی وفات ۷۱۱ھ میں ہوئی۔ قاموس کے مولف علامہ فیروز آبادی ہیں جن کی وفات ۸۱۶ھ میں ہوئی۔ تاج العروس کے مولف کا پورا نام محبّ الدین' ابن الفیض' السید محمد مرتضٰی الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی ہے۔ ان کی وفات ۱۲۰۵ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی معرکہ آرا لغت کو مصر میں مدون کیا۔ یہ دس ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ انگریزی زبان میں عربی کا مشہور لغت (Lane's Lexicon) تاج العروس پر مبنی ہے۔ (پرویز: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص۔ 23-22)

کی 124 ویں آیت میں اعلان ہوا کہ جو کوئی میرے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی اور ہم اُسے ظہورِ نتائج (قیامت) کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ تو اس کے بعد یہ آدم مایوس ہوا۔ قرآن میں قصہ آدم کے متعلق نہایت تمثیلی انداز میں جو ایک استعارۃً بات بیان ہوئی ہے' وہ دراصل تمہاری میری ہی داستان ہے۔ یہ اُس آدم کی نہیں بلکہ آدمی کی سرگزشت ہے کیونکہ آدم کا خاصہ مایوس ہونا بھی ہے۔

انسان کی تمام تر مایوسیوں کا علاج

عزیزانِ من! تو کیا اس کے بعد یہ ہمارے لیے ابدی محرومی ہوگی یا اس حالت زار سے نکلنے کی کوئی ایسی صورت ہوگی اور کیا انسان کو پھر سے کھوئی ہوئی جنت حاصل ہو جائے گی؟ کہا کہ ہاں' تمہیں وہ کھوئی ہوئی جنت حاصل ہو جائے گی لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ اگر تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا ہے تو اس لیے تم میں اصلاح کی گنجائش ہے: فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ (20:123) جو میری راہنمائی کا اتباع کرے گا تو فَلَا یَضِلُّ (20:123) اس کی محنتیں رائیگاں نہیں جائیں گی' وَلَا یَشْقٰی (20:123) اور نہ ہی وہ زندگی کی خوش گواریوں سے محروم رہ کر ان جانکاہ مشقتوں میں پڑے گا۔ یہاں یشقی کا وہی لفظ آ گیا ہے جو (20:2) میں آیا تھا۔

قرآنی قوانین سے اعراض برتنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! دیکھیے' یشقی کا مفہوم کیسے واضح ہو رہا ہے۔ وہاں (20:118-119) میں تھا کہ نہ بھوک کی پریشانی ہوگی' نہ پیاس کی' نہ کپڑے کی' نہ مکان کی۔ یہاں (20:123) میں پھر کہا ہے کہ وہ جو ہماری راہنمائی کا' ہمارے قوانین کا' اتباع کرے گا وہ ان مشقتوں میں نہیں پڑے گا۔ اس کے خلاف جو وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ (20:124) ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا (20:124) اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! یہاں مذہب کی دنیا میں دیکھیے کہ ہمیں تھپکیاں دے دے کر سلایا جاتا ہے اور کہا یہ جاتا ہے کہ نہیں' کوئی بات نہیں' یہاں اگر زندگی تنگ ہو جائے گی تو کوئی بات نہیں' چار دن کی یہ زندگی ہے۔ آگے چل کے' آخرت میں' تو پھر راوی عیش لکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں وہ جنت تمہارے ہی لیے ہوگی۔ عزیزانِ من! میں نے ابھی یہ آدھی آیت پڑھی ہے: فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا (20:124) روٹی' روزی تنگ ہو جائے گی اور اس آیت کا اگلا حصہ ہے کہ وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (20:124) جس کی یہاں روزی تنگ ہو جائے گی' وہ وہاں بھی اندھا ہی اٹھے گا۔ اب "تشقٰی" کے معنی سمجھ لیجیے۔ عزیزانِ من! محاورہ عرب میں قرآن اپنا مفہوم آپ واضح کرتا ہے۔ یہ دیکھیے کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ استعمال کیسے ہوتا ہے؟ قرآن نے مختلف مقامات پہ اس لفظ کی تشریح کیسے کی ہے؟ اس سے قرآن واضح ہو جاتا ہے' اِسی لیے اس سورۃ کی دوسری ہی آیت میں کہا کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (20:2) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تجھ پر زندگی بارِ گراں بن

جائے اور تُو سعادتوں سے محروم رہ جائے۔ یہ تو زندگی کی کامرانیاں اور خوش گواریاں عطا کرنے کا ضابطہ ہے: 20:18; 20:123-124۔ اس انقلابی پروگرام کے ابتدائی مراحل ضرور دشوار گزار ہیں لیکن اس کے بعد کامیابی تمہارے ہی حصے میں آئے گی: (94:1-6)۔

قرآن زندگی میں آسودہ حالی پیدا کرنے کے لیے دیا گیا ہے

عزیزانِ من! اب پھر میں اسی سورۃ طٰہٰ کی دوسری آیت پر آ گیا ہوں جہاں سے بات چلی تھی۔ قران ہم نے اس لیے نہیں دیا کہ تُو تشقٰی کی کیفیت میں آ جائے عزیزانِ من! قرآن نے بتا دیا کہ یہ تشقٰی تنگیٔ رزق ہے، یہ تشقٰی زندگی کے بلند مقاصد سے محرومی ہے، یہ تشقٰی زندگی کی خوشگواریوں، سرفرازیوں، سربلندیوں سے محرومی کا نام ہے، روٹی کے لیے جگر پاش مشقتیں تشقٰی ہیں۔ یہ کہا کہ یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم تشقٰی کی کیفیت میں رہو اور عزیزانِ من! پچھلا دور تو چھوڑ دیجیے آج جب بھی دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو سوائے اس رونا رونے کے کوئی دوسری بات نہیں کہ تشقٰی پڑ گیا۔ کہتے ہیں کہ ''اوبھئی! کدی ملیا کرو۔ بابا ملنا کی اے؟ روٹی دا دھندا ایہو جیا ہو گیا۔ اے ناں ذہن ای نیں لگن دیندا''[1] یہ تشقٰی ہے۔ یہ جگر پاش مشقتیں ہیں۔ کاہے کے لیے؟ میں جو کہا کرتا ہوں کہ گدھا بھی دن بھر مشقت کرتا ہے، اس کے پیچھے چلنے والا، اس کا چلانے والا، لا دو یا کمہار، وہ بھی دن بھر مشقت کرتا ہے۔ دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے جتنا وہ گدھا چلتا ہے، اتنا یہ چلتا ہے مگر اس سے زیادہ اس کو مصیبت ہوتی ہے کہ اسے اس گدھے کو بھی آگے پیچھے روکنا پڑتا ہے اور پھر اس کے اُوپر بوجھ بھی لادتا ہے۔ تھک تھکا کے دونوں گھر آ جاتے ہیں۔ گھر آنے کے بعد گدھے کا ''تشقٰی'' تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے گھاس کی ذمہ داری اس پہ ہے۔ اب اس کا ''تشقٰی'' پھر شروع ہو جاتا ہے کہ گدھے کا گھاس بھی لائے اور اپنے بچوں کے لیے روٹی بھی کہیں سے لائے۔ ''فٹے منہ تیرا اوکھوتے''[2] یہ ہے لتشقٰی۔ اسی لیے کہا کہ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (20:2)۔ ہم نے تجھ پہ یہ قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تجھ پر زندگی بوجھ بن جائے اور تُو سعادتوں سے محروم رہ جائے۔

قرآن پر عمل نہ ہو تو پھر تشقٰی کی کیفیت ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! اگر کسی قوم کی تشقٰی کی کیفیت ہے تو پھر سمجھ لو کہ اس کے پاس قرآن نہیں ہے، ورنہ (معاذ اللہ) قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا۔ عربی جاننے والے مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ کا انداز جانتے ہیں کہ یہ قرآن اس لیے نازل ہی نہیں ہوا کہ اِس سے یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ اب یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا یہ قرآن ہماری کتاب ہے، آیا اس قرآن کو ہم مانتے ہیں، آیا یہ ہمارے لیے بھی نازل ہوا ہے یا نہیں، ایک ہی ٹیسٹ ہے اور وہ ہے Pragmatic Test (عملیّتی آزمائش)۔ اس سے یہ دیکھیں گے کہ اگر تشقٰی کی

---

[1] بھائی صاحب! کبھی تو ملا کرو۔ ارے بابا! کیسا ملنا؟ روزگار کا مسئلہ ہی اتنا گمبھیر ہو چکا ہے کہ اب ذہن کہیں ٹکتا ہی نہیں۔

[2] فٹے منہ تیرا اے گدھے

کیفیت ہے تو پھر یہ تمہارے پاس نہیں ہے کیونکہ اس کے پاس ہوتے ہوئے تشقّی کی کیفیت ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس کے بعد بھی ایک شرط ہے۔ وہ ہے اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (20:3)۔ اس کے نازل کرنے سے مقصد یہ ہے کہ جو شخص ڈرتا ہے کہ وہ کہیں زندگی کی شادابیوں سے محروم نہ رہ جائے' یہ اس کے لیے اقبال مندیوں اور سرفرازیوں کا موجب ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟ اس میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ اس کے لیے ہے جو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ یاد رکھیے! جسے ہم ''خشیّت'' کہتے ہیں' جسے خشیّتِ باری تعالیٰ کہتے ہیں' اس کے یہ معنی نہیں ہوتے ہیں کہ ''بیٹھا ہوا کانپ رہا ہے' رو رہا ہے' اوہو ہو کر رہا ہے' ڈر رہا ہے۔'' ڈر کا تو سوال نہیں ہے' عزیزانِ من! یہ تشقّی ہوتا ہے کہ ایسا نہ کرنے سے کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ اسے ہی خشیّت کہتے ہیں' تو یہ خشیّت وہ احساس ہے جس میں ہمیشہ یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ اگر قرآن کے مطابق زندگی نہ گزاری تو تشقّی ہو جائے گا۔ یہ ہے خشیّـــت۔ کہا کہ جسے یہ احساس ہے کہ اگر قرآن کے مطابق زندگی نہ گزاری تو تشقّی ہو جائے گا' تنگی ہو جائے گی' محرومی ہو جائے گی اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ اسے ضرور یہ روٹی ہی ملے گی' رزقِ باشرف ملے گا۔

ذکر کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں تو ذکر کے معنی وہ ''ذکر'' ہے جو کچھ خفی ہوتا ہے اور کچھ جلی۔ پھر اس جلی اور خفی ذکر کا نتیجہ قلب کا ''چلنا'' ہوتا ہے پھر اس ''چلنے'' کا نتیجہ اخبار میں آتا ہے کہ جی! رات اچھے بھلے سوئے' صبح انتقال فرما گئے کیونکہ ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ اے قلب چلدا اے۔ ❶

یعنی ان کے ہاں ذکر کے معنی ایک ایسی چیز کے ہیں جو ہر وقت سامنے رہے۔

عزیزانِ من! صرف یہی بات نہیں ہے۔ سامنے رہنے کے لیے تو ہر چیز رہے گی۔ درحقیقت ذکر اس چیز' یا اس پروگرام' یا اس نصب العین کو کہتے تھے' جو شرف اور عزت کا باعث بنے۔ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (21:10)۔ ہم نے تمہاری طرف یہ ضابطۂ قوانین نازل کیا ہے۔ اِس میں خود تمہارا ''ذکر'' ہے۔ یعنی ہم نے قرآن نازل کیا ہے جس میں تیرے اور تیری قوم کا ''ذکر'' ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ذکر تو اس کے اندر خدا کا ہے۔ یہ تیرے اور تیری قوم کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ نہیں' یہ تو تیری اور تیری قوم کے ذکر کے لیے ہے' تو ذکر کے معنی ہی ''شرف اور مجد'' ہیں۔ کہا کہ اس میں تیری اور تیری قوم کے شرف و مجد کا راز پوشیدہ ہے۔ کہا کہ یہ قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ اس کے نزول کے بعد اس کے ماننے والی قوم پھر تشقّی کی زندگی بسر کرے۔ وہ زندگی تو شرف کی زندگی ہو گی' یعنی یہی نہیں کہ اِس زندگی میں روٹی کپڑے کی طرف سے فراغت ہو جائے گی' اِس زندگی میں شرف' مجد' تکریم' عزت اور سرفرازیاں نصیب ہو جائیں گی۔ لیکن یہ کس کے لیے ہو گا؟ کہا کہ یہ اس کے لیے ہو گا جو لِمَنْ يَّخْشٰى (20:3) ہو گا۔ یعنی جسے یہ احساس رہے کہ اگر یہ نہ ہوا تو پھر تشقّی کی زندگی آ جائے گی اور وہ زندگی پھر اِس دنیا اور اُس دنیا' دونوں میں' ذلت

---

❶ یہ ہے جسے کہتے ہیں کہ قلب ''چلتا'' ہے۔

اور عذاب کا باعث ہوا کرتی ہے۔

معاشرے کی حالت کو رفتہ رفتہ بدلتے چلے جانا

عزیزانِ من! کہا ہے کہ یہ دعویٰ جو ہم کر رہے ہیں' بہت بڑا ہے اور یہ اس قوم کی طرف سے کیا جا رہا ہے جو کہ ایک ضعیف' ناتواں' کمزور سی' چند نفوس پر مبنی ایک قوم ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ جن وانس کے لیے جنگ کا اعلان ہے' بہت اچھا:

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے

یہ شخص [1] کیا باتیں کر جاتا ہے! کہتا ہے کہ میری یہ مٹی ہوا کے زور سے اڑ رہی ہے تا کہ ایک نیا آسمان پیدا کر دے' اس مٹی کو مٹی نہ سمجھو:

ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانے دگر

یہ ایک ذرہ ناچیز ہے اور اُس کے ولولے کی یہ حالت ہے کہ یہ کہتا ہے کہ میں اس سے ایک پورے کا پورا صحرا بنا کے رکھ دونگا۔ کہا کہ کہیں یہ قوم اپنے دل میں یہ نہ سمجھ لے کہ صاحب! یہ اتنی بڑی چیز کہہ دی گئی ہے۔ کہا: تمہیں معلوم ہے کہ کہنے والا کون ہے؟ کہنے والا ''تنزیلاً'' کہہ رہا ہے۔ ''تنزیل'' تو رفتہ رفتہ کسی چیز کو ''نزلاً'' (نازل) کرنا ہے' رفتہ رفتہ کسی چیز کو' بتدریج کسی چیز کو' نازل کرنا ہے۔ یہ پروگرام تئیس سال کے عرصے پر پھیلا دیا تھا اس لیے کہ جس حالت میں کوئی معاشرہ ہو' اس پروگرام کی وہاں سے ابتداء کی جائے گی' شباشب وہاں نہیں پہنچا دیا جائے گا۔ عزیزانِ من! یہ جو آج بھی ہمارے ہاں کے عجلت پسند اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب! تمہیں بھی درس دیتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا۔ یہ نظام کیوں قائم نہیں ہو جاتا؟ کیوں مکمل نہیں ہو جاتا؟ کہنے والے نے اسے ''تنزیلاً'' کہا تھا۔ یہ تئیس سال کے عرصے میں تکمیل تک پہنچا تھا۔ یہ کہا کہ اِس پروگرام میں استقامت کی ضرورت ہوگی۔ یہ Over Night (شباشب) ہونے والی بات نہیں ہے۔ تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَالسَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى (20:4)۔ یہ اُس خدا کی طرف سے رفتہ رفتہ بتدریج نازل ہوا ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلند ترین پہنائیوں کو پیدا کیا ہے اور ان میں اس کا قانون اس حسن و خوبی سے کارفرما ہے۔ جسے تم ارض کہتے ہو' یہ تو بڑی چھوٹی سی بات ہے۔ کائنات میں ارض کے ایک معنی پستی کے ہیں۔ یہ بڑا نچلا درجہ ہے اور یہ بات اور ہے' اور اسے قرآن کہنے والا ہے۔

قرآن انسان کو خاک کی پستی سے عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے

کہا کہ یہ قرآن نازل کرنے والا وہ ہے جس نے اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اس نے اس ارض ہی کو پیدا نہیں کیا بلکہ سماوات کے

---

[1] مفکرِ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)۔

اوپر الاعلیٰ ہے۔اس کی کیفیت کا تو تمہیں پتہ ہی نہیں کہ اس کے اوپر کتنی اور بلندیاں ہیں۔لہٰذا یہ کچھ پیدا کرنے والا اگر تمہیں یہ بات کہدے کہ تمہیں اس خاک کی پستی سے اٹھا کے عرش کی بلندیوں پر پہنچا دیا جائے' تو وہ غلط نہیں کہتا۔اس نے تو یہ کر کے دکھا دیا ہے۔ خلق یعنی پیدا ہی نہیں کیا' بلکہ **اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى** (20:5)۔اس کارگہہ کائنات کا مرکزی کنٹرول بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔یہ کنٹرول تو ''استوٰی'' ہے جو کبھی ڈولے ہی نہیں۔یہ ہمارے ہاں ایک لفظ ہے' اس چیز کا ترجمہ ڈولنا ہوتا ہے۔استوٰی کی وہ کیفیت ہوتی ہے جسے Balanced کہتے ہیں یعنی ڈولے نہیں۔عرش کے معنی سنگھاسن ❶ کے ہوتے ہیں۔یہ اقتدار کا مقام ہے جسے ہمارے ہاں تخت کہتے ہیں۔یہ مرکزی کنٹرول ہے۔ہاں تو وہ اس عرش پر ہے جو ڈولتا نہیں۔کیا خوبصورت الفاظ میں' عزیزانِ من! کہہ جاتے ہیں: میں سمجھتا ہوں کہ ''ڈولدا نئیں ہیگا'' ❷ اس کا صحیح ترجمہ ہے۔اور اس پہ کون براجمان ہوتا ہے؟ کیا فرعون معاذ اللہ؟ کیا کوئی مستبد حاکم' جبروت کا مالک جو ہر ایک کو اپنے شکنجے میں کسا ہوا رکھتا ہے؟ کہا کہ نہیں صاحب! اس پہ الرحمٰن ہے' رحمتوں کو بانٹنے والا' بلا مزدو معاوضہ سامانِ نشوونما دیکے اس قابل کرنے والا کہ پھر تم خود کما سکو۔یہاں اسے رحمٰن کہا ہے' رحیم نہیں کہا۔رحیمیت کی صفت وہ ہوتی ہے جو مسلسل چلتی جائے' جس میں سامانِ نشوونما بتدریج بلا مزدو معاوضہ ملتا چلا جائے۔یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں انسان کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔وہ سامانِ نشوونما بلا مزدو معاوضہ دیا ہے۔یہاں رحمانیت کی بات ہے۔یعنی وہ یک لخت' یک بارگی سامانِ نشوونما دے گا اور جب بچپن سے آگے چلو گے تو سامان تو وہ سارا بہم پہنچائے گا لیکن پھر اس کے بعد تمہیں خود ہی اس سے حاصل کرنا پڑے گا۔قرآن تو دیا ہی اس لیے گیا ہے تا کہ تم ''تشقیٰ'' کی حالت میں نہ رہو اور پھر آگے ''عرش'' کہا ہے۔عرش کے معانی آگے دیئے: **لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَمَا تَحۡتَ الثَّرٰى** (20:6)۔کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں یہ جو کرّے نظر آ رہے ہیں' یہ تمام اسی کے پروگرام کے لیے (لَهٗ) سرگرمِ عمل ہیں۔کہا کہ صرف یہی نہیں بلکہ اُن میں بھی جو' ان بلند ترین پہنائیوں (السمٰوٰت) سے پست ترین گہرائیوں (الارض) تک ہے۔وہ جسے ہم Vacuum یا خلا کہتے ہیں' وہ صرف خلا ہی نہیں ہے۔ان کے درمیان میں تو پتہ ہی نہیں ہے کہ کیا کچھ ہے۔اب جدید تحقیقات سے پتہ چل رہا ہے کہ ان کے درمیان کتنا کچھ ہے' اور پھر یہی نہیں کہ یہ جو کچھ زمین کے اوپر' اور نیچے تک ہے' وہی اس کے پروگرام کے لیے رواں دواں ہے بلکہ وہ بھی جو اِن پستیوں اور بلندیوں کے درمیان اس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے مصروفِ تگ وتاز ہے۔قرآن کریم نے اس کے لیے ثریٰ کا لفظ استعمال کیا ہے اور پھر ثریٰ کے ساتھ بھی صفت ہے یعنی تحت الثریٰ۔ان کے ہاں ثریٰ ہے ''جنوں اسیں وتر کہنے اں پنجابی اچ۔کہ زمین کھودی جائے جہاں تک کہ

---

❶ یہ ہندی مذکر لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں شاہی تخت' راج گدی۔

❷ وہ ڈگمگاتا نہیں ہے۔

وہ ذرا سی گیلی مٹی نکلتی ہے اووتر ہوندا ہیگا اے۔''❶ وہ عرب اسے ثرٰی کہتے تھے۔ ریت کے میدان والے کا ثرٰی تو پتہ نہیں کہ ان غریبوں کا کہاں جا کے نکلتا ہوگا۔ ان کے ذہن میں یہی آیا کہ سب سے نیچے درجہ وہی ہوتا ہے' جتھوں پانی نکل آوے'❷ یعنی جس سطح پر پانی نکل آئے۔ بہرحال یہ عرب اسے ثرٰی کہتے ہیں یعنی مٹی کے نیچے انتہائی گہرائی کو ثرٰی کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ تو ہوا اس کا کنٹرول۔ پھر کہا کہ صرف انہی محسوسات پہ ہی کنٹرول نہیں بلکہ سِرَّ وَاَخۡفٰی پر بھی ہے۔

سِرَّ وَاَخۡفٰی کا قرآنی مفہوم

کہا: وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰی (20:7)۔ جب اس کے قانونِ مکافات کی کارفرمائی کا یہ عالم ہے کہ یہ تمام سلسلۂ کائنات اس کے لیے سرگرم عمل ہے' تو اس کے نزدیک یکساں ہے کہ کوئی بات پکار کر کہے (یا چپکے سے)۔ وہ تو تمہارے ہر بھید بلکہ بھید سے بھی زیادہ مخفی شے (نیت اور ارادہ) تک سے بھی واقف ہے۔ تمہاری ہر بات کو جاننے والا ہے۔ کہاں تک بھی وہ بات کیوں نہ ہو' وہ جاننے والا ہے۔ دو لفظ یہاں آئے ہیں جی! سننے کی بات ہے۔ وہ ہیں: ''سر'' اور اس کے بعد ہے ''اخفیٰ''۔ سر تو خود بھید کو کہتے ہیں' راز کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ اخفیٰ ہے یعنی جو اس سے بھی خفی ہے' راز سے بھی آگے ہے۔ راز تو پھر وہ بات ہوتی ہے کہ کسی دوسرے کو آپ ہمراز بنا ہی لیتے ہیں تو یہ بات اس طرح بھی زبان پر آجاتی ہے خواہ وہ مستور ہی کیوں نہ ہو' خواہ آپ باہر سے اس پہ پردہ ڈالے ہوئے ہوں۔ لیکن خدا تعالیٰ وہ بھی جانتا ہے جو اخفیٰ ہے' جو تمہارے دل کی گہرائیوں میں گزرے' زبان تک بھی نہ آئے' وہ اسے بھی جانتا ہے۔ سر کے بعد اخفیٰ تو قرآن ہی کہہ سکتا تھا۔ عزیزانِ من! ہم انتہا تک پہنچتے تو ''سر'' تک ہی بات کہہ سکتے تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اخفیٰ کون کہہ رہا ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (20:8)۔ اللہ کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں تمام اقتدار و اختیار اُسی کا ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی اور صاحب اقتدار ہستی نہیں ہے اور لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (20:8)۔ اس کی تمام صفات (جو قرآن کریم میں مذکور ہیں) انتہائی حسن و توازن کے ساتھ اس کی ذات کے مختلف پرتو Facets ہیں۔ یہاں ڈرنے کی بات نہیں۔ بڑے زور کے لفظ آ گئے تھے: بڑا اقتدار ہے اس کا۔ لیکن کانپنے کی بات نہیں صاحب! آ ڈاہڈے سوہنے سوہنے ناں وی تے سارے اوہدی ای نیں ناں ہیگے۔❸ قربان جاؤں میں اس قرآن کے اسلوبِ بیان پہ! عزیزانِ من! ذرا ڈر لگتا ہے تو فوراً پیار دیندا اے۔❹ کہا: اَلۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی (20:8) ہیں۔ ڈرنے والی

---

❶ جسے ہم پنجابی زبان میں ''وتر'' کہتے ہیں۔ یعنی زمین کو کھودا جائے یہاں تک کہ ذرا سی گیلی مٹی نکل آئے' وہ ''وتر'' ہوتا ہے۔

❷ جہاں سے پانی نکل آئے۔

❸ یہ سارے پیارے پیارے نام بھی تو اُسی ہی کے ہیں۔

❹ یہ پیار نچھاور کرنے لگ جاتا ہے۔

بات نہیں ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ جس انقلاب کے متعلق کہا ہے' وہ انقلاب ضرور آ کے رہتا ہے۔

ظالم کو ظلم سے روکنا بھی حسن ہے

اس سے یہی بات نہ مان لینا کہ اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کے اندر اس کی صرف یہی خوبیاں ہیں۔ وہ بھی ایک حسن ہے لیکن ظالم کو اس کے ظلم سے روک دینا بھی ایک حسن ہے صاحب! اور اس کے بعد کہا: وَهَلْ اَتٰـکَ حَدِیْثُ مُوْسٰی (20:9)۔ اِس حقیقت کبریٰ کو جاننے کے لیے خدا کے ضابطۂ قوانین پر عمل پیرا ہونے سے' کس طرح ابتدائی دشوار گزار مراحل کے بعد بالآخر کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں' اس کے لیے آؤ تمہیں موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت سنائیں۔ آؤ تمہیں حدیثِ موسیٰ علیہ السلام سنائیں۔ عزیزانِ من! سورۃ طٰہٰ کی آیت 8 تک ہم آ گئے۔ وقت ختم ہو گیا' 9 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 9 تا 17)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ۘ‏ ﴿۹﴾ اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّىۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّىۡۤ اٰتِيۡكُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ
اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى‏ ﴿۱۰﴾ فَلَمَّاۤ اَتٰٮهَا نُوۡدِىَ يٰمُوۡسٰى ؕ‏ ﴿۱۱﴾ اِنِّىۡۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَيۡكَ‌ۚ اِنَّكَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ
طُوًى ؕ‏ ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى‏ ﴿۱۳﴾ اِنَّنِىۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِىۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ
لِذِكۡرِىۡ‏ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخۡفِيۡهَا لِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا تَسۡعٰى‏ ﴿۱۵﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنۡهَا مَنۡ لَّا يُؤۡمِنُ
بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ فَتَرۡدٰى‏ ﴿۱۶﴾ وَمَا تِلۡكَ بِيَمِيۡنِكَ يٰمُوۡسٰى‏ ﴿۱۷﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1976 کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 9 سے ہو رہا ہے: (20:9)۔ مجھے افسوس ہے کہ پچھلے اتوار کو طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے میں درس نہ دے سکا۔ آج بھی ابھی کمزوری بہت ہے لیکن جی نہیں چاہا کہ مسلسل ناغے ہوں، حاضر ہو گیا ہوں۔ جہاں تک ہمت ساتھ دے گی، درس جاری رکھوں گا۔

تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ یہ جو سورتیں کہف، مریم اور طٰهٰ چلی آ رہی ہیں، ان میں ان انقلاب انگیز جماعتوں یا افراد کا ذکر آ رہا ہے جنہوں نے اپنے ہاں ہدایاتِ خداوندی کے تابع جرأت مندانہ اقدام سے بڑے بڑے انقلاب برپا کیے ہیں۔

ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی داستان کا

انقلاب کی ان داستانوں میں آویزشِ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون خاص اہمیت رکھتی ہے اور اسی کے پیشِ نظر قرآن کریم نے اس کا ذکر بڑے ہی تکرار اور تسلسل سے مختلف مقامات پر کیا ہے: کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمالاً۔ جیسا کہ میں ذرا آگے چل کر عرض کرونگا: جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ انقلاب کیوں لایا جا رہا ہے، تو وہاں میں عرض کرونگا کہ یہ انقلاب بڑا ہی جامع قسم کا تھا، اسی لیے قرآن نے اس کا ذکر نسبتاً زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ آغازِ داستان یہاں سورۃ طٰهٰ میں ہوتا ہے۔ کہا: وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ((20:9۔ اے مخاطب! اے رسول! اس حقیقتِ کبریٰ کو جاننے کے لیے کہ خدا کے ضابطۂ قوانین پر عمل پیرا ہونے سے کس طرح ابتدائی دشوار گزار مراحل کے بعد بالآخر کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہو جاتی ہیں، تُو سرگزشتِ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے سامنے رکھ۔ اے مخاطب! ان کی داستان بھی تجھ تک پہنچی ہے۔

عزیزانِ من! میں ذہنی تسلسل کے لیے عرض کر دوں کہ یہ مقام کونسا ہے اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی داستانِ حیات میں یہ مرحلہ کس

وقت آیا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں انہیں نبوت سے نوازا جا رہا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی قوم میں مصر میں پیدا ہوئے۔ حضرتِ یوسف علیہ السلام جن کا ذکر مصر میں آخری نبی کے اعتبار سے ہوتا ہے وہ شاخِ ابراہیمی کی اسرائیلی شاخ میں یعنی ذریتِ ابراہیمی کی اسرائیلی شاخ میں ہیں۔ ان کے بعد اس سلسلے میں نبیوں کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ ہوا یوں تھا کہ حضرتِ یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان، اپنے قبیلے کو بھی مصر میں بلا لیا تھا اور وہیں بس گئے تھے۔ چار سو سال کے عرصے میں وہ ایک اچھی خاصی قوم بن گئے لیکن وہ محکوم قوم کی حیثیت سے تھے۔ مصر کے شہنشاہوں کو فرعون کہا کرتے تھے، یہ ان کا نام نہیں ہوتا تھا، ان کا لقب ہوتا تھا۔ تو ان فراعنہ مصر کی محکومی میں بنی اسرائیل کی قوم مصر میں آباد تھی۔ چار سو سال کے عرصے میں تعداد کے اعتبار سے اچھی خاصی ہوگئی، اور جب یہ استبدادِ فرعونیت انتہا تک پہنچا تو اس دور میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی ہے۔ آپ وہیں اسی قوم میں پیدا ہوئے۔ آگے چل کر تفصیل سے بات آئے گی تو میں بھی زیادہ تفصیل سے عرض کرونگا۔ چونکہ مشیت کے پروگرام میں یہ تھا کہ انہوں نے آگے چل کر خود حکومت سے ٹکر لینی تھی، اس لیے ضروری تھا کہ یہ محلاتی سازشوں اور سیاست کی پیچیدگیوں سے واقف ہوں۔ محکوم قوم کے گھرانے میں پرورش پانے سے تو انہیں اس کے مواقع میسر نہیں آ سکتے تھے۔

حاکم اقوام، محکوم اقوام کے جوہرِ ادراک خرید لیتی ہیں

عزیزانِ من! حاکم قوم، محکوم قوم کو تو شریکِ حکم کرتی ہی نہیں ہے۔ وہ ان کے جوہرِ ادراک کو خرید لیتی ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877-1938) کے الفاظ میں اِس کے بغیر تو انہیں کہیں موقع ہی نہیں مل سکتا تھا کہ انہیں معلوم ہو کہ سیاست کے یہ پیچ وخم کیا ہوتے ہیں، جن سے انہیں لڑنا پڑے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ابتدائی زندگی

مشیت کے پروگرام کے تابع حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے محلات میں پہنچایا گیا۔ وہیں ان کی پرورش ہوئی، وہیں بڑھ کر جوان ہوئے۔ وہاں ایک قتل کا جرم سرزد ہوا، وہاں سے بھاگے ہیں تو یہی سینا کا صحرا ہے، یہی بیت المقدس کی زمین ہے، یہی طور کی چوٹیاں اور وادیاں ہیں، اسی علاقے میں یہ مدین میں پہنچے، وہاں شادی کی، بارہ برس تک بکریاں چرائیں۔ ہونے والے حکمران کے لیے یہ تربیت نہایت ضروری ہے۔

ہمارے ہاں یا عربی زبان میں بھی جو ''رعیت'' اور ''رعایا'' کا لفظ ہے، وہ اسی اعتبار سے ہے۔ وہ حاکم کو ''راعی'' کہتے ہیں۔ عربی میں راعی گڈریئے کو کہتے ہیں، بکریاں چرانے والے کو کہتے ہیں۔ یہ تربیت بڑی عظیم ہوتی ہے۔ بہر حال میں اِس سے آگے گزرتا ہوں مگر آگے بڑھنے سے پہلے اتنا تو ضروری ہے کہ عرض کرتا چلوں کہ راعی اور رعایا کا تعلق استبداد اور محکومیت کا تعلق نہیں ہوتا۔ کوئی راعی یا کوئی

گڈریا بھی اپنی بکری کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک نہیں کرتا۔ وہ اسے ہر قسم کی ہلاکت اور نقصان سے بچاتا ہے' اس کی پرورش کرتا ہے' غلط راستے پہ چلتی ہے تو صحیح راستے پہ لے آتا ہے۔ اس بکری کی پرورش' اس کی تربیت' اس کی حفاظت اس راعی کے ذمہ ہوتی ہے' وہ راعی کہلا ہی اس صورت میں سکتا ہے کہ جب وہ اپنی رعیت یعنی ان مویشیوں کے اس غلے کی حفاظت اور پرورش کرے۔ یہ بڑی عجیب قوم تھی۔ اپنے لیے جو الفاظ منتخب کیا کرتی تھی اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بڑی گہرائی میں جاتی تھی۔ ایک اَن پڑھ قوم' جس کے ہاں حکومت کا ایک منظّم تصور ہی نہیں تھا' اس نے بھی اپنے ہاں اگر حاکم اور رعیت یا رعایا کا تصور دیا ہے تو وہ راعی اور رعیت کے تصور سے دیا تھا۔ بہر حال وہاں بکریاں چرائیں۔ اس کے بعد اپنے اہلِ خاندان کو لے کر وہاں سے چلے آرہے ہیں۔ یہاں اہل خاندان یعنی قبیلے سمیت چلے آرہے ہیں۔ حالانکہ قبیلہ بہر حال ایک بڑا خاندان ہوتا تھا لیکن وہ اہلِ خاندان یا قبیلہ ہمارے ہاں اب بیوی کی حیثیت میں ہی سمٹ گیا ہوا ہے۔ قبیلہ جنوں اسی کینے اں ناں پنجابی اچ' اوہدی مراد بیوی ہوندی ہیگی اے [1]۔ کہا یہ ہے کہ وہاں وہ اپنے بال بچوں بلکہ اہل کے سمیت' معلوم نہیں اور بھی ساتھ تھے' وہاں سے چلے آرہے ہیں۔ قرآن نے یہ نہیں بتایا کہ اس سفر سے مقصود کیا تھا؟ اس کی منزل کیا تھی؟ کہا یہ ہے کہ وہاں راستے کا یہ مقام آ گیا۔ سردیوں کا زمانہ ہے' جنگل کا مقام ہے۔ غالبًا تاریک رات ہے' سرد بھی ہے تو قرآن وہاں سے بات شروع کرتا ہے۔ کہا: **هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى** (20:9)۔ تو اے مخاطبِ رسول ﷺ! موسیٰ کی داستان بھی تجھ تک پہنچی!

آگ بھی ایک حقیقت تک پہنچنے کی علامت ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہاں بات شروع کی۔ کہا: **اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى** (20:10)۔ اِس داستان کا آغاز ہم اُس مقام سے کرتے ہیں جب اُس نے (دُور سے) آگ دیکھی تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو' میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے میں وہاں سے تمہارے لیے ایک انگارا لے آؤں۔ یا (کم از کم) الاؤ پر کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ہمیں (اس اندھیری رات میں) راستے کا پتہ نشان بتا سکے۔ تنہا عقلِ انسانی' وحی کی مدد کے بغیر' اسی طرح قیاسات سے نشانِ راہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

ہاں تو عزیزانِ من! دُور سے انہوں نے دیکھا کہ پہاڑی کے اوپر آگ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو چیزیں یا نشانیاں ہیں' عربی زبان میں انہیں آیت کہتے ہیں۔ وہ کسی اور حقیقت کی نشانی یا علامت ہوتی ہے۔ اگر کہیں آگ ہو تو اس سے اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ میرا خیال ہے مشیت کو چونکہ مقصود تھا کہ اس کا یہ کارگاہ تباہ ہی نہ ہو جائے اس لیے اس نے حیوانات میں آگ جلانے کی صلاحیت ہی نہیں رکھی ہے۔ یہ کم بخت بندر تک سب کچھ نقل مار کے کر لیتا ہے لیکن آگ نہیں جلا سکتا۔ اگر انہیں کہیں آگ

---

[1] جسے ہم پنجابی زبان میں قبیلہ کہتے ہیں' اس سے مراد بیوی ہوتی ہے۔

جلانا آ جائے تو پوچھو نہیں یہ کیا کچھ کر گزریں' تو آپ کا یہ کائنات کا سلسلہ بھسم ہو کے رہ جائے' کم از کم یہ کرّہ ارض تو محفوظ ہی نہیں رہ سکتا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آگ اس بات کی آیت ہوتی ہے کہ وہاں کوئی انسان ہے۔ جیسے اگر کسی صحرا میں آپ کو پرندہ نظر آئے تو وہ اس امر کی نشانی ہوتا ہے کہ یہاں پانی ہے۔ کہیں صحرا کی تنہائیوں میں کتے کی آواز آئے تو ذہن میں آ سکتا ہے کہ کوئی بستی ہے' تو یہ چیزیں کسی حقیقت کی علامت بنتی ہیں۔ لفظوں لفظوں میں ہی قرآن عجیب باتیں کہہ جاتا ہے۔ آگ دیکھی تو اپنے اہلِ خانہ سے کہا کہ تم ذرا یہیں ٹھہرو' میں جاتا ہوں' سردی ہے یا تو وہاں سے کوئی آگ کا شعلہ لاؤنگا' یہاں آ کے پھر اس سے زیادہ آگ جلالیں گے' الاؤ بنالیں گے' اسے تاپ لینا اور یا ایسا نظر آتا ہے کہ یہ وہاں کچھ راستہ بھول گئے تھے اور کوئی بتانے والا نہیں تھا تو کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی راستہ بتانے والا بھی مل جائے۔

عقل کا طریق قیاسی ہوتا ہے

میں ابھی عرض کرونگا کہ عقل کا طریقِ کار قیاسی ہوتا ہے۔ وہ ان علامات سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے آگ دیکھی تو اس قیاس سے کہ وہاں کوئی انسان ہوگا' تو کہا کہ شاید وہ راستہ بتا سکے۔ یہ ساری چیزیں شاید کے تابع آتی ہیں' قیاس ہوتا ہے' منطق ہوتی ہے' Logic ہوتا ہے' یہ حقیقت تک پہنچنے کا فکری طریق ہوتا ہے' قیاس غلط بھی ہوسکتا ہے' ہوسکتا ہے کہ جہاں آگ روشن ہو' آگ جلانے والا وہاں سے کہیں اور چلا گیا ہو اور آگ سلگتی بھڑکتی رہ جائے۔ قیاس غلط ہو گیا کہ جہاں آگ ہو وہاں آدمی ضرور ہوتا ہے۔ آگ جلاتا تو وہ ہے یہ ضروری نہیں کہ وہاں وہ ہو بھی' تو یہ کہ وہاں اگر کوئی ہے تو وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ ہمیں راستہ بتا سکے۔ قیاس ہے کہ شاید راستہ بتادے۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ جو شاید ہے یہ عقل کا طریقِ کار ہوتا ہے' اس کے پاس دوسرا طریقہ ہی نہیں ہوتا۔ ان قیاسات کی رو سے بھی عقل اپنے تجرباتی طریق سے' جسے Trial & Error (سعی وخطا) کہتے ہیں' آہستہ آہستہ ناکامیوں سے' نامرادیوں سے گزرتی ہوئی' آگے بڑھتی ہے مثلاً ایک فارمولا لیا' اس پہ صدیوں تک عمل کیا۔ جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ ہڈیاں تڑوائیں' آگ اور خون کی خندقیں پھاندیں' اس کے بعد جا کے معلوم ہوا کہ نہیں یہ تو غلط تھا' صحیح طریق نہیں تھا۔ پھر دوسرا طریق لیا' پھر اس پہ چل نکلی۔ قرآن نے بات تو صرف یہی کہی ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں آگ ہے۔ میں جاتا ہوں وہاں کوئی آدمی ہوگا۔ آدمی ہوگا تو ممکن ہے وہ راستہ بھی بتادے۔ یہ عقل کا طریقہ تھا' ابھی حضرتِ موسیٰ علیہ السلام وحی اور نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ یہ وہ مقام ہے۔ وہاں سے آگے چلیے:
فَلَمَّآ اَتٰهَا (20:11)۔ وہاں پہنچے تو **نُوْدِیَ** (20:11)۔ آواز آئی: **یٰمُوْسٰی** (20:11)۔ اے موسیٰ علیہ السلام! قرآنِ کریم کے متعدد دیگر مقامات پر بھی اس واقعہ کا ذکر ہے اور ہر مقام پہ کہا یہی گیا ہے' جسے ہم پکارا گیا کہتے ہیں۔

یہاں آواز کا لفظ وحی کے لیے ہی استعمال ہوا ہے

نُوْدِیَ (20:11)۔ایک آواز آئی۔ ہم اس کا ترجمہ یہی کریں گے کہ ایک آواز آئی کہ اے موسیٰ! اب اسے بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب ہم اپنی زبان میں ''آواز آئی'' کہتے ہیں' تو اسے خدا کی طرف اس انداز کی آواز نہیں سمجھ لینا چاہیے جیسے انسان کی آواز ہوتی ہے۔ آواز کے لیے کسی واسطے' کسی میٹریل' کسی مادی یا طبعی یا Physical مشینری کی ضرورت ہے۔ آواز کے نکلنے کے لیے' آواز کے دوسرے کان تک پہنچنے کے لیے بھی' اگر راستے میں کہیں خلا ہو جائے' یہ Air (ہوا) نہ ہو' میری آواز آپ تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر میرے یہاں کا وہ وجود جسے ڈاکٹر Vocal Chord (وترصوت) کہتے ہیں' کہیں Defective (ناقص) ہو جائے یا نہ ہو' میں آواز نہیں نکال سکتا۔ یہ طبعی چیزیں ہوتی ہیں۔ خدا کی آواز طبعی آواز نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسی ہوتی ہی نہیں۔ اسے وحی کہا جاتا ہے۔

وحی کا معنیٰ ہوتا ہے: تیز اشارہ اور اشارے میں آواز نہیں ہوتی

عزیزانِ من! خود عربوں کے ہاں رسول اللہ ﷺ سے صدیوں پہلے کوئی وحی والا آیا ہی نہیں تھا۔ اصل یوں ہے کہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام کے بعد تو وہاں کوئی بھی پیغمبر نہیں آیا تھا لیکن یہ قوم بڑی ہی تیز ذہن والی تھی۔ انہوں نے جو وحی [1] کا لفظ ایجاد کیا' تو اس میں آواز کا پہلو نہیں تھا بلکہ اشارے کا پہلو تھا اور اشارہ بھی لطیف اور تیز۔ راغب [2] نے کہا ہے اور صاحب تاج نے بھی اس کی تائید کی ہے کہ اَلْوَحْی کے معنی تیز اشارہ کے ہیں۔ ابن فارس [3] نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا علم ہو جائے وحی کہلاتی ہے خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ بھی ہو: مخفی طور پر یا ویسے ہی۔ اس طرح ان کے ہاں کسی لطیف ترین' تیز ترین' اشارے کے لیے وحی کا لفظ آتا تھا اور وہ اسی لیے تھا کہ اس میں آواز کا پہلو نہ نکلے۔ یہ قوم کس قدر دوررس تھی۔ عزیزانِ من! اور ادھر یعنی ہم ہیں کہ قرآن ہمارے سامنے ہے' اس میں وحی کا تصور دیا گیا ہے' ویسے بھی فطری طور پہ' علمی طور پہ' زمانہ آگے چلا گیا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ آج بھی ہم جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور طور کی چوٹی پر ان کی ہم کلامی کی بات کریں گے' تو ذہن کے اندر ایسے ہی ہوتا ہے جیسے دو آدمی آپس میں

---

[1] اَلْوَحْیُ: اشارہ جس میں تیزی اور سرعت ہو۔ وَحَیْتُ لَکَ بِخَبَرٍ کَذَا۔ میں نے تمہیں فلاں بات کا اشارہ کر دیا یا چپکے سے مطلع کر دیا (تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن)۔ اَلْوَحْی کے معنی کتابت (یعنی لکھنا) بھی ہیں۔ وَحَیْتُ الکتاب۔ میں نے کتاب کو لکھا۔ واحٍ لکھنے والا (کاتب)۔ اَلْوَحْی لکھی ہوئی چیز اور بقول راغب ''لکھے ہوئے حکم''۔ اَوْحٰی کے معنی حکم کرنا۔ امر کرنا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم ۱۹۶۱ء ص۔۱۶۹۱)۔

[2] امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی مشہور تصنیف المفرداتِ فی غریب القرآن ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا لغت ہے۔ یہ کتاب بڑی مختصر ہے۔ علامہ پرویزؒ (1903-1985) نے اپنے لغات القرآن کی تدوین کے لیے اسے بنیادی طور پر سامنے رکھا ہے۔

[3] ابن فارس (المتوفی 395ھ) کی ''مقاییس اللغۃ'' ہے جس میں ہر لفظ کا مادہ اور مادہ کے بنیادی معنی دیئے گئے ہیں۔ چونکہ علامہ پرویزؒ (1903-1985) کے لغات القرآن کا مرکزی نقطہ مادے کے بنیادی معنی ہیں اس لیے اس میں انہوں نے ابن فارس سے نمایاں استفادہ کیا ہے۔

آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں۔ آمنے سامنے نہ سہی پسِ پردہ سہی' لیکن ہمارے ذہن میں تصورِ آواز ہی کا آتا ہے کہ آواز آئی۔ ہم جب ہم کلامی کہتے ہیں تو وہ اسی طرح کا کلام ذہن میں آتا ہے جیسے انسان آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ اور عربوں کے ہاں وحی کے وہ معنی فراموش کر دیتے ہیں جن کے لیے انہوں نے یہ لفظ وضع کیا تھا۔

غیر از نبی وحی کی ماہیت کو جان ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! اسے بھی ذہن میں رکھیے کہ خدا اور نبی کا جو ہم کلامی کا سلسلہ ہوتا ہے وہ انسانوں جیسا نہیں ہوتا۔ یہ کیا ہوتا ہے' اِسے کوئی غیر از نبی جان ہی نہیں سکتا اور نہ ہی اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن میں تو یہی کہا ہے کہ علمِ خداوندی براہِ راست قلبِ نبی میں القاء کر دیا جاتا ہے۔ بات یہ ہوتی ہے کہ خدا اُسے براہِ راست یہ علم عطا کر دیتا ہے۔ جسے یہ علم ملتا ہے اس میں اس شخص کی اپنی فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہاں سے عقل اور وحی میں یہ فرق پیدا ہو گیا۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ یہ علم ملتا کس طرح ہے' اسے کوئی غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا' Appreciate (داد و تحسین) ہی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد آج یہ بحث ہی ہمارے لیے بیکار ہے۔ اول تو یہ کہ جب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا' اس زمانے میں بھی کوئی غیر از نبی اِسے سمجھ ہی نہیں سکتا تھا اور دوسرا یہ کہ اب تو نبوت کا سلسلہ ہی ختم ہو چکا۔ یاد رکھیے! ختمِ نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کا تصور بڑا ہی باطل تصور ہے۔ ہمکلامی وحی کا ہی دوسرا نام ہوتا ہے۔ خدا صرف انبیاء سے ہمکلام ہوتا تھا' غیر از نبی سے نہیں اور جب وحی کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا تو خدا سے ہمکلامی ختم ہو گئی۔ آج کلام اللہ قرآنِ کریم میں ہے۔ اسے کہا ہی کلام اللہ گیا ہے اور یہ تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ (6:115) ہے' یعنی خدا کی طرف سے یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ جب اس کی طرف سے کلام ختم ہو گیا تو ہمکلامی کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ مگر ہمارے ہاں تو کہا یہ جاتا ہے کہ جی! نبوت نہیں' خدا سے رسالت نہیں' ہمکلامی کا سلسلہ تو اب بھی جاری و ساری ہے۔ یعنی لفظ بدل دینے سے سمجھ لیا کہ حقیقت بدل گئی۔ یہ بالکل غلط ہے' مگر افسوس یہ ہے کہ یہ جو ''ان'' کی خدا سے ہمکلامی ہے' یہ تو نبیوں سے بھی زیادہ اوپر کے درجے کی ہمکلامی ہوتی ہے۔

خدا کا نبی بھی خدا سے نہیں پوچھتا

عزیزانِ من! نبی کے معاملے میں Initiative (ابتدا) خدا کی طرف سے ہوتا تھا' یعنی وہ جب نبی سے بات کرنا چاہتا تھا تو بات ہوتی تھی' اگر کہیں ادھر سے بات نہیں آتی تھی تو نبی کے بس میں نہیں تھا کہ وہ آپ پوچھ لے کہ صاحب! آپ آجکل بات کیوں نہیں کر رہے' کیا بات ہو گئی' روٹھے ہوئے کیوں ہیں' ذرا اس بات کا جواب تو دیجیے۔ یہ نبی کی استطاعت میں نہیں تھا کہ وہ خود خدا سے کہے کہ مجھ سے بات کرو۔ یہ جو ختمِ نبوت کے بعد کی ہمکلامی ہے اس میں تو وہ ایک ایک گھڑی پہ کہتے ہیں کہ ذرا ٹھہریئے! میں خدا سے پوچھ کے بتاتا ہوں' اور روز رات کو تو (بقول اُن کے) یہ وہاں ایسے ہوتے ہیں کہ بس پوچھو نہیں۔ انہوں نے خدا کو ایسا بنا لیا ہے جس طرح کہ ''وہ

لنگوٹیا یار ہوندااے۔اس طراں دا کوئی رب بنایا ہویا اے اینہاں نیں۔''[1]

نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کا سارا تصور باطل تصور ہے

عزیزانِ من! نبوت کے بعد خدا سے ہم کلامی کا یہ سارا تصور ہی باطل ہے۔ نبی کا لفظ استعمال کرنے والے کے پیچھے تو یہ لوگ لٹھ لے کے پڑ جاتے ہیں اور یہ جتنی خاصیتیں خاصۂ نبوت تھیں' جو غیر از نبی میں ہو نہیں سکتی تھیں' وہ ساری کی ساری ان کے ہاں آ موجود ہوئیں۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ وحیِ نبوت یا خدا سے ہمکلامی کو کوئی غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہمارے سامنے تو اس وحی کے Contents مضامین' مواد ہیں' اس کا متن ہے' اس کے مندرجات ہیں جو قرآن کے اندر ہیں۔ ہم اسی پہ ایمان لانے کے مکلّف ہیں۔ یہ جاننے کے لیے مکلّف نہیں ہیں کہ یہ کیسے ہوتا تھا۔

خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہماری طرح کوئی آواز نہیں دی تھی

عزیزانِ من! نبی کو یہ علم کس طرح ملتا تھا' ہم اسے جان ہی نہیں سکتے۔ اس لیے جب یہ کہا کہ **فَلَمَّآ اَتٰـهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی** (20:11)۔ جب موسیٰ علیہ السلام آگ کے قریب پہنچا تو ایک آواز آئی کہ اے موسیٰ! اب چونکہ ہمارے ہاں اس کے لیے کوئی دوسرا لفظ ہی نہیں ہے اس لیے ہم اسے آواز ہی کہہ سکتے ہیں' ندا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ آواز انسانوں کی سی آواز ہے۔ انگریزی میں بھی تو اسے Voice ہی کہتے ہیں' حالانکہ یہ Vocal (صوتی) نطقی چیز نہیں ہوتی۔ کیا آواز آئی؟ **اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ** (20:12)۔ میں تیرا نشو ونما دینے والا ہوں۔ تُو اب اس مقام تک آ پہنچا ہے' جہاں تیرے لیے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں۔ کیا بات ہے! ''انـــی'' تو بڑی ضخیم سی چیز ہے۔ کہا کہ اب قیاس کی منزل ختم ہوئی۔ اِس لفظ ''انی'' نے ہی قیاس ختم کر دیا۔ عزیزانِ من! اس زبان میں یہ لفظ آتا ہی ''یقین کے لیے'' ہے۔ کہا کہ یہ بات اب قیاسی نہیں ہے کہ ''پتہ نہیں آواز آئی ہے' کس کی آواز ہوگی۔'' اور پہلی ہی آواز کے اندر جو ''ہم'' کہا گیا ہے' تو اس سے یہ نظر آ رہا ہے کہ کس قسم کے ''تخت'' سے یہ انی اَنَا کی آواز آ رہی ہے: لیکن ''اَنَا'' کہنے کے ساتھ ہی کہ کہیں وہ حاکمیت کا تصور' وہ جلال کا تصور' وہ استبداد کا تصور' نہ پیدا ہو جائے' عزیزانِ من! قرآن نے فوراً ہی ''ربک'' کہا' کہ ڈرنا نہیں' ہم وہ ہیں جو تمہاری پرورش کے ذمہ دار ہیں' تمہاری تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ ماں بن کے گود اچ لے لیا۔[2] یہ ایک لفظ ''ربک'' فوراً کہا۔ عزیزانِ من! سینکڑوں صفاتِ خداوندی تھیں' جو کہی

---

[1] وہ ان کا ''یارِ غار'' ہوتا ہے۔ انہوں نے اس طرح کا کوئی ''رب'' بنایا ہوا ہے۔

[2] ماں بن کر ہم نے اپنی گودِ پرورش میں لے لیا۔

جا سکتی تھیں، لیکن '' اَنَا '' کے فوراً بعد '' ربک'' کہا کہ ڈرنے کی بات نہیں۔ جو پرورش کرنے والا ہوتا ہے اس سے ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک نئی منزل کی طرف سفر کا آغاز

کہا: **اَنَا رَبُّکَ** (20:12)۔ میں تیرا نشوونما دینے والا ہوں۔ عزیزانِ من! طبعی پرورش تو ہوتی چلی آ رہی تھی۔ یہاں یہ ربوبیت کس قسم کی آ رہی ہے؟ یہ ایک نئی منزل شروع ہو رہی ہے۔ اب انسانیت کی ربوبیت کا دور آیا ہے، اس لیے کہا: **اَنَـا رَبُّکَ** (20:12)۔ تمہاری پرورش کرنے والا، تربیت دینے والا، میں تمہارا رب ہوں۔ اِس کے بعد اگلا ہی پہلا لفظ ہے: **فَـاخْـلَـعْ نَعْلَیْکَ** (20:12)۔ ان الفاظ کا عام مفہوم اور عام ترجمہ جو ہمارے ہاں لیا جاتا ہے، پہلے میں وہ عرض کرتا ہوں۔ کہا: **فَـاخْـلَـعْ نَعْلَیْکَ** (20:12)۔ اپنا جوتا اتار دے۔ کیوں؟ **اِنَّکَ بِـالْـوَادِ الْـمُقَدَّسِ طُوًی** (20:12)۔ ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ اس وادی کا نام ''طوی'' تھا اور اِسے مقدس کہا گیا۔ اِس لیے اس کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ کہا کہ ''موسیٰ تُو طوی کی مقدس وادی میں ہے'' اس لیے جوتا اتار دے۔ یعنی اینوں ناپاک نہ کرے، جتھے بھگیاڑ گیدڑ شیر سارے پھردے سن پئے، اوا ونہاں نال تے ناپاک نئیں سی ہوندی۔ [1] اب بقول ان کے اس وادی نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی جوتی سے ناپاک ہو جانا تھا۔ مگر عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے۔

عقل کی راہنمائی اور وحی کی راہنمائی میں فرق

عزیزانِ من! قرآن چار لفظوں میں اتنی بڑی حقیقت کہہ گیا ہے کہ اگر واقعی اس کی تفصیل میں جایا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ عقل کا تجرباتی اور فکری انداز ہے اور وحی کا براہِ راست علم ملنے کا انداز ہے۔ ان دونوں کا فرق اس آیت میں آ گیا۔ میں نے ابھی ابھی عرض کیا تھا کہ عقل کا اندازِ تحقیق کا ہوتا ہے، تجرباتی ہوتا ہے۔ سینکڑوں سال تک ایک چیز پہ تجربہ ہوتا ہے عقل ناکام رہتی ہے، پھر اپنا سفر شروع کر دیتی ہے، پھر ناکام رہتی ہے، پھر تجدیدِ سفر کر دیتی ہے۔ منزل خواہ یہاں کوٹ [2] کے پیچھے ہی کیوں نہ ہو، مگر اسے معلوم نہیں ہوتا اس لیے چکروں میں پڑی رہتی ہے۔ اتنی سی بات کے لیے کہ انسانی تمدن میں یہ نظامِ مشینری کس قسم کی ہونی چاہیے تاکہ تمدنی زندگی ٹھیک گزرے۔ یہ وہی ہے جسے آپ سیاست کہتے ہیں، حکومت کہتے ہیں۔

---

[1] یعنی اس وادی کو ناپاک نہ کر۔ یہ وہ وادی ہے جہاں بھیڑیئے، گیدڑ، شیر سبھی گھومے پھرا کرتے تھے، ان سے تو یہ ناپاک نہیں ہوتی تھی۔

[2] علاقائی زبان میں چھوٹے سے گاؤں کو کوٹ کہتے ہیں جیسے سبزل کوٹ۔ اسے موضع بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان کے علاقائی رنگوں کے مختلف (Shades) انداز ہیں۔

عقل کے اڑھائی ہزار سالہ سفر کا ماحصل

عقل کی زیادہ نہیں تو کم از کم اڑھائی ہزار سال کی تاریخ تو ہمارے سامنے ہے۔ حکمائے یونان کے ہی زمانے سے لے لیجیے۔ اڑھائی ہزار سال میں عقلِ انسانی نے ''انسانی تمدن میں نظام مشینری کس قسم کی ہونی چاہیے'' کے لیے کتنی لمبی مسافتیں کاٹیں مگر ابھی تک صحیح منزل تک نہیں پہنچ سکی:

ایں قدر ہست کہ بانگِ جرس می آید

ابھی کارواں کے کان میں گھنٹی کی یہ آواز تو آنی شروع ہوئی ہے۔ ابھی ان کے کان میں، جو جمہوریت لیے پھرتے ہیں، منزل تک پہنچنے کی بھنک تک نہیں آئی، اڑھائی ہزار سال ہو گئے۔ اسی طرح انسانی زندگی کے متعلق جتنے اہم مسائل ہیں، ان کے صحیح حل تک پہنچنے کے لیے عقل کو بڑے لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں مگر وہ اہم مسائل بھی حل نہیں ہو سکے۔ ہونے والے نبی کی خود بھی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس میں اور اس کے ساتھ جو باقی اس دور کے لوگ ہوتے ہیں ایک فرق ہوتا ہے۔ عام طور پہ باقی لوگ تو اپنے مسلک پر مطمئن ہو کر بیٹھے رہتے ہیں، کہ جو ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے، وہ اس میں غور و فکر نہیں کرتے، انہیں اس میں پوری تسلی ہوتی ہے، اطمینان ہوتا ہے خواہ وہ فریب ہی کیوں نہ ہو، ہوتے وہ مطمئن ہی ہیں، اس لیے کہ ان کا جو معبود ہوتا ہے وہ بھی جامد ہوتا ہے۔ عربوں کے ہاں جو ''وثن'' کا لفظ ہے اس کے معنی ہی جامد ہیں، یہیں سے انہوں نے بت کا لفظ بنایا ہوا ہے۔ تو ہمارے ہاں بھی بت کا لفظ ہے۔ کہتے ہیں کہ بت بنڑیا ہویا بیٹھا اے۔ [1] اس میں ایک جمود ہوتا ہے۔ وہ معبود کا جمود نہیں ہوتا بلکہ یہ جو پوجنے والے ہوتے ہیں یہ ان کا ذہنی جمود ہوتا ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ اِن چیزوں کے متعلق یہ تنہا فکر کی رو سے بھی کاوشیں کرنے والے کہاں پہنچتے ہیں۔

جو کچھ ہو رہا ہے اسی پر مطمئن ہو جانا بت پرستی ہے

وائٹ ہیڈ (1861-1974) Whitehead ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا مفکر ہو گزرا ہے۔ حال ہی میں اس کا انتقال [2] ہوا ہے۔ اس کی ایک کتاب Adventure of Ideas (مہم تصورات) ہے۔ یہ بڑی عجیب کتاب ہے۔ اس میں یہ Idolatry (بت پرستی) کی بڑی خوبصورت Definition (تعریف) دیتا ہے۔ یہ شخص Idolatry، جسے بت پرستی کہتے ہیں، کی Definition (تعریف) اس طرح کرتا ہے کہ ''مروجہ نظریات پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بت پرستی کہلاتا ہے۔'' کیا بات ہے: مطمئن ہو کر بیٹھ جانا! عزیزانِ من! اسے یاد رکھیے کہ نبی مذہب پرست نہیں ہوتا۔ وہ نظامِ حیات دیتا ہے اور دلائل و براہین سے اس نظام کی وضاحت کرتا ہے، سمجھاتا ہے۔

---

[1] بت بنا بیٹھا ہے۔

[2] یعنی 1974 میں

نبی کی ذات ہر آن تجسس میں ہوتی ہے

نبی بت پرست نہیں ہوتا۔ جو ہو رہا ہوتا ہے اسی پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتا۔ اس میں تلاشِ حقیقت کی کوئی تڑپ ہوتی ہے، کوئی کاوش ہوتی ہے، تجسس ہوتا ہے، حیرت ہوتی ہے۔ اگر کبھی حیرت کی انتہا پر آؤنگا تو وہاں عرض کرونگا کہ عقل کی انتہا حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ **سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى** (53:14) کے یہ لفظ تو سنے ہی ہونگے اور پھر ان کا مروج تصور بھی سنا ہوگا۔ ہمارے ہاں کا یہ مروج تصور تو عجیب چیز ہے۔ دراصل سدرۃ انتہائی حیرت کے مقام کو کہتے ہیں اور جب اس کے بعد منتہٰی کا لفظ بھی ساتھ ہو تو پوچھو نہیں کہ وہ حیرت کا کونسا مقام آ جائے گا۔ نبی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرتا ہے، وہ نبوت سے قبل کسی بات سے مطمئن نہیں ہوتا، ہر وادی میں جاتا ہے، ہر مرحلے سے گزرتا ہے، تلاش کرتا ہے لیکن جو چیز ابھی خلافِ حقیقت ہوتی ہے اس پہ مطمئن ہو کے نہیں بیٹھتا۔ اس کے اندر کوئی چیز ہوتی ہے جو اسے کہتی ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

خضر کا تصور ہی غلط ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں پایا جانے والا خضر کا تصور بھی غلط ہے۔ سورۃ الکہف میں ہم نے دیکھا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اپنے ہمدم یا دوست کے ساتھ، ایک مردِ بزرگ کے پاس گئے جسے ہم نے حضرتِ خضر علیہ السلام بنا رکھا ہے اور وہاں اس سے کہا کہ میں، جو کچھ تمہارے پاس ہے، اسے سیکھنے کے لیے آیا ہوں۔ عزیزانِ من! یہ نبوت ملنے کے بعد کی بات نہیں ہے۔ نبوت کے بعد تو نبی کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ پھر تو دنیا بھر کے مفکر نبی کے پاس آتے ہیں۔ یہ واقعہ زمانہ قبل از نبوت کا ہے۔ اس زمانے میں نبی میں جو اضطراب، تحقیق، کاوش اور تجسس کی تڑپ ہوتی ہے، وہ اسے لیے لیے پھرتی ہے۔ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رکھتی ہے۔ یہ واقعہ اس دَور کا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کا ارشاد

یہ تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہنا وہ حقیقت ہے جو نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآنِ کریم میں اس مقام پہ آئی ہے جہاں یہ چیزیں گنائی ہیں کہ تُو قبل از نبوت کس کیفیت کو لیے ہوئے تھا، پھر ہم نے تجھے کتنے انعامات سے نوازا۔ اس میں یہ ہے کہ **وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى** (93:7)۔ پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تُو تلاشِ حقیقت میں حیران و سرگرداں پھر رہا تھا، تو اس نے بذریعہ وحی زندگی کے صحیح راستے کی طرف تیری راہنمائی کر دی؟ مگر عزیزانِ من! ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہوتا ہے۔ یہ "ضالًّا"[1] کا

---

[1] ضالًّا کا مادہ "ض ل ل" ہے۔ الضلۃ۔ حیرت، متحیر ہونا، سرگردان پھرنا۔ (Perplexed; Confused)، کسی چیز کا پوشیدہ اور غائب ہو جانا، مختلف چیزوں کا اس طرح مل جانا کہ پھر انہیں الگ الگ نہ کیا جا سکے، دلیل نہ سوجھنا۔ (تاج العروس اور کتاب القرطین جلد اول ص:5) چونکہ صحرا میں راستہ کھو جانے والا اپنی تگ و دو کے باوجود منزل کے قریب نہیں ہونے پاتا اس لیے کوشش کے ناکام و نامراد رہ جانے کو ضل سَعْيُهٗ کہتے ہیں۔ اور چونکہ ریگستان میں اس طرح پھرنے کا انجام تباہی اور بربادی ہوتا ہے اس لیے اسے ان معنی میں بھی استعمال کرنے لگے (Lane,s Lexicon)۔

ترجمہ ''گمراہ'' کر دیتے ہیں یعنی ہم نے تمہیں گمراہ پایا تو ہدایت دی۔ یاد رکھیے! نبی' گمراہ نہیں ہوتا۔ ❶ ویسے بھی ضالاً کے معنی گمراہی کے نہیں ہوتے۔ ضالا کے معنی ہیں ''تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرنا'' اِس کا تو سوال ہی نہیں ہے کہ وہ کسی نظریہ پر مطمئن ہو کے بیٹھ جائے۔ اس کے برعکس جو آنکھیں بند کر کے بیٹھا ہوا ہے' سورج نکلے نہ نکلے' شمع روشن ہو یا بجھ جائے' اس کے لیے یہ سب یکساں ہوتا ہے۔ اُس ہونے والے نبی کی تو تلاشِ حقیقت کی وہ تڑپ ہوتی ہے جو اُسے اضطراب کی حالت میں رکھتی ہے۔

اے رسول! تُو حقیقت کی تلاش میں تھا' خدا نے تجھے حقیقت سے آگاہ کر دیا

عزیزانِ من! یہ ہونے والا نبی اسی معاشرے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر تلاشِ حقیقت کی ایک تڑپ ہوتی ہے' وہ باطل پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھتا لیکن حقیقت ہے کیا؟ وہ اس کو پتہ نہیں ہوتی' یعنی یہ کہ یہ حقیقت نہیں ہے اس کا تو اسے علم ہوتا ہے۔ وہ لا الٰہ کی منزل سے تو گزرتا ہے لیکن اسے الا اللہ کا پتہ نہیں ہوتا۔ یہ جو قبل از نبوت کی منزلیں ہوتی ہیں' بڑی دور دراز کی راہیں ہوتی ہیں' لمبی لمبی مسافتیں ہوتی ہیں۔ نبوت کے بعد خدا ان لمبی مسافتوں کو لپیٹ اور سمیٹ دیتا ہے۔ پھر اس متلاشی حقیقت کو یہ لمبے لمبے سفر نہیں کرنے پڑتے۔ اسے حقیقت کا براہِ راست علم ملتا ہے اور یقینی علم ملتا ہے۔ یہ علم قیاسی نہیں ہوتا۔ اس مقام پہ عقل کے Trial & Error (سعی وخطا) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اس کا تجرباتی طریق نہیں ہوتا' وہ جو Reveal (انکشاف کرنا) کا لفظ ہے' وہ Unveil (پردے کے اٹھ جانے) کا لفظ ہے۔ حقیقت اپنے آپ کو اس کے سامنے بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ حقیقت کو Discover (بے نقاب) نہیں کرتا' بلکہ وہ حقیقت ہوتی ہے' جو اپنے آپ کو اس کے سامنے (Discover) منکشف کر دیتی ہے۔ اس لیے اب وہ قیاس نہیں ہوتا۔ وہ قیاسات کی رو سے جو لمبی لمبی منازل میں سے گزر کر' کہیں ہزار ہا سال کے بعد' پہنچنا تھا' ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ لمبی مسافتیں سمٹ جاتی ہیں' لپٹ جاتی ہیں۔ اس کے یہ سفر ختم ہو جاتے ہیں۔

ہاں تو عزیزانِ من! آواز آئی کہ اے موسیٰ! ہم تمہارے رب ہیں' اس لیے **فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ** (20:12)۔ اب اُس لمبے سفر کے ساز و سامان کو الگ رکھ کر' اطمینان سے بیٹھ جا۔ اسی انداز کو پنجابی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ ''جوتی لاکے' تُو ہن ذرا نٹھ کے بیہ جا میاں۔ ہن سفر دے زمانے مک گئے تیرے ❷۔ ہمارے ہاں پنجابی میں تو عام گفتگو میں یہ باتیں کہتے تھے: ذرا اہم بات کرنے والا

---

❶ ایک ہونے والا نبی' نبوت سے پہلے بھی' غلط تصوراتِ زندگی سے غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن چونکہ صحیح تصورات اس کے سامنے نہیں ہوتے اس لیے وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے خدا کی طرف سے رہنمائی مل جاتی ہے تو یہ سرگردانی ختم ہو جاتی ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' 1961' ص۔1069)

❷ ارے میاں! اب تم جوتا اُتارو اور ذرا اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ اب تمہارا سفر کا دور ختم ہوا۔

آ کے کھڑا ہو جاتا تھا تو اسے کہتے تھے کہ "تُو کھلوتا ہویا گل کرنا ایں۔ جوتی لا کے ذرا آ کے بہہ جاناں نٹھہ کے، تے فیر گل کر' کی گل اے ❶۔ عزیزانِ من! قرآن ان استعاروں میں بات کرتا ہے۔ اس نے چودہ سو سال پہلے کے بدو کو بھی تو سمجھانا تھا' اس نے نیوٹن Newton کو بھی سمجھانا تھا' اس نے آئن سٹائن کو بھی تو سمجھانا تھا' اس نے فلسفہ اور وحی کا جو بَیِّن فرق ہے اس کو بھی تو بتانا تھا۔ میں پھر عرض کروں کہ اس نے بدو کو بھی سمجھانا تھا۔ کیا الفاظ ہیں اُس کے! فلاسفر کو اس نے سمجھایا۔ اقبالؒ (1877-1938) نے ایک ہی فقرے میں بات کہدی کہ وحی کرتی کیا ہے؟ اس نے کہا کہ وحی Economises human efforts۔ (وحی انسانی سعی وعمل کی مسافت کو مختصر کر دیتی ہے) اب میں اس Economises کا بھی کیا ترجمہ کروں۔ یہ جو انسان کی لمبی لمبی محنتوں سے' یہ مسافت طے ہوتی ہے' لمبی لمبی محنتوں کی مسافت کو کم کرنے کے لیے یہ Economises بڑا خوبصورت لفظ ہے۔ یہ شخص بھی تو بلا تھا۔

علامہ اقبال کے چھ لیکچروں کی اہمیت

علامہ اقبالؒ کے چھ لیکچرز (خطبات) اتنی سی کتاب ہے۔ ❷ ہم اب کیا جانیں کہ اس میں اقبالؒ کیا کہہ گیا! پوچھو' یورپ کے فلاسفروں سے کہ وہ اتنے سے چھ یا سات خطبات میں کیا کچھ کہہ گیا! (ساتواں خطبہ تو اس نے بعد میں ایڈ کیا تھا) انگریزی میں لیکچرز ان کی ایک ہی کتاب ہے جس نے دنیا بھر کے فلاسفروں میں ایک تہلکہ مچا دیا ہوا ہے' اِس میں بڑی سمٹائی ہوئی اکتناز ہے جسے انگریزی زبان میں Concentrated form کہتے ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ان میں یہ کہا تھا کہ وحی Economises human efforts یعنی human efforts (انسانی کوششیں) اپنے تجرباتی طریق سے ہی سہی' لمبے لمبے راستوں سے ہی سہی' وہاں پہنچ جاتی ہیں' فرق یہ ہے کہ وحی ان Efforts (کوششوں) کی منزلوں کو Economise (مختصر) کر دیتی ہے۔

وحی کے لازوال عمل نے اس مختصر سی عمر کو زندگی کا دوام بخش دیا

عزیزانِ من! وحی کو Economise (مختصر کرنے والی) ہونا بھی چاہیے تھا۔ اتنی سی تو انسان کو عمر ملتی ہے۔ اس میں سے آدھا حصہ تو سوتے میں ہی گزر جاتا ہے۔ انسانی فکر کے سلسلہ میں ہی تیس چالیس سال تک کی عمر کا پہلا حصہ پختگی کو بھی نہیں پہنچتا' سو عمر کا یہ حصہ بھی اس طرح نکل گیا۔ پھر دنیا کے سارے دھندے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ اس نے ٹھیک کہا تھا:

فرصت کہاں کہ تری تمنا کرے کوئی

---

❶ تم کھڑے کھڑے ہی بات کر رہے ہو۔ ذرا اپنے جوتے اُتار کر اطمینان سے آ کر بیٹھ جاؤ تو پھر بات کرو کہ معاملہ کیا ہے؟

❷ اِس کتاب کا نام ہے: Reconstruction of Religious Thought in Islam۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے 1928ء میں اپنے مشہور چھ لیکچرز مدراس میں دیئے تھے۔ ساتواں لیکچر تو انہوں نے بعد میں شامل کیا تھا۔

کیا ہر شخص کے لیے یہ ممکن تھا کہ ان تجرباتی طریقوں کے ذریعے وہ کہیں ان حقیقتوں کو پا سکے؟ اِس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کی خاص ربوبیت اور رحمت ہے۔ عزیزانِ من! اس کی طرف سے without efforts (بلا کوشش، بلا مزدوو معاوضہ) جو چیزیں ملتی ہیں، اسے رحمت کہتے ہیں۔ ''رحمِ مادر کے اندر بچے کی پرورش''، یہ ہوتی ہے رحمت۔ وحی اسی طرح سے without efforts (بلا کوشش، بلا مزدوو معاوضہ) ملتی ہے۔ کسی بچے کو دنیا میں آ کے، اسی دودھ یا اسی روٹی کے لیے جو کچھ کرنا پڑتا ہے، تو دیکھتے ہیں کہ پھر اس کے لیے عقل کا طریقہ کیا کچھ ہوتا ہے۔ وہ دودھ کے ایک گھونٹ کے لیے مرجاتا ہے۔ یہ وہی دودھ ہوتا ہے، جو ماں کی طرف سے، اس کی پرورش کے لیے، اُسے بلا مزدو معاوضہ، براہِ راست ملتا ہے۔ وہ وحی ہے، یہ فکرِ انسانی ہے۔

It economises human effort

بڑے خوبصورت انداز میں اقبالؒ (1938-1877) یہ باتیں کہہ جاتا ہے۔ شعر تو فارسی کا ہے لیکن کیا عرض کروں، اس کے بہترین شعر فارسی کے ہی ہوتے ہیں:

ہر دو بہ منزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں ✦ عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

عشق زپا در آورد خیمۂ شش جہات را ✦ دست دراز می کند تا بہ طناب کہکشاں ❶

عقل اور وحی دونوں ہی میرِ کارواں ہو سکتے ہیں، دونوں ہی کسی منزل کی طرف روانہ ہو سکتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ
عقل بہ حیلہ می برد۔ یہ عقل ساز وسامان، قیاسات، ظن وتخمین اور دلائل کی رو سے چلتی ہے، قیاسات کی رو سے چلتی ہے اور اس کے برعکس،
عشق برد کشاں کشاں۔ وحی ظن وتخمین کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے علم ویقین کے محکم نقطہ پر پہنچ جاتی ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

عقل اسے بے کراں ہی سمجھتی ہے جبکہ وحی عقل کی حدود کو وسیع تر کرتی اور اس کے ظن وتخمین کو تم ویقین میں تبدیل کرتی ہے۔ اس طرح وحی ایک ہی جست میں تمام قصے طے کر دیتی ہے۔ یہ ہے وحی۔ اور یہ ہے وحی اور عقل کا تعلق۔ یہاں کہا گیا کہ اے موسیٰ! وہ تیری لمبی لمبی مسافتیں، وہ خضر کی تلاش، وہ بارہ بارہ سال بکریاں چرانا، وہ تمام منزلیں، جتنی بھی تھیں، وہ تمہارا دور ختم ہوا اور اب: **فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ** (20:12)۔ اب جوتے اتار دے، اور اطمینان سے بیٹھ کر بات سنو۔ ❷ کیونکہ یہ **اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى** (20:12)

---

❶ زبورِ عجم ص۔ 20 ص دعا نمبر 15 بحوالہ کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ایڈیشن مارچ 1978، ص۔ 412

❷ صاحب تاج العروس اور امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (20:12) کا مطلب یہ ہے کہ تم اسی جگہ قیام کرو۔ یہیں ٹھہرو۔ جیسے ہم، اس شخص کو جسے تم چاہو کہ تمہارے پاس کچھ وقت ٹھہر جائے، کہتے ہو کہ ذرا اپنے جوتے موزے اتار کر اطمینان سے بیٹھو۔ قرطبی نے اپنی ''تفسیر القرآن'' میں لکھا ہے کہ یہاں اِخْلَعْ نَعْلَيْكَ کے معنی یہ ہیں کہ تو اپنے اہل و عیال کے مشاغل سے فارغ ہو جا یعنی ذہن سے ان کے خیال کو نکال دے۔ اس نے کہا ہے کہ ''نَعْلٌ'' سے مراد اہل وعیال بھی لیے جاتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960، ص ص۔ 611-610 اور پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، 1961، ص۔ 1634

ہے۔عزیزانِ من! ''قدس'' یا جسے آپ ''تقدیس'' کہتے ہیں کے معنی ہوتا ہے: ''دُور دُور تک چلے جانا''❶ یعنی پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہتے ہوئے' جتنی دُور تک جانا پڑے' چلے جانا۔اور ''طُوًی'' کے معنی ہیں: ''طویل مسافت کو لپیٹ کر راستے کو بہت مختصر کر دینا''❷ اس آیت (20:12) میں کہا کہ ''عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق کی جگہ وحی کا مسافتوں کو سمیٹنے والا راستہ کھول دیا گیا ہے' جہاں حقائق ازخود منکشف ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔❸

تسبیح کا مفہوم

آپ کو معلوم ہے کہ قصہ آدم میں ملائکہ نے کہا تھا: نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ (2:30)۔اس آیت میں وَنُقَدِّسُ لَكَ ہے۔ہمارے ہاں تو ترجمے کی آسانیاں ہوگئیں' اس کا یہ ترجمہ کر کے مست ہوگئے کہ ''ہم تیری تسبیح کرتے رہتے ہیں' تیری تقدیس کرتے رہتے ہیں' تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔'' دراصل عربی مبین میں اس آیت (2:30) کے معنی یہ تھے کہ ''ہم تیرے پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرداں رہتے ہیں' جتنی دور تک جانا پڑے' جاتے ہیں۔'' تو یہاں ملائکہ نے کہا کہ پھر ہماری موجودگی میں نئی تخلیق کی کیا ضرورت پڑی ہوئی تھی جو تُو نے انہیں پیدا کر دیا۔عزیزانِ من! ''مقدس'' لفظ کے معنی ہوتا ہے''دور دور تک چلے جانا۔'' یہاں قرآن نے اس آیت (20:12) میں کہا ہے کہ یہ جو وادی ہے' جس میں تُو اب آ پہنچا ہے' یہ وادیٔ عشق ہے' وادیٔ وحی ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ وادیٔ حیات میں بہت لمبی مسافتیں ہیں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔

وحی کرتی کیا ہے؟

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ وحی کرتی کیا ہے؟ یہاں اس آیت (20:12) میں لفظ طوًی آیا ہے۔اس کے معنی ہیں: ''لپیٹ دیتا ہے'' تو گویا طوی کے معنی ''لپیٹ دینا'' ہوتے ہیں۔یہاں کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تیری لمبی وادیاں لپٹ گئی ہیں' تیری راہیں سمٹ گئی ہیں' اس لیے اب تُو جوتا اتار کے' اطمینان و سکون سے' ہماری بات سن۔عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کیا کہہ جاتا ہے! کہا

---

❶ لین (Lane) نے اپنی انگریزی لغت میں "قَدَسَ فِی الْاَرْضِ" کے معنی ''وہ بہت دور تک چلا گیا'' لکھے ہیں۔

❷ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی تصنیف ''مقاییس اللغۃ'' میں ''طوی'' کے بنیادی معنی ''لپیٹ دینا'' لکھے ہیں۔صاحب تاج العروس نے طَوَی الْبِلَادَ طَیًّا کے معنی ''اس نے شہروں کی مسافت کو قطع کیا یعنی راستوں کو لپیٹا'' نیز طَوَی اللّٰہُ الْبُعْدَ لَنَا کے معنی ''اللہ نے ہمارے لیے مسافت کو سمیٹ کر دوری کو قریب کر دیا'' لکھے ہیں۔پطرس بستانی نے اپنی تصنیف محیط المحیط میں طَوَی اللّٰہُ عُمُرَہٗ کے معنی ''خدا نے اس کی عمر ختم کر دی' اس کی مدتِ عمر کو لپیٹ دیا'' لکھے ہے۔

❸ تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز رحمہ اللہ: لغات القرآن' جلد دوم' 1960' ص۔1102۔

کہ سن لیا آپ نے کہ عقل کے تجرباتی طریق اور وحی کے Economising Factor (مختصر کرنے والے عنصر) کو قرآن کس انداز میں سمجھا گیا ہے۔ آپ یورپ کے مفکرین سے پوچھیے' آپ کو یہ بات وہ سمجھائیں گے۔ یہ بالکل نئی بات ہے۔ ہاں تو عزیزانِ من! کان میں آواز پڑی کہ میری مسافتیں ختم ہوگئیں' منزلیں طے ہوگئیں' راہیں سمٹ گئیں' اب مجھے سفر کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تو پھر کیا یہ ہوا کہ جسے کہتے ہیں بڑی موج ہوگئی' اب بیٹھے بٹھائے مجھے سب کچھ مل جایا کرے گا؟ کہا: نہیں جناب! وہ جو تمہاری محنتوں اور مشقتوں کا وقت ان وادیوں کی لمبائیوں کو سمیٹنے میں صرف ہوتا تھا' اسے سمٹا لیا ہے کیونکہ اَنَا اخْتَرْتُکَ (20:13)۔ میں نے تجھے ایک عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک نئی منزل کے لیے چن لیا گیا

عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہم نے تمہیں اپنے لیے چن لیا ہے۔ وہ کچھ جو تُو کیا کرتا تھا وہ تُو اپنے لیے کیا کرتا تھا۔ اس کی لمبی راہیں تھیں۔ اب ہم نے تمہیں اپنے پروگرام کے لیے چن لیا ہے۔ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ خدائے قادر و مطلق ہے جس کے ارادے سے کائناتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ اب یوں نظر آیا کہ اس کا جیسے کوئی کام رکا ہوا تھا' اسے پورا کرنے کے لیے اس نے کہا ہے کہ ''ہم نے تجھے چن لیا ہے۔'' ہم نے وہ جو ''ایہو جیا ویلیاں والا کم سی ناں تیرا' او مکا دتا۔ ایدر آ' تینوں کم دساں ہن' او کم میرا اے''[1]۔ اللہ اکبر! مقامِ نبوت آپ دیکھ رہے ہیں!

انسانوں کی دنیا میں' انسانوں کا کام' انسانوں کے ہاتھوں

عزیزانِ من! خدا ہونا بھی اسے ہی سجتا ہے کہ جس کے اختیاراتِ کاملہ و بے کراں کی یہ کیفیت ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خدا وہ ہستیِ کاملہ ہے جس کے ایک ارادے سے کائناتیں وجود میں آجائیں۔ اس نے انسانوں کی دنیا بنائی اور اس میں یہ کہا کہ بھئی! انسانوں کی دنیا میں کام' انسانوں کے ہاتھوں سے ہی ہوا کریں گے' ہم براہِ راست کچھ نہیں کیا کریں گے۔ ہمارا اپنا بھی کوئی کام اڑا[2] ہوا ہوگا تو وہ بھی انسان کے ہی ہاتھ سے کرائیں گے۔ وہ جو بدر کے میدان میں کہا گیا تھا کہ ''تیر بے شک ہماری ہی قبا کے تھے' جن سے ان کی موت واقع ہوئی لیکن اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی جماعت! تمہاری کمانوں کے بغیر ہمارا تیر چل نہیں سکتا تھا۔'' عزیزانِ من! کائنات میں انسان کا بہت بلند مقام ہے' اور انسانوں میں سے بھی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تو آپ پوچھیے نہیں! خدا کے دین کا آپ موسیٰ علیہ السلام سے پوچھیے گا' وہ بتائیں گے لیکن موسیٰ علیہ السلام سے کیوں پوچھیں؟ دینے والے سے ہی کیوں نہ پوچھیں۔ اسی سورۃ میں چند ہی آیتیں آگے چل کر (یاد رہے کہ میں

---

1. وہ جو اس طرح کا فالتو' فارغ لوگوں والا تیرا کام تھا' وہ ہم نے ختم کر دیا۔ اِدھر آ؛ اب میں تمہیں کرنے کا کام بتاؤں۔ ذرا سن' وہ کام میرا ہے۔
2. اٹکا ہوا' رکا ہوا۔

اس وقت 12 ویں آیت پہ ہوں) 35 ویں 36 ویں آیت لے لیجیے۔ یہی سورۃ طٰــــہٰ ہے۔ کہا کہ تمہاری مسافتیں سمٹا دیں، مشقتیں Economise (مختصر) کر دیں، تجھے اپنے کام کے لیے چن لیا اور نبوت جیسے منصب پہ سرفراز کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جذبۂ تشکر سے یقیناً سرِ نیاز جھک گیا۔ کہا کہ اے خدائے کریم! تم نے مجھ پہ بڑا احسان کیا ہے، تو ذہن میں یہی تھا کہ یہ پہلی بار ہے جو مجھ پہ یہ احسان کیا گیا ہے۔

سرفرازی کا یہ عمل تو ایک عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا

خدا کی طرف سے فوراً جواب آیا: وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ (20:37)۔ اے موسیٰ! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔ عزیزانِ من! اسے پھر دہرا دوں۔ کہا کہ اے موسیٰ! یہ پہلی بار نہیں ہے، اس کا سلسلہ تو بہت پیچھے سے چلتا ہے۔ جسے نبوت کے منصب سے سرفراز کیا جاتا ہے یا اس کے لیے چنا جاتا ہے، تو یاد رکھو، یہ چناؤ اس بادشاہ کا سا نہیں ہوتا کہ جو بھی پہلے دروازے میں داخل ہو جائے، اس کے سر پر تاج رکھ دیں۔ اور پھر بادشاہت میں تو دروازے میں پہلے داخل ہونے کی بھی بات نہیں ہوتی ہے، جو بادشاہ کے گھر میں پیدا ہو جائے وہ ولی عہد ہوتا ہے، لیکن نبوت یوں نہیں ملتی۔ کہا: سنو! ہونے والے نبی کو...... لیکن ٹھہرو، وہ لفظ آگے آتا ہے۔ عزیزانِ من! میں وہ لفظ وہیں بتاؤں گا اور وہیں آپ اس سے لطف اندوز ہوں گے۔

پہلے دن سے نبوت تک کا سفر

عزیزانِ من! خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ بات، یہ سلسلہ، تمہاری پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ اگر تم اسی محکوم قوم کے گھرانے میں رہتے تو نبوت کا سلسلہ تو رہا ایک طرف، تم شرفِ انسانیت سے بھی محروم ہوتے۔ تم دیکھتے ہو کہ باقی قوم کو وہاں سے نکالا، تیری ماں کی طرف حکم بھیجا کہ اسے صندوق میں بند کرو، تمہیں صندوق میں بند کیا، پھر کہا کہ تمہیں اس صندوق سمیت دریا میں بہا دو، دریا میں بہا دیا، تیری بہن کو کہا کہ پیچھے پیچھے دیکھتی چلی جاؤ کہ کہاں جا رہا ہے تاکہ تیری ماں کہیں صدمے سے بیہوش نہ ہو جائے۔ اس صندوق کو بادشاہ کے محلات والوں نے لیا۔ اس طرح تمہیں بادشاہ کے محلات میں پہنچایا۔ ان کے ہاں اولاد نہیں تھی۔ ان کے دل میں تمہاری محبت ڈال دی۔ انہوں نے تمہاری پرورش شروع کر دی۔ ہم وہاں تمہاری نگہ پرداخت کرتے رہے۔ ماں تڑپ رہی تھی، تُو کسی کا دودھ نہیں پیتا تھا، اسی کو دودھ پلانے کے لیے دائی کی حیثیت سے ہم نے محل میں پہنچا دیا کہ اپنے سے جدا بھی نہ ہو اور جو مقصد تھا کہ آگے چل کر تم نے ان کے ساتھ جو ٹکراؤ لینا تھا اس کے لیے بھی ہم نے تیاری شروع کر دی اور پھر وہاں تم سے قتل ہوا۔ وہاں سے بھاگے۔ بھاگے تو پھر بارہ سال کے لیے اس منزل میں سے گزارا۔ ایک بہت بڑی قوم، بہت بڑا بھیڑوں کا گلہ جسے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی بھیڑیں ہی کہا تھا، بنی اسرائیل ان کی رعیت تھی، وہ تمہارے ذمے آنی تھی۔ وہاں تُو بارہ برس تک چرواہا بن کر یہ سارا کچھ کرتا رہا۔ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ (20:40)۔ ''اس طرح تم کئی برس مدین میں چرواہا بن کر رہے۔'' یہ سارا کچھ کس لیے تھا؟ یہی نہیں بلکہ اور سنو۔ اس سے پہلے

فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ (20:40)۔ہم نے تجھے ایک آدمی کو مار ڈالنے کی پریشانی سے نجات دلائی۔ اس طرح ہم نے ان تمام مصیبتوں سے تمہیں رہائی دلائی۔

موسیٰ علیہ السلام کو مختلف قسم کی کھٹالیوں سے گزار کر کندن بنایا

عزیزانِ من! خدا نے کہا کہ اِس قدر غم وحزن کی منازل سے تمہیں بچاتے ہوئے، ہم تمہیں یہاں تک لے گئے۔اب وہ لفظ ہے جس میں کہا ہے کہ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (20:40)۔پھر تجھے محلات سے نکال کر، سخت اور درشت زندگی کی کئی کٹھالیوں میں ڈالا تا کہ تُو کندن بنتا چلا جائے۔اس طرح سے اے موسیٰ! ان کٹھالیوں میں سے تمہیں گزارا، پھر کہیں تم کندن بنے۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (20:40)۔اس قدر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد، کہیں جا کر تُو ہمارے پیمانے پر پورا اترا۔اس کے بعد اے موسیٰ! تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے ہو تو ہم نے تمہیں آج اس منصبِ نبوت کے لیے منتخب کیا ہے۔اسی طرح وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (20:41)۔ہم نے اے موسیٰ! تجھے اپنے ایک خاص کام کے لیے بنایا اور تیار کیا۔یہ نہیں تھا کہ تُو بکریاں چراتے چراتے اتفاق سے آگ لینے کے لیے اِدھر نکلا اور ہم نے تیرے سر پر تاجِ نبوت رکھ دیا۔قطعاً نہیں۔تمہیں تو فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا (20:40)۔ان کٹھالیوں میں سے گزارا ہے۔عزیزانِ من! کتنی کٹھالیوں میں سے گزار کر اس دھات کو کندن بنایا جاتا ہے۔اسے فولاد بنایا گیا۔کیا الفاظ ہیں! پھر کہا: ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى (20:40)۔اب دیکھا تم نے اے موسیٰ! پھر کہیں جا کے تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے۔یہ نہیں ہے کہ آگ لینے کو جاؤ تو پیغمبری مل جائے۔وہ تو کہتا ہے کہ تمہاری پیدائش کے زمانے سے ہی یہ بات چلی ہوئی تھی۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى(20:40)۔ پھر کہیں جا کے اے موسیٰ! تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے۔اصل یہ ہے کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ(20:41)۔تو پھر ہم نے تمہیں اپنے ایک کام کے لیے منتخب کر لیا، کام ہی کے لیے نہیں یہاں تو لِنَفْسِيْ کہا ہے۔یعنی اپنے لیے تجھے منتخب کر لیا۔

یہ ساری تیاری، یہ سرفرازی، اور پھر یہ چناؤ: آخر کس لیے تھا؟

عزیزانِ من! یہاں کسی کام کا بھی نہیں کہا ہے۔کہا ہے کہ لِنَفْسِيْ یعنی اپنے لیے۔اپنے لیے کسی کو چن لینا! بہت اچھا جی! ہمارے ہاں یوں چن لیا تو موج ہوگئی۔یہاں تو کہتے ہیں سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا،[1] کہ جسے خدا یہ کہہ دے کہ صاحب! تمہیں ہم نے اتنا کچھ تیار کر کے اپنے لیے چن لیا تو پھر تو بڑی موج ہوگئی۔کہنے لگے: جی، چن لیا تو پھر کیا حکم ہے؟ کہا: اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى(20:43)۔

---

[1] یہ مثل ہے کہ ''جس کا رشتہ دار یا واقف حاکم ہوا اُسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔''

تم دونوں (ہارون اور موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم وستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس لیے جاؤ' دنیا کا سب سے زیادہ مستبد فرعون حدود فراموش ہو رہا ہے۔ جاؤ' اور جا کے اس کے منہ میں لگام دو۔ اللہ اکبر!

علیہ السلام کے مقام پر فائض ہونا پھولوں کی سیج نہیں ہوتا

عزیزانِ من! جس کا قیامت تک علیہ السلام کا مقام ہوتا ہے' اُسے معلوم ہے کہ اس کا منصب کیا ہے' اس کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو پہلی ہی بار حکم دیا: جاؤ' فرعون کی طرف جاؤ۔ بڑا سرکش ہو رہا ہے۔ اسے جا کے لگام دو۔ پہلے اس کام کے لیے یہ تیاریاں ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد یہ ٹیسٹ آتا ہے اور جب وہ اس ٹسٹ پر پورا اترتا ہے' تب کہیں جا کے وہ علیہ السلام بنتا ہے' ایسے ہی نہیں ہوتا کہ جس کے لیے کہہ دیا جائے کہ اِنَّ اللّٰـهَ وَمَلٰٓـئِكَتَـهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (33:56)۔ خدا اور اس کے ملائکہ کی تائید ونصرت تمہارے رسول کے ساتھ شامل ہے۔ یہی ہے وہ جسے کہتے ہیں کہ خدا اور اس کے ملائکہ درود وسلام بھیجتے ہیں' تہنیت وتبریک کے پھول نچھاور کرتے ہیں اور قیامت تک کے لیے کہا کہ يٰٓـاَيُّهَا الَّـذِيْـنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ(33:50)۔ اے ایمان والو! تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم اپنے عملِ پیہم سے رسول کے مشن (Mission) کی تقویت کا موجب بنو' اس کے دست و بازو بنو' اس کے پرگرام کو تکمیل تک پہنچاؤ۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تم دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ یہ نہ سوچنا کہ ملائکہ بھی تم پر درود وصلوٰۃ بھیجتے ہیں کیوں کہ تو ہمارا بڑا چہیتا ولی عہد بنایا ہوا تھا۔ اللہ اکبر! پہلے تو تیاریوں کی یہ کیفیت بتائی کہ پیدائش کے دن سے لے کر اس وقت تک مختلف مراحل سے گزارتے چلے گئے اور جو اس پر پورا اترا ہے تو پھر باپ کے مرنے کے بعد یہ نہیں ہوتا کہ وہ ملوکیت کے عرش پر بیٹھ جائے۔ کہا: چل' اب یہ ہمارا کام ہے' اسے کر اور اس کے لیے پہلا ہی یہ حکم دیا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور سنو کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ اِنَّهٗ طَغٰى (20:43)۔ وہ بہت بڑا سرکش ہے۔ عزیزانِ من! اِنَّهٗ طَغٰى (20:43)۔ دیکھ لیا کہ اس لفظ کے معنی کیا ہو رہے ہیں۔ پہلے کہا تھا کہ دیکھ' میں تیرا نشوونما دینے والا ہوں۔ تُو اب اُس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں تیرے لیے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں اور اس کی جگہ وحی کا ان طول طویل مسافتوں کو سمیٹنے کا راستہ کھول دیا گیا ہے جہاں حقائق از خود منکشف ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔ لہٰذا تُو اب اُس لمبے سفر کے ساز وسامان کو الگ رکھ کر اطمینان سے بیٹھ جا۔ تمہارا وہ دور ختم ہو گیا۔ اب میں نے تجھے اپنے ایک عظیم مقصد کے لیے چن لیا ہے۔ سو فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (20:13)۔ جو بات تجھے وحی کے ذریعے بتائی جاتی ہے تُو اسے دل کے کانوں سے سن۔ اب وہ بات بڑی اشاروں میں کہنے کی ہے۔ ذرا کان لگا کے سن۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ فاستمع کیا چیز ہوتا ہے۔ سَمِعَ اور اِسْتَمَعَ میں کیا فرق ہوتا ہے؟ جی! اور یہ وہی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ دھیان لگا کے' خواہش سے' آرزو سے' یہ بات سن لے۔ لہٰذا بات یہاں سے شروع ہوگی کہ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ

اِلآَّ (20:14)۔ اِس وحی کا اولین پیغام یہ ہے کہ خدا میں ہی ہوں۔ پھر سن لے اقتدار صرف ہمارا ہے۔ یہاں اَنَـا اللّٰـهُ (20:14) آیا ہے۔ یہ اقتدار (Sovereignty) کی بات ہے۔ فرعون کے مقابلے میں بھیجا جا رہا ہے اور کہا کہ اقتدار ہمارا ہوگا۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنَا (20:14)۔ اور صرف ہمارا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دیئے جانے والا پروگرام

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ پھر سن لو ہمارے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ اس لیے پہلی بات تُو خود اپنے لیے سن لے کہ فَـاعْبُدْنِـيْ (20:14)۔ تجھے محکومیت صرف ہماری اختیار کرنا ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام، محکوم بنی اسرائیل کا فرد ہے اور اُسے فرعون کی طرف یہ کہہ کر بھیجا جا رہا ہے کہ پہلے اپنے متعلق فیصلہ کر لو کہ تُو کسی کا محکوم نہیں ہوگا۔ فرعون کے خلاف بغاوت کا اعلان تو یہیں سے کرا دیا کہ میں تمہیں حکمران ہی نہیں مانتا، میں تمہیں صاحبِ اقتدار ہی نہیں مانتا۔ ٹکراؤ تو یہیں سے شروع ہو گیا جب کہا کہ فَاعْبُدْنِيْ (20:14)۔ یہ ہے پروگرام کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں، تمہیں میری محکومیت اختیار کرنا ہوگی۔ میں آگے چل کر عرض کرونگا کہ فرعونیت اور ملوکیت ہی نہیں، بلکہ ان کی کیا کیا چیزیں ہیں جن کے خلاف بغاوت کرنا ہوگی، اس طرح ان کا کچھ باقی نہیں رہے گا اور حکمرانی صرف خدا کے قوانین کی ہوگی۔ سوچیے، یہ کتنا بڑا انقلاب تھا۔

اس انقلاب کے لیے پروگرام سنیے۔ کہا: وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (20:14)۔ ''میرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لیے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔'' لیکن ہمارے ہاں تو صلوٰۃ قائم کرنے کا وہی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ''نماز پڑھو، فرعون بہت زیادہ سرکش ہو گیا ہے'' جبکہ وہاں دورِ فرعون میں حالت یہ ہے کہ انسان انسانوں کے محکوم ہو رہے ہیں۔ خدائی اقتدار دنیا میں کہیں باقی نہیں رہا۔ لہٰذا کہا تو یہ گیا تھا کہ ''جاؤ، انسانوں کو انسانوں کے اقتدار سے چھڑاؤ، فرعون کے استبداد کو ختم کرو۔'' میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ یہ اکیلا فرعون ہی نہیں ہے۔ یہ بات آگے آتی ہے کہ اس کے لیے کیا پروگرام دیا جا رہا۔ اس پروگرام کے لیے کہا کہ اَقِمِ الصَّـلٰوةَ لِذِكْرِيْ (20:14)۔ میرے نظام اور قانون کو لانے کے لیے صلوٰۃ کا نظام قائم کرو۔ یہاں ذکر کا لفظ ساتھ آ گیا۔ ہمارے ہاں تو کہا کہ ٹھیک ہے: پہلی بات تو یہ ہو گئی کہ نماز پڑھو۔ ''جی، شاہ جی! پڑھ لیاں فیر۔ پھر بیٹھ جاؤ تے فیر ساڈا ذکر کرو۔ جلی بھی کرؤ تے خفی وی کرو۔ اللہ ھو کرو فیر۔[1] پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ پھر فرعون تخت سے اتر جائے گا۔

ہمارے ہاں صلوٰۃ کے مفہوم کو کس قدر محدود کر دیا گیا ہے

عزیزانِ من! الفاظ کہہ رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی عظیم پروگرام دیا جا رہا ہے۔ یہ پروگرام الصلوٰۃ کا نظام تھا۔ یہی تو کہا

---

[1] جی، شاہ صاحب! نمازیں پڑھ لیں تو پھر کیا کریں؟ کہا کہ پھر بیٹھ جاؤ اور ہمارا ذکر کرو۔ یہ ذکر جلی اور خفی......دونوں طرح کا......کرو۔ پھر ''اللہ ھو'' کرو۔

تھا مفکر اسلام علامہ محمد اقبالؒ (1938-1877) نے:

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے اقیم الصلوٰۃ! اور عزیزانِ من! قرآن نے تو اگلے ہی لفظ میں اس اَلصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (20:14) کا مفہوم' اس کی تشریح' خود ہی بیان کر دی۔ کہا کہ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (20:15)۔ یہ انقلاب آنے والا ہے۔ اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں سے' اے موسیٰ علیہ السلام! ایک انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ اسے پھر یاد رکھ کہ یہ انقلاب تمہارے ہاتھوں سے آنا ہے۔ یہاں الساعۃ کہہ کر صَلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (20:15) کا ترجمہ کر دیا' تشریح کر دی' اس کے فوراً بعد وہ بات کہہ دی کہ جس پر غور کرنے کے لیے فلاسفر بیٹھے ہونگے بلکہ یہاں تو آپ کہیے کہ دنیا کے سیاستدان بھی بیٹھے ہونگے' نفسیات کے علما بھی بیٹھے ہوں گے۔ کیا کہا تھا؟ کہا یہ تھا کہ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ (20:15)۔ تیرے ہاتھوں ایک عظیم انقلاب رونما ہونے والا ہے' بلکہ یوں کہیے کہ آیا ہی چاہتا ہے۔ مگر کہتے یہ ہیں کہ انقلاب راتوں رات نہیں آتا۔ تو پھر یہ کیا کہا گیا ہے؟

انقلاب راتوں رات نہیں آتا

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ انقلاب آ رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ انقلاب کہاں تھا جو آ رہا ہے؟ کہا کہ اَکَادُ اُخْفِیْھَا (20:15)۔ پہلے یہ انقلاب نگاہوں سے مخفی چلا آ رہا تھا۔ ہمارا پروگرام یہ ہے' اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ محسوس طور پہ سامنے آ جائے' ابھر اور نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ ہے وہ حقیقت جسے میں نے کہا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سیاستدان ہی نہیں بلکہ فلاسفر اور نفسیاتی علماء اسے Appreciate (قدر) کریں گے کہ انقلاب راتوں رات نہیں آ جایا کرتا۔ فساد تو راتوں کو چھوڑ' پل میں ہی رونما ہو جاتے ہیں۔ ماچس دکھاؤ' فساد برپا ہو گیا' اس کے لیے تو کسی لمبے وقفے کی ضرورت نہیں ہوتی' مگر انقلاب نہیں آیا کرتا۔ یہ تو بڑا ہی سست رفتار' ٹک ٹک ٹک پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ اعمال کے فطری نتائج مرتب ہو رہے ہوتے ہیں۔

ہر چیز کے مخفی نتائج کو ظاہر ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے

عزیزانِ من! اس لفظ الساعۃ کو پھر دیکھیے۔ ان عربوں نے گھڑی کے لیے' Watch کے لیے' ساعۃ کا لفظ لیا۔ آپ جتنا جی چاہے زور لگا دیجیے کہ جس وقت بارہ بجے ہیں' اسی وقت' ایک سیکنڈ کے بعد' گھڑی دوسرے بارہ بجا دے یا ایک بجا دے یا دو بجا دے۔ وہ یہ نہیں کرے گی۔ آپ جو جی میں آئے کر لیجیے' آپ اِسے خود تو کر دیں کہ مثلاً وہ اگلے ہی لمحے ایک بجا دے۔ یہ الگ بات ہے مگر گھڑی از خود تو وہ نہیں کرے گی۔ اس نے تو سیکنڈوں کا ایک چکر پورا کرنا ہے' پھر وہ منٹ بنتا ہے' پھر وہ منٹ کے چکر آتے ہیں اور اسی رفتار سے وہ چلی

جاتی ہے۔اب یہ سیکنڈ یا منٹ کی سوئی کو تو ہم نے اپنی سہولت کے لیے بنا رکھا ہے کہ ہمیں نظر آئے۔اب ان دونوں سوئیوں کو اتار دیجیے اور گھڑی سامنے رکھ چھوڑ دیئے' دیکھتے جائیے عمر بھر آپ کو اس کی رفتار نظر ہی نہیں آتی۔وہ چل رہی ہوتی ہے۔عزیزانِ من! اسے انقلاب کہتے ہیں۔یہاں کہا کہ اَکَادُ اُخۡفِیۡهَا (20:15)۔پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب' جو اس وقت ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ تھا' اب نکھر کر سامنے آجائے۔عزیزانِ من! کیا الفاظ ہیں عربی زبان کے! زبان کے اعتبار سے "اُخۡفِیۡهَا" تضاد میں ہوتا ہے' وہ اس طرح کہ پہلے کسی چیز کا مخفی رہنا اور اس کے بعد اُس کا نمود میں آجانا۔دوسری جگہ اس "اُخۡفِیۡهَا" کی تشریح مزید واضح الفاظ میں کر دی۔اگلی سورۃ انبیاء ہے۔اس کی آیت 12-11 سے بات شروع کی' یعنی (12-21:11)۔میں کہا کہ وَكَمۡ قَصَمۡنَا مِنۡ قَرۡيَةٍ كَانَتۡ ظَالِمَةً وَّ اَنۡشَاۡنَا بَعۡدَهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ (21:11)۔اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ اِن قوانینِ خداوندی کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں رفعت و عظمت حاصل ہو جائے گی۔اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ و برباد ہو جاؤ گے جس طرح ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی اور پھر ان کے بعد ان کی جگہ دوسروں قوموں کو اٹھا کھڑا کیا۔

قرآنِ حکیم کا انداز بیان

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم پہلے بات یوں شروع کر دیتا ہے۔یہ بڑا عجیب انداز ہوتا ہے کہ اسٹوری (کہانی) کا جو End (اختتام) ہوتا ہے اُسے پہلے بیان کیا جائے پھر اسٹوری (کہانی) کو ابتداء سے بیان کیا جائے۔آپ دیکھتے ہیں آج کل یہ انداز کیسا ہو رہا ہے۔یہ قرآن کا انداز ہے: کتنی ہی ظالم قومیں تھیں جن کا ہم نے تختہ اکھیڑ کے رکھ دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لی۔اور بات آگے چلاتا ہے۔کہتا ہے کہ تمہاری محسوس نگاہوں نے تو یہی دیکھا کہ کل تک یہ قوم برسرِ اقتدار تھی' یہ حاکم تھا اور کسی نے حملہ کیا یا نیچے سے کوئی انقلاب اٹھا اور اس کے بعد انہوں نے اس کو الٹا کے رکھ دیا اور دوسرے دن شباشب یہ کچھ ہو گیا۔قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔یہ تو غیر محسوس طور پر ہوتا ہے۔اس کے لیے یہ عناصر کام کرتے چلے آرہے ہوتے ہیں۔کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا' خاص طور پہ جن کا تختہ الٹ جانا ہوتا ہے انہیں احساس ہی نہیں ہوتا۔وہ اپنی قوت کے نشے میں بدمست ہوتے ہیں' پھر کہا کہ فَلَمَّاۤ اَحَسُّوۡا بَاۡسَنَاۤ (21:12)۔ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس روش سے باز آجائیں لیکن وہ اس تنبیہہ پر کان نہیں دھرتے تھے چنانچہ ان کی غلط روش کے وہ نتائج محسوس طور پر ان کے سامنے آگئے۔

انقلاب کے وقت انسان نشۂ قوت میں بدست رہتا ہے

عزیزانِ من! ہماری گرفت کی یہ آواز محسوس طور پر (اَحَسُّوۡا) ان کے سامنے آئی جن کا تختہ الٹ رہا تھا۔اس کے معنی ہیں کہ یہ گرفت اس سے پہلے غیر محسوس طور پہ آرہی تھی اور جب وہ گرفت نتائج کی صورت میں سامنے آگئی تو اِذَا هُمۡ مِّنۡهَا يَرۡكُضُوۡنَ

(21:12)۔ پھر لگے اس سے بھاگنے۔ ان سے کہا کہ لَا تَـرْكُضُـوْا (21:12)۔ ہمارے قانون مکافات نے انہیں للکارا اور کہا: اب کہاں بھاگ کر جا سکتے ہو؟ مت بھاگو۔ قرآنِ حکیم کے اندازِ بیان کی کیا بات ہے! اب وہ بھاگ رہے ہیں، ہمارے قانونِ مکافات نے پیچھے سے آواز دی: کہاں بھاگ رہے ہو۔ بھاگ نہیں سکتے۔ اس لیے وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ (21:13)۔ لوٹو، واپس آؤ، انہی محلات میں کہ جن کی رنگینیاں تم نے غریبوں کے خونِ ناحق سے پیدا کی تھیں۔ اب الٹے پاؤں انہی عیش سامانیوں کی طرف چلو جن کی سرشاریاں تمہیں اس طرح مدہوش کیے تھیں اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ آؤ اور وہاں چلو تاکہ لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ (21:13)۔ اس موقع پر تم سے پوچھا جائے کہ یہ کس کی محنتیں تھیں، جن پہ یہ سب کچھ بنا ہوا تھا؟ اور تمہارا اس پر کیا حق تھا؟ (21:12) میں "اَحَسُّوْا" کی بات کہہ رہا ہوں۔ قرآن کی رو سے غیر محسوس شکل میں انقلاب تو پتہ نہیں کب سے چلا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت یہ انقلاب مِنْ حَيْثُ لَا تَشْعُرُوْنَ (16:26)۔ اُن راستوں سے آ پہنچتا ہے جو ان کے عقل وشعور میں بھی نہیں ہوتے۔

عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے کہ قرآن کہتا ہے کہ یہ انقلاب ان راہوں سے آ رہا ہوتا ہے جو تمہارے شعور میں بھی نہیں ہوتیں۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا (20:15)۔ یہ غیر محسوس، غیر مرئی انقلاب آ رہا تھا مگر یہ اس وقت تک ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ تھا اور اب ہم چاہتے ہیں کہ وہ محسوس طور پہ سامنے آ جائے۔ اس کے لیے تمہیں بھیجا جا رہا ہے۔ غیر محسوس طور پہ تو ہمارے ہی کائناتی قوانین سے بھی یہ کچھ ہو رہا تھا۔ مگر محسوس طور پر انسانوں ہی کے ہاتھوں اسے رونما ہونا تھا۔ کیوں یہ انسانوں کے ہاتھوں ہونا ہے؟ اگر یہ اسی انداز سے غیر مرئی طور پہ ہو جائے تو پھر انسانوں کی کوئی جماعت بھی حوصلہ نہ کرے کہ ہمی نے اسے کرنا ہے۔ بتایا یہ ہے کہ یہ کچھ انسانوں سے کرا کے، ہر دور کے انسانوں کو، ہم نے بتایا کہ اسے تمہی نے کرنا ہے۔ یاد رکھو، اس انتظار میں نہ رہنا کہ سب کچھ ہم ہی کر دیں گے۔

آخر اس انقلاب کی شکل کیا ہوگی؟

عزیزانِ من! لیجیے اب آپ کے سامنے وہ بات آ گئی جو یہاں تک ہو رہی تھی کہ یہ انقلاب کیا ہے؟ فرعون کی فرعونیت کیا کر رہی تھی؟ یہ انقلاب کیوں لایا جا رہا ہے؟ کیوں تختہ الٹا جا رہا ہے؟ غور سے سنیے، عزیزانِ من! آج خاص طور پہ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آئے گی۔ کہا کہ یہ اس لیے لایا جا رہا ہے کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (20:15)۔ تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا پھل مل سکے، کوئی دوسرا نہ لے جائے، یعنی یہ انقلاب اس لیے آئے تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور سلب ونہب کا موجودہ فرعونی، قارونی، اور ہامانی معاشرہ ختم ہو جائے جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ لیجیے، یہ

دنیا کا عظیم ترین انقلاب ہے' جسے آویزشِ صاحبِ ضربِ کلیم ❶ اور فرعون کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک انقلابی ❷ کو ساری کٹھالیوں میں سے گزار کر تیار کیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہیں اپنے کام کے لیے چنا ہے۔ کام کیا ہے؟ تمہارے ہاتھوں سے ایک انقلاب آنا ہے۔ اے جی! کاہے کے لیے آنا ہے؟ اس سے کیا ہوگا؟ کہا کہ یہ اس لیے آنا ہے کہ کوئی کسی کی محنت کا پھل کھسوٹ کر نہ لے جائے' بس یہ انقلاب اس لیے لانا ہے۔ یہ ہے جی ماحصل سارے انقلاب کا! اگر صورت یہ ہے کہ محنت کسی اور کی ہے لیکن محنت کا پھل کوئی اور لیتا ہے تو اس نے تو اس کا تختہ الٹ دیا۔ اس عمل میں تو نظر بظاہر فساد تھا مگر وہ تو اِسے انقلاب کہتا ہے۔

قرآن میں اجرت مقرر کرنے کا سوال ہی نہیں ہے

عزیزانِ من! اگر یہ چار لفظ ہی ہمارے ہاں Motto (نصب العین) بن جائیں تو یہ جتنی بحثیں ہو رہی ہیں' ساری ختم ہو سکتی ہیں۔ یہ جو لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى (20:15) ہے' وہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا پھل مل جائے۔ آپ دیکھیں گے قرآن نے جہاں جہاں سعی مشکور کہا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کوششوں کا بھرپور نتائج پیدا کر لینا۔'' قرآنی نظام میں Wages (اُجرتوں) کا سوال نہیں ہے۔ اجرت مقرر کرنے کا سوال نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اجرت تو وہ مقرر کرتا ہے جو محنت کراتا ہے' جو سرمایہ دار ہے' جو صنعت کار ہے' جو ایوانِ اقتدار میں ہے۔ یہاں تو لفظ ''ماتسعیٰ'' ہے۔ یہی ماتسعیٰ یعنی جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے' اس کا پھل (Reward) ہے۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ میں ہی' آگے چل کر آیت 112 میں' اس کی تشریح کر دی کہ یہ انقلاب کب آتا ہے؟ اس کے لیے کہا کہ یہ انقلاب اس وقت آتا ہے جب وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (20:112)۔ اقدارِ خداوندی پہ ایمان ہو اور اعمالِ صالح ہوں تو پھر اس کا ایک نتیجہ نکلتا ہے جو انقلاب کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

قرآنی انقلاب میں کوئی سلب ونہب اور کوئی ظلم وحزن باقی نہیں رہتا

سنیئے عزیزانِ من! اس انقلاب کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ پہلے کہا تھا کہ جو شخص خدا کے ضابطۂ قوانین کی صداقت کو تسلیم کر کے صلاحیت بخش کام کرے گا تو فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (20:112)۔ اُسے سلب ونہب اور Exploitation کا ڈر نہیں رہتا' اُسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا' نہ کسی حق تلفی کرنے والے کے سلب ونہب کا اندیشہ۔ عزیزانِ من! یہاں ظلم اور حزن دو الفاظ ہیں۔ لہٰذا نہ تو اس چیز کا ڈر رہتا ہے کہ جو اس کا صحیح مقام ہے وہ اسے نہیں ملے گا کیونکہ ''صحیح مقام کے نہ ملنے کو ظلم کہتے ہیں''، اور نہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محنت کا ماحصل کوئی دوسرا لے جائے۔ یہاں تو حزن کا ہی لفظ آئے گا۔ کہا کہ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا (20:113)۔ اس

---

❶ مفکرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبال رحمہ اللہ (1877-1938) کی یہ اصطلاح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے۔

❷ حضرت موسیٰ علیہ السلام

مقصد کے لیے تو قرآن اتارا ہے' جو عربی مبین میں ہے۔ اس سے بات پھر وہیں چلی گئی کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (20:15)۔ اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک عظیم انقلاب رونما ہونے والا ہے۔ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ تھا' اب نکھر کر سامنے آ جائے۔ یہ انقلاب اس لیے آئے گا تا کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ مل سکے اور سلب ونہب کا موجودہ فرعونی' قارونی اور ہامانی معاشرہ' جس میں حالت یہ ہے کہ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ماحصل کوئی دوسرا لے جاتا ہے' الٹ کر رکھ دیا جائے۔

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کو سب سے بڑا انقلاب کیوں کہا گیا ہے؟ یہ جو ظلم اور حزن والی' سلب اور نہب والی' Exploitation والی' دنیا میں قوتیں یا نظام یا ادارے یا Institutions ہیں' یہ اصولی طور پر ان تین شقوں میں تقسیم ہوتا ہے: ملوکیت' قارونیت اور ہامانیت۔ [1] ملوکیت میں حکمران طبقہ خود کچھ نہیں کرتا۔ اس کی عجیب صورت ہوتی ہے وہ دوسروں کی محنت کو سلب کرتا ہے اور پھر ان پہ ڈنڈا بھی چلاتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری سے شہنشاہت زیادہ خطرناک ہے

عزیزانِ من! ملوکیت کو قرآن نے اس لیے حرام قرار نہیں دیا کہ اس میں ایک شخص بادشاہ ہو جاتا ہے' پھر اس کا بیٹا بادشاہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو محنت کی Exploitation استحصال کے لیے ایک لفظ سرمایہ داری آتا ہے۔ آپ غور کیجیے گا' ملوکیت دراصل سرمایہ داری ہی کی دوسری قسم ہے۔ سرمایہ داری تو میں سمجھتا ہوں کہ کمتر درجے کی ہوتی ہے۔ استحصال' جسے Exploitation کہتے ہیں' کم تر درجہ ہے۔ سرمایہ دار کچھ نہ کچھ تو سرمایہ Invest (سرمایہ لگانا) کرتا ہی ہے اور پھر روپے پہ کچھ لیتا ہے۔ لیکن یہ جو ملک کا بادشاہ یا شہنشاہ یا صاحبِ اقتدار ہے' یہ کمبخت تو ایک پیسہ بھی Invest (لگانا) نہیں کرتا۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا۔

شہنشاہت یا ملوکیت سے زیادہ خطرناک شکل مذہبی پیشوائیت کی ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس کے بعد قرآن نے کہا تھا کہ دوسرا طبقہ ہامان یعنی مذہبی پیشوائیت کا ہے' جو ملوکیت کی بدترین شکل ہے۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ سرمایہ داری کی بدترین شکل یہ ملوکیت ہے اور اس سے آگے چلیے تو ملوکیت کی بدترین شکل مذہبی پیشوائیت ہے۔ بادشاہ یا حاکم کا اقتدار تو صرف جسموں پر ہوتا ہے' یہ مذہبی پیشوائیت وہ طبقہ ہے جس کی حکمرانی قلوب اور اذہان پہ ہوتی ہے' دل و دماغ پہ ہوتی ہے' روح

---

[1] ان نکات کی مزید مفصل تشریح کے لیے دیکھیے: منظور الحق' پروفیسر ڈاکٹر (زیرنگرانی): مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل' 2004' ص ص۔ 124 ,109: (فٹ نوٹ)

پر ہوتی ہے۔ انہیں کسی پولیس یا فوج کے مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کے خوف سے تو گھر کے کمرے کے اندر تنہا بیٹھا ہوا ہی کانپ رہا ہے کہ اگر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ جہنم میں چلے جاؤ گے۔ پیر صاحب نے اگر یہ کہہ دیا کہ مردود ہو گئے ہو تو تباہ ہو گیا' ڈر رہا ہے' کانپ رہا ہے۔ سارے محنت کرنے والے محنت کرتے ہیں اور بہترین چیز لا کے اس کے قدموں میں ڈھیر کرتے ہیں۔ ان کے پاس پہلا پھل آتا تھا۔ اگر یہ گجر ❶ ہے تو پہلا دودھ ''جیہڑا ہیگا سی'' ❷ وہ ان کے قدموں میں لا کر رکھ دیتا تھا تو یہ وہی چیز ہے جو مذہبی پیشوائیت میں چلی آ رہی ہے یعنی وہ کوئی محنت کر کے' جا کے نہیں لیتا۔ سرمایہ دار کو تو پھر بھی لاکھ جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اگر کوئی سرمایہ لے کر بھاگ ہی جاتا ہے تو اُسے دعوے کرنے پڑتے ہیں' رقم ہی ڈوب جاتی ہے۔ ان مذہبی پیشواؤں کے ہاں تو رقم انوسٹ ہی نہیں ہوتی' ڈوبنا کیا ہے! اِدھر تو وہ دینے والا لیے لیے پھر رہا ہے' ان کی منتیں کر رہا ہے' وہ دھتکار رہے ہیں' تو رو رہا ہے' پاؤں پہ گڑگڑا رہا ہے کہ حضرت قبول کر لیجیے۔ اللہ اکبر! ارے اس سے بڑی سرمایہ داری بھی دنیا میں کوئی اور ہو سکتی ہے!

قرآن نے ہامان کے لشکر گنائے ہیں

عزیزانِ من! سنیے' قرآن نے قارون کا نام تو آخر میں جا کے لیا ہے۔ یہ ایک ٹائپ کا Exploiter (ناجائز فائدہ اٹھانے والا) ہی کچھ کم نہیں ہوتا تو جہاں یہ تینوں اکٹھے ہوں: فرعون' قارون اور ہامان' وہاں صورتِ حال کیا ہو گی۔ قارون کے علاوہ ہامان کے تو خود قرآن نے جنود ❸ گنائے ہیں۔ یہ تھی کیفیت اُس معاشرے کی جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صاحبِ ضربِ کلیم کو' بھیجا گیا تھا۔ اب ذہن میں آیا کہ اس مرحلے کی کتنی اہمیت تھی۔ آگے چل کے ابھی بات آئے گی کہ جب یہ چیزیں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے لائی گئیں تو ان سے بدک کر وہ کس طرح سے کانپ اٹھے تھے۔ کہا گیا تھا کہ اِسے ہاتھ میں لو اور نکل کے چلو۔ اس نے کہا تھا کہ ڈر لگتا ہے' یہ تو اژدھا ہے' ہڑپ کر جائے گا۔ یہ بات آگے آئے گی۔ بہر حال یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے کہا تھا کہ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (20:15)۔ تا کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ (Reward) مل سکے۔

محنت کا ایسا ماحصل جیسے دودھ سے تھن بھرے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! اسے پھر ذہن میں رکھیے کہ اس انقلاب کا مقصد یہ تھا کہ ہر محنت کرنے والے کو اس کی پوری محنت کا صلہ مل جائے۔ اس لیے خدا نے اسے اپنے ہاں سعی مشکور کہا ہے یعنی تمہاری محنت یوں بن جائے جیسے دودھ سے تھن بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہا کہ

---

❶ دودھ فروش۔

❷ جو جیسا ہوتا تھا۔

❸ لشکر

موسیٰ! جاؤ۔ پھر کہا کہ ایک احتیاط برتنا: فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَتَرْدٰى (20:16)۔ جو لوگ اس آنے والے انقلاب کے واقع ہونے پر یقین نہ رکھیں اور اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہیں (انہیں اپنے ساتھ نہ رکھنا ورنہ) وہ تمہارے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جائیں گے اور اپنے ساتھ تیری تباہی کا بھی موجب بن جائیں گے۔ اسے یاد رکھو' یہ انقلاب ان لوگوں کے ہاتھوں رونما ہوگا جو اس پر دل سے یقین رکھیں اور اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے خیال سے بالاتر ہو جائیں۔

ساتھیوں کے سلسلہ میں احتیاط ضرور برتنا

عزیزانِ من! اسے دیکھیے کہ اس کام کے لیے کہا کہ ایک احتیاط برتنا۔ تمہیں ساتھی چاہئیں مگر ایسا ساتھی' جو اپنے مفاد کو ترجیح دے اسے ساتھ نہ رکھنا۔ وہ اتنا ہی نہیں ہوگا کہ خود بھی ڈوبے گا' وہ تیرے راستے میں بھی رکاوٹ (يَصُدَّنَّكَ) بن جائے گا' تو پھر مصیبت میں پھنس جائے گا۔ بس یہی ایک احتیاط تمہیں کہتا ہوں' اِسے ضرور برت لینا' باقی سب خیر سلا۔ ایسے مفاد پرست کو ساتھ نہ رکھنا (فَتَرْدٰى) ۔خود تو ہلاک ہوگا' تیرے راستے میں روک بن کے کھڑا (يَصُدَّنَّكَ) ہوجائے گا۔ ایسا نہ کرنا' سمجھ لی بات! لے لیا پروگرام۔ جی! لے لیا پروگرام۔ اب آگے ایک بات چلتی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (20:17)۔ اے موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ جی' یہ میرا سوٹا ہے۔❶ ''کی کرنا ہونا اے' ایہدے نال؟ پتہ جھاڑنا ہونا؟''❷

عزیزانِ من! ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 17 تک آ گئے۔ آیت 18 سے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

❶ عصا۔

❷ اس سے کیا کرتے ہو؟ کہا: جی! اس کے ساتھ پتے جھاڑتا ہوں۔

تیسرا باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 18 تا 35)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ﴿١٨﴾ قَالَ أَلْقِهَا
يَا مُوسَىٰ ﴿١٩﴾ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴿٢١﴾
وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ﴿٢٢﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا
الْكُبْرَى ﴿٢٣﴾ اذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغَىٰ ﴿٢٤﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ
عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوا قَوْلِي ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي ﴿٢٩﴾ هَارُونَ أَخِي ﴿٣٠﴾ اشْدُدْ بِهِ
أَزْرِي ﴿٣١﴾ وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ﴿٣٣﴾ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ﴿٣٤﴾ إِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيرًا ﴿٣٥﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1976 کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 18 سے ہو رہا ہے: (20:18)۔

تجدید یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی داستان ہے اور مقام وہ ہے جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رات کی تاریکی میں ایک مقام پہ ٹھہر گئے ہیں۔ غالباً وہاں راستہ بھول گئے۔ سردی بھی تھی‘ دُور سے پہاڑ پر آگ نظر آئی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا‘ نبوت سے پہلے کی منزلوں میں نبی قیاسات کی وادیوں کے اندر تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پھرتا ہے۔ اِسے استعارۃً یونہی سمجھیے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ذرا یہاں ٹھہرو؛ وہاں آگ نظر آتی ہے۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ آگ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہاں کوئی انسان ہوگا‘ تو نبی علامات کے پیچھے چلتا ہے‘ یہ تو وحی ہے جو قیاس کو یقین سے بدل دیتی ہے‘ پھر وہ علامات نہیں رہتیں‘ حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے۔ وہ وہاں پہنچے۔ مشیت کے پروگرام میں وہ وقت آ گیا تھا جب آپ کو نبوت سے سرفراز کیا جانا مقصود تھا۔ وہاں سے ندائے جمال آئی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پچھلی آیات میں کہا گیا تھا کہ **اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی** (20:12)۔ میں تیرا نشوونما دینے والا ہوں۔ تُو اب اس مقام تک آ پہنچا ہے جہاں تیرے لیے عقل کے تجرباتی اور قیاسی طریق سے نتائج تک پہنچنے کی طول طویل مسافتیں لپیٹ دی گئی ہیں اور اس کی جگہ وحی کا اِن طول طویل مسافتوں کو سمیٹنے کا راستہ کھول دیا گیا ہے جہاں حقائق از خود منکشف ہو کر سامنے آ جا

سامنے آ جاتے ہیں لہٰذا تُو اب اس لمبے سفر کے ساز و سامان کو الگ رکھ کر اطمینان سے بیٹھ جا۔ پچھلا پورا درس انہی دو آیتوں کی تشریح میں گزرا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تُو تلاشِ حقیقت میں جو اس وقت تک اتنا سرگرداں پھرتا رہا' بڑی لمبی لمبی منزلیں تم نے طے کیں۔ اب تمہاری وہ مسافت ختم ہوگئی۔ اب جوتے اتار کر سکون سے بیٹھ جا۔ اب تُو اس منزل پہ پہنچ گیا ہے جہاں جو لمبی لمبی منزلیں تھیں (طوٰی) وہ لپیٹ دی گئی ہیں' سمٹا دی گئی ہیں۔ بس یہی فرق ہے عقل اور وحی کے طریقہ کار میں۔

عزیزانِ من! تنہا عقل کی رو سے تلاشِ حقیقت کی سرگردانیاں لمبی لمبی مسافتیں ہوتی ہیں' وہ بھی قیاسات کی رو سے طے ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وحی ان طول طویل مسافتوں کو Economise (مختصر) کر دیتی ہے' انسان کی Labour (محنت) کم کر دیتی ہے تو اس طرح وہ چیزیں جو صدیوں میں جا کے کہیں عقل کی گرفت میں آتی ہیں' وہ بھی دُور سے' دھندلکے کی رو سے۔ وحی ایک حقیقت ثابتہ کی طرح' اُسے فوراً' ثانیاً سامنے لے آتی ہے۔ اِس طرح اس کی منزلوں کی مسافتیں بچ جاتی ہیں۔ یہاں کہا کہ اب تُو اس وادی میں آ گیا ہے' میری بات غور سے سن۔ اس کے بعد یہ کہا تھا کہ بات یہ ہے کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15)۔ ایک انقلاب غیر شعوری طور پر' غیر محسوس طور پر' اندر ہی اندر چلا آ رہا تھا۔ وہ انقلاب ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ محسوس طور پہ سامنے آ جائے۔ اسے محسوس طور پر سامنے لانے کے لیے' تمہارے لیے حکم یہ ہے کہ فرعون کی طرف جاؤ۔ اِسے یاد رکھو کہ انسانیت کی ہڈیاں کچلنے کے لیے تین فولادی آہنی شکنجے ہوتے ہیں: ملوکیت کا استبداد' مذہبی پیشوائیت کی گرفت اور قارونیت کا شکنجہ۔ اور وہ تینوں وہاں موجود ہیں۔

ملوکیت کا استبداد اور اس کی حقیقت

عزیزانِ من! ملوکیت کا استبداد انسان کا دوسرے انسان پر حکومت کرنا ہے۔ ملوکیت کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ ایک بادشاہ ہو تو ملوکیت ہوتی ہے۔ اس کی کوئی بھی فارم ہو' اس کی کوئی بھی شکل ہو' اس میں اگر انسانوں کو قانون سازی کا حق دیا جائے تو ماڈرن دور کے اندر وہ ملوکیت ہو جائے گی۔ اگر ایک شخص کی رائے ہو یا ایک شخص کا فیصلہ ہو تو وہ ذرا زمانہ قدیم کی ملوکیت ہوتی ہے۔ ملوکیت بہرحال ملوکیت ہوتی ہے' جہاں انسانوں کو دوسرے انسانوں پر حکومت کا حق دیا جاتا ہے خواہ وہ Constitutional یعنی آئینی ہو یا وہ Autocracy (مطلق العنانی) ہو یا ڈکٹیٹر شپ ہو' یا پیری مریدی ہو' بات ایک ہی ہوتی ہے۔

مذہبی پیشوائیت کی گرفت اور قارونیت کا شکنجہ

عزیزانِ من! دوسری لعنت مذہبی پیشوائیت کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ حکومت کی گرفت تو انسان کے اجسام پر ہوتی ہے' اس کے بدن پہ ہوتی ہے' Physical (طبعی) ہوتی ہے' قلب و دماغ پہ نہیں ہوتی۔ حکومت میں آپ جس کے بھی سامنے جھکتے ہیں'

اُسے دل میں گالیاں بھی دیتے ہیں لیکن مذہبی پیشوائیت میں تو ان کے حکم کے خلاف آپ کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی نہیں گزر سکتی۔ اگر کہیں ایسا ہو جائے تو آپ تنہائی میں' جہاں کوئی پولیس نہیں ہوتی' فوج نہیں ہوتی' جیل خانہ نہیں ہوتا' آپ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے ہیں' روتے گڑگڑاتے ہیں' ڈرتے ہیں۔ حکومت کی یہ قسم بڑی سخت ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! تیسری حکومت قارونیت کی ہے جس میں لوگوں کو روٹی کا محتاج بنا کے سب کچھ کرایا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہ تین لعنتیں بیک جا اکٹھی ہوگئی تھیں اور ان سے کہا تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! جاؤ' ان تینوں لعنتوں کو الٹنے والا انقلاب لاؤ۔ یہ انقلاب مختلف منازل سے گزر رہا تھا اور ابھی تک غیر محسوس تھا' ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ ہوتا بھی یہی ہے کہ شروع شروع میں' اندر ہی اندر اِس انقلاب کی پختت خوئی (Development) ہوتی ہے اور باہر نہیں آتا۔ کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! اب وقت آ گیا ہے کہ وہ محسوس شکل میں سامنے آجائے اور وہ تمہارے ہاتھوں سے آئے گا' لہٰذا اس کی طرف جاؤ۔

معاشرتی زندگی کے لیے قرآن کریم کی ایک عظیم رہنمائی

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ہی انتباہ کیا تھا' وارننگ دی تھی کہ یاد رکھو! جو شخص اپنے مفاد کو سامنے رکھے' اُسے ساتھ نہ لینا۔ یہی نہیں کہ وہ خود منزل تک نہیں پہنچے گا بلکہ **فَلَا يَصُدَّنَّكَ** (20:16)۔ تمہارے راستے بھی روک کے کھڑا ہو جائے گا۔ بس یہی ایک انتباہ کیا۔ جیسا کہ میں نے اکثر عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ کسی داستان کی تمام کڑیوں کو خود ہی مسلسل بیان نہیں کیے چلا جاتا' درمیان میں وہ خود تمہاری فکر' عقل' اور شعور کے لیے گیپ (Gap) دیتا ہے۔ سمجھ سے کام لیجیے گا تو وہ اِن گیپ کو خود ہی فل اِن (پُر) کر دیتا ہے اس طرح وہ گیپ (Gaps) خود ہی فِل ان (Fill in) نہیں کرنے پڑتے۔

قرآن کا اعجاز

عزیزانِ من! قرآن کے دیگر مقامات میں اُن گیپ (Gaps) کو فل اِن (Fill in) کرنے والے اسباب وسامان موجود ہوتے ہیں' بس وہ کڑیاں وہاں سے لاکے آپ نے یہاں جڑنی ہوتی ہیں تو اس طرح وہ خود ایک مسلسل زنجیر بن جاتی ہے۔ اب جو شخص قرآن کا یہ اندازِ بیان نہیں جانتا یا نہیں سمجھتا' وہ یہ کہتا ہے کہ صاحب! اس قرآن میں تو کوئی ترتیب نہیں' کوئی ربط نہیں' یہ تو اکھڑی اکھڑی سی باتیں ہیں۔ اب آگے جاکے یہ کہہ دیا کہ بات یہ نہیں ہے۔ جب قرآن نے خود کہا ہے کہ ہم نے تصریفِ آیات کی رو سے بات بیان کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مختلف مقامات پہ یہ کڑیاں آپ کو بکھری ہوئی ملیں گی۔ اس میں بھی بہت بڑی حکمت ہے کہ یہ مختلف مقامات پہ کیوں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ بات دوسری ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہاں پہنچنے کے بعد جب ایسے مقام آتے ہیں جہاں درمیان کی کڑیاں وہاں موجود نہیں ہوتیں تو بس جو قرآن کو اس طرح سے پڑھتا ہے' وہاں جاکے وہ کہتا ہے کہ اس میں تو کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ یہ بے

ربط کتاب ہے' اللہ اکبر! یاللعجب!

قرآن میں ربط کا طریق

عزیزانِ من! آپ یہاں کے کسی انسانی مصنف کو کہہ دیجیے کہ تمہاری کتاب میں ربط نہیں' یہ بے ربط ہے' وہ منہ پہ چانٹا مارے گا لیکن یہاں یہ خدا جیسا مصنف ہے' یہ اس کی آخری تصنیف ہے اور اس کے لیے محراب و منبر پہ کھڑے ہو کے کہا جاتا ہے کہ صاحب! اس میں ربط نہیں ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس میں ربط کا طریق تصریفِ آیات ہے۔ یہی بات ہے جس کی وجہ سے اگلی آیت آئی کہ **وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى** (20:17)۔ اے موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تو ذہن میں یہ آیا کہ وہاں پہلے یہ بات ہوئی تھی کہ ہاں! تمہیں ہم نے انقلاب کے لیے تیار کیا ہے اور اس کے بعد کہا تھا کہ اچھا موسیٰ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟

عزیزانِ من! یہاں بات یہ ہو رہی تھی کہ اتنا عظیم انقلاب ہے جس کے لیے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ ابھی اگلی آیتوں میں یہ تشریح پھر آئے گی جس میں کہا تھا کہ یہ آج کی بات نہیں ہے کہ آگ لینے آئے اور پیغمبری مل گئی۔ تمہیں تو ہم نے پیدائش کے وقت سے اس کے لیے تیار کرنا شروع کیا تھا اور اس کے لیے قرآن کے یہ الفاظ ہیں کہ اتنی کٹھالیوں میں سے گزرنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ تُو ہمارے پیمانے پہ پورا اتر آیا ہے پھر تمہارے لیے یہ مقام آیا ہے کہ جسے یوں تیار کیا گیا اس کے ذمے یہ مقصد' منصب اور پروگرام لگایا گیا۔ سوچیے تو سہی یہ کتنی عظیم چیز ہے۔ تو اس کے لیے بات یہی ہوگی کہ وہاں پھر جب ان سے یہ کہا گیا کہ ہاں بھئی! تمہیں اس انقلاب کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کی طرف جاؤ اور اس کے بعد کیا پھر یہ بات پوچھی کہ اے موسیٰ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ نہیں' بات یہ نہیں تھی۔ تو عزیزانِ من! قرآن فہمی کے سلسلے میں ایک اہم بات تصریفِ آیات ہے۔ یہی چیز قرآنِ کریم میں ربط کا طریق ہے۔

قرآن فہمی کے لیے ایک اہم بات

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں تلاشِ ربط کے بعد قرآن فہمی کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم میں خدا بار بار یہ کہتا ہے کہ اسے ہم نے عربی مبین میں نازل کیا ہے۔ خود عربی کے متعلق بھی آپ احباب نے ہمیشہ یہ سنا ہوگا کہ قرآن فصاحت و بلاغت میں بھی بینظیر کتاب ہے' اس کی یہ حقیقت لاریب ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ خود لفظ عربی کے معنی ''نہایت واضح ہونا'' ہوتا ہے پھر جب خدا اسے عربی مبین کہہ رہا ہے تو لفظ مبین سے اس کی خصوصیت اور زیادہ ہوگی تو اس طرح جو خصوصیت عربی زبان کی ہوگی' ان کے اسلوب و انداز کی بھی ہوگی۔ لفظ مبین سے قرآن کے اندر وہ خصوصیت بلند ترین مقام پہ ہوگی' اور جو کتاب فصاحت و بلاغت کی ہو' اس میں Suggestiveness یعنی ایمائیت' بلند ترین مقام پہ ہو تو اسے ادب (Literature) میں الفاظ کے مجازی معنی لینا کہتے ہیں۔

عربوں کے ہاں الفاظ کے مجازی معنی لینے کی یہ چیز بہت ہی عام تھی اور اسی سے ان کی زبان انتہائی بلندیوں پہ پہنچی ہوئی تھی۔ اسی لیے ان کے لغت میں آپ دیکھیے کہ Root (مادہ) کے اعتبار سے‘ وہ اس مادے کے بنیادی معنی دیتے ہیں اور اس کے بعد آگے چل کے تمام ابواب میں گو کہ وہ ان بنیادی معنوں کو تو رکھتے ہیں مگر وہ اس کے جتنے مجازی معنی استعمال کرتے ہیں‘ ان سے صفحوں کے صفحے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان تمام معانی کی مثال میں وہ شعرائے جاہلیہ کے وہ اشعار لاتے چلے جاتے ہیں کہ ان معنوں میں بھی یہ لفظی استعمال کیا جاتا تھا‘ ان معنوں میں بھی کیا جاتا تھا۔ تو عزیزانِ من! یہ ساری چیزیں سامنے رکھیے تو عربی مبین بنے گی اور پھر اس عربی مبین کا مصنف خدا ہوگا لیکن ہمارے ہاں تو یہ چیز آئی کہ بس وہ قرآن کا لفظ لیا اور وہ جو اس کا وہی لغوی معنی جسے یہ Literal Meaning (لفظ معنی‘ لغوی معنی) کہتے ہیں‘ وہ سامنے رکھا اور یہ اس کا ترجمہ کیا۔ اب اس کے بعد اگر کوئی شخص جو فکری رو سے قرآن سمجھنا چاہتا ہے‘ وہ کہتا ہے کہ صاحب! اس لغوی معنی سے تو بات سمجھ میں نہیں آتی تو وہ فوراً کہتے ہیں کہ ملاحظہ تو فرمایئے یہ خدائے بلند و برتر کا کلام ہے‘ تمہارا اتنا نارمل سا دماغ ہے یہ تمہاری سمجھ میں کیسے آ سکتا ہے؟ یعنی یہ تو وہی ہے جو ہمارے ہاں پرانا سا‘ بازاری سا‘ محاورہ ہوا کرتا تھا کہ لکھے موسیٰ‘ پڑھے خدا۔ تو گویا ہوا یہ کہ اتنے بڑے جلیل القدر خدا کا کلام‘ اسے سمجھنے کے لیے بھی تو کوئی دوسرا خدا ہی معاذ اللہ ہونا چاہیے یا کم از کم نبی تو ہو۔ عام آدمی اسے کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ ہماری یہ ساری الجھنیں اس سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔

قرآن کا ترجمہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتا البتہ اس کا مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! یہ وجہ تھی جو میں نے عربیٔ مبین کی یہ چیز دی اور جس کی بنیاد پہ کہا کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ‘ لفظوں کی جگہ لفظ رکھ کے نہیں ہوسکتا۔ الفاظ کو جب بھی مجازی معنوں میں استعمال کریں گے تو ان میں ایمائیت (Suggestiveness) ہوگی‘ ان میں بلاغت ہوگی۔ اسلوبِ زبان جاننے والے احباب اسے Appreciate (بہ نظرِ تحسین دیکھنا) کر سکتے ہیں یعنی اس کی داد دے سکتے ہیں کہ اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا‘ اس کا مفہوم ہی بیان ہوسکتا ہے‘ اور وہ مفہوم بھی بہر حال اس زبان کے دامن کی وسعت کے اعتبار سے ہی ہوسکتا ہے‘ جس زبان میں آپ وہ مفہوم بیان کریں۔ لہٰذا قرآن کو سمجھنے کے لیے اس تمہید کو ذہن میں رکھیے اور اس قسم کے مقامات جہاں اس کی بلاغت انتہا پہ پہنچی ہوئی ہوتی ہے وہاں تو خاص طور پہ اسے دیکھنا پڑتا ہے۔ اِس کی ایک مثال یہ آیت ہے: وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (20:17)۔

لفظی ترجموں کے تحت آیات کی تشریح: ایک نقصان رساں انداز

عزیزانِ من! اس آیت ’وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى (20:17)‘ کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اے موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ پہلے اس کے جو یہ لفظی ترجمے ہو رہے ہیں‘ میں لغوی معنی (Literal Meanings) کے اعتبار سے دو تین آیتیں بیان کرونگا۔

پہلی چیز تو یہ کہ **وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى** (20:17)۔اے موسیٰ! تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ **قَالَ هِيَ عَصَايَ** (20:18)۔اے میرا سوٹا ہیگا اے ❶ ۔ یہ جی میرا عصا ہے۔عزیزانِ من! یہاں مقام ملاحظہ فرمایئے۔قرآن کہتا یہ ہے کہ **اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا** (20:15)۔اس حقیقت کو یاد رکھ کہ تیرے ہاتھوں ایک عظیم انقلاب آنے والا ہے۔ہمارا پروگرام یہ ہے کہ وہ انقلاب جو اس وقت تک ظاہر بین نگاہوں سے پوشیدہ تھا' اب نکھر کر سامنے آ جائے۔اس کے لیے کہا یوں جا رہا ہے کہ اے موسیٰ! وہ مقام آ گیا ہے کہ جہاں وہ انقلاب' جو برسوں سے نیچے ہی نیچے' آگ کی طرح سلگتا چلا آ رہا تھا' ہم چاہتے ہیں کہ اب وہ ایک شعلہ بن کے بھڑک اٹھے' دنیا دیکھ لے کہ استبداد' قارونیت' اور مذہبی پیشوائیت کا انجام کیا ہوا کرتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے یہ انقلاب آئے گا؟ عزیزانِ من! اسے پھر دہرا دوں کہ اس انقلاب کے کیوں آنے والے الفاظ تو ہمارے ہاں ہر در و دیوار' پہ کم از کم ایواناتِ حکومت میں' لکھے ہوئے ہونے چاہئیں۔وہ الفاظ ہیں کہ یہ انقلاب اس لیے آئے گا: **لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى** (20:15)۔تا کہ ہر فرد کو اس کی محنت کا صلہ مل جائے۔یعنی اس انقلاب کے لیے انہیں کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اس انقلاب کے لیے تیار کیا ہے' عمر بھر ان بھٹیوں میں سے گزارا ہے' اب جاؤ جس انقلاب کے لیے تجھے یوں تیار کیا تھا۔تو کیا اب اس انقلاب کو لانے کے لیے پھر یوں باتیں شروع ہونگی کہ اے موسیٰ علیہ السلام! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ اور موسیٰ کہیں گے کہ یہ تو میرا عصا ہے' میرا سوٹا ہے۔ ❷ چلو جی! اللہ میاں نے پوچھ لیا: تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ اس نے کہہ دیا ہے کہ کوئی عصا ہے' سوٹا ہے' جس پر کہا کہ **اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا** (20:18)۔میں سہارا لے کے اس سے کھڑا ہوا کرتا ہوں۔یعنی تھک جاتا ہوں تو اس سے سہارا (Support) لیتا ہوں۔پوچھا تھا: تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ کہہ دیا کہ عصا ہے۔آگے چلیے۔کہا کہ جی! میں پھر اس سے سہارا لے کر کھڑا ہو جایا کرتا ہوں۔**وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ** (20:18)۔اور پھر یہ کہا کہ میں اس عصا سے اپنی بھیڑوں بکریوں کو ہانکا کرتا ہوں۔خدا اور اس کے عظیم پیغمبر کی یہ باتیں ہو رہی ہیں۔یہ وہ عظیم پیغمبر ہے جسے اس انقلابِ عظیم کے لیے بھیجا جا رہا ہے اور پوچھا جا رہا ہے کہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: سوٹا ہے ❸ اور پھر خود ہی آگے چل پڑتا ہے حالانکہ یہ پوچھا ہی نہیں گیا کہ اسے کرتے کیا ہو؟ یعنی اس خدا کو یہ بھی پتہ نہیں ہے" کہ سوٹے نوں کی کردے ہوندے نیں"۔❹ حضرت موسیٰ نے بتایا کہ میں اس سے یہ یہ کام کیا کرتا ہوں۔قصہ مختصر کہا کہ **وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى** (20:18)۔میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے فائدے ہیں۔میں اس سے کئی اور کام بھی لیا کرتا ہوں' جی! **قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى** (20:19)۔خدا نے کہا: اے موسیٰ! اسے ڈال دو' اس سوٹے کو پھینک دو۔میں ترجمے کے اعتبار سے اِن آیات کا عمومی مفہوم کہہ رہا ہوں۔ **فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى** (20:20)۔چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈال دیا۔اور دیکھتا کیا ہے کہ وہ تو ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔وہ پھینکا

---

❶ یہ میری لاٹھی ہے۔ ❷ لاٹھی۔عصا

❸ لاٹھی۔عصا ❹ لاٹھی سے کیا کام لیتے ہیں؟

اور وہ دیکھا کہ وہ ایک سانپ ہے جناب! جو دوڑتا پھر رہا ہے۔ ارے میں ''یا اللہ کتھے پھس گیا آ کے اگ لین آیا؟''❶ حکم ہوا: **قَالَ خُذۡهَا** (20:21)۔ کہا کہ اب اسے پکڑلو اس سانپ کو پکڑو۔ **وَلَا تَخَفۡ** (20:21)۔ اور مت ڈرو۔ یعنی ''نہ ڈر' نہ ڈر' پھڑ لے سپ نوں'' ❷ **سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى** (20:21)۔ ہم اُسے پھر اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں۔ کوئی بات نہیں' کوئی بات نہیں' پکڑ لے' سوٹا بن جائے گا۔ اور پھر حکم ہوا کہ **وَاضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ** (20:22)۔ اپنا ہاتھ اپنے پہلو میں رکھو اور پھر نکال بغیر اس کے کہ کسی طرح کا عیب ہو' چمکتا ہوا نکلے گا۔ یہ جو ایسے کھڑا ہے یہ ایسے ایسے تُو جو کھڑا ہے۔ ''ذرا ہتھ باہر کڈ' روتا ہے کمبن ڈیا ہے' سپ بنادتا ہے سوٹے نوں'' کیا ہو گیا؟❸ عزیزانِ من! اندھیری رات ہے' پاس کوئی نہیں ہے' بال بچہ پیچھے ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ یہ ہاتھ نکالو اس طرح وہ ہاتھ دیکھا تو وہ ہاتھ روشن ہو چکا ہے' چمک رہا ہے۔ کہا کہ **اٰيَةً اُخۡرٰى** (20:22)۔ یہ تیرے لیے دوسری نشانی ہے۔ یعنی کہا کہ ایک اور نشانی دیکھ لے' یہ تو ابھی چھوٹی چھوٹی نشانیاں ہیں جو ہم نے ابھی تمہیں دکھائی ہیں۔ ''و یکھ تے سہی اگے جا کے توں'' ❹ **لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى** (20:23)۔ یہ نشانیاں اس لیے دی گئی ہیں کہ آئندہ تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں گے۔ عزیزانِ من! کہا کہ عظیم چیزیں تیرے سامنے آئیں گی اور اس کے بعد ہے کہ: **اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24)۔ اب تم فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم واستبداد میں بہت ہی آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔ یعنی اب یہ باتیں ہو گئیں تو کہا کہ لو! اب تم تیار ہو گئے' اس کے لیے تمہاری پوری تیاری ہو گئی' Instructions (ہدایات) مل گئیں' ہدایات مل گئیں۔ اب فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ حدود فراموش ہو گیا ہے' سرکش ہو گیا ہے۔ اللہ اکبر!

تراجمِ قرآن کے بعد تفاسیرِ قرآن مزید دو ہاتھ آگے ہیں

عزیزانِ من! ہمارے تراجم میں آپ یہی چیزیں دیکھیں گے اور پھر جب ان کی تفاسیر ہوئی ہیں تو پھر تو پوچھیے ہی نہیں کہ کیا کچھ ان میں آ گیا ہے۔ آپ انہیں پڑھ کے دیکھیے کہ پھر یہ اژدھے کس کس قسم کے بنے ہیں اور وہ ہاتھ میں سے کیا کیا کچھ نکلتا ہے اور کیا باتیں ہوتی ہیں اور پھر اس کے بعد یہ موضوع شاعری کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اب وہ شعراء کہنے لگے کہ اللہ میاں نے تو پوچھا تھا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اور اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا اتنا زیادہ لمبا کر دیا۔ اس پر وہ کہنے لگا: یہ ساریاں ہوندیاں پیاں ہیگیاں۔❺

---

❶ ارے میں آگ لینے آیا تو کہاں پھنس گیا؟

❷ نہ ڈر' قطعاً نہ ڈر' بلکہ اس سانپ کو پکڑ لو۔

❸ ذرا اپنا ہاتھ باہر نکالو۔ روتے ہو' کانپ رہے ہو کہ اس لاٹھی کو سانپ بنا دیا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

❹ آگے جا کر دیکھنا تو سہی۔

❺ یہ ساری باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

کیا مبالغہ آرائی میں اس سے بڑا بھی کوئی افسانہ بنے گا؟ یاللعجب!

ہر کتاب کو سمجھنے کا ایک اسلوب ہوتا ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ہر کتاب کے سمجھنے کا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! ہر کتاب تو رہی ایک طرف، آپ تو شعر کو بھی نثر کی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ قرآن نے جو اپنا ایک اسلوبِ بیان دیا ہے، جو عربی مبین کا انداز ہے، ہمیں اس کی رو سے قرآن کو سمجھنا ہوگا ورنہ ہم دوسری پٹڑی پہ جا پڑیں گے۔

ہر پروگرام کے لیے ہدایات ضروری ہوتی ہیں

عزیزانِ من! اب یہاں آپ سوچیے کہ جب یہ کہا ہے کہ یہ اتنا عظیم کام تمہارے ذمے لگایا ہے۔ پہلی بار تو یہ وحی مل رہی ہے اور پہلی ہی بار اتنا عظیم فریضہ سپرد کر کے کہا جا رہا ہے کہ یہیں سے اب چلے جاؤ اور کوئی Training (تربیت) کا درمیان میں عرصہ نہیں ہے۔ تو آپ سوچتے ہیں کہ بغیر ہدایات دیئے ہوئے ہی یہاں سے چلتا کیا ہوگا کہ جاؤ، اب تم جانو اور وہ جانے۔ کام یہ ہے جو تمہارے ذمے ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ وہاں ایک پورا پروگرام دیا ہوگا، ہدایات دی ہونگی، احکام دیئے ہونگے، راہنمائی دی ہوگی، وہاں پورا پروگرام Discuss (زیرِ بحث لانا) کیا ہوگا، زیرِ بحث لایا ہوگا کہ یہ کچھ کیا جائے گا، جہاں تم جا رہے ہو۔ یہ سارا کچھ دیا۔ قرآن کے دیگر مقامات میں یہ چیزیں موجود ہیں۔ ان سب کو یہاں لا کے رکھ لیجیے۔ بات سمجھ میں آ جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کے اسلوبِ بیان میں فصاحت و بلاغت بھی ہے، اعجاز بھی ہے اور ایمائیت بھی۔ جہاں یہ اسلوبِ بیان اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے وہاں اگر ہم ان الفاظ کے مجازی معانی لیں تو بات کچھ اور سامنے آتی ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ وہ غیر محسوس حقائق کو تشبیہات و استعارات کے رنگ میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مقامات میں الفاظ کو ان کے ظاہری معنوں پر، لغوی معنوں پر، محمول نہیں کرنا چاہیے بلکہ وہ جس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اُسے سامنے رکھ کر مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس اعتبار سے ان آیات کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عظیم مہم سے متعلق احکامات دیئے گئے تو ندائے غیب نے پوچھا: وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ (20:17)۔ یمین کا مادہ (Root) ''ی م ن'' ہے۔ عربوں کے ہاں ''یمن و سعادت'' تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ یہ لفظ ہمارے ہاں بھی آتا ہے۔ عربوں کے ہاں اس کے اندر دونوں چیزیں ہوتی ہیں یعنی یمن بھی اور سعادت بھی۔ اس زبان کا آپ کیا پوچھتے ہیں! میں تو کہتا ہوں کہ قرآن سے بھی پہلے یہ تو زبان ہی خود اعجاز تھی۔ ان کے ہاں یہی نہیں ہے کہ وہ مادہ (Root) کچھ معنی خود بتا دیتا ہے، ان کے ہاں کیفیت یہ ہے کہ مادہ عام طور پہ تین حرفوں کا ہوتا ہے تو ان کے ہاں جس مادہ میں یہ دو حرف ''ی اور م'' اکٹھے آئیں، اس کے معنی سعادت و قوت ہونگے۔ یہاں بھی اس مادے کے اندر

''ی م ن'' ہے۔ جن الفاظ کے مادوں کے اندر ''م'' آئے گا' ان کے ہاں برکت' قوت اور زور کے معنے ہونگے۔ تیسرے حرف کے بدلنے سے معنی بدلتے جائیں گے۔ دو حرف کے آنے سے ان کے معنی مشترک ہونگے۔ اگر اس قسم کے ہزاروں الفاظ آجائیں گے کہ جن میں وہ دو حرف آئیں گے اور وہ مشترک معنی ان کے اندر آتے چلے جائیں گے۔ ❶ یہ عرب بلا ہیں۔ یمن کی ''ی م'' سے اسکے معنی برکت بھی ہوتا ہے' قوت بھی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے وہ یمین دائیں ہاتھ کو کہا کرتے تھے کہ جو دایاں ہاتھ ہے اس میں برکت کا پہلو بھی ہوتا ہے اور قوت و زور کا بھی۔ دائیں ہاتھ سے جو چیزیں کی جاتی ہیں' ان میں قوت بھی ہوتی ہے' برکت بھی ہوتی جب کہ بائیں ہتھ ❷ سے نہیں۔ اسی لیے کہتے کہ ''سجے ہتھ نال دے ناں''❸ اور دائیں میں بائیں کے مقابلے میں قوت بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کچھ دیا گیا' اس میں دونوں پہلو تھے: قوت بھی تھی' تباہی نہیں اور برکت بھی تھی۔ ان کے ہاں ''اس طرح فصل کا بھرپور طور پہ اگنا کہ اس کی سبزی سیاہی مائل ہو جائے' برکت کہلاتی تھی۔'' یعنی اتنا بھرپور نتائج کا نکلنا برکت تھی۔ یہ چیز صرف قوت سے نہیں ہوتی' اس میں بہت سے عناصر ہوتے ہیں اور ان میں ایک چیز قوت ہوتی ہے' جو ہل چلانے کے کام آتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں جتنی بھی ہیں' ان میں دایاں ہاتھ زیادہ کام کرتا ہے تو اس طرح عربوں میں یمن' سعادت' برکت اور قوت کے معنوں میں آتا ہے۔ اس میں برکت' قوت اور زور بنیادی چیز ہے۔ یہ سارا پروگرام دینے کے بعد کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم نے پروگرام سن لیا' ہماری ہدایات دیکھ لیں۔ اس کے لیے کہا: وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى (20:17)۔ اے موسیٰ! تم ان احکام پر غور کرو اور قوت و برکت دونوں نکاتِ نگاہ سے بتاؤ کہ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ پوچھا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے' اس پر غور کیا۔ کہا کہ جی ہاں! سن لیا' غور بھی کر لیا! جی' کہو کہ برکت اور قوت دونوں نکتہ نگاہ سے اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے' کیسا رہے گا یہ پروگرام؟ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ وہاں قوت سے تو مقابلہ کرنا ہے۔ کامیابی کے بعد پھر اس پروگرام کی اگلی منزل آئے گی۔ اس میں برکات و سعادات آئیں گے۔ یہ نکات میں ابھی تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا۔

عصا اور ید بیضا کا مفہوم

عزیزانِ من! آگے آیات میں عصا' حیة یعنی اژدہا اور یدِ بیضا کے الفاظ آئے ہیں۔ کہا تھا کہ ندائے غیب نے پوچھا: ان دونوں

---

❶ اِن نکات کی توثیق کے حوالے کے لیے دیکھیے ''العلم الخفاق فی علم الاشتقاق''۔ یہ نواب صدیق حسن خان کا مختصر سا رسالہ ہے لیکن اس میں مادوں کے حروف کی بنیادی خصوصیات عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح ابن فارس (متوفی 395ھ) کی مقاییس اللغة کی 1952 کی چھ جلدیں اور ابن درید (المتوفی 321ھ) کی کتاب الاشتقاق اور جمهرة اللغة مادہ (Root) کے بنیادی معنی معلوم کرنے کے لیے بڑی مفید ہیں۔

❷ بایاں ہاتھ ❸ دائیں ہاتھ سے دو۔

گوشوں (قوت اور برکات وسعادت) کی روشنی میں اس کے متعلق سمجھو اور پھر بتاؤ کہ اس پروگرام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں کہا کہ بارِالٰہا! آپ پوچھتے ہیں کہ کہو کیا خیال ہے؟ یہ احکام کیا ہیں؟ **قَالَ هِيَ عَصَايَ** (20:18)۔ اس نے کہا کہ یہ تو میرے لیے سفرِ زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں، یہ تو میری زندگی بھر کا مجھے سہارا مل گیا، آپ مجھ سے ان کے بارے میں میرا خیال پوچھتے ہیں! کیا بات ہے اس اندازِ بیان کی! کیا بات ہے اس سوال کی! کیا بات ہے اس جواب کی! عصا کا مادہ ''ع ص و'' ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''کسی شے کو اجتماعی طور پر، مضبوطی سے پکڑنا۔'' اصل میں وہ کہتے ہیں: ''ہاتھوں کی انگلیوں کا یوں اکٹھا ہو جانا کہ وہ کسی شے کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔'' تو بنیادی طور پہ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ یہ جو عصا ہے، جسے ہم لاٹھی کہتے ہیں، اس کو اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ یوں مضبوطی سے، ہاتھ کی انگلیوں کو اکٹھا کر کے، پکڑی جاتی ہے، ورنہ صرف لاٹھی کے معنوں میں یہ لفظ نہیں آتا، اس ''گرفت کے اعتبار سے'' اسے عصا کہا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی معنی ''اس طاقت اور قوت کے ہوتے ہیں جو گرفت میں آ جائے۔'' ❶

ایسی قوت جو گرفت میں آئی ہوئی ہو وہ تو تعمیری پہلوؤں میں ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! آگے چل کے جو مقامات آئیں گے تو وہاں میں عرض کرونگا کہ یہی قوت اور طاقت جب کہیں سرکش ہو جائے، تو اژدہا بن جاتی ہے، کھا جاتی ہے اور اگر گرفت میں رہے تو وہ سہارے کا عصا ہوتی ہے۔ گرفت میں نہ رہے، تو اژدہا بن جاتی ہے:

لا دِیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دِیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

کہا: پوچھتے ہیں کہ یہ ہدایات، یہ پروگرام تمہارے لیے کیسا رہے گا؟ کیسا رہے گا! میں یہ عصا محکم طور پہ پکڑونگا۔ عصا کا یہ لفظ آپ کے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے آپ بیٹے کو عصائے پیری کہتے ہیں۔ تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ لٹھ کی طرح آپ کو لیے لیے پھرتا ہے۔ عصائے پیری کیا ہوتا ہے؟ وہ سہارا ہوتا ہے، وہ قوت ہوتی ہے۔ جب اس نے ❷ کہا تھا کہ ''عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد'' تو اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ اگر وہ عصا پولیس والوں کی چھ فٹ کی ایک لمبی لاٹھی نہ ہو تو اس سے کام نہیں چلے گا۔ عصا کے تو معنی ہی ''قوت'' کے ہوتے ہیں اسی لیے العصا جماعت کو کہتے ہیں۔ ❸

ہمارے ہاں بھی جب اردو میں یہ محاورہ آیا ہے تو اس کے معنی ''طاقت اور قوت'' کے ہی ہیں گو کہ وہاں عصا کی جگہ لاٹھی ہے: جس کی

---

❶ ''تاج العروس'' اور ''المفردات فی غریب القرآن''

❷ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877)۔

❸ کیونکہ اس اجتماع اور ائتلاف سے قوت بنتی ہے اور عربی میں عَصَوْتُ الْقَوْمَ کے معنی ہیں: میں نے قوم کو جمع کر لیا، اور اس کے برعکس شَقَّ الْعَصَا کے معنی ''جماعت میں افتراق پیدا کر دینا'' کے ہیں۔ (تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن)

لاٹھی' اس کی بھینس۔ تو اس میں لاٹھی کے معنی یہی نہیں ہوتے' یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ'' بھئی! جس کی قوت ہوتی ہے' اسی کی پوزیشن ہوجاتی ہے۔'' ''ڈاڈے داستی ویہنہ سوٗ'' [1] جس کی لاٹھی اسی کا سب رعب داب' عزت ومرتبہ اور جاہ وجلال۔ تو اب ان الفاظ کو ہم اپنے ہاں ان معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن جب یہ عصا کا لفظ قرآن میں آئے گا' اس زبان عربی مبین میں آئے گا' جس زبان نے بنیادی طور پہ اپنے ہاں لغت میں یہ معنی دیدیئے کہ بھئی! یہ ان لغوی معنوں (Literal Meanings) کے اندر استعمال ہوتا ہے' وہاں ہم اس کو وہ سوٹا [2] ہی کہتے ہیں۔ اسے لاٹھی کہتے ہیں' جیسے لغوی لحاظ سے کہیں گے کہ حضرتِ موسیٰ نے ''اوسوٹا ماریا' پہاڑ ایں ہوگئے۔ سوٹا ماریا' آ ہوگیا'' [3]۔ لغوی معنوں کے لحاظ سے وہی سوٹا ہمارے ہاں تفاسیر میں چلا ہے' پھر یہاں سے وہاں فرعون کے دربار میں بھی۔ جب میں اُن آیات پہ آؤں گا تو وہاں عرض کرونگا کہ ساحرین دربارِ فرعون کے ساتھ جو مقابلہ ہوا ہے تو اس میں کیسی کیسی عظیم حقیقتیں بیان ہوگئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کہنے کو اتنا ہی کافی ہوگا۔ ایک باپ سے بھی جب آپ پوچھیے کہ بیٹا کیسا ہو۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو میرے لیے عصائے پیری ہے۔ یہی بات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ بارِالٰہا! یہ احکام کیا ہیں؟ **قَالَ هِيَ عَصَايَ** (20:18)۔ یہ تو میرے لیے سفرِ زندگی میں بہت بڑا سہارا ہیں۔ یہ تو آپ نے ایسا محکم سہارا' ایسی مضبوط چیز دیدی ہے کہ اب میں اسی کے بعد **اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا** (20:18)۔ انہی کے آسرے پر چلوں گا۔ اب زندگی بھر میں اسی کے سہارے پہ جیوں گا اور اسی کے سہارے سے چلوں گا' یہ تُو نے بہت بڑا سہارا دیدیا' بڑی چیز دیدی۔

عزیزانِ من! آگے نبوت اور صوفیائے کرام کے کشف والہام کے تجربے کا فرق آیا۔ میں نے پہلے ہی دن کہا تھا کہ مفکر اسلام اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں نبوت کا اور آپ کے ہاں صوفیا کے تجربے کا جو فرق ہوتا ہے مجھے اس سے بحث نہیں ہے لیکن مجھے تو یہ بتانا ہے کہ وہ فرق ہوتا کیا ہے اور اس کے لیے کیا کہا گیا ہے۔

صوفی کے تجربے اور نبوت کی قوت میں بنیادی فرق ہوتا ہے

عزیزانِ من! نبوت کی قوت اور صوفی کے تجربے میں جو کچھ کہا گیا ہے' اُسے ایک صوفی کے ہی الفاظ میں سنیے کہ صوفی کو جب وہ چیز حاصل ہوجاتی ہے تو پھر وہ اس کے اندر جذب ہو کے بیٹھ جاتا ہے' مگن ہو کے بیٹھ جاتا ہے' دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاتا ہے' اُسے دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا اور جب نبی کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ ''اتر کر حرا سے سوئے قوم'' [4] آتا ہے اور دنیا کی تاریخ کو بدل

---

1. طاقتور کا سو (100) بھی اس وقت بنتا ہے جب 20 کو سات (7) دفعہ جمع کیا جائے۔ یعنی جس کی قوت ہوتی ہے' اسی کی پوزیشن ہوتی ہے۔
2. لاٹھی
3. ایسی لاٹھی ماری کہ پہاڑ اس طرح ہوگیا۔ لاٹھی ماری تو یہ کچھ ہوگیا۔
4. حالی' مولانا الطاف حسین (1837-1914): مسدس حالی' تاج کمپنی لمیٹڈ' لاہور (سن اشاعت درج نہیں ہے) ص۔ ۱۵

دیتا ہے۔ ❶ تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ جو سہارا ملا' یہ تقویت ملی' یہ زندگی کا آسرا ملا' تو یہ ملا تو خدا ہی کیطرف سے لیکن اس میں نبی کے ذاتی استعمال کے لیئے' ذاتی فائدے کے لیے یہ چیز نہیں تھی۔ یہ تو نوع انسان میں ایک عظیم انقلاب برپا کرنے کے لیے تھی۔ اور یہی تو فرق ہے۔ نبوت تو یہ تھی۔ رسالت آگے جا کے شروع ہوتی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے لے کر کیا کرو گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ **اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِیْ** (20:18)۔ میں اِسی کے ذریعے اب اپنے ریوڑ (بنی اسرائیل) کو جھنجوڑوں گا اور ان کے جمود و تعطل کو حرکت وحرارت میں بدل دوں گا۔

گڈریئے کا عمل اور فریضہ ہی نبوت کا فریضہ ہوتا ہے

عزیزانِ من! وہ جو اس آیت (18:20) کا یوں لفظی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ میں اپنی بکریوں کو اِدھر اُدھر کرونگا۔ میں نے کہا تھا کہ عربوں میں گڈریئے کو کہا ہی "راعی" جاتا ہے اور اس کے ریوڑ کو "رعیت" کہا جاتا ہے' گو کہ ان کے ہاں کوئی منظّم طریقِ حکومت بھی نہیں تھا لیکن الفاظ میں کتنی گہری بات کہہ گئے۔ اگر رعایا کا اور حکمران کا تعلق راعی اور رعیت کا ہے تو مقصد رعیت کی نگہداشت اور پرورش ہوتا ہے۔ گڈریئے اور اس کی بھیڑوں کا عجیب تعلق ہے۔ گڈریئے کا فریضہ ہے کہ سارا دن وہ ان کی حفاظت' تربیت اور پرورش کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوتا ہے۔ بھیڑ بکری اگر دن بھر میں پچاس میل چلتی ہے تو یہ دو سو میل دوڑتا ہے۔ ان کو خطرات سے محفوظ رکھنا' ان کو ایک صحیح راستے پر چلانا' ان کی پرورش کرنا' ان کی تربیت کرنا' ان کی رکھوالی کرنا' وہ سوئیں تو اس کا راتوں کو جاگنا۔ اس کے لیے راعی یہ ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! دیکھا اس قوم کی حریت اور صاحبِ اقتدار کی یہ ڈیوٹیاں' یہ ذمہ داریاں! ہاں تو بات عصا کی ہو رہی ہے۔

قرآن کریم اکثر تلمیحات کے انداز میں بات کرتا ہے

عزیزانِ من! جسے آپ شاعری میں تلمیحات کہتے ہیں' قرآنِ حکیم انہی تلمیحات ❷ کے انداز سے باتیں کرتا چلا جا رہا ہے۔ اب یہاں دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل قوم کے متعلق کہا تھا کہ جاؤ' ان کی تعلیم و تربیت کرو' ان کی تنظیم کرو' ان کو ایک جتھہ بناؤ' ان کو ایک سیدھے راستے پہ چلاؤ۔ اب یہ ساری چیز وہی تلمیح ہے: رعایا کی اور راعی کی۔ اسی اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

❶ تفصیل کے لیے دیکھیے: Iqbal, Allama Muhammad: The Spirit of Muslim Culture (pp.99 to 115) in M. Saeed Sheikh (Edited and Annotated). The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1989.

ان خطبات کا پہلا ایڈیشن 1930ء میں کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور سے شائع ہوا تھا اور پھر 1934ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا۔ یہ ساری تفصیل ایم سعید شیخ کے اس ایڈٹ کیے ہوئے نسخے کے صفحہ xv پر موجود ہے۔

❷ کلام میں کسی حصے کی طرف اشارہ کرنا۔ اس کی جمع تلمیحات ہے۔ یہ عربی الاصل ہے۔

گفتگو کرتے ہیں کہ یہ میری بھیڑیں ہیں جن کی طرف مجھے بھیجا جا رہا ہے۔ یہ بھیڑیں تلمیح کے انداز میں بنی اسرائیل ہیں۔ یہاں اَهُشُّ کا لفظ آ گیا جس کے معنی انہوں نے ''زور زور سے لاٹھی مار کے درخت کے پتے جھاڑنا'' کیے ہوئے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ بھیڑوں بکریوں کے لیے درخت کے پتے جھاڑنے کی بات نہیں تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ بنی اسرائیل قوم' مردہ قوم ہو چکی ہے' اس میں حس و حرکت نہیں رہی' اس میں جدوجہد کی صلاحیت نہیں رہی۔ میں اس پروگرام کی رو سے اس مردہ قوم میں از سرِ نو زندگی بیدار کرونگا' اسے مائل بہ حرکت کرونگا' چلاؤنگا' ان کو جھنجھوڑونگا۔ یہ وہی ہے جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ یہ کچھ کرونگا۔ وَلِیَ فِیۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی (20:18)۔ ان کے علاوہ جو معاملات زندگی بھی مرے سامنے آئیں گے' میں اُن سے بصیرت و راہ نمائی حاصل کروں گا' ان کے علاوہ جس قسم کے مواقع سامنے آئیں گے' اِن کی روشنی میں وہاں عمل کرونگا۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ یہ کیا گفتگو ہو رہی ہے! خدا اور اس کے رسول کی بات میں اس پروگرام کے سلسلے کی ایک زریں کڑی کا کیا ربط ہے! ندائے غیب نے کہا: موسیٰ علیہ السلام! تم بالکل صحیح سمجھے۔

پورا پروگرام اور راہنمائی دینے کے بعد فرعون کی طرف بھیجا

عزیزانِ من! ندائے غیب نے کہا کہ قَالَ اَلۡقِهَا یٰمُوۡسٰی (20:19)۔ اے موسیٰ علیہ السلام! جاؤ اور ان احکامات اور پروگرام کو لوگوں کے سامنے پیش کرو۔ اب یہ بات ایسی نہیں ہے کہ اِسے اپنے تک ہی رکھو۔ یہاں آیا ہے فَاَلۡقٰهَا (20:19)۔ اس کے معنی ہیں: ''جاؤ اسے اب دوسروں کے سامنے پیش کرو [1]''۔ ان احکامات کو پیش کرنے کے اس وفورِ شوق کے بعد' جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے' اس نئی مہم اور ان انقلاب آور احکام و ضوابط کے نتیجہ میں جو کچھ ہونے والا تھا' پر غور کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ احکام نہیں' ایک اژدہا ہے' جو بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ اس مقام کی بات آئی ہے جہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے اس پورے پروگرام پر نگاہِ تصور ڈالی تو وہاں یہ ساری کڑیاں سامنے آئیں: وہاں جانا ہے' یہ پروگرام پیش کرنا ہے۔ یہ پروگرام کیا کرے گا؟ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسۡعٰی (20:20)۔ یہاں ''حیة'' کا لفظ آیا ہے۔ حیات ہی سے تو اس کا مادہ آیا ہے۔ زندگی اس کے معنی ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ یہ عرب عجیب قوم تھی۔ کہا تو جاتا ہے کہ یہ جاہل قوم تھی۔ اس جاہل پہ ہزار عقلیں قربان ہو جاتی ہیں۔ آج بھی یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی کی ایک علامت ''سکڑنا یا حرکت کرنا'' ہوتی ہے۔ اگر کسی جاندار چیز کو کسی طرح سے چھیڑا جائے یعنی اس میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ کوئی خطرہ ہے یا اس میں اضطراب پیدا کرنا مقصود ہے تو اس کے ردِعمل میں اس کی زندگی کی علامت ''سکڑنا یا حرکت کرنا'' بیان کی جاتی ہے۔ یعنی

---

[1] امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' کے مطابق القاء کے معنی ''کسی چیز کو اس طرح ڈال دینا کہ وہ دوسرے کے سامنے آ جائے' کسی بات کا حس (Senses) اور بصر یا بصیرت سے ادراک کر لینا (Perception) یا کسی کا پا لینا'' کے ہیں۔

خطرے کا احساس ہو تو وہ یوں سکڑے گی یا حرکت کرے گی۔ اگر سانپ بھی چپکے سے بیٹھا ہوا ہو ذرا سے تنکے سے بھی یوں کرو تو دیکھیے وہ کیا کرتا ہے۔ یہ ننھی سی چیونٹی، وہ بھی اگر کہیں آرام سے سو رہی ہو یا بیٹھی ہو وہ ذرا سا تنکا یوں اس کے سامنے کیجیے، آپ دیکھیے وہ کیسے یوں بھاگنا شروع کر دیتی ہے۔ حرکت زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا یا وہ کچھ کیا۔ تو اس میں یہ دونوں معنی آ سکتے ہیں کہ ''یہ پروگرام جب سامنے رکھا تو اس وقت سے پہلے تو یوں نظر آتا تھا کہ بالکل سکوت ہے، سکون ہے، فضا میں چاروں طرف کچھ بھی نہیں، لیکن بعد میں وہاں حرکت و اضطراب پیدا ہوا۔ تو اس طرح بات یہ ہوئی کہ جب وہ پروگرام و احکامات پیش کیے تو وہاں جو کچھ تھا وہ تو سانپ کی طرح سے اِدھر اُدھر بھاگ اٹھا، کھلبلی مچ گئی۔ آج بھی اگر آپ بڑے سے بڑے مجمعے کے اندر بھی آواز دید یجیے کہ سانپ آیا، پھر دیکھتے ہیں ہوتا کیا ہے؟

عزیزانِ من! آگے چل کے ہم دیکھیں گے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں جائیں گے اور وہاں جا کے اس پیغام کو پیش کریں گے تو نظر آئے گا کہ کیسے کھلبلی مچی تھی، وہاں طوفان برپا ہو گیا تھا، پکڑ یو دوڑ یو مار یو کی صدائیں گونج اٹھی تھیں۔ جب اس نے بتایا تھا کہ میرا پروگرام یا میرے سامنے مقصد کیا ہے تو فرعون، اس کے وزراء، اس کی کابینہ، اس کا پورا لاؤ لشکر، ہامان، یہ سارے کے سارے تڑپ اٹھے تھے۔ وہ تو جب انہوں نے پہلی ہی بات کہی تھی تو یہ اضطراب و ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ آپ غور کیجیے کہ ہمارے ہاں تو بادشاہ بھولے بادشاہ ہی ہوتے تھے کہ سارا کچھ وزیر ہی سمجھوندے سن [1] لیکن وہاں وہ بات نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے بھی وہاں یہ بات دیکھی تھی کہ شاید کوئی مذہبی پیشوا ہی ہو گا، جو آیا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون نے اپنے امراء و وزراء سے کہا تھا کہ کہیں فریب میں مبتلا نہ رہنا، تمہیں معلوم نہیں ہے یہ ہماری حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے آیا ہے۔ یہ تمہیں مصر سے نکال دینے کے لیے آیا ہے۔ یہ یہاں ایک نیا نظام مسلط کرنے کے لیے آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، یہ ضرور کر دکھائے گا۔

اس پہ کابینہ کے اجلاس ہوئے، ان میں Resolutions (قرار داد) پاس ہوئے، پروگرام بنے۔ کسی نے کہا کہ ان دونوں بھائیوں کو پکڑ کر قتل کر دو۔ اس نے کہا: اوئے! ایسا نہ کرنا، نہ نہ نہ، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اس کے پیچھے کتنی بڑی قوت ہے۔ کسی نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے اس کا مقابلہ کراؤ، اس کو یوں شکست دو۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، یہ کر کے دیکھتے ہیں۔ یہ وہ مذہبی راہنما ہی ہونگے۔ ہامان نے کہا تھا کہ دیکھیے تو سہی، ہم مناظرہ کرتے ہیں۔ فرعون نے وہاں یہ کہا تھا کہ پھر یہ اکیلے نہیں کرنا، اس میں پوری خلقت کو اکٹھا کرو۔ اگر مناظرے میں بھی تم جیت گئے اور اُسے شکست دیدی تو کم از کم ان کی نگاہوں میں یہ ذلیل ہو جائے گا۔ مقصد تو میں جانتا ہوں جو اس کا ہے لیکن اس پروپیگنڈے کا پہلا اثر یہ ہو گا۔ قرآن عجیب چیزیں کہہ رہا ہے۔ فرعون نے کہا کہ میں یہ بات جانتا ہوں کہ یہ صرف مناظرے

---

[1] سارا کچھ وزیر ہی سمجھاتے تھے۔

سے تو نہیں ہوگا لیکن اس سے پروپیگنڈہ کی ویلیو (Value) (قدروقیمت) ضرور ہو جائے گی۔ اسی لیے اس نے کہا تھا کہ ساری مملکت کے اندر ڈگڈگی بجاؤ' ڈھنڈورا پیٹو' اس دن کے لیے جشن مناؤ اور اس میں ایک بہت بڑا دربار لگاؤ' اور اپنے ان ملاؤں سے کہا کہ یاد رکھو! یہاں بات یونہی نہیں ہو جائے گی کہ مناظرہ جیت لیا یا مناظرے میں ہار گئے' یہاں اس کا ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ اگر اِسے شکست مل گئی تو اس کی پروپیگنڈہ ویلیو بہت بڑی ہو جائے گی۔ اس کے سامنے یوں آنا۔ قرآن نے یہ کہا تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ یہ وہ چیز ہے کہ جب ان کے سامنے پیش کی جائے گی تو تہلکہ مچ جائے گا' انہوں نے اسے خوب اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور عزیزانِ من! یہی ہوا تھا: **قَالَ خُذْهَا** (20:21)۔ خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو اطمینان دلایا' کہا گیا کہ ٹھیک ہے پھر اس پروگرام کو گرفت میں لو۔ **خذھا** کے معنی پکڑ لینا ہی نہیں بلکہ اسے اختیار کر لینا اس پر عمل پیرا ہو جانا بھی ہوتا ہے۔ ❶ کہا کہ چلو! اب اس پر عمل پیرا ہو جاؤ' یہ بہت بڑا پروگرام ہے' اس کے مقابلے میں اتنی عظیم قوتیں ہیں۔

عزیزانِ من! ابھی تو تنہا موسیٰ علیہ السلام تھا' وہ قومِ اسرائیل تھی کہ جسے جھنجھوڑ کے ابھی جگانا پڑے گا۔ جو قوم بھی محکومی پر مطمئن ہو کے بیٹھ گئی ہو' اُسے مائل بہ حرکت کرنا' بڑا مشکل ہوتا ہے اور پھر حرکت بھی کیسی؟ جس میں زندگی اپنے جوبن پہ نظر آئے۔ مائل بہ فساد کرنا تو بڑا آسان ہوتا ہے' اسے آمادہ بہ انقلاب کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے' منزل لمبی ہوتی ہے اور غیر محسوس بھی۔ یہ قلب و ذہن کا انقلاب ہوتا ہے۔

ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے شارٹ کٹ کبھی کارگر نہیں ہوا

عزیزانِ من! ذہنی انقلاب غیر محسوس' غیر مرئی' غیر شعوری' طور پہ آتا ہے جبکہ عام لوگ اس کے نتائج فوراً دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ اس میں شارٹ کٹ مانگتے ہیں۔ شارٹ کٹ اس میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس لیے وہ دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں' مایوس ہو جاتے ہیں' اس سے پھر جاتے ہیں۔ بہرحال یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلے اپنی قوم کے ساتھ کیا کچھ کرنا پڑا! مخالف قوتیں اتنی بڑی تھیں اور اپنی قوم ایسی محکومیت میں بصالت و شجاعت سے بھی عاری تھی! چنانچہ دل میں احساس تو پیدا ہوا کہ پروگرام بہت بڑا ہے' کچھ سہمے' کچھ ڈرے۔ انہیں کہا گیا کہ **وَلَا تَخَفْ** (20:21)۔ ڈرنے کی بات نہیں ہے' ان احکام و ضوابط کو مضبوطی سے تھام لو۔ **سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى** (20:21)۔ اس کے متعلق جو بات تم نے پہلے کہی تھی (کہ میں ان سے فلاں فلاں فائدہ دینے والے

---

❶ اس کا مادہ ''ا خ ذ'' ہے۔ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی تصنیف ''مقاییس اللغۃ'' میں اس کے بنیادی معنی ''کسی چیز کو احاطہ میں لے لینا'' کیے ہیں۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اَخْذٌ کے معنوں میں قہر اور غلبہ کا مفہوم ہوتا ہے اور ہلاک کر دینے اور استیصال (بیخ کنی کر دینے) کے معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ نیز سزا دینے (مُؤَاخِذَۃٌ) کے معنوں میں بھی۔ یہ معنی تاج العروس میں لکھے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص ص۔ 208-207۔

کام لوں گا) ہم انہیں ایسا ہی بنا دیں گے۔ عزیزانِ من! میں یہاں ایک چیز تو ان ترجمہ والوں (Translators) سے پہلے یہ کہہ دوں کہ انہوں نے کہا ہے کہ ''وہ جو عصا تھا' وہ پھینکا تو سانپ بن گیا اور پھر خدا نے کہا: پکڑ لو اسے' پھر وہی لاٹھی بن گیا۔'' قرآن نے تو کہا ہے: **سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا** (20:21)۔ ہم انہیں (تمہارے منفعت بخش کاموں کے لیے) ایسا ہی بنا دیں گے۔ یہاں قرآن نے **صورتها** تو نہیں کہا۔ ان معانی کے اعتبار سے تو بقول ان کے اس کی صورت بدلی تھی۔ یعنی وہ لکڑی کا ٹوٹا[1] یا عصا تھا' وہ سانپ بن گیا تھا۔ صورت بدلی تھی۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں' وہی بنا دونگا تو اس کی صورت وہ بنی چاہیے تھی۔ قرآن تو **سِيرَتَهَا** کہتا ہے۔ سیرت ہے تو یہاں کوئی تبدیلی سیرت کی ہے' اس لیے قرآن کہتا ہے کہ **لَا تَخَفْ** (20:21)۔ ڈرو نہیں۔ پھر ساتھ ہی کہا کہ **سَنُعِيدُهَا**[2] (20:21)۔ ہم انہیں بنا دیں گے' پلٹ دیں گے' لوٹا دیں گے کیونکہ یہ سیرت ہی تو ہے۔ یہ روش' رفتار' چال' طور طریق' ہیئت' حالت[3] ہی تو ہے۔ جس سے یہ باطل کے لیے' اژدہا کی طرح ہلاکت آفریں ثابت ہوں گے لیکن تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے سہارا بن جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ وہی اس کا انداز ہے' وہی نظام ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا تھا؟

مذہبی پیشوائیت مذہب میں صورت کو تو نہیں بدلتی البتہ سیرت کو ضرور بدل دیتی ہے

پہلے انبیاء کرام نظام لا کر دیتے ہیں جو وحی کی روشنی میں صحیح ہوتا ہے' پھر مفاد پرست قوتیں اس نظام کی سیرت کو بگاڑ دیتی ہیں' صورت تو وہی رکھتی ہیں۔ اور یہی تو ابلیس کا حربہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی صورت کو نہیں بدلتا۔ صورت بدل دینے سے کوئی بھی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا' وہ اس کی سیرت بدلتا ہے' اس کی روح بدلتا ہے' اس کے مقاصد بدلتا ہے' اس کے نصب العین بدلتا ہے مگر صورت برقرار رکھتا ہے۔ آج بھی آپ دیکھیے سارا سر پھٹول اس پہ ہوتا ہے کہ نماز کی صورت میں ہاتھ یہاں باندھنے چاہئیں یا یہاں باندھنے چاہئیں' مذہب نے اس میں صورت کو برقرار رکھا ہے' صورت کی ذرا سی تبدیلی پر تو آپ کے ہاں خون ہو جاتا ہے اور جو شخص یہ کہے کہ بھئی! اس کے اندر اس کی روح پیدا کرو' یہ تو رسمی ہے' اسے کافر قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ سیرت بدلنے کے لیے کہتا ہے۔ ابلیس کو یہ پتہ ہے کہ اگر میں نے سیرت بدلنے کی بات کی تو ان میں سے اسے کوئی بھی نہیں مانے گا۔ اس کا حربہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صورت برقرار رکھتا ہے۔ اسی طرح سے دین کے ارکان کی سیرت یعنی روح بدل دیتا ہے۔ کہا کہ یہ نظام جو اس سے پہلے انبیاء لائے تھے' انہوں نے اس کی سیرت بدل دی تھی۔

---

1. ٹکڑا
2. یہ لفظ ''ع و د'' سے ہے۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ ''عاد'' کے معنی ویسے تو ''پلٹنے'' کے ہیں' لیکن بعد میں ''صَارَ'' کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی ''ہو گیا''۔ عام اس کے کہ وہ پہلے بھی ویسا تھا یا نہیں۔ اَلْعَوْدُ۔ لوٹنا' بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اَلْعَوْدُ کسی کام کو ابتداءً کرنے کے بعد دوبارہ کرنا ہوتا ہے لیکن صاحب المفردات فی غریب القرآن امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) اور صاحب کشاف یعنی زمخشری کی تحقیق ہے کہ یہ لفظ ابتداءً (پہلی مرتبہ) کسی کام کے کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ' لغات القرآن جلد سوم' 1960' ص۔ 1208-1206
3. پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' 1960' ص۔ 927۔

حضرتِ یوسف کے بعد وہاں بھی تو انبیاء آئے ہونگے۔ انہوں نے بھی تو نظام دیا ہوگا اور نظامِ یوسفی کا تو قرآن نے خود بتایا ہے۔ کہا کہ اس کے بعد جو فراعنہ ملوکیت' مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری کے علمبردار آئے ہیں' انہوں نے اس پہلے نظام کی سیرت بدل دی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ڈرو نہیں: **سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا** (20:21)۔ آخر الامر ہم اس نظام کو ایسا ہی بنا دیں گے یعنی یہ جو فرعونی نظام ہے ہم اس کی سیرت ہی بدل دیں گے جو اس سے پہلے تھی۔ یعنی **سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى** (20:21)۔ یہ اس کی پہلی ہی سیرت ہو جائے گی۔ پھر کہا کہ اب اس نظام کا دوسرا گوشہ سامنے لاؤ۔ انبیاء کرام کو قرآنِ کریم نے منذرین (Warners) یعنی اعمال کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرنے والے اور مبشرین یعنی اعمال کے خوش گوار نتائج کی بشارت دینے والے' کہا ہے۔ انذار تو ہوتا ہے کسی غلط نظام یا عمل کے تباہ کن نتائج سے کسی کو وارننگ دینا' کسی کو تنبیہہ کرنا اور اس کے بعد ان کو اس سے روکنا۔ اس روکنے کے لیے یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انقلاب لانے کے لیے بھی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس انقلاب میں یہی ہوتا ہے کہ قوت کے زور پہ ہی سہی' ایک نظام کو الٹ کے رکھ دیا تو کہا کہ بس' پھر آگے معاملہ طے ہو گیا۔

اربابِ اقتدار کی تبدیلی کا نام انقلاب نہیں ہوتا

عزیزانِ من! دنیا کے انقلاب میں ہوتا یہ ہے کہ پہلے نقشے کو الٹ کر' اس کی جگہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے پھر اُس قسم کا نظام قائم کر دیا جاتا ہے جو پہلے والے نظام سے خواہ بدتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں جسے انقلاب کہا جاتا ہے یا Revolution کہا جاتا ہے' اس سے صرف اربابِ اقتدار کی تبدیلی ہوتی ہے' نظام کی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ نئے اربابِ اقتدار اپنے مفاد کی خاطر اس میں کوئی تبدیلیاں بھی کر دیں لیکن یہ طے ہے کہ اس سے اس کی سیرت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ جو وہاں ان کے ساتھ مقابلہ ہوگا' قوت کا بھی مقابلہ ہوگا' ان کے ہاتھوں سے ملک بھی چھینا جائے گا' اقتدار بھی اپنے ہاتھ میں لیا جائے گا' تو کیا بس یہی کچھ ہوگا؟ اس نے کہا کہ یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ یہ تو تنذیر ہے' نبی تو مبشر بھی ہوتا ہے' وہ زندگی کے خوش گوار پہلوؤں کو لانے کے لیے یہ کچھ کرتا ہے۔ زندگی میں جتنی بھی ظلمت کی تاریکیاں ہوتی ہیں وہ انہیں قندیلِ آسمانی کی روشنی میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے وحی کو کتاب کے ساتھ **ضیاء** (21:48) بھی کہا ہے اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام[1] و ہارون علیہ السلام کی کتاب کو تو خاص طور پہ **ضیاء** کہا ہے۔ میں نے ضیاء کا لفظ اس لیے لیا ہے کہ یہاں جو اس آیت (20:22) میں بیضآء ہے' وہیں یہ کہا کہ **وَاضْمُمْ يَدَكَ**

---

[1] وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ (21:48)۔ موسیٰ اور ہارون کو ہم نے وہ ضابطۂ قانون عطا کیا تھا جو صحیح اور غلط کو نکھار کر' الگ الگ کر دینے والا' اور ان لوگوں کے لیے جو زندگی کی تباہیوں سے بچنا چاہیں' مشعلِ ہدایت اور وجہ شرف تھا۔

اِلٰی جَنَاحِکَ [1] تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ [2] (20:22)۔اس مہم میں تو بالکل پریشان نہ ہو' بلکہ نہایت اطمینان وسکون اور کامل دل جمعی سے اپنی دعوت کو واضح اور روشن دلائل کے ساتھ پیش کرتا چلا جا۔ تُو تمام مشکلات سے محفوظ ومصئون باہر نکل آئے گا۔اٰیَةً اُخْـرٰی (21:48)۔ تیری یہ کامیابی' تیری دعوت کی دوسری نشانی ہوگی۔ پہلی نشانی دشمن کی تباہی اور دوسری نشانی تمہاری جماعت کا تمکن اور سرفرازی۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ دشمن کی تباہی مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے جیسے پاکستان کا خطہ زمین لینا مقصود بالذات نہیں تھا' یہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔مگر یہ پہلا مرحلہ بڑا ضروری تھا' یہ دوسرے مرحلے کی تمہید تھا اور وہ تمہید یہ تھی کہ تمہارے ہاتھوں سے وہ روشنی پھیلے گی جس سے یہ ساری تاریکیاں اور اندھیرے چھٹ جائیں گے' سحر ہو کے رہے گی' ظلمت کی تاریکیاں کافور ہو کے رہ جائیں گی۔اس لیے اے موسیٰؑ ! اس قوت کے زور پہ یہ کر۔اور پھر کہا کہ اے موسیٰؑ ! اپنا ہاتھ نکال [3] اب یہ ہاتھ آستین میں چھپا ہوا نہیں رہے گا۔تصوف والوں کا تو دعویٰ یہ ہے کہ خانقاہوں کے حجروں میں' خلوت گاہوں میں' یہ ہاتھ چھپا ہوا رہتا ہے۔رسول کا ہاتھ آستینوں میں چھپا ہوا نہیں رہتا۔اس کا ''ید بیضا'' [4] تو نکھر کر باہر آتا ہے۔تصوف والوں کا مقصد اپنے ہی ہاتھ کو روشن کرنا ہوتا ہے مگر نبی کا مقصد تو ساری دنیا کی تقدیروں کی لکیروں کو روشن کرنا ہوتا ہے۔اب اگلی منزل' اے موسیٰ! یہ ہوگی۔ یہ مروّج نظام الٹے گا اب یہ نہیں ہوگا کہ جیسا اب بدنظمی کا بدنظام' برا نظام' رائج ہے اُسے بدل کے اسی قسم کا دوسرا بُرا نظام قائم کر دیا جائے گا۔ یہ غیر سوءٍ ہوگا یعنی اس کی جتنی برائیاں ہیں وہ بدلیں گی' وہ حسنات بن جائیں گی۔ یہ تو نظامِ سوء کا نتیجہ ہے کہ ہر جگہ تاریکیاں ہی

---

[1] عربیٔ مبین کے مطابق ضُمَّ جَـنَـاحَکَ عَنِ النَّاسِ کے معنی ہیں: ''لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ اور اپنا پہلو ان کے لیے نرم رکھو۔'' (لغت تاج العروس)۔یعنی ''خوف کی حالت میں مضطرب ومتردد مت ہو (پھڑ پھڑاؤ نہیں) بلکہ اس طرح اطمینان سے رہو جس طرح پرندہ حالتِ امن میں اپنے بازو سمیٹ کر بیٹھتا ہے'' (پرویزؒ لغات القرآن' 1961' ص۔1071) اور الجَناحُ۔(جمع اَجْنِحَةٌ) ہاتھ' بازو' پرندے کا بازو' بغل' پہلو نیز اس کا اطلاق خودنفسِ شے پر بھی ہوتا ہے (لطائف اللغہ تاج العروس) اَنَا فِیْ جَنَاحِهٖ: میں اس کے سائے اور حفاظت میں ہوں (تاج العروس)۔

[2] اس آیت کے لفظی معنی یہ ہیں: ''تم اپنے ہاتھ کو اپنے گریباں میں ڈالو۔وہ بغیر کسی خرابی کے سفید نکل آئے گا اور تم خوف کے وقت اپنے بازوؤں کو سمٹائے رکھو۔''

[3] الیـد ۔ہاتھ کو کہتے ہیں۔اس کا استعمال درج ذیل معنوں میں ہوتا ہے: جاہ اور وقار' قوت واقتدار' غلبہ وتسلط' ملکیت' مددگار' امداد اور فریادرسی۔احسان و انعام' حفاظت وصیانت' حذاقت ومہارت اور دوسری طرف یہ لفظ ندامت وشرمندگی' ذلت وانقیاد کے لیے بھی آتا ہے۔مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: لغات القرآن جلد چہارم' 1961' ص ص1790-1788۔

[4] صاحب تاج العروس کے مطابق الید البیضاء کے معنی ہیں: ''وہ حجت جس پر دلیل وبرہان قائم ہو یعنی روشن اور واضح دلیل نیز وہ ہاتھ جو کسی کو کچھ دے کر احسان نہ جتائے' جو بلا سوال دے۔'' صاحب محیط المحیط نے اس کے معنی لکھے ہیں: نعمت' قدرت' فخر' جودت' شہرت۔'' حضرت موسیٰ کے قصے میں ''ید بیضا'' کے مجازی معنی ہیں: روشن اور واضح دلائل۔صاحب لطائف اللغۃ نے بھی ان معنی کی تائید کی ہے۔اس نکتے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: لغات القرآن' جلد اول' 1960' ص۔363

تاریکیاں ہیں۔قرآنِ کریم نے سورۃ ابراہیم علیہ السلام (چودھویں سورۃ) کی ابتداء میں کہا ہے کہ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ (14:1)۔ اے رسول! ہم نے تیری طرف اس کتاب کو اس لیے نازل کیا ہے کہ تُو اس کے ذریعے بنی نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔سوال یہ ہے کہ یہ کتاب کاہے کے لیے نازل کی ہے؟ اس کے جواب میں دو الفاظ ہیں: لِتُخْرِجَ النَّاسَ (14:1)۔تاکہ تُو پوری نوعِ انسانی کو مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:1) تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے۔یہ کتاب تیری طرف اس لیے نازل کی ہے۔

وحی خداوندی انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتی ہے

عزیزانِ من! پھر کہا کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ (14:5)۔اسی نہج کے مطابق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ضابطۂ قوانین کے ساتھ بھیجا تھا یعنی اسی طرح اس سے پیشتر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی اپنے احکام وقوانین دے کر بھیجا تھا۔کاہے کے لیے بھیجا تھا؟ کہا کہ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:5)۔وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لے آئے' وہ بنی اسرائیل کو موت کی تاریکیوں سے نکال کر' زندگی کی روشنی میں لے آئے۔اور قربان جائیے اس کتاب کے حضور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ سے پہلے جتنے بھی رسول آتے تھے' وہ قومی ہوتے تھے' وہ ایک خاص خطہ زمین میں بسنے والے لوگوں کے لیے ہوتے تھے' کسی خاص قوم کی طرف ہوتے تھے' ساری تورات انجیل بائبل اس حقیقت سے بھری پڑی ہے۔مگر آپ بنی نوع انسان کی طرف رسول تھے اور ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر ہر نبی اپنی اپنی قوم کی ہی طرف آیا تھا

عزیزانِ من! حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں یہ ہے کہ میں تو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی طرف آیا ہوں۔وہ اپنے مبلغین کو' شاگردوں کو' تبلیغ کے لیے بھیجتے تھے تو ان سے کہتے تھے کہ یاد رکھو! بنی اسرائیل کے گھروں کی طرف جانا' غیرِ بنی اسرائیل کے ہاں نہ جانا۔بیٹوں کی یہ روٹی کتوں کے سامنے نہ پھینکنا۔یہ موتی دے رہا ہوں' سوروں کے سامنے نہ پھینکنا۔

عزیزانِ من! یہ کچھ انجیل میں لکھا ہوا ہے۔یہ اندازِ تبلیغ اس لیے چلا آرہا تھا کہ نبی ایک قوم کی تربیت کے لیے آتا تھا کیوں کہ ابھی وسائلِ رسل ورسائل اور مواصلات اتنے عام نہیں ہوئے تھے کہ وہ پیغام اتنا دور تک پہنچے۔وہ نبی خاص خطہ زمین کے اندر' ایک خاص قوم کی تعلیم وتربیت کے لیے آتا تھا۔دیکھیے یہاں موسیٰ کے متعلق کہا کہ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:5)۔تُو اپنی قوم کو ظلمات سے نور میں لے آئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تو پوری نوع انسانی کے لیے تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14:10)۔اس کتاب

یعنی ضابطۂ قوانین کو تیری طرف اس لیے نازل کیا کہ تُو اس کے ذریعے نوع انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ اس کتاب کا تو ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے کہ جس پہ آپ غور کیے بغیر آگے چلے جائیں۔ کہا کہ کاہے کے لیے یہ سب کچھ ہوگا؟ جواب میں عجیب الفاظ ہیں: **لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى** (20:23)۔ ہم نے یہ احکام تجھے اس لیے دیئے ہیں کہ تجھے دکھادیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ یہ ساری تعلیم' یہ تربیت' یہ ابتدائی مراحل' یہ تمہیدات' یہ اس نظام کا الٹنا' یہ سارا کچھ' اس لیے ہے کہ ہم تمہیں اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں' یہ بتائیں کہ ہمارے پروگرام کے مطابق جب معاشرہ متشکل ہوتا ہے' تو وہ کس قسم کے خوشگوار نتائج باہر لایا کرتا ہے' کس طرح سے ظالموں کی جڑ کٹا کرتی ہے۔ یہی قرآن نے کہا ہے کہ وہ انقلاب آیا تو **فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا** (6:45)۔ اِس طرح اُس قوم کی جڑ کٹ گئی جو دوسروں کے حقوق کو غصب کرکے' انسانیت پر ظلم اور زیادتی کرتی تھی۔ عزیزانِ من! اس انقلاب سے ظالم قوم کی جڑ کٹ گئی اور اسکے بعد کہا کہ **وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (6:45)۔ جب ان کی تباہی سے نظامِ ربوبیت کی راہ میں حائل ہونے والے موانع دُور ہو جاتے ہیں تو وہ نظام دنیا کے لیے وجۂ ہزار حمد و ستائش بن جاتا ہے۔ یہ ہے **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ** ۔ ''اک ساڈا الحمدللہ ہونداا ے''[1] عزیزانِ من! خدا کے احکامات پر عمل کرنے سے ایسے نظر آتا ہے جیسے وہ خود بے اختیار کہہ رہا ہے کہ ظالموں کی جڑ کٹ گئی۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ کسی کی جڑ کٹنے پہ الحمدللہ کہنا کوئی اچھی بات نہیں' انہیں اس پر اعتراض ہوتا ہے' مگر پتہ نہیں ہے' جو اقبالؒ (1938-1877) نے کہا ہے کہ: ؎

مرگِ او اہلِ جہاں را زندگی است [2]

تاریکی کے ختم ہونے پر ہی روشنی کا ظہور ہوتا ہے

عزیزانِ من! ایک ظالم کی موت ہزاروں مظلوموں کی زندگی کا باعث بنتی ہے۔ یہ الحمدللہ اس ظالم کی جڑ کٹنے پہ نہیں تھا۔ وہ جو ہزاروں انسانوں کو اس کی وجہ سے زندگی ملتی تھی یہ الحمدللہ اس کی وجہ سے تھا۔ گویا کہا کہ ان کی جڑ کٹ گئی تو مظلوموں کے ہاں سے یہ غلغلہ بلند ہوا ہے: الحمدللہ۔ یہ ہے اصل بات۔ بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ کہا کہ یہ سب کچھ اسے موسیٰ علیہ السلام! اس لیے ہوگا کہ ہم تمہیں اپنی بڑی نشانیاں دکھائیں گے کہ ہمارا انقلاب کیا کچھ کیا کرتا ہے۔ بات میں سے تو بات نکلے گی۔ یہ تصریف آیات ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کی ابتدا ہی میں کہا کہ **سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ** (17:1)۔ (مخالفین کی ریشہ دوانیوں میں آخری اسکیم یہ تھی کہ رسول کو چپکے سے قتل کر دیا جائے لیکن) خدا کی اسکیمیں اتنی بلند و برتر ہیں کہ وہ ان کے قیاس و گمان میں بھی نہیں آسکتیں۔ چنانچہ وہ اپنی اسکیم کے مطابق اپنے بندے کو راتوں رات بیت المکرّم (مکہ) سے نکال کر (مدینہ) کی کشادہ سرزمین کی طرف لے گیا تاکہ اس دُور دراز مقام میں جا کر نظامِ خداوندی کی تشکیل کرے۔ ہم نے اس مقام

---

[1] ایک ہمارا بھی الحمدللہ ہوتا ہے جو اس سے قطعاً مختلف ہے۔

[2] ایک ظالم کی موت ہزاروں مظلوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

اوراس کے گردوپیش کو بڑا بابرکت بنایا ہے' اس کی فضا اس آسمانی انقلاب کے لیے بڑی سازگار ہے۔ عزیزانِ من! یہ ایک جلیل انقلاب آفریں پروگرام کی انتہائی کڑی ہے۔ عام ترجمے کے اعتبار سے اس کے معنی تو ہمارے ہاں یہ ہیں کہ اس میں معراج شریف کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو راتوں رات مکے سے بیت المقدس لے گیا تو اس آیت کو معراج کی اول کڑی گنا جاتا ہے۔ یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ کاہے کے لیے ہم نے یہ کیا؟ کہا: لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا (17:1)۔ تاکہ ہم اسے دکھائیں کہ ہمارے قوانین و احکام کس قسم کا انقلاب پیدا کیا کرتے ہیں' اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو (20:23) میں حضرت موسیٰؑ سے کہے گئے تھے' جس میں کہا گیا تھا کہ یہ احکام تجھے اس لیے دیئے گئے ہیں کہ تجھے دکھادیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب عظیم رونما ہوجاتا ہے۔

جسے ہم معراج شریف کہتے ہیں دراصل یہ ہجرت کا بیان ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے مروجہ عقیدے کی رو سے معراج شریف کیا ہے؟ جب پوچھیے تو کہتے ہیں کہ صاحب! قرآن نے اِسے اٰیٰتِنَا کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہاں اپنی آیات (نشانیاں) دکھائی تھیں' اور اِسی سورۃ کی اگلی ہی آیت میں ہے کہ وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ (17:2)۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی طرح ضابطۂ ہدایت عطا کیا تھا یعنی اسی طرح ہے جیسے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی اور لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى (20:23)۔ اسے اٰیٰت کبریٰ دکھائی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو معراج میں نہیں دکھائی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر نبی کے لیے ایک مقامِ ہجرت آتا ہے۔ وہ اِس فضا سے جہاں اِس نظام کا قیام مشکل ہوتا ہے' وہ اُس فضا کی طرف چلا جاتا ہے جہاں یہ نظام آسانی سے قائم ہوجاتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو بھی بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے جانا پڑا تھا۔ وہ ہجرت کر کے سینا میں آئے تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ ہجرت کی آیت ہے۔

70 ہجری سے پہلے دنیا بھر کے اندر کوئی بھی مسجد' مسجد اقصیٰ کے نام پر موجود نہ تھی

عزیزانِ من! (17:1) میں کہا تھا کہ کس قدر دُور نگہی ہے تیرے خدا کی (سبحان اللہ) کہ وہ اپنے بندے کو ایک رات مکے سے مسجدِ اقصیٰ ❶ لے گیا تھا۔ جس مسجد کا نام مسجدِ اقصیٰ رکھا ہوا ہے' اس زمانے میں کہیں بھی کوئی مسجدِ اقصیٰ دنیا میں نہیں تھی' کسی مسجد کا نام اقصیٰ تھا ہی نہیں۔ اب بھی جو مسجدِ اقصیٰ ہے' اس کے اوپر کتبہ لگا ہوا ہے کہ یہ مسجد بنی امیہ 132-41ھ بمطابق 661-750A.D کے عہد میں عبدالملک ❷ کے زمانے 86-65ھ بمطابق 684-705A.D میں بنی تھی۔ اس پہ سن تعمیر بھی لکھا ہوا ہے۔ بہرحال یہ بات تو دوسری آ گئی۔ یہاں کہا یہ تھا کہ ''لے گیا وہ خدا بندے کو مکے سے مدینے کی طرف'' سوال یہ ہے کہ خدا کاہے کے لیے لے گیا تھا؟

---

❶ ''مدینہ طیبہ کے ناموں میں سے ایک نام اس کا ''مسجد اقصیٰ'' بھی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے مولانا عنایت اللہ اثری' وزیر آبادی: حصول تیسیر البیان (علیٰ) اصول تفسیر القرآن' گجرات' 1955' ص۔ 121۔

❷ Rauf, Abdul Dr. Illustrated History of Islam, Ferozsons (Pvt) Ltd, Lahore, 1994, pp 53 and 56.

لِنُرِيَهٗ مِنۡ اٰيٰتِنَا (17:1)۔تا کہ دکھائیں کہ وہی انقلاب جو اندر اندر اس وقت تک پک رہا تھا' جس کے لیے یہاں تیاریاں ہو رہی تھیں' وہ (لِنُرِيَهٗ) آنکھوں سے نظر آ جائے اور اس کے بعد کتابِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے اور یہی آیاتِ کبریٰ ہیں۔اس کا ذکر ہے۔لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى (20:23)۔یہ احکام تجھے اس لیے دیئے ہیں تا کہ تجھے دکھا دیں کہ ان کے ذریعے کتنا بڑا انقلاب عظیم برپا ہو جاتا ہے۔اسی لیے یہاں کہا ہے کہ جاؤ' وہاں ہم تمہیں ہماری عظیم آیات دکھائیں۔یہ وہی لِنُرِيَهٗ کا لفظ وہاں ہے۔اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں۔عزیزانِ من! آپ لفظ بہ لفظ دیکھیے کہ قرآن کس طرح یہ رویت [1] دہراتا ہے۔یہ آنکھوں سے دیکھنے کی ہیں۔یہ جیسے رویتِ ہلال کہتے ہیں' یہ وہی لفظ ہے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔قانون تو صرف سمجھا جاتا ہے۔جب اس پہ عمل کیا جاتا ہے تو اس کے نتائج محسوس طور پہ سامنے آتے ہیں۔اس کو رویت کہتے ہیں' ورنہ پہلی چیز تفہیم کی ہوتی ہے۔یہاں کہا تھا کہ ہم اپنی محسوس نشانیاں دکھائیں۔یہ کچھ کہنے کے بعد پھر دہرایا کہ ہاں! اے موسیٰ علیہ السلام! سب کچھ واضح ہو گیا' پروگرام بھی واضح ہو گیا' ہدایات بھی مل گئیں' مقصد بھی بتا دیا۔لہٰذا اب اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى (20:24)۔تم فرعون کی طرف جاؤ۔وہ اپنے ظلم و استبداد میں بہت ہی زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی بات آ گئی کہ جاؤ' فرعون کی طرف کیونکہ اِنَّهٗ طَغٰى (20:24)۔وہ سرکشی میں حدود فراموش ہو گیا ہے۔اسے ساحل فراموش کہتے ہیں۔طغیانی کا لفظ اسی طغٰی لفظ سے ہے۔کیا بات ہے یہ!

نبوت کا مقصد اقتدار کو ساحلوں کے اندر پابند کرنا ہوتا ہے

قوت کا ساحلوں کے اندر رہنا' قوت کی برائی نہیں ہے۔قوت کے ساحل فراموش ہو جانے کا نام طغیانی یا سرکشی ہے۔اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جاتے ہی پہلی بات یہ نہ کہہ دینا کہ ''ڈبو دونگا۔'' بات آرام سے کرنا اور اسے کہنا کہ بابا! اپنی قوتوں اور اقتدار کو ساحلوں کے اندر رکھو۔میں قوت و اقتدار چھیننے کے لیے نہیں آیا۔پہلے اس سے یہ بات کہنا۔شاید یہ بات اُس کی سمجھ میں آ جائے کہ انبیاء اقتدار چھین کر اپنے ہاتھوں میں لینے کے لیے نہیں آتے؛ یہ ساحل فراموش اقتدار کو' جو کسی کے ہاتھوں سے طَغٰی ہو جائے' ساحلوں کا پابند بنانے کے لیے آتے ہیں۔اب جانے سے پہلے انہوں نے اپنی اس مہم کی کڑیوں پر نگہ بازگشت ڈالی۔کہا کہ ''میں تیار ہوں' دو ایک درخواستیں ہیں' وہ بھی قبول ہو جائیں تو ٹھیک ہے۔'' ندائے غیب نے کہا کہ کہیے۔ قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ (20:25)۔اُس نے عرض کیا کہ اے میرے نشو و نما دینے والے! (یہ مہم بڑی سخت ہے اس لیے تُو) میرے سینے میں وسعت اور کشادہ عطا کر دے۔عزیزانِ من! بڑی عظیم چیز ہے۔پہلی ہی چیز ایک قائدِ انقلاب کے لیے شرحِ صدر ہونا چاہیے۔شرحِ صدر کے عجیب معنی ہیں۔عربی زبان کے اعتبار سے اس کا ترجمہ سینے کی کشادہ ہو جائے گا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کشادہ کیا ہوتی ہے؟

---

[1] رویت۔(رُویَت' رَوِیت) عربی۔اسم' مونث) دیدار' نظارہ۔

تنگ نظری کا مفہوم اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ تنگ نظری کے مقابلے میں کشادہ ظرفی آتا ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ کتنے ہی بڑے بڑے مقابلوں کے بعد یہ نظر آجاتا ہے کہ آخر کار اس مخالف یا اس دشمن کی گردن پہ ہاتھ آجائے گا۔ اس وقت تنگ نظری یہ ہوگی کہ وہاں ذاتی انتقام لینا شروع کر دیا جائے: ''آیاناں قابو تیری ایسی تیسی۔''[1] اس کے اعمال کی سزا نہ دی جائے بلکہ اس سے شکتی[2] اور ذاتی غصہ ورنجش والی چیزیں آجائیں۔ یہ تنگ نظری ہو جائے گی۔ وسعتِ نگاہ کا تقاضا یہ ہوگا کہ اگر ان میں ہی صلاحیت ہے تو وہ اس کی قوت، شکتی، سرکشی، اقتدار کو ساحلوں کے اندر گھیر لیں۔ اِسی لیے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! ٹھیک ہے یہ کچھ تم بھی کرو۔ یہی تمہاری کشادہ ظرفی ہوگی۔

شرحِ صدر کا مفہوم

شرحِ صدر کا مفہوم اس واقع سے سمجھیے۔ فتح مکہ کے وقت قریش کے سارے سردار پابجولاں سامنے کھڑے تھے۔ یہ بڑی عظیم چیز تھی کہ اتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ ان پابجولاں سرداروں نے یہ پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا ہے کہ کہو: تمہارے ساتھ اب کس قسم کا سلوک کیا جائے؟ یہ عرب تھے۔ ان کے ہاں بھی اہمیت غیرت تھی۔ کہا: ٹھیک ہے جیسا کہ ایک شریف دشمن دوسرے دشمن سے کیا کرتا ہے۔ ان کے ہاں تو اس کا بدلہ قصاص تھا، ان کے ہاں یہ سارا کچھ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم نے میرے پیغام کی صداقتوں کے متعلق کیا سوچا؟ انہوں نے کہا: وہ تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ کہا: جب یہ صورت ہے تو اب: **لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ** (12:92)۔ اب تم پر کوئی سرزنش نہیں، اب تم سے کوئی مواخذہ نہیں، اسے شرحِ صدر ہونا کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ شرحِ صدر ہوتا ہے: ''مصائب، مشکلات اور مزاحمات کا نہایت پامردی، ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کرنا، معاملات کا نہایت اچھی طرح سے سمجھ لینا۔'' یہ تمام چیزیں شرحِ صدر کے اندر آجائیں گی۔ اور یہی وہ عظیم چیز ہے جس سے اتنے بڑے انقلاب لانے والے رسولوں اور انقلاب لانے والی ہستیوں کو نوازا جاتا ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا کہ **اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ** (94:1)۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم نے تمہارا شرحِ صدر کر دیا، ہم نے تمہیں وحی عطا کی جس سے زندگی کی تمام راہیں روشن ہوگئیں، تمہارے سینے میں اس قدر کشادہ پیدا ہوگئی کہ جو مہم پہلے ناقابلِ تسخیر نظر آتی تھی، اس کا سر کرنا ممکن دکھائی دینے لگا تھا، تمہاری ہمت بلند اور حوصلے وسیع ہوگئے۔

---

[1] اب آ گیا نا ہمارے قبضے میں۔ اب دیکھ، میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔

[2] طاقت، بل، زور۔

ہمارے ہاں روایت کے تحت شرحِ صدر کے لفظ کا مفہوم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں روایت سے بات آئی ہے کہ پھر جبریل آئے تھے' انہوں نے حضور ﷺ کا سینہ چاک کیا تھا' پھر قلب کو چاک کیا' پھر اس کو زمزم سے دھویا' پھر سی دیا۔ بہرحال اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (94:1)۔ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ شرحِ صدر کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ (94:2-3)۔ (پھر اس پروگرام کے ابتدائی مراحل میں سختیٔ منزل اور تنہائی سفر کے احساس) اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ خدا نے تمہارے رفقاء کی ایک جماعت پیدا کر دی اور اس طرح تمہارا وہ بوجھ بھی ہلکا ہو گیا۔ تمہاری ذمہ داریوں کا وہ بوجھ جس سے تمہاری کمر ٹوٹ رہی تھی تمہارے اوپر سے اٹھا دیا۔ عزیزانِ من! شرحِ صدر کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن ذمہ داریوں کے بوجھ سے انسان دبا جا رہا ہوتا ہے' اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ یوں آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش

عزیزانِ من! حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کہا تھا: قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (20:25)۔ اُس نے عرض کیا کہ اے میرے نشو ونما دینے والے! (یہ مہم بڑی سخت ہے۔ اس کے لیے تُو) میرے سینے میں وسعت اور کشادہ عطا کر دے تا کہ میں مصائب' مشکلات اور مزاحمات کا نہایت پامردی' ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کروں' معاملات کو اچھی طرح سمجھوں۔ اس طرح اے میرے پروردگار! پہلی چیز یہ چاہتا ہوں کہ تنگ نظری نہ رہے' مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور استطاعت پیدا ہو جائے' کشادہ جبینی سے میں ان چیزوں کو سر پہ لوں' ان کو بیگار نہ سمجھوں' مجھ میں یہ شرحِ صدر ہونی چاہیے۔ پھر کہا کہ وَ یَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ (20:26)۔ اور جو جو دشواریاں میری راہ میں آئیں' انہیں مجھ پر آسان کر دے۔ وہاں (94:1) میں کہا تھا کہ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (94:1)۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ہم نے تمہارا شرحِ صدر کر دیا۔ آگے اسی سورۃ میں کہا کہ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (94:5-6)۔ مکہ کی زندگی میں ابتدائی مشکلات کے بعد ہجرت کا پروگرام سامنے آیا۔ اس سے ان مشکلات میں آسانیاں پیدا ہو گئیں جن کا سامنا مکی زندگی میں کرنا پڑا تھا۔ اب مخالفین نے جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس سے نئی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان مشکلات کے بعد بھی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

زندگی کا اصول یہ ہے کہ جو شخص مشکلات کو ہمت اور استقامت سے برداشت کر لیتا ہے اس کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کہا: مشکلات آئیں گی' گھبرانا نہیں۔ ہر مشکل کے بعد منزل آسان ہو جائے گی۔ پھر مشکلات آئیں گی' پروگرام بڑا لمبا ہے' ایک ہی بار سر نہیں ہو جائے گا لیکن یقین رکھو کہ ہر مشکل کے بعد اگر تم نے شرحِ صدر سے اس کا مقابلہ کر لیا تو اس کے بعد پھر یسر (آسانی) پیدا

ہوجائے گا' آسانیاں آجائیں گی۔ وہی بات جو وہاں ہے' یہی بات یہاں ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا: وَ يَسِّرۡ لِيۤ اَمۡرِيۡ (20:26)۔ اور جو جو دشواریاں میری راہ میں آئیں' انہیں مجھ پر آسان کردے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ جو معاملہ میرے سامنے ہے' یہ جو پروگرام میرے سامنے ہے' ان میں آسانیاں پیدا کردے۔ یہ خواہشات' یہ آرزوئیں' فطری ہیں۔ ان کے لیے بڑی عظیم مہم تھی جس کے لیے جارہے تھے۔ اس کے بعد یہ کہا کہ میں وہاں جارہا ہوں' جہاں مجھے معلوم ہے کہ ان کے ہاں کے احبار ورہبان' خود ان کے ہاں کے کابینہ کے وزرا سے باتیں کرنا ہونگی۔ یہاں عزیزانِ من! ایک چیز تو یہ تھی کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے قریباً بارہ برس' ہاں' کم از کم بارہ برس' تو اس دیہاتی زندگی میں بسر کیے' ''شبانی'' ❶ میں بسر کیے' گڈریئے کی حیثیت سے رہے۔ مدین کے بیابانوں میں بدویت کی زندگی بسر کرنے سے زبان میں وہ طلاقت نہیں رہی ہوگی جو ایسے مواقع پر حسن خطابت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ ''پنڈاں اچ رہے' زمینداراں اچ رہے'' ❷ ٹھیک ہے یوں رہنے سے بھی' مجازی طور پہ بھی' انسان کی زبان میں کچھ فرق آجاتا ہے' اس کے لیے بھی آپ نے یہ کہا کہ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِيۡ يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِيۡ (20:27-28)۔ اور میری زبان میں ایسی طلاقت اور روانی پیدا کردے (کہ میں تیرے پیغامات کو بطریق احسن فریق مقابل تک پہنچا سکوں)۔ اور میری بات ان کی سمجھ میں آجائے۔ اور سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔ عزیزانِ من! یہ ان کی خدا سے عرض گزاشت تھی کہ مجھ میں طلاقتِ بیان پیدا ہوجائے۔ یہ وہی ہے جسے گرہ کھل جائے کہتے ہیں۔ طلاقت کے معنی ہی گرہ کھلنا ہوتا ہے۔ یہیں سے طلاق ہے یعنی گرہ کھل جائے۔

ہمارے مفسرین کا بیان: ہم نے قرآن کو چیستاں بنادیا ہے

میں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو یہ بات زیبِ داستاں کے لیے آتی ہے اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ہاں پرورش پائی تھی۔ ایک دن فرعون انہیں (حضرت موسیٰ علیہ السلام کو) گود میں کھلا رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے انہوں نے فرعون کی داڑھی پکڑ لی۔ اُسے غصہ آگیا۔ اس نے کہا کہ دیکھو' یہ میری اس قدر بے عزتی کررہا ہے' میری داڑھی نوچ رہا ہے۔ ہے یہ ٹھیک' یہ بنی اسرائیل کا بچہ ہے۔ بڑا غصہ آیا۔ اس نے کہا کہ ٹکڑے ٹکڑے کردو۔ وزیر باتدبیر نے عرض کیا کہ حضور! جان کی امان پاؤں تو کہوں۔ (یہ ہمارے ہاں داستان امیر حمزہ ہوتی ہے) تو اس نے کہا کہ یہ بچہ ہے' یہ نفع نقصان جانتا نہیں ہے' اِسے ابھی اس کا امتیاز نہیں ہے۔ کہنے لگے: نہیں' اِسے امتیاز ہے' یہ بچہ نہیں ہے' جان بوجھ کر کیا ہے۔ اس نے کہا کہ

---

❶ غالباً یہ اشارہ استعارۃً مفکر اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اس شعر کی طرف ہے:

اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے — (اقبالؒ)

❷ دیہاتوں میں رہے' زمینداروں میں رہے' (رہی تو دیہاتی ہی زندگی)۔

نہیں جناب ! اسے ابھی یہ امتیاز نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، آگ کا ایک انگارہ ایک طرف رکھیے اور دوسری طرف مصری کی ڈلی رکھیے۔ پھر دیکھیے کہ آیا یہ دونوں میں فرق کرتا ہے۔ انہوں نے ایک طرف آگ کا انگارہ اور دوسری طرف مصری کی ایک ڈلی (کوزہ) رکھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے وہ انگارہ لیا اور منہ میں ڈال لیا۔ اسی وقت آپ کی زبان جل گئی۔ اس سے پھر آگے بات چلی کہ آپ کو لکنت ہو گئی۔

عزیزانِ من! یہ مفہوم لینے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تصریفِ آیات سے کام نہیں لیا۔ اس آیت کے بعد ہے کہ **وَاجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ هٰرُوۡنَ اَخِی** (20:29-30)۔ میرے اہل خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرے ساتھ کر دے تا کہ وہ میرا بوجھ بٹالے۔ حضرتِ ہارون علیہ السلام کو وہ ساتھ لینے کے لیے کہتے تھے اور کہا یہ تھا کہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ **هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا** (28:34)۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہے، وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے تو گویا یہاں بات آپس میں فصیح البیان ہونے کی نسبت تھی۔ اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ **وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ** (20:27-28)۔ میری زبان میں طلاقت اور روانی پیدا کر دے تا کہ میری بات آسانی سے ان کی سمجھ میں آ جائے۔ میں نے کہا ہے کہ یہاں اگلے ہی الفاظ میں اس کی وضاحت کر دی: **وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً** (20:27)۔ طلاقت اور روانی پیدا کر دے۔ اسے میں نے طلاقت کہا ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ طلاقت کاہے کے لیے تھی؟ **یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ** (20:28)۔ میری بات آسانی سے ان کی سمجھ میں آ جائے۔ اس لیے کہا تھا کہ میرے ساتھ میرے بھائی کو بھی بھیج دو کیونکہ **هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ** (28:34)۔ وہ مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے۔ وہ وہیں رہا ہے، وہیں پلا ہے، وہیں کا ہے، وہ ابھی زبان کے طرق و اسالیب، فصاحت، وضاحت اور روانی جانتا ہے تو اسے میرے ساتھ کر دے تو گویا اس کے یہ معنی ہیں۔

پروگرام کی تکمیل کے لیے بنیادی خصوصیات

یہ چیز بھی ہمیں پتہ چلی کہ جو یہ پروگرام دیتا ہے اس کی جو کڑیاں بیان کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جس شخص کو بھی اس قسم کے پروگرام ہاتھ میں لینے ہوں گے، وہ دیکھ لے کہ یہ خصوصیات اس کے اندر ہیں: یہ مرحلہ ہونا چاہیے، شرحِ صدر ہونی چاہیے، مشکلات سے مقابلہ کرنے کی ہمت ہونی چاہیے، استقامت ہونی چاہیے، معاملات کے سمجھنے کے لیے بھی شرحِ صدر ہونی چاہیے، خندہ جبینی ہونی چاہیے، طلاقتِ زبان بھی ہونی چاہیے، طلاقتِ بیان بھی ہونی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ صاحب! **وَاجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ. هٰرُوۡنَ اَخِی . اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ. وَاَشۡرِکۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ** (20:29-32)۔ میرے اہل خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو بطور وزیر یعنی میرا بوجھ بٹانے والا بنا دے۔ اس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی۔ وہ اس عظیم مہم میں میرا شریک کار رہے گا۔ وزیر

کے بنیادی معنی ہیں: بوجھ بٹانے والا ہوتا ہے۔ گو کہ آجکل اس کے مجازی معنی بوجھ لادنے والا ہے۔ مگر عربی مبین میں، وزیر کے معنی ہوتا ہے: بوجھ گھٹانے والا۔ اس لیے کہا کہ اسے بھی میرے ساتھ کر دے۔

اصل رشتہ خیالات کی ہم آہنگی ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ مِنۡ اَهۡلِىۡ (20:29) کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ چونکہ میرا بھائی ہے اس لیے اپنوں میں سے ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی اور عربوں کے ہاں بھی **اهل** کا لفظ، جسے آپ اپنوں میں سے کہتے ہیں، خون کا ہی رشتہ نہیں ہوتا، اس میں ہم آہنگی فکر و نظر ہوتی ہے، پروگرام میں برابر کی شرکت ہوتی ہے۔ خون کا رشتہ تو قرآن نے یونہی کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ یہ اھل کا ہی لفظ ہے جب حضرتِ نوح علیہ السلام نے کہا تھا کہ یا اللہ! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اھل کو نجات دونگا تو میرا بیٹا ڈوب رہا ہے۔ اس سے بڑا میرا اھل اور کونسا ہوسکتا ہے تو جواب ملا تھا کہ اے نوح علیہ السلام! نہیں، لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ (11:46)۔ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، بے شک تیرا بیٹا ہے۔ تیرے اہل میں سے وہی ہو سکتے ہیں جن کے اعمال صالح ہوں۔ اس لیے وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ تُو دیکھتا نہیں ہے کہ اس کے اعمال کیسے ہیں۔

خون کا رشتہ کسی کو اہل نہیں بناتا

عزیزانِ من! خود قرآن نے بتا دیا ہے کہ اہل میں سے کون ہوتا ہے۔ خون کا رشتہ کسی کو اہل میں سے نہیں بناتا، اس پہ تو کسی کو اختیار ہی نہیں ہوتا، ماں باپ کے گھر پہلا لڑکا یہ پیدا ہو گیا اور دوسرا وہ پیدا ہو گیا۔ اس پیدا ہونے پر ان لڑکوں کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس سے کسی نے پوچھا تھا کہ اسے تمہارا بھائی بنا دیں تو کہا کہ یہ رشتہ ہی کیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ معاشرے پر تمدن میں یہ صورت ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے ہوسکتی ہے لیکن وہ اہل میں سے نہیں ہوسکتا۔ تو یہ جو حضرت ہارونؑ کا معاملہ تھا کہ میرے بھائی کو میرے ساتھ کر دے، تو وہاں قرآن نے اسے مِنۡ اَهۡلِىۡ (20:29)۔ کہا ہے حالانکہ یہ پتہ تھا کہ یہ ان کا (حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا) بھائی ہے لیکن کہا یہ کہ نہیں، وہ تو میرا ہم نظر ہے، ہم فکر ہے، ہم عقیدہ ہے، ہماری ایک ہی سوچ ہے۔ قرآن نے حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی تو نبی کہا ہے۔ نبوت میں بھی شریک ہے۔ اس لیے اہل ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ہونے کا کہا کہ اَخِى اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِىۡ (20:30-31)۔ اس کی مدد سے میری قوت مستحکم ہو جائے گی، مضبوط ہو جائے گی۔ ''اک گڈ نال دو جٹ جان جینوں کیندے نیں''،[1] اس قسم کی گاڑی جب پہاڑ پہ چڑھا کرتی تھی، بڑی اونچائی ہوتی تھی تو دو انجن لگاتے تھے، ایک آگے سے ایک پیچھے سے۔ اس لیے کہا کہ اَشۡرِكۡهُ فِىۡۤ اَمۡرِىۡ (20:32)۔ اس

---

[1] جسے ایک گاڑی کو کھینچنے کے لیے ایک کی بجائے دو مل کر زور لگائیں کہتے ہیں۔

عظیم مہم میں اسے میرا شریکِ کار بنادے۔ میرے ساتھ اس کو بٹھا دے' یہاں بات یہ ہے۔ اس پروگرام میں وہ میرا برابر کا شریک ہوگا۔ یہ ساری آرزوئیں' دعائیں مانگنے کے بعد یا اس مہم کے لیے جو ساز و سامان چاہیے تھا اس کی یہ لسٹ پیش کر دی کہ مجھے یہ چیزیں دی جانی چاہئیں۔ او بھئی! کاہے کے لیے تمہیں یہ اتنا کچھ چاہیے؟ آپ بھی منتظر ہونگے' حضرت موسیٰ بھی اس کے بعد منتظر ہونگے کہ ان کی طرف سے کچھ جواب ملے۔ سو پوچھا گیا: کاہے کے لیے یہ کچھ چاہیے؟ تو جواب کے الفاظ ہیں: كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا . وَنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (20:33-34)۔ یوں ہم دونوں مل کر تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہیں گے اور تیرے قانون اور نظام کو غالب بنادینے کے لیے پیش از پیش قدم اٹھا سکیں گے۔ مگر عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو کہتے ہیں کہ ہم تیری تسبیح پھیریں اور تیرا بہت زیادہ ذکر کریں۔ کہتے ہیں کہ یہ سارا کچھ مانگا جارہا ہے' مگر وہاں سے حکم ہورہا ہے کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ (20:24)۔ تم فرعون کی طرف جاؤ۔ اور ہمارے ہاں ہے کہ ''ایتھے نئیں' اے تسبیحاں اوتھے جاکے۔ میں کلا سوا لکھ واری تسبیح کیہہ دینا کہ دانے گنوں' تے اک دے نال ہور ہووے' ادھا ادھا بھار ونڈیا جائے ساڈے تے''❶ یہاں لفظ ہیں: نُسَبِّحَكَ (20:33)۔ یہاں کہتے ہیں کہ ہم تسبیح پھیریں اور پھر (نَذْكُرَكَ) (20:34)۔ الا اللہ الا اللہ کریں' واہ اے کیا خوب ''کلے دی الا اللہ دی آواز تے کچھ جانی نئیں ہیگی' کم از کم دوتے ہوئے۔''❷

تسبیح کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ اگر مزید وقت ہوتا تو میں قرآن سے ان دو الفاظ کو پیش کرتا۔ بیسیوں آیات ہیں جن میں یہ کہا ہوا ہے۔ سبح کے معنی ہیں: ''کسی پروگرام کے حصول کے لیے سرگرداں پھرنا'' پھرنے کے اِسی چکر کے اعتبار سے عرب اسے تسبیح کہتے تھے۔ انہوں نے اس کو کہا تھا کہ وہ اسے سرگرداں پھراتے رہتے ہیں۔ سبح کے معنی ہوتے ہیں: کسی مقصد کے حصول کے لیے پوری پوری قوت صرف کر دینا۔ گھوڑا جب سرپٹ دوڑتا ہے تو اس وقت یہ دونوں پاؤں اٹھا کر دوڑتا ہے تو اس دوڑ کو سبح کہتے ہیں۔ معلوم نہیں' اس کا Technical (تکنیکی) لفظ کیا ہے۔ یہ گھوڑ دوڑ کے اندر ہوتی ہے۔ اس میں وہ پوری قوت صرف کر دیتا ہے۔ عرب اس کو تسبیح کہتے ہیں۔ یہ تیرنے والا' تیراک' تیراکی' جس میں پورا ہاتھ آگے کیا جائے' جسے غالباً Breast Stroke کہتے ہیں' پورا ہاتھ جب آگے پھیلا کر تیرتا ہے تو اسے سبح یا تسبیح کہتے ہیں۔

---

❶ یہ تسبیحاں یہاں نہیں' وہاں جا کر کریں گے۔ میں اکیلا سوا لاکھ دفعہ تسبیح کروں تو آپ کہہ دینا کہ اپنے ہی تسبیح کے دانے گنوں تو دگنے ہو جائیں اس لیے ہمارے ساتھ آدھا آدھا بوجھ تو بٹایا جائے۔

❷ اکیلے کی الا اللہ کی آواز تو وہاں تک پہنچتی ہی نہیں ہے۔ کم از کم دو ہوتے تو یہ آواز وہاں' عرشِ معلیٰ تک ضرور جاتی۔

حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ

عزیزانِ من! حضرتِ یونس علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ وہ وہاں گئے۔ انہیں وہیل مچھلی نے اپنے منہ میں پکڑ لیا۔ وہاں یہ چیز ہے کہ اگر وہ مُسَبِّحِیْنَ (37:143)۔ میں سے نہ ہوتا تو وہ اسے نگل جاتی۔ لیکن ہمارے ہاں یہ ہے کہ اگر وہ وہاں تسبیح نہ پڑھتا تو وہ اسے کھا جاتی۔ وہاں(37:143) میں کہا یہ ہے کہ اگر وہ تیرنا نہ جانتا تو وہ ڈوب گیا تھا۔ اسی طرح یہاں آیا ہے کہ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا (20:33)۔ ہم دونوں مل کر تیرے پروگرام کی تکمیل میں بہت ہی زیادہ سرگرمِ عمل رہیں گے۔ اس لیے اب یہ ہے کہ ہم دونوں اس پروگرام کی تکمیل کے لیے پوری پوری توانائیاں صرف کریں اور پوری پوری سرگردانی کریں۔ عزیزانِ من! یہ مرحلہ بڑا لمبا ہے۔

ذکر کا مفہوم

اب سوال یہ ہے کہ پوری پوری توانائیاں صرف کرنیکے بعد کیا کریں؟ کہا کہ نَذْکُرَکَ کَثِیْرًا (20:33)۔ ہم دونوں تیرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لیے پیش از پیش قدم اٹھا سکیں۔ عزیزانِ من! ذکر کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی کے قانون کو بلند کرنا''۔ ارے اگر اس کا لفظی ترجمہ ''اس کا نام لینا ہی'' کرنا ہے' تو اردو محاورے میں تو کرو کہ ''ہم تیرے نام کا ڈنکا بجا سکیں۔'' چلو اتنا ہی کہہ دو' تو بھی بات قریب کی ہو جائے گی: ''اس کے نام کا ڈنکا بجانا''۔ وہاں جا کے جسے قرآن نے بدر کے میدان میں' بدر کی جنگ کا مقصد بتایا کہ جو کلمۃ الکفر ہے وہ پست ہو جائے اور جو کلمۃ اللہ ہے یعنی ہماری بات ہے وہ اونچی چلی جائے۔ یہ ہے نَذْکُرَکَ کا ترجمہ۔ کہا: تا کہ وہاں جا کے تیری بات کو اونچا کریں اور اگلی بات یہ ہے کہ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا (20:35)۔ تُو ہم دونوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے اور جانتا ہے کہ ہم دونوں مل کر کس طرح اس مہم کو سر کریں گے۔ ٹھیک ہے ہم تو یہ کچھ کریں گے۔ تیری ہدایات تو ہماری طرف آ گئیں۔ یہ ایک بات ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تُو ہماری ہر روش پہ' ہماری ہر چال پہ' اپنی نگاہ رکھنا تا کہ ہم کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ ''تکدے رئیں' اج دیاں ماواں نوں تے شاید پتہ ای ناں ہووے۔ ساڈیاں ماواں دی صورت سی۔ چھوٹے ہوندیاں گلی اچ کسے دوکاندار کول وی پیجدے سن ناں سودا لین نوں: جا دہی لے آ' دو پیسیاں دا۔ بچہ ڈرتا تھا' ماں دروازے میں آ جاتی تھی۔ کہتی تھی تُو جا' میں تینوں تکنی آں۔ میں دیکھنی آں تینوں اور بچہ چل پڑتا تھا۔''[1] عزیزانِ من! اس سے اس بچے کو بڑی تقویت ہوتی ہے۔ یہ تھی وہ تقویت

---

[1] دھیان رکھنا' دیکھتے رہنا۔ آج کی ماؤوں کو تو شاید ہمارے ہاں کی ماؤوں کی صورتِ حال کا علم ہی نہ ہو۔ کہتی تھیں کہ جاؤ' دو پیسے (Paisas) کا دہی لے آؤ۔ بچہ جاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ماں دروازے پہ آ کھڑی ہوتی تھی۔ کہتی تھی کہ تم جاؤ' میں تمہارا دھیان رکھے ہوئے ہوں۔ میں تجھے نظروں میں رکھے ہوئے ہوں اور بچہ چل پڑتا تھا۔

جسے کہا تھا کہ ''ہم جا تو رہے ہیں، ہم پہ نگاہ رکھیے گا، ہمیں دیکھتے رہنا، درخواستیں آپ نے دیکھ لیں، دعائیں آپ نے سن لیں۔'' **قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی** (20:36)۔ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! ہم نے تیری مانگ پوری کردی۔ تیری درخواست منظور ہوگئی۔ اب تُو اس پروگرام پر جم کر کھڑا ہو جا اور کسی کی بات کی طرف دھیان مت دے۔ صاف کہہ دیا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تمہاری سب دعائیں منظور کرلیں، یعنی دعائیں منظور ہوگئیں، اس کے بعد اور کیا چاہیے، جو مانگا، کہا: ٹھیک ہے ہم نے تمہیں دے دیا، دعائیں مل گئی منظور ہوگئیں، قبول ہوگئیں۔ پیغمبر مانگنے والا، خدا براہِ راست جواب دے رہا ہے: **اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ** (20:36)۔ جو کچھ تم نے مانگا تھا، جو تمہاری احتیاجات تھیں، وہ ہم نے تمہیں دے دیں، تو اس کے بعد وہ کہتا ہے: سلام علیکم ٹھیک ہے: ''میں جاناں''[1]

اب اگر وہ یہ کہے کہ میرے ذمے تو کچھ رہا ہی نہیں۔ کرنے کی کونسی بات رہی۔ میری دعائیں تو قبول ہوگئیں۔ اب مجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ عزیزانِ من! جی! درس کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ بات قدرے لمبی ہے، اس لیے اسے اگلے درس پہ ہی اٹھا رکھتا ہوں، وہاں پتہ چلے گا کہ خدا کے حضور دعا کی قبولیت کے معنی کیا ہیں۔

ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 35 تک آ گئے، عزیزانِ من! آیت 36 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] میں جا رہا ہوں۔ بس جایا ہی چاہتا ہوں، جا ہی رہا ہوں۔

چوتھا باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 36 تا 52)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا
يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ
لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ڬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ
يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ڛ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ
فُتُوْنًا ڣ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ڏ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ
لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ
قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا
تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ وَلَا
تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ
الْعَذَابَ عَلٰي مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰي كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ
ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿٥١﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿٥٢﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1976 کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 36 سے ہو رہا ہے: (20:36)۔ داستانِ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام مسلسل چلی آ رہی ہے۔ اس وقت ہم اس مقام پہ ہیں جب طور کی چوٹیوں پر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو پہلے پہل وحی سے نوازا گیا۔ کہا گیا کہ تمہیں ہم نے اتنا عرصہ تیار کیا ہے کیونکہ ہمارا ایک کام تھا جس کے لیے تمہیں تیار کیا گیا تھا اور اب تم چونکہ ہمارے پیمانے پہ پورے اتر آئے ہو اس لیے تمہیں وہ پروگرام دیا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اندازہ لگائیے کہ یہ مصر کی محکوم غلام قوم کا ایک فرد ہے۔ بزعمِ خویش مصر سے ایک قتل کے جرم کا مفرور مجرم ہے۔ یہاں وادئ مدین میں بارہ سال تک بکریاں چرا کر اپنا گزارا کرنے والا اب اپنے ساتھیوں کو بال بچوں کو لے کر کہیں کسی دوسرے مقام پہ جا رہا ہے اور راستے میں انہیں نبوت سے سرفراز کیا جاتا ہے

اور کہا یہ جاتا ہے کہ پروگرام یہ ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے۔ اس کے ہوش ذرا ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے۔ اندازہ لگائیے کہ کسے کہا جا رہا ہے اور کیا پروگرام دیا جا رہا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو کچھ مانگا انہیں مل گیا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ ٹھیک ہے' میرے سپرد یہ فریضہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مرحلہ بہت مشکل ہے۔ مہم بڑی صعوبت انگیز ہے اس لیے میرے ساتھ میرے بھائی کو بھی کر دیجئے' یہ بھی دیجیے اور وہ بھی دیجیے۔ اس کے بعد میں پھر اس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کے لیے دیکھونگا۔ میں نے کہا تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کچھ مانگا ہے تو جواب ملا: قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (20:36)۔ ارشاد ہوا کہ اے موسیٰؑ! ہم نے تیری مانگ پوری کر دی' تیری درخواست پوری ہو گئی۔ آپ سوچیے کہ جواب اتنا ہی نہیں ہے کہ تیری دعا قبول ہو گئی۔ قرآن کریم کے عجیب الفاظ ہیں۔ کہا: اُوْتِيْتَ (20:36)۔ جو کچھ تُو نے مانگا تھا' یوں سمجھو کہ تجھے مل گیا۔ جو تمہارا تقاضا تھا' وہ ہم نے تجھے دے دیا۔ بلکہ سُؤْلَكَ (20:36)۔ جن جن چیزوں کی تمہیں احتیاج تھی اور تم نے ان کا تقاضا کیا تھا یا درخواست کی تھی اُوْتِيْتَ ہم نے تمہیں دے دیا۔ میں نے کہا تھا کہ مانگنے والا ایک نبی ہے' دینے والا خدا ہے' الفاظ یہ ہیں کہ ہم نے دیدیا۔ اب اے موسیٰ! چلو۔ اندازہ لگائیے کہ اگر یہاں حضرت صاحب سے اور حضرت صاحب بھی وہ جو مجذوب ہوتے ہیں' کے پاس بھی جا کے کوئی فرمائش کرو کہ دعا کرو تو وہ پچاس پچاس گالیاں دیتا ہے اور اس کے بعد ڈنڈا مار کے کہتا ہے: چل یہاں سے بھاگ جا' چل بھاگ جا۔ تو وہ آ کے جشن مناتا ہے' نیاز بانٹتا ہے کہ صاحب! بس بات ہو گئی' کام بن گیا' تو اب سوچیے کہ یہ مانگنے والا ہے' دینے والا خدا ہے' وہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے تمہیں دے دیا' تو راوی عیش لکھتا ہے کہ اس کے بعد تو پھر کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن نہیں' ایسا نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا کہ یہیں سے تو پتہ چلتا ہے کہ قبولیتِ دعا کے بعد پھر یہ سارے مراحل خود بخود طے نہیں ہو جاتے۔ دوسرے مقام پہ بھی یہ بات آئی ہے۔ سورۃ یونس (10:89) میں بھی یہی سلسلہ کلام اسی طرح سے چلا آ رہا تھا تو وہاں یہ تھا کہ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (10:89)۔ اللہ نے کہا کہ ہم نے تم دونوں بھائیوں کی بات سن لی اور اُسے قبول بھی کر لیا۔ لیکن دعا کے قبول ہونے کے بعد اگلا قدم بڑا ہی سخت ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ اگلا قدم کیا ہے؟

دعا کے قبول ہونے کے بعد کا اصل قدم

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ خدا حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم نے مانگا تھا ہم نے وہ بات قبول کر لی' وہ تمام مال و اسباب دے دیا۔ وہاں (20:36) میں تھا: بس یوں سمجھو کہ تجھے مل گیا۔ اب یہاں (10:89) میں یہ کہنے کے بعد سنیئے' کیا کہا۔ کہا یہ کہ فَاسْتَقِيْمَا (10:89)۔ اب ثابت قدمی سے جمے رہنا' اپنے پروگرام میں پوری ثابت قدمی دکھانا۔ جی' قبولیت دعا کے بعد یہ کچھ

ضرورت ہوتی ہے' پھر کامیابی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ یوں سمجھو تمہیں وہ مل گیا۔ لیکن اب شرط یہ ہے کہ اس پروگرام میں ثابت قدمی دکھانا۔

منزل کا ساتھی نہ تو بصیرت سے خالی ہو اور نہ ہی مفاد پرست

اب اس کے بعد ایک لفظ میں اگلی ساری بات کہہ دی کہ اب یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مل گیا ہے تو اب مجھے تو کچھ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ کہا کہ فَاسْتَقِيمَا وَلَا تَتَّبِعَآنِّ سَبِيلَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (10:89)۔ لہٰذا تم اپنے پروگرام میں ثابت قدمی دکھاؤ اور جلد بازی میں ان لوگوں کا طریق نہ اختیار کر لو جو ہمارے قوانین اور ان کے نتیجہ خیز ہونے کے انداز سے واقف نہیں ہوتے۔ اور وہاں (20:36) میں یہ کہا تھا کہ اس شخص کو ساتھ نہ لینا جس کے سامنے اپنے ہی مفاد ہوں اور یہاں (10:89) میں کہا کہ ان لوگوں کے راستے پہ نہ چلنا جو بات نہیں سمجھتے' علم نہیں رکھتے' حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ راستہ ایک ہے جس پہ چلنا ہے اور وہ راستہ ہے علم و بصیرت کی بنیاد پہ چلنا اور اس پہ صرف چلنا ہی نہیں ہے بلکہ فَاسْتَقِيمَا (10:89)۔ استقامت سے' استقلال سے' ثابت قدمی سے' اس راستے پر جمے رہنا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! ایک رسول دعا مانگنے والا ہے' خدا اس دعا کی قبولیت کی ضمانت دینے والا ہے' وہ کہنے والا ہے کہ مل تجھے گیا ہے جو تو نے مانگا تھا۔ اس کے بعد اسے کہا یہ جا رہا ہے کہ اب اس پر جم کے کھڑے ہو جانا' کہیں تمہارے پاؤں میں لغزش نہ آ جائے' یاد رکھو۔ یہیں آگے چل کے' چار ہی آیتیں آگے یعنی 42 آیت میں یہ کہا ہے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ (20:42)۔ اب تم اور تمہارا بھائی' دونوں' ہمارے قوانین کو لے کر فرعون کی طرف جاؤ۔ یعنی ہمارے یہ احکام' ہمارے یہ قوانین' لے کر فرعون کی طرف جاؤ۔ آپ کو یاد ہے کہ پچھلی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میرے بھائی کو ساتھ دیدے' یہ چیز پیدا کر دے' وہ سامان مہیا کر دے تا کہ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (20:33-34)۔ ہم دونوں مل کر تیرے تفویض کردہ پروگرام کی تکمیل میں بہت زیادہ سرگرم عمل رہیں اور تیرے قانون اور نظام کو غالب کرنے کے لیے بیش از بیش قدم اٹھا سکیں۔ تو میں نے پچھلی دفعہ بتایا تھا کہ اس بات سے انہوں نے یہ بات بنا لی کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم وہاں تیری تسبیح کریں اور تیرا ذکر کریں' اس لیے فرعون کی طرف جانے کے لیے یہ سارے سامان کی ضرورت تھی۔ وہاں میں نے کہا تھا کہ ان دونوں بھائیوں نے کہا یہ تھا کہ اس سارے سامان کی ضرورت ہے تا کہ اس پروگرام کی تکمیل اور حصول میں ہم پوری پوری توانائیاں صرف کر دیں اور وہاں تیرے نام کا ڈنکا بجا دیں' تیرے نام کا بول بالا کر دیں۔ یہ تھا نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا (20:34)۔ کہ تیرے نام کا ڈنکا بجا دیں۔ تو یہاں یہ سارا کچھ دینے کے بعد کہا کہ لو دیکھو! اب: وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ (20:42)۔ میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔ یہاں بھی وہی لفظ آیا ہے کہ اس میں کہیں سستی نہ کرنا' کہیں تھک کے نہ بیٹھ جانا۔

دیکھنا' اس زادِ راہ کے مل جانے کے بعد کہیں سستی نہ کرنا

عزیزانِ من! قبولیتِ دعا کے بعد' یہ کہنے کے بعد کہ ''تمہیں مل گیا ہے جو کچھ تم نے مانگا ہے'' کہا کہ اب اس راستے پہ جم کے کھڑے ہونا اور یہ جو تم نے کہا ہے کہ ہم وہاں تیرا نام بلند کریں' تیرے نام کا ڈنکا بجائیں' ہم تیرے قوانین کو اور تیرے پروگرام کو غالب کریں تو اس کے لیے وَ لَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي (20:42)۔ اب دیکھنا ذرا سی سستی بھی نہ ہونے پائے۔ یہ ہے قبولیتِ دعا کے بعد کیفیت! یہ تو بس یونہی ہے کہ جیسے راستے میں کہیں کسی کو سامانِ سفر کی ضرورت ہوئی اُسے وہ مہیا کر دیا جائے اور اس کے بعد یہ نہیں ہوتا کہ وہ منزل پہ پہنچ جائے گا۔ اسے کہا جائے گا کہ اب سفر تو تم نے کرنا ہے۔ یہ سامانِ سفر' یہ زادِ راہ' یہ چیزیں' ہم نے تمہیں دیدی ہیں' اب بسم اللہ کرو اور چلو' چلنا تو تم نے خود ہی ہے۔ دیکھنا' اس راستے پہ جم کے رہنا' راستے میں کہیں تھک نہ جانا۔ خدا کی طرف سے قبولیتِ دعا کے معنی کہ جو تم نے مانگا ہے وہ تمہیں دیدیا ہے تو وہ دیدیا اتنا ہی ہوتا ہے جیسا کہ میں نے مثال کے طور پہ کہا ہے کہ کسی چلنے والے مسافر کو کچھ سامانِ سفر دیدیا جائے' چلنا تو اس نے خود ہی ہوتا ہے۔ دعائیں مانگ مانگ کے' عزیزانِ من! منزل پہ نہیں پہنچا جا سکتا۔ جو جتنا زیادہ مصیبت میں ہوتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ دعائیں مانگتا ہے۔ ہم سے زیادہ مصیبت میں کون ہے' ہم سے مراد پوری امتِ مسلمہ ہے جو قریب ساٹھ ستر اسی کروڑ کی آبادی کہی جاتی ہے' ان تمام مسلمان مملکتوں کے عین قلب میں اسرائیل کی مملکت ہے۔ یہ ان کے دل میں ایک اتنا سا ناسور ہے۔ اگر یہ جمِ غفیر متحد ہو جائے تو اِس مملکت کو چٹکی میں مسل کے رکھ دے۔ یہ مسلمانوں کا وہ جمِ غفیر ہے جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلا ہے۔ اس کے اندر اسرائیل کا یہ ایک اتنا سا ناسور ہے جو آج کی اِس امتِ مسلمہ کو سنبھلنے نہیں دیتا۔ آپ اندازہ لگائیے۔

میدانِ عرفات میں سالہا سال سے مانگی جانے والی دعائیں آخر کیوں قبول نہیں ہوتیں؟

عزیزانِ من! باقی جگہوں کی دعائیں تو آپ چھوڑ دیجئے' صرف حج کے موقع پر عرفات کے میدان کو لیجیے۔ پچیس' چھبیس' تیس سال سے ہر سال حج کے موقع پر' سب سے زیادہ اِس مقدس مقام پر' عرفات کے میدان میں' کھڑے ہو کے پانچ دس پندرہ لاکھ حاجی پوری خلوصِ نیت سے گڑگڑا کر' دعائیں مانگتے چلے جا رہے ہیں' وہ اسرائیل کی مملکت ناسور کینسر بنتی چلی جا رہی ہے۔ ہر سال دیکھیے مسلمانوں کا یہ جمِ غفیر پہلے سے زیادہ پھیلا ہوا ہوتا ہے' دعائیں مانگ رہے ہیں اور پھر ساری دنیا میں دعائیں مانگ رہے ہیں' ہمارا کوئی اجتماع ایسا نہیں ہوتا جس کے آخر میں یہ دعائیں نہیں مانگی جاتیں۔ اس کے باوجود آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس اسرائیل کی مملکتِ ناسور کا قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ مذہب کی دنیا میں اپنے آپ کو فریب دے لینا ہے۔ یہ اس فریب کا نتیجہ ہے۔ عزیزانِ من! دعائیں مانگ مانگ کر منزل پہ نہیں پہنچا جا سکتا۔ قبولیتِ دعا کے بعد اس پروگرام پر جم کر کھڑے ہونا ہوتا ہے۔

مذہب ہمیشہ فریب میں مبتلا رکھتا ہے جبکہ دین کی نظر حقائق پر ہوتی ہے

عزیزانِ من! دین حقائق کو سامنے رکھتا ہے Facts (حقائق) کو Face (سامنا کرنا) کرنا سکھاتا ہے۔ رسول سے تو کہا ہی یہ ہے کہ حقائق کا سامنا کرو اور پھر دیکھیے تو سہی کہ اگر یہی بات تھی کہ جو کچھ خدا سے مانگا تھا وہ تو خدا کی طرف سے مل گیا۔ خدا تو قادرِ مطلق ہے بس وہ سب مل گیا۔ اس نے کہا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق میں جب اس کا ارادہ ہوتا ہے تو وہ چیز وجود میں آجاتی ہے تو اس کے لیے یہ مشکل کیا تھا کہ جب وہ سب کچھ، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگا تھا، وہ اسے دے دیا تھا تو وہ تمام کا تمام کام بھی خود ہی کر دیتا۔ مگر یہاں یہ ہوا کہ اس نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تمہاری پیدائش کے دن سے اس وقت تک تمہیں تیار کیا جا رہا تھا یعنی اگر اس کی دعا سے یہ سب کچھ مل جانا تھا تو پھر تیاری کا سوال ہی کیا ہے۔ مگر یہاں کہا کہ تمہیں تیار کیا جا رہا تھا۔ جو تم مانگ رہے ہو، دیا جا رہا ہے اور اس کے بعد پھر کہا جا رہا ہے کہ اب اس سفر پہ چلو۔ راستے میں تھک نہ جانا، اس معاملے میں جم کے، استقامت سے، کھڑے ہو جانا۔ یہی چیز ہے جس کے لیے خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی اور نبوت سے سرفراز کیا پھر اس کے بعد یہ کہ اس کام کے پورا کرنے کے متعلق جو مانگا ہم نے تجھے دیدیا ہے یہ بہت بڑی چیز تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سننے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سجدہ شکرانہ میں جھک گئے ہونگے: یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے۔ نبوت ہی بڑا احسان ہے۔ مگر یہاں تو سب کچھ دینے کے بعد کہا کہ اب تمہیں فرعون کو حدود میں رکھنے کے کام کے لیے استقامت سے کھڑا ہونا ہوگا۔

راہنمائی کی قدر کسی راہ گم کردہ مسافر سے پوچھیے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے تو خود اس امتِ مسلمہ سے، نبی اکرم ﷺ کی مخاطب قوم سے، کہا کہ **لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ** (3:164)۔ یہ خدا کا ایمان والوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انہی میں سے، ان کی طرف اپنا ایک رسول بھیجا۔ اس طرح تمہیں اپنی راہنمائی دی۔ کبھی راہ گم کردہ مسافر سے پوچھیے کہ جب کوئی اُسے راستہ دکھانے والا مل جائے تو اس کا کتنا بڑا احسان ہوتا ہے۔ وحی کی راہنمائی کو قرآن نے احسان کہا ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے بھی وہاں یہی چیز کہی ہوگی اور پھر یہ بات کہ ''جو مانگا ہے، وہ میں نے تمہیں دیدیا ہے'' کے تحت جذباتِ تشکر و امتنان یقیناً ایک نیازمندانہ سجدہ کی شکل میں سامنے آگئے ہوں گے۔ آپ نے کہا ہوگا کہ اے بارِ الٰہی! یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ یہاں کہا کہ **وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى** (20:37)۔ اے موسیٰ علیہ السلام! تم پر ہمارا یہ احسان کچھ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ اس کا سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہوا تھا۔ عزیزانِ من! کتنی وضاحت سے کہہ دیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! یہ تجھ پہ پہلا احسان نہیں ہے، تمہیں اس کا پتہ نہیں ہے، ان احسانات کا سلسلہ تو بہت پیچھے سے شروع ہوا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ایک نبی کو اس منصب کے لیے جو تیار کیا جاتا ہے تو وہ چیز کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اِس سلسلے میں کہا کہ **اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ**

عَدُوٌّ لِّیۡ وَعَدُوٌّ لَّهٗ (20:38-39)۔ تمہاری پیدائش کے ساتھ ہی ہم نے تمہاری ماں کی طرف اپنے ایک نیک بندے کی معرفت یہ حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے بچے کو صندوق میں ڈال دے اور پھر اس صندوق کو دریا میں بہادے۔ دریا کی لہریں اُسے کنارے پر لگا دیں گی جہاں سے اِسے وہ شخص لے جائے گا جو میرے احکام وقوانین کا بھی دشمن ہے اور خود اس بچے کا بھی۔

الجھی سوچ اور الجھے جواب

عزیزانِ من! میں ابھی ایک لفظ بتاتا ہوں جسے کہتے ہیں: ''وحی نے حکم دیا۔'' یہ میں نے اس لیے رک کر کہا ہے کہ بات تو کچھ بھی نہیں تھی، آگے بڑھ جانا چاہیے تھا، لیکن یہ جو اَب ہمارے ہاں نبوت کے دعووں کی نئی طرحیں پڑی ہیں تو اس کے متعلق کہیں تو یہ کہا گیا ہے کہ صاحب! نبی وہ ہوتا ہے جو چٹھی نہیں لاتا، چٹھی رسان ہوتا ہے۔ کہیں کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو ساتھ چٹھی یا کتاب لاتا ہے، نبی کتاب نہیں لاتا۔ کہیں کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا، تو میں رسول نہیں ہوں، نبی بھی نہیں ہوں لیکن مجھ پر وحی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! حقیقت یہ ہے کہ وحی تو صرف نبی پہ ہی ہوتی تھی، نبی اور رسول ایک ہی سکے کے دورخ تھے تو سوال یہ ہے کہ ان پہ وحی کیسے ہوتی ہے؟ جب نبوت نہیں ہے، تو دعویٰ نبوت بھی نہیں ہے۔ یہ عجیب قسم کی الجھی ہوئی سوچ ہے اور الجھے ہوئے جواب ہیں کہ میں یہ ہوں، وہ نہیں ہوں، پھر ہوں، پھر نہیں بھی ہوں، تو پھر وحی کیسے؟ اس پر کہا کہ دیکھیے، قرآنِ کریم میں ہے کہ امِ موسیٰؑ کی طرف خدا نے وحی کی تو وہ تو نبی نہیں تھیں لیکن اس پر خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی کی طرح وحی کی تھی۔

وحی کا مفہوم اور دعویٰ نبوت کی کیفیت

عزیزانِ من! ان کے دعویٔ نبوت کی کیفیت یہ ہے مگر عربی زبان تک سے واقف نہیں۔ [1] عربوں کے ہاں یا کم از کم ان کے لغت میں ہی دیکھ لیتے کہ یہ جو لفظ وحی کا مادہ......و ح ی...... ہے اس کے کتنے معنی ہیں اور پھر یہ لفظ کن کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ''کسی کی طرف کوئی حکم بھیجنا، خواہ وہ کسی کی معرفت بھیج دیا جائے یا کسی شکل میں بھیج دیا جائے'' اہل عرب اس کو بھی وحی کہتے تھے، بشرطیکہ وہ رازدارانہ طریقہ پہ کیا جائے کیونکہ ان کے ہاں وحی کے بنیادی معنی اشارہ صریح تھا یعنی تیزی سے کوئی اشارہ یوں کر دینا کہ باقیوں کو پتہ ہی نہ چلے، صرف اسی کو معلوم ہو۔ یہ بڑی بنیادی چیز تھی۔ اس میں ایک اصطلاحی چیز تھی جسے وحی نبوت کہتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے جبرائیل کی معرفت ایک شخصیت کے اوپر آتی تھی، وہ براہِ راست علم خدا کی طرف سے ملتا تھا، وہ اس کی ایک اصطلاحی شکل تھی ورنہ قرآنِ کریم میں تو یہ بھی ہے کہ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ (16:68) تیرے نشوونما دینے والے نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی، اس لحاظ سے تو جتنی مکھیاں ہیں سب کو نبی ماننا چاہیے۔ اے چنگے نبی نیں ساڈے زمانے دے [2]۔ میں نے اس لیے کہا کہ یہ لوگ ہمیشہ یہ آیت پیش کرتے

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) کی طرف اشارہ ہے۔

[2] تو گویا کیا خوب ہیں ہمارے زمانے کے یہ نبی!

ہیں کیونکہ ہمارے ہاں تو عام طور پہ عربی کا بھی علم نہیں' پھر قرآنِ کریم پہ بھی نگاہ نہیں۔ اور دوسرا یہ کہ یہ لوگ دلیل پہ آ جاتے ہیں' انہیں ان دلیلوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے کہ ہاں صاحب! امِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی آئی تھی' حواریوں کیطرف وحی آئی تھی' ٹھیک ہے حضرتِ عیسیٰ کی جو وحی تھی وہ حکم تھا جو ان کے حواریوں کی طرف منتقل کیا گیا تھا اس کا نام وحی ہے' تو بہرحال یہاں سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ کہا یہ گیا کہ تیری ماں کی طرف ہم نے' اللہ تعالیٰ نے' اپنے کسی بندے پہ وحی کی یعنی رازدارانہ طریق سے کہا کہ ام موسیٰ سے یہ بات کہو۔

عزیزانِ من! پھر یہی کچھ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ اس طرح بن باپ کے پیدا ہونے کی ایک دلیل یہ دیکھیے کہ یہاں ان کو ابنِ مریم کہا جاتا ہے۔ ''ٹھیک ہے جی! صرف ماں کا ذکر کیا جائے تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ باپ نہیں تھا؟ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے ساری داستان کے اندر کہیں باپ کا ذکر نہیں' ماں ہی کا ذکر آتا ہے' حتیٰ کہ حضرتِ ہارونؑ کے سلسلہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام جب غصہ میں آئے ہیں تو حضرتِ موسیٰ نے انہیں ڈانٹا' جھڑکا تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ اے میرے ماں جائے! ایسا تو نہ کر۔ عزیزانِ من! انہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ بعض قوموں کے اندر کچھ کہنے کی روایت اور روش کیا ہوتی ہے' عرب یا ان قوموں کے ہاں بھی یہ صورت تھی کہ بچے کا نام عورت کے نام کے حوالے سے لیا جاتا تھا۔ اور جیسا کہ میں نے کئی دفعہ کہا ہے ہمارے ہاں گاؤں میں بھی یہ بات تھی' گاؤں کی زندگی میں آپ کی سمجھ میں یہ بات آ جائے گی کہ جس گھر کے اندر' گھر کا مرد کچھ زیادہ مشہور نہیں ہوتا تھا' کسی طرح سے بھی عورت مشہور ہوتی تھی' گاؤں کے اندر وہ گھرانہ اس عورت کے نام پہ ہوتا تھا' اس کے بچے اس عورت کے نام سے کہے جاتے تھے جیسے کہ ''فاطمہ دا منڈا اے ناں خیر نال' آج فاطمہ دے گھر کنے بندے آئے نیں''۔ ❶ یہ وہاں ہوتا تھا جہاں ان عورتوں کی زیادہ شہرت ہوتی تھی۔ یہ دلیل دینے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ سیدوں کی جو سب سے بڑی سلطنت ہوئی ہے اسے بنی فاطمہ کہا جاتا ہے' اُسے حضرتِ علیؓ کی اولاد میں سے نہیں کہا جا رہا بلکہ بنی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہ حضرت علیؓ کی اولاد ہے' گویا علوی ❷ اور ہوتے ہیں' اور بنی فاطمہؓ اور۔ لیکن بہرحال ''ان کا'' کیا ہے انہیں تو کوئی چار تنکے چاہئیں جس پہ پل بنایا اور ہاتھی گزارنا شروع کر دیئے کہ صاحب! دیکھیے کہ ماں کا ذکر ہے۔ حضرتِ مریمؑ کی شہرت کا کیا پوچھنا ہے! قرآنِ کریم کہتا

---

❶ اللہ سلامت رکھے یہ فاطمہ کا بیٹا ہے۔ آج فاطمہ کے گھر کتنے ہی لوگ آ جمع ہوئے ہیں۔

❷ امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ ان کی اولاد کو عام طور پر سادات کہا جاتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں' جن سے آپ کے ہاں بکثرت اولاد ہوئی۔ روایات کی رو سے ان کے ہاں 18 بیٹے اور 18 بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو بیٹے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ' ان کے ہاں دوسروں بیویوں سے پیدا ہوئے' اِن کی اولاد علوی کہلاتی ہے۔ اسی نسبت سے انہوں نے فاطمیین اور علوییین کے نام سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں میں فاطمیین مصر اور علوییین مصر کی سرگرمیاں بھی تھیں۔ تاریخی تحقیق کے مطابق انہوں نے 138ھ سے لے کر 358ھ تک قریب 62 مرتبہ حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ہر بار ناکام رہے۔ ان میں سے صرف ایک جماعت اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی جو فاطمیین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے خلیفہ نے قارہ (شمالی افریقہ) میں 297ھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ (پرویزؒ: شاہکار رسالت' 1987' ص ص۔ 468-469)

ہے کہ ہم نے تجھے زمانے بھر کی عورتوں یا کم از کم اپنی ہم عصر عورتوں پر سب سے بڑی فضیلت دی۔ جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ حقیقت میں جو آسمانی انقلابیوں کا گروہ ہے ان میں حضرتِ مریمؑ کی پوزیشن بڑی بلند ہے۔ اگر انہیں ایسی ماں کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا تو اور کس کی طرف منسوب کیا جائے گا!

صندوق کو دریا کے سپرد کر دیا جائے

عزیزانِ من! بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰى (20:38)۔ تمہاری ماں کی طرف ہم نے حکم بھیجا کہ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ (20:39)۔ اس بچے کو ایک صندوق میں ڈال دو اور فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ (20:39)۔ صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (20:39)۔ وہ دریا اس صندوق کو کنارے کی طرف لے جائے گا اور يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ (20:39)۔ اس صندوق کو وہ شخص پکڑ لے جائے گا جو میرے احکام و قوانین کا بھی دشمن ہے اور خود اس بچے کا بھی۔ یہاں یہ واضح کر دیا کہ اس صندوق کو پکڑ لیں گے۔ کون پکڑ لیں گے؟ وہ جو میرے بھی دشمن ہیں اور اے موسیٰ! تیرے بھی دشمن۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کے بھی دوست ہوتے' تو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کا بچہ تھا' خدا اور اپنے دشمن فرعون کے محل میں تھا۔ فرعون تو ہو گیا اس کا دشمن اور اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24)۔ ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔'' کہنے والا علی الرغم خدا بننے والا' ہمارا بھی دشمن تھا۔ کہا: سوچتے ہو کس کے گھر میں چلے گئے تھے! کیا انداز ہیں قرآن کے! وہ دشمن کا گھرانہ جو تمہارا بھی دشمن اور میرا بھی دشمن۔

خدا تعالیٰ کی زیرِ نگرانی محلوں میں پرورش

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ پہلی بات تو ہم نے یہ کی کہ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ (20:39)۔ اور ہم نے اپنی عنایت سے تجھے ایسا بنا دیا کہ سب لوگ تجھ سے محبت کریں۔ تمہیں اتنا پیارا بچہ بنا دیا کہ جس نے بھی دیکھا' تجھے گود میں اٹھا لیا' منہ چوم لیا۔ تو بہت پیارا بچہ بن گیا۔ ان دشمنوں کے گھرانے کے اندر اور کوئی چیز تو تھی نہیں' بچے کو اتنا زیادہ واقعی پیارا ہونا چاہیے تھا۔ یہی بات تھی جو فرعون کی بیوی نے کہہ دیا تھا: اسے کچھ نہ کہنا' اِسے ہم پالیں گے' بڑا پیارا بچہ ہے۔ کہا: یوں وہاں تمہاری پرورش کی۔ یہ سب کچھ کیوں کیا؟ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ (20:39)۔ ہم چاہتے تھے کہ تمہاری پرورش و تربیت' ہماری زیرِ نگرانی (شاہی محلات میں) ہو تا کہ تو اِن رموزِ مملکت و سیاست سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کا تجھے آخر الامر مقابلہ کرنا تھا۔ یہاں یہ بات واضح کر دی کہ ہم چاہتے تھے کہ یہ جو رموزِ سیاست ہیں' محلاتی سازشیں ہیں' کاروبارِ سلطنت ہے' اس تمام کی بھی تمہیں تربیت مل جائے۔ وہاں فرعون کے محلات میں تمہاری تربیت ہو رہی تھی لیکن وہ تھی عَلٰى عَيْنِىْ (20:39)۔ ہماری زیرِ نگرانی۔ اگر اس تربیت میں نگرانی اور نگاہیں بھی فرعونیوں کی ہوتیں تو تُو

فرعونیوں میں سے ایک ہوتا۔ وہاں تربیت گو کہ ان کے ہاتھوں ہورہی تھی لیکن نگاہیں ہماری تھیں جو تیری طرف لگی ہوئی تھیں۔ عزیزانِ من! اس مقام پہ ایک چیز اور بھی ضروری ہے۔ کہا جائے گا کہ صاحب! یہ تو ایک نبی کی بات ہے' نبوت کی باتیں تھیں' خدا نبی کے ساتھ یہ کچھ کرنے والا تھا۔ اب تو یہ سلسلہ نبوت نہیں ہے۔ اب خدا کی زیرِ نگرانی کس کی تربیت ہوگی؟ اب کس کے ساتھ یہ چیز ہوگی؟

اب قرآن کی زیرِ نگرانی' خدا کی زیرِ نگرانی کہلائے گی

عزیزانِ من! یاد رکھیے' جب تک سلسلہ نبوت جاری رہا' یہ جتنی بھی چیزیں خدا اپنے نبی سے کہتا تھا کہ ہم کرتے ہیں' اور ہمارے ذریعے یہ ہوتا ہے' ہماری زیرِ نگرانی یہ ہوتا ہے' ختمِ نبوت کے بعد یہ سارے کام خدا کی کتاب کرتی ہے۔ اب اگر بچے کی صحیح تربیت کرنی ہے تو خدا کی کتاب کی ہدایات کے مطابق کیجیے۔ تو گویا خدا کی زیرِ نگرانی تربیت ہوجائے گی۔ فرعون کے محلات میں جب خدا کہتا تھا کہ ہم راستہ دکھاتے ہیں' تو اب اس کی کتاب قرآنِ کریم راستہ دکھاتی ہے۔ دربارِ فرعون میں جب وہ کہتا تھا کہ ہم سے مانگو' ہم تمہارے ہر سوال کا جواب دیں گے' تو اس زمانے میں خدا جواب انبیاء کرام کو دیتا تھا کہ وہ ہمکلامی تھی' اب جواب خدا کی کتاب قرآن کریم دے گی۔ اس سے مانگ کے دیکھیے' یہ جواب دیتی ہے۔ اب خدا کا اور ہمارا تعلق اس کی کتاب قرآنِ کریم کے ذریعے سے ہے۔ اب خدا کے ساتھ کسی کا تعلق براہِ راست قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ نکتہ بڑا ہی اہم ہے' اسے ضرور اور ہمیشہ ذہن میں رکھیے۔

خدا تعالیٰ سے رابطہ کی کیفیت کو غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا

لہٰذا اب ہمکلامی کے تمام دعوے فریبِ نفس ہے یا مغالطہ آفرینی ہے۔ اسی کلام کو اس نے کلام اللہ کہا ہے۔ جب یہ کلام اللہ ہے تو جب ہم اسے پڑھتے ہیں تو خدا کلام نہیں کرتا تو اور کیا ہورہا ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! ختمِ نبوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ جو خدا اور نبی کا براہِ راست تعلق ہے جسے تم شخصی تعلق کہتے ہو' ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیسا ہوتا تھا۔ غیر از نبی تو اس کیفیت اور ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ براہِ راست ایک تعلق خدا کے ساتھ تھا' اس تعلق سے وہ سب راہیں ملتی تھیں' ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو اس قسم کا تعلقِ شخصی ہوتا تھا' براہِ راست خدا کا اور خدا کے نبی کا ہوتا تھا' وہ ختم ہوگیا۔ اسی لیے تو اس کتاب کو قیامت تک کے لیے محفوظ رکھا' مکمل کیا: **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:116)۔ اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے اور اب **اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9)۔ اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے۔ اگر یہ باتیں براہِ راست ہی اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے کرتے چلے جانا تھا تو اِس قدر اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس زمانے میں تو پھر بھی یہ ہوتا تھا کہ ایک نبی ہوتا تھا مگر اب تو نبی آخر الزمان ﷺ پوری دنیا کے لیے ایک نبی ہیں۔ یعنی اس ایک شخص سے بات ہورہی تھی مگر ان کے بعد تو یہ سلسلہ ہی ختم کر دیا گیا۔

یا اللہ خیر! ہر خانقاہ میں نبی‘ ہر حجرے میں نبی

عزیزانِ من! اسی صورتِ حال میں اب اگر کیفیت یہ ہو کہ ان کی بعثت کے بعد جگہ جگہ‘ گاؤں گاؤں‘ ہر خانقاہ پہ‘ ہر زیارت گاہ کے اوپر‘ ہر حجرے کے اندر‘ ایک ایک شخص کی خدا سے باتیں ہوتی چلی جا رہی ہیں تو یہ تو ایک وقت میں‘ ایک گاؤں میں‘ کتنے ہی نبی ہو گئے۔ عزیزانِ من! اب وہ سلسلہ تو صرف خدا کی کتاب کے ذریعے ہے‘ اسی کی رو سے خدا کلام کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ وہاں کہا تھا کہ یہ اس لیے تھا تا کہ وَلِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ (20:39)۔ تیری پرورش و تربیت ہماری زیرِ نگرانی ہو‘ تو اب جو پرورش و تربیت زیرِ نگرانی ہوگی وہ خدا کی اس کتاب کی زیرِ نگرانی ہوگی۔ پھر آگے قرآن نے ایک بڑی عجیب بات بتائی‘ کہ امِ موسیٰ کو تردد لاحق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی برگزیدہ بندے[1] (نبی) کی وساطت سے اس کی طرف حکم بھیجا کہ اللہ ایسا چاہتا ہے کہ وہ بچے کو دریا میں بہا دے (28:7) چنانچہ امِ موسیٰ نے خدا کے حکم کے مطابق بچے کو صندوق میں ڈال دیا۔ بنی اسرائیل تو بہرحال خدا کو بھی مانتے تھے‘ نبیوں کو مانتے تھے‘ یہ الگ بات ہے کہ وہ جو نبیوں کا دیا ہوا دین تھا وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن بنی اسرائیل ان چیزوں کو تو مانتے تھے۔ لہٰذا اس کی ماں نے جب یہ سنا کہ یہ خدا نے حکم بھیجا ہے تو اس نے ایسا کر دیا۔

صندوق میں بچے کا سفر اور خدا کی طرف سے ماں کے جذبات کا خیال

عزیزانِ من! یہ قرآن عجیب ہے۔ امِ موسیٰ کے جو ممتا کے جذبات تھے‘ وہ اپنے بچے کے صندوق کو دریا میں بہا کر مر تو نہیں گئے‘ وہ تو باقی تھے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اس نے بچے کو صندوق میں بھیج تو دیا‘ دریا میں بھی ڈال دیا‘ مگر اپنی بیٹی سے کہا کہ بیٹی! ذرا دریا کے کنارے کنارے دیکھتی جانا کہ اس صندوق پہ کیا بیتتی ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! کیا بات ہے اس خدا کی! ماں کے سینے میں جھانک کے بات کر رہا ہے۔ اور دوسری جگہ یہ ہے کہ بیٹی سے یہ کہا کہ ذرا دُور دُور رہنا‘ کوئی یہ نہ بھانپ لے کہ تم اس صندوق کو دیکھتی جاتی ہو‘ لیکن دیکھتے رہنا۔ ماں ہے‘ اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ چیز بیان کی ہے وہاں کچھ ڈانٹ کر نہیں کہا کہ دیکھو اس کو اتنا بھی اعتبار نہیں تھا کہ ہم نے کہا ہے کہ ڈال دو کہ وہ محفوظ رہے گا‘ اس کو اتنا بھی یقین نہیں۔ تعمیلِ ارشاد کی تو کیفیت یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے بچے کو صندوق میں ڈال کے جیسے کہا گیا ہے دریا برد کر دیا ہے۔ انسانی جذبات کی کیفیت یہ ہے کہ خدا خود کہہ رہا ہے کہ اس نے پھر اپنی بیٹی سے یہ کہا۔ اور بیٹی ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ یہاں آج اگر کوئی حضرت صاحب یا کوئی خان صاحب اس قسم کا اشارہ کرے کہ ''جی ٹھیک ہے اس بچے کو یہ کرو'' اور وہ اس کے بعد یہ دیکھے کہ وہ ساتھ ساتھ اس بچے کو دیکھ بھی رہی ہے تو پوچھیے نہیں کہ پھر اس کا پارہ کہاں چڑھتا ہے: ہیں! تمہیں ہم پہ یقین ہی

---

[1] پرویز: برق طور‘ ادارہ طلوعِ اسلام‘ لاہور‘ 1993‘ ص۔8۔

نہیں ہے، اعتبار ہی نہیں ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ ہم محفوظ رکھیں گے۔ ''بیج دتاَ'' مگر کڑی نوں جناب! تکدی رہو۔ تے ساڈے تے اعتبار ای نئیں۔ ایہو جی بے یقینی سی تے پچیا کیوں سی؟ او شروع ہو جان گے جی۔''[1] عزیزانِ من! یہاں خدا اس واقعہ کو پورے پیار سے بیان کرتا ہے کہ اس ماں نے بھیج تو دیا لیکن ساتھ ہی بیٹی سے کہا کہ بیٹی: ذرا دیکھتی رہنا، صندوق کہاں جاتا ہے۔ صندوق چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تھے تو محکوم سی قوم میں سے لیکن گھرانا بہرحال باعزت تھا کیونکہ آگے یہ ہے کہ وہ بہن محلات تک پہنچ گئی۔ محکوم قوموں میں بھی بعض گھرانے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ممتاز ہوتے ہیں ورنہ اگر یہ ایک عام سا گھرانہ ہی ہوتا تو یہ نہ ہوتا کہ وہ وہاں تک پہنچ جاتی۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ **اِذْ تَمْشِیْٓ اُخْتُکَ** (20:40)۔ تمہاری بہن وہاں سے گزری۔

وہاں پہنچنے کے بعد ایک مشکل کا سامنا اور خدا کی مشیت

عزیزانِ من! یہاں قرآن کہتا ہے کہ فتقول (20:40)۔ بہن نے کہا: **هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی مَنْ یَّكْفُلُهٗ** (20:40)۔ کیا میں تمہیں ایک ایسی عورت کا پتہ بتاؤں جو اس کی پرورش کر سکے گی؟ اب یہ مشیت کا پروگرام ہے کہ بچہ کسی کا دودھ نہیں پیتا۔ یہاں مشکل آ گئی، پھر اس کی بہن نے یہ کہا کہ میں تمہیں ایک ایسی عورت کا بتاتی ہوں، میں سمجھتی ہوں کہ Try (کوشش) کر کے دیکھ لو، شاید یہ اس کا دودھ پی جائے تو اس طرح سے پھر وہ ماں دودھ پلانے والی کی حیثیت سے وہاں پہنچی یا یوں کہو کہ پھر وہ بچہ ماں کی ہی آغوش میں آ گیا۔ اب وہ ان کا بچہ ہے، ماں کی مامتا وہیں پوری ہو رہی ہے۔ اسی کی گودی میں ہے۔ **فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓی اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ** (20:40)۔ اس طرح ہم نے پھر تمہیں تمہاری ماں ہی کے آغوش میں پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور ہر وقت اس غم میں ہی نہ گھلتی رہے کہ پتہ نہیں میرے بچے پہ کیا بیت رہی ہے۔ اے موسیٰ! سنتے جا رہے ہو۔ تم کہتے تھے کہ یہ تمہارا بڑا احسان ہے۔ دیکھتے جا رہے ہو کہ احسانات کی کڑیاں کہاں تک جا رہی ہیں۔ تمہیں چاہوں کہ تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں۔ تمہارے احساسات، تمہاری حفاظت و تربیت، تمہاری ماں کے جذبات کے احساسات، بہن کے جذبات، کہاں تک جا رہے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے **كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ** (20:40)۔ تاکہ اس کی (تمہاری ماں کی) آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ بیٹے کی جدائی کی وجہ سے غمگین نہ رہے ورنہ وہ بے چاری کڑھ کڑھ کے مر جاتی، تم بڑے ہوئے تو تمہارے غصے کی یہ کیفیت تھی کہ **وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ** (20:40)۔ تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ لیکن ہم نے اس معاملے کی پریشانی سے بھی نجات دلائی۔

عزیزانِ من! یہ واقعات دوسرے مقام پہ آئیں گے۔ حاکم قوم کے افراد کے سامنے محکوم قوم کے افراد تو بالکل بھیڑ بکریوں کی

---

[1] اس کے پیچھے لڑکی کو بھیج دیا تاکہ وہ اسے اپنی نگاہ میں رکھے۔ اسے ہمارے اوپر اعتبار ہی نہیں ہے۔ اگر ایسی ہی بے یقینی کی حالت تھی تو پھر پوچھا ہی کیوں تھا؟ پھر وہ ایسی ہی باتیں کرنا شروع کر دیں گے۔

طرح ہوتے ہیں، جس کو جی چاہا مار دیا، جس کو جی چاہا جو کر دیا۔ تو وہاں ایک دن ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوئی۔ ایک دن وہ سوفتہ [1] میں شہر کا چکر لگا رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی [2] (قومِ فرعون کا فرد) آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے آپؑ سے فریاد کی۔ آپؑ نے اسے برحق سمجھتے ہوئے قبطی کے مکہ مارا۔ وہ غالباً اس کے دل پہ جا لگا ہوگا، وہ چت ہی ہوگیا تو خیر۔ جب میں وہاں پہنچوں گا تو یہ تمام واقعات تفصیل سے بتاؤں گا کہ کیا ہوا تھا۔ تو بات اتنی ہوئی تھی کہ مظلوم فرد کی حفاظت میں ایک ظالم کے مقابلے میں یہ آئے اور ایسا اتفاق ہوگیا کہ اُسے ضربِ کاری لگ گئی۔ صاحب ضربِ کلیم تو انہیں کہا ہی جاتا ہے تو بس وہ وہیں ڈھیر ہوگیا تھا اور یہ جرم نہیں تھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔ یہ واقعہ یوں ہوگیا تھا لیکن بہرحال وہ قبطی حاکم قوم کا فرد تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں قبطی مستبد قوتوں کے مالک تھے اور اسرائیلی بے حد مظلوم و مقہور۔ **فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَۃِ خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَہٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُہٗ قَالَ لَہٗ مُوْسٰٓی اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ** (28:18)۔ دوسرے دن صبح موسیٰ شہر آیا ڈرتے ڈرتے اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے (یہ جاننے کے لیے کہ کل کے واقعہ کا شہر میں کیا چرچہ ہے)۔ وہ اسی طرف جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہی شخص جس نے کل اس سے مدد مانگی تھی، اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے اسے کہا کہ تُو تو بڑا غلط کار ہے، بڑا جھگڑالو ہے۔ ہر ایک سے لڑتے جھگڑتے ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلی نے جب یہ کیفیت بیان کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہوگیا کہ آج وہ فی الواقعہ مظلوم ہے اور قبطی اس پر زیادتی کر رہا ہے۔ آپؑ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ قبطی دستِ قضا کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر چلایا۔ **فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ یَّبْطِشَ بِالَّذِیْ ھُوَ عَدُوٌّ لَّھُمَا. قَالَ یٰمُوْسٰٓی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ کَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ. اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ جَبَّارًا فِی الْاَرْضِ وَمَا تُرِیْدُ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِیْنَ** (28:19)۔ جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ اُسے پکڑ لے جو (اُن) دونوں کا دشمن تھا (یعنی قبطی) تو اُس (قبطی) نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر دے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ تیرے تو یہ ارادے دکھائی دیتے ہیں۔ ملک میں (سب سے زیادہ) جابر تُو ہی ہے۔ تُو تو اصلاح کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ فرعون اور اس کے اراکین سلطنت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسرائیلی ہونے کا علم ہو چکا تھا یا نہیں۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ مظلوم اسرائیلیوں کے متعلق آپ کا جذبۂ ہمدردی اور انصاف کے ترازو میں اسرائیلی اور قبطی کے درمیان عدمِ امتیاز ان لوگوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا ہوگا۔ وہ اس فکر میں ضرور ہوں گے کہ کوئی واقعہ ملے تو آپ پر ہاتھ ڈالا جائے۔ اب جو یہ واقعہ سامنے آگیا تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

---

1. حوالہ: پرویز: برقِ طور، ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور، 1993، ص۔ ۱۱۔
2. قبطی (قب طی:) [عربی۔ اسم۔ مذکر]۔ قدیم مصری قوم۔ (صفت) قبط سے متعلق۔ یاد رہے کہ مصر کا قدیم نام قبط تھا۔

اور یہیں سے ایک سازش کا آغاز ہوا اور مشورہ کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبطی کے قتل کے جرم میں قتل کر دیا جائے تاکہ یہ مستقبل کا کانٹا الگ ہو جائے۔

فرعون کی کیبنٹ کا ایک مردِ مومن اور قرآن

عزیزانِ من! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود فرعون کی کیبنٹ کے اندر ایک مردِ مومن ہے۔ یہ کوئی نیک طینت اللہ کا بندہ ہے جو دل سے حضرت موسیٰؑ کی انصاف پسندی اور مظلوم نوازی کا قدردان ہے۔ جب درسِ قرآن میں یہ آیات آئیں گی تو میں بتاؤں گا کہ قرآن کس کس کی صلاحیت کا کیا کیا صلہ دیتا ہے' اور وہ کسی کے کارنمایاں کو یوں ہی ضائع نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! فرعون کی قوم کا' فرعون کی کیبنٹ کا' ایک مردِ مومن ہے جس نے حضرت موسیٰ کا کیس Defend (دفاع) کیا ہے۔ قبل اس کے کہ اربابِ حکومت کا مشورہ' فیصلہ کی صورت اختیار کرے' وہ بھاگا بھاگا آیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع کر دی کہ ان کے خلاف کیا سازش ہو رہی ہے۔ وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى. قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ. (28:20)۔ اور شہر کے آخری کنارہ کی طرف سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! بڑے بڑے لوگ (اراکین سلطنت) تیرے متعلق مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیا جائے۔ سو تو (یہاں سے) نکل جا۔ میں تیرے خیر خواہوں میں سے ہوں۔ عزیزانِ من! ''سول لائن'' (Civil Lines) یعنی شہر کے آخری کنارے کی طرف سے یہ شخص بھاگا آ رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بڑا آدمی تھا' جبھی تو اُسے ارکانِ سلطنت کی اس سازش کا علم تھا۔ چنانچہ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل گئے۔ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔(28:21)۔ سو (موسیٰ) ڈرتے ہوئے' اس کی نگرانی کرتے ہوئے (کہ پیچھے سے کوئی آن نہ پکڑے) وہاں سے نکل پڑا اور عرض کی: اے میرے رب! مجھے ان ظالموں سے بچائے رکھیو۔

عزیزانِ من! اندازہ لگائیے قرآنِ کریم کا ایک ایک لفظ کتنا بیش بہا اور قیمتی ہے۔ اس مردِ مومن کی ساری تقریر قرآنِ کریم نے اپنے ہاں محفوظ کر لی ہے۔ ساری تقریر کا پورا ایک رکوع ہے۔ اس میں بھی ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ گاہے گاہے غیر قوموں یا حاکم قوموں میں بھی اس قسم کے افراد نکل آتے ہیں جن کا سینہ جوہرِ ایمانی سے منور ہوتا ہے۔ علی الرغم کیبنٹ (Cabinet) میں کھڑے ہو کے' فرعون کی موجودگی میں' موسیٰ علیہ السلام کو Defend (دفاع) کرنا اور وہ دلائل دینا' کارنمایاں ہیں۔ اس کی وجہ سے قرآن نے اِسے محفوظ کیا ہے۔ اس کے اندر ایسے دلائل دیئے ہیں کہ ان سے اس کا جواز نہیں بن پڑا' اور پھر کیا بات ہے اس تقریر کی! عزیزانِ من! جب وقت آئے گا تو میں پھر عرض کروں گا' عجیب و غریب تقریر ہے۔ پتہ نہیں یہ کوئی گھنٹے بھر کی تقریر ہو گی جو اس نے بیان کی ہے اور سب کچھ کہنے کے بعد اس نے یہ کہا کہ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکا' حق و صداقت کی آواز پہنچا دی' مجھے تمہارے تاثرات معلوم ہیں' میں جانتا ہوں کہ تم میں

سے اکثر پر میری باتیں بڑی ناگوار گزری ہوں گی لیکن میں حق کہنے میں کسی کی ناگواری کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ **وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ** (40:44)۔ میں اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کے بعد میرا کیا انجام ہوگا' میں اسے اپنے خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ عزیزانِ من! اسے معلوم بھی تھا کہ اس کا انجام کیا ہے۔ بہرحال' قرآن میں ہے کہ وہاں سے ایک مردِ مومن کے کہنے پر' کہ یہاں سے چلے جاؤ' اندر ہی اندر تمہاری گرفتاری و قتل کے مشورے ہو رہے ہیں' اور پتہ نہیں کہ اس کے بعد کیا کچھ ہو جائے' حضرت موسیٰ وہاں سے بھاگ آئے۔ کوئی متعین منزل نہ تھی لیکن مشیت کے سامنے تو راستہ اور منزل دونوں متعین تھے۔ مدین [1] کی طرف رخ کر لیا اور نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائیں کہ بھولے بھٹکوں کو وہیں سے نشانِ راہ مل سکتا ہے اور اس طرح مدین آ گئے۔ یہ داستان بھی بڑی عجیب ہے۔ بھاگے ہوئے مدین آئے' تھک گئے تھے' بستی کے باہر ایک پیاؤ [2] تھا۔ وہاں ایک درخت کے نیچے تھکے ماندے بیٹھ گئے۔ عزیزانِ من! اب سوچیے کہ پچھلی داستان کس طرح پردۂ چشم کے سامنے آ رہی ہوگی: فرعون کا ظلم و ستم' استحصال' سلب و نہب اور محکوموں اور کمزوروں کے ساتھ جو وہاں بیت رہی تھی' اس سارے قصے کو وہاں دیکھا۔ وہاں یہ بھی دیکھا کہ زبردست' مظلومیت اور بالادست کا استبداد' جو مصر میں چھوڑ آئے تھے' وہاں بھی موجود تھا۔ پیاؤ پر لوگ اپنے اپنے مویشی پانی پلانے کے لیے لا رہے ہیں' پانی نکالتے ہیں' پلاتے چلے جاتے ہیں۔ وہاں دیکھا کہ دو کمزور اور ناتواں لڑکیاں ہیں' جو اپنے جانوروں کو الگ لیے کھڑی ہیں کہ ان کے مویشی پانی پی جائیں تو تلچھٹ اِن کے جانوروں کے حصے میں آئے۔ یہاں بھی وہی ''قوت کا استبداد'' ہے۔ Might is right (جس کی لاٹھی اس کی بھینس) کا قانون کارفرما ہے۔

پانی پر سرداروں کا کنٹرول اور دو بچیوں کی بے بسی

عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم میں دو الفاظ آئے ہیں۔ کہا کہ کیفیت یہ ہے کہ ان کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پانی کی طرف دوڑتی ہیں اور وہ آگے سے روک کے انہیں پیچھے کی طرف لے جاتی ہیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ انہیں تو اتنی سخت پیاس ہے' پانی

---

[1] حجاز کے شمال میں متصل علاقہ مدین کہلاتا تھا۔ تاریخ کا قیاس یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی قطورا کے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی ان میں سے ایک بیٹے کا نام مدین تھا۔ حضرت اسماعیلؑ ارض حجاز میں متمکن ہوئے اور حضرت اسحٰقؑ فلسطین میں' مدین' حجاز کے شمال میں شام سے متصل علاقہ میں سکونت پذیر ہو گیا اور اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قوم مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ ۲۱۰۰ یا ۲۳۰۰ ق م ہے۔ اس لیے قومِ مدین کے آغاز کا زمانہ ۲۰۰۰ ق م تصور کرنا چاہیے۔ جو قافلہ حضرت یوسفؑ کو چاہِ کنعان سے بازارِ مصر لے گیا تھا وہ انہی مدیانیوں کا تھا۔ یہ قوم اس علاقے میں بڑھی پھولی پھلی قریب چار سو سال تک یہی حالت رہی تا آنکہ ان میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ قبل از نبوت مصر سے بھاگ کر مدین کی بستی کی طرف ہی آئے تھے۔ (پرویزؒ: جوئے نور' 1994' ص۔ 279۔)

[2] پانی پینے کی جگہ۔

پیا جا رہا ہے' پلایا جا رہا ہے' یہ کیوں روک رہی ہیں؟ آخر نہ رہا گیا۔ تربیت تو بہرحال خدا کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی' وہاں ظلم وستم بھی دیکھ آئے تھے۔ جو کچھ محکوموں مظلوموں پہ ہوتا ہے اُسے بھی دیکھا تھا۔ آ کے کہا کہ بچیو! کیا بات ہے' تمہاری بھیڑیں پیاس سے تڑپ رہی ہیں' پانی کی طرف جا رہی ہیں' تم انہیں خود روک رہی ہو۔ بتاؤ کیوں روک رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ کیا کہیں' یہ بڑے بڑے طاقتور سرداروں کی بھیڑیں ہیں' ہم غریب آدمی ہیں' گھر میں کوئی بڑا نہیں ہے ایک باپ ہے' وہ بوڑھا ہے' ہم دو ہی بچیاں ہیں' جب تک ان کی بھیڑیں پی پلا کے نہ چلی جائیں' ہم اپنی بھیڑوں کو آگے نہیں جانے دے سکتے۔ قرآن نے کہا ہے کہ موسیٰ پھر درخت کے نیچے بیٹھ گیا' ہتھیلی پہ ہاتھ رکھا اور کہا کہ بارِالٰہی! وہاں سے آیا تھا کہ ظلم واستبداد سے بھاگ کے کسی ایسی سرزمین میں چلا جاؤں جہاں یہ کچھ تو نہ آئے' یہاں آ کے بیٹھا ہوں' دیکھ رہا ہوں کہ یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا ہے' یہاں بھی کمزور اور غریب کی بھیڑیں پانی تک نہیں جا سکتیں' جب تک سرداروں کی بھیڑیں پانی پی کے نہ چلی جائیں' یہ بھیڑیں پانی نہیں پی سکتیں۔ کہا کہ بارِالٰہی! ان کمزوروں کا' کوئی تو والی وارث' کوئی تو مددگار ہونا چاہیے۔ اٹھے' سیدھے گئے اور اُن کمزوروں کو تو ان لڑکیوں سے کہا کہ ذرا پیچھے ہٹو۔ یہ تو پہلے ہی غصے کی طبیعت کے تھے۔ ان لڑکیوں نے بھی دیکھا کہ یہ جرأت کر کے آ رہا ہے۔ کہا کہ ذرا پیچھے ہٹو' دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح یہ بھیڑیں پانی کی طرف آ رہی ہیں۔ پانی نکالا۔ کہا: آؤ پانی پی لو۔ ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا۔ عزیزانِ من! نبی تو قبل از نبوت بھی یہ کچھ ہوتا ہے۔ اس کی تربیت خدا کی نگاہ کے نیچے ہوئی تھی۔ پھر آ کے بیٹھ گئے۔ پتہ ہی نہیں لیا کہ تم کون ہو' کہاں واپس جانا ہے۔ بچیوں نے گھر آ کے کہا کہ ابا جان! ہم آ گئیں ہیں۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ تم آج بڑی جلدی پانی پلا کے لے آئی اور بھیڑیں بھی اچھی تندرست ہیں' پانی پورا پیا ہوا ہے تو انہوں نے بات سمجھائی ہوگی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ حضرتِ شعیب علیہ السلام تھے[1] غالباً اس زمانے میں بوڑھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بیٹا! وہ تو ان بستیوں کا آدمی نظر نہیں آتا' وہ مسافر تو ان میں سے نہیں ہے' جاؤ! اسے بلا لاؤ۔ بہرحال' انہی بچیوں میں سے ایک کے ساتھ پھر ان کی شادی ہوگئی تھی۔ پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی بات یہاں تک آئی تھی۔ یہ داستان یوں نا تمام نہ رہ جائے' دلچسپ آ رہی ہے۔ خدا نے کہا کہ وہاں سے تم بھاگے' مدین آئے۔ فَلَبِثۡتَ سِنِیۡنَ فِیۡۤ اَہۡلِ مَدۡیَنَ (20:40)۔ بارہ برس تک بھیڑیں چرائیں' بڑی صعوبات کی زندگی بسر کی۔ موسیٰ! تم نے بات چھیڑی تھی' مجھے یہ ساری کہانی سنانی پڑی۔ تمہیں ابھی تک ان چیزوں کا پتہ نہیں۔ وَفَتَنّٰکَ فُتُوۡنًا (20:40)۔ اے موسیٰ! تجھے ان کٹھالیوں میں ڈالا تا کہ تو کندن بنتا چلا جائے۔

ہمیں اندازہ ہی نہیں کہ ایک پیغمبر کو کن کن بھٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! کتنی بھٹیوں میں سے تمہیں گزارا' پھر کہیں جا کے تم کندن بنے۔ اس طرح ثُمَّ جِئۡتَ

---

[1] ''قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بزرگ کون تھے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ حضرت شعیبؑ ہی تھے۔'' (پرویزؒ: جوئے نور' 1994' ص 279) اور ''قیاس یہ ہے کہ یہ صاحب بزرگوار حضرت شعیب علیہ السلام ہی تھے۔'' (پرویزؒ: برق طور 1993' ص۔ 19)''

عَـلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (20:40)۔اے موسیٰ! تب کہیں جا کے تم ہمارے پیمانے پہ پورے اترے۔میں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں کی شاعری بھی کیا خوب ہے! کہتے ہیں کہ موسیٰ سے پوچھیے گا کہ ''آگ لینے جائیں تو پیغمبری مل جائے۔'' جس سے وہ آگ لینے گئے تھے ذرا اس پیغمبری دینے والے سے پوچھیے یا پیغمبری لینے والے سے پوچھیے' کہ موسیٰ کو پہلے کتنی بھٹیوں میں سے گزرنا پڑا' تب کہیں جا کے' اتنے تاؤں کے بعد' وہ ہمارے پیمانے پہ پورا اترا۔ یہ تھا عَـلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی (20:40)۔عزیزانِ من! پیغمبری تو اسے ملتی ہے جو اس کے پیمانے پہ پورا اترتا ہے اور پیمانے پہ پورا اترنے کے لیے بھٹیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ عزیزانِ من! پھر یہی وہ فرد ہوسکتا ہے جو اس کے بعد اس خام لوہے کو بھٹیوں میں سے گزار کر فولاد بنائے تاکہ پھر وہ شمشیر سایہ فگن بنے' پھر وہ مومنین کے ہاتھوں کے اندر ہوں تو خدا کہے کہ ہاں! بازو تمہارے تھے' تلواریں ہماری تھیں۔ جو جماعت مومنین کی ہوتی ہیں وہ بھی ان بھٹیوں میں سے گزاری ہوئی ہوتی ہیں اور پھر' بہرحال برملا کہہ دیا کہ وَاصْطَـنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (20:41)۔اس طرح ہم نے اے موسیٰ! تجھے اپنے ایک خاص کام کے لیے بنایا اور تیار کیا ہے۔ یہاں اپنے ایک خاص کام کے لیے ''لنفسی'' کہا ہے کہ اے موسیٰ! یہ سارا کچھ جو ہم نے کیا' وہ اس لیے کیا کہ ہمارا ایک کام تھا' اس کے لیے ہم نے تمہیں چن لیا۔

خدا اپنے کام بھی براہ راست خود نہیں کرتا

عزیزانِ من! یہاں لنفسی کہا ہے یعنی اپنی ذات کے لیے ہم نے تمہیں چن لیا' اللہ اکبر! دیکھا جو میں نے کہا تھا کہ وہ خدائے قادرِ مطلق ہے' اس کے ایک ارادے سے کائنات وجود میں آسکتی ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ انسانی دنیا کے اندر جو اس کے اپنے کام ہیں' وہ انہیں براہِ راست خود نہیں کرتا' انسانوں کے ذریعے سے کراتا ہے۔ اِسی لیے کہا کہ وَاصْطَـنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ (20:40)۔اس طرح ہم نے تجھے اپنے ایک خاص کام کے لیے منتخب کرلیا۔اب معلوم ہوا کہ یہ جو کہا تھا کہ آپ کا بڑا شکریہ' آپ نے بہت بڑا احسان کیا کہ مجھے نبوت سے سرفراز کیا۔ ذرا دیکھو تو سہی' یہ تھی وہ پوری داستان۔ بہرحال' وہ بات جو ہم نے تمہیں برسبیلِ تذکرہ سمجھا دی' وہ بات اصل میں یہ تھی کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ (20:42)۔اب تم اور تمہارا بھائی دونوں ہمارے قوانین لے کر فرعون کی طرف جاؤ۔ اب یہاں ہے کہ وَلَا تَـنِيَا فِیْ ذِکْرِیْ (20:42)۔اور دیکھنا! میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے میں ذرا بھی سستی نہ کرنا۔ہم نے جو کہہ دیا ہے کہ تمہاری دعا قبول ہوگئی' ہم نے دیدیا جو کچھ تم نے مانگا تھا' تو اس کے بعد پھر یہاں سو نہ جانا' ہمارے ذکر میں سستی نہ کرنا' عزیزانِ من! میں نے آپ کو ذکر کے معنی تو بتائے تھے۔ یہاں کہا کہ اس میں سستی نہ کرنا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ اس مہم کے لیے روانہ ہوگیا اور جب اس کا بھائی حضرت ہارون علیہ السلام بھی اس کے ساتھ آملا تو انہی ہدایات کا پھر اعادہ ہوا اور ان سے کہا گیا کہ اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّـهٗ طَغٰی (20:43)۔تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ۔ وہ اپنے ظلم و ستم میں حد سے زیادہ آگے بڑھ گیا ہے۔ اس کی سرکشی کی

کوئی انتہا نہیں رہی۔ اب یہاں ''اذھبا'' آیا ہے۔ (تم دونوں جاؤ) پہلے ''اذھب'' تھا کہ تُو جا۔ اب کہا کہ ٹھیک ہے تو اور تیرا بھائی دونوں، فرعون کی طرف جاؤ، وہ بڑا ساحل شکن، حدود فراموش ہو گیا ہے۔

قوت اگر ساحلوں میں نہ رہے تو پھر بستیوں کی بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں

عزیزانِ من! قرآن کے کیا الفاظ ہیں! پانی دریا میں ہو، ساحلوں کے اندر ہو، نہر کے اندر رہو، تو ممدِ حیات ہوتا ہے، زمینِ مردہ تک کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ وہی پانی جب ساحل توڑ دیتا ہے، چلتی پھرتی بستیوں کو موت کے گھاٹ سلا دیتا ہے۔ اسے طغیٰ کہتے ہیں۔ قوت بُری چیز نہیں ہے۔ قوت کا حدود فراموش ہو جانا بُری چیز ہے۔ یہاں کہا کہ جا کے روکو۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جتنا بھی پانی ہے اسے ضائع کر دو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بند بنا دو تا کہ پانی ساحلوں کے اندر بہے۔ ایک لفظِ طغیٰ ہے جس میں یہ سب مفہوم موجود ہے۔ عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ قرآن کے کسی لفظ سے بھی یوں ہی آگے نہ چلے جایئے۔ اس کے اندر بڑی بڑی معنی خیز چیزیں ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اس کی طغیانی کو روکو، پانی کو ختم نہیں کرنا، اس لیے یہ کرو، اول تو قومِ موسیٰ کے ساتھ وہاں جو کچھ فرعون کے ہاتھوں ہو رہا تھا وہی کچھ کم نہیں تھا۔ غصے کے لیے کہا کہ بردباری اور تحمل سے کام لینا۔

بردباری کے ساتھ تحمل مزاجی کی بھی تاکید

عزیزانِ من! اراکینِ سلطنتِ فرعون نے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف جو سازش کی تھی کہ پکڑ لو اور پھانسی دیدو، وہی کچھ کم نہیں تھی۔ پھر اس کے بعد فرمانِ خداوندی میں یہ کہا گیا کہ جاؤ، اس کے ساتھ ٹکراؤ۔ اس سے بھی ایک خاص قسم کے جذبات ابھرنے تھے۔ کچھ یوں بھی نظر آتا ہے کہ آپ طبعًا بھی کچھ غصہ ور تھے، اس لیے کہا کہ دیکھنا جب اس کی طرف جاؤ تو فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (20:44)۔ اس سے نرمی سے بات کرنا۔ ''جاندے ای گل نہ پیجائیں اوہدے۔'' [1] بات کی ابتداء بڑی نرمی سے کرنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے کہ یہ تو خدا کی رحمت تھی کہ تُو بہت نرم دل واقع ہوا تھا، اگر کہیں سخت مزاج ہوتا، تنگ دل، ترش رو ہوتا تو تیرے پاس سے یہ سارے بھاگ جاتے۔ یہ نرم دل، بردبار اور تحمل مزاج ہونا بھی نہایت ضروری ہے تو یہاں تو اتنا بڑا دشمن ہے جس کے خلاف ٹکراؤ کے لیے تجھے بھیجا جا رہا ہے، ہدایت دی جا رہی ہے۔ نظر آتا ہے کہ جسے ہم Otherwise (بصورت دیگر) کہتے ہیں کہ اگر انہیں اپنے آپ پہ چھوڑ دیا جاتا تو یہ واقعی جا کے گریبان سے پکڑ لیتے اور پھر یہ کہ ''صاحب سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔'' [2] وہ اللہ ساتھ ہے: خدا

---

[1] جاتے ہی ہتھوڑا مار انداز نہ اختیار کرنا۔

[2] یہ مثل ہے کہ ''جس کا رشتہ دار یا واقف کار حاکم ہو، اسے قانون کا ڈر نہیں ہوتا۔''

نے کہا تھا کہ میں تمہاری سنتا جاؤں گا اور تمہیں دیکھتا بھی جاؤں گا۔ وہ دیکھنے والا' سننے والا' یقین دلا دینے والا' یہ سب کچھ مل گیا ہے' اس نے مجھے بھیجا ہے' اور اس کے بعد جب اتنی تائید' اتنے مددگار' اتنا سب کچھ حاصل ہو تو آدمی کیوں نہ اس کے گلے پڑ جائے۔ اس لیے خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ جا کے نرمی سے بات کرنا۔

لفظ خَشِیَ کا مفہوم

لَعَلَّهٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی (20:44)۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس طرح نصیحت پکڑ لے یا اپنی سرکشی کے عواقب سے ڈر جائے۔ اسی لیے کہا تھا کہ نرمی سے بات کرو گے تو جو کچھ اسے سمجھاؤ گے کہ تمہارے یہ جو غلط اقدامات ہیں' ان کے نتائج تمہارے حق میں کتنے نقصان دہ ہیں' شاید یہ بات اس کی سمجھ میں آ جائے' اور اپنے اعمال کے نتائج کو دیکھ کر شاید وہ ڈر جائے۔ **یخشی** سے پہلے "**یتذکر**" آیا' پھر ہے "**او یخشٰی**" یعنی پہلے آرام سے' نرمی سے' دھیمے لہجے سے' بات سمجھانا۔ قرآن نے خود کہا ہے **اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَةِ وَ الۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ** (16:125)۔ اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ دعوت دیتے چلے جاؤ۔ یعنی خدا کی طرف بلانا ہو تو ہمیشہ موعظت حسنہ سے بلایا کرو۔ یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ فرعون کو یاد دلاؤ کہ تمہاری غلط روش کیا ہے؟ اور اس کے نتائج کیا ہیں؟ نرمی سے کہو گے تو وہ سننے کے لیے آمادہ ہوگا' اور پھر اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس غلط روش کے تباہ کن مآل کو دیکھ کے جھک جائے۔ **خَشِیَ** کے معنی ''ڈرنا'' غلط ہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''جھکاؤ پیدا ہو جانا' کسی کام کے انجام کا علم ہونے کی وجہ سے اس سے اندیشہ کرنا یا اسے ناپسند کرنا' اس امر کا احساس ہونا کہ اگر قوانینِ خداوندی کے مطابق نہ چلے تو سعی و عمل کی کھیتی جھلس کر رہ جائے گی''۔ یہ احساس خشیت ہے۔ اس میں جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔

یہاں خشیت کہا ہے۔ آگے کہا کہ **قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ یَّفۡرُطَ عَلَیۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ یَّطۡغٰی** (20:45)۔ ان دونوں نے کہا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ڈر ہے کہ فرعون ہماری مخالفت میں پیش دستی نہ کرے یا سرکشی سے پیش نہ آئے۔ کہا کہ ہم دونوں جا رہے ہیں۔ جب اکیلے جا کے اس سے بات کریں گے تو وہ بات تو سمجھ لے گا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ ہم اکیلے ہونگے تو ڈر یہ ہے کہ وہ ہمیں اکیلے جان کے ہم پہ ہاتھ نہ ڈال دے اور پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو وہ بھی یاد تھا کہ بھاگا ہوا ہوں' کہیں اس جرم کی پاداش میں وہ گرفتار نہ کرلے۔ کہا کہ تم جاؤ تو سہی۔ **قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِیۡ مَعَکُمَاۤ** (20:46)۔ خدا نے کہا کہ تم مت گھبراؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' ڈرو نہیں۔ یہاں ایک ہی لفظ ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس میں سب کچھ ہی کہہ دیا' بڑی چیز ہے۔ جنہیں یہ یقین دلا دیا جائے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' انہیں اور کیا چاہیے؟ بات میں سے بات نکل آئی' یہاں خدا کو یہ کہنا پڑا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' انہیں یقین دلانا پڑا۔ ذہن بوقت ہجرت ''غار'' کی طرف چلا گیا جب حضرت ابوبکر صدیق [1] آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریکِ سفر تھے۔

---

[1] آپؓ اسلام کے پہلے خلیفہ تھے' اصل نام عبداللہ ہے اور صدیق لقب ہے۔ آپ کا دورِ خلافت 11ھ تا 13ھ بمطابق 632 تا 634ء ہے۔
(Rauf, Abdur Dr: Illustrated History of Islam, Ferozsons (Pvt) Ltd, Lahore, 1994,P.37)

غار میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [1] کی پریشانی اور خدا کی طرف سے سہارا

عزیزانِ من! غارِ ثور کا یہ ایک واقعہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ غار کے اندر دو فرد دشمنوں سے چھپے ہوئے تھے۔ ایک ہمارے نبی ختم المرتبت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ (571-632AD) تھے اور دوسرے جنہیں قرآن نے' خدا نے' دوسرے کا صحابی "یا صاحب" کہہ کے پکارا ہے۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق تھے' جن کی پیشانی پہ کچھ پریشانی کے آثار دیکھ کے اس دوست [2] نے یہ کہا: لَا تَحْزَنْ (9:40)۔ پریشان نہ ہو۔ وہ اپنی وجہ سے پریشان نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوست [3] کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا جو دنیا میں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ تم سب یاد رکھو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہونا چاہیے۔ یہ جو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اس کے متعلق کچھ پریشانی تھی کہ میرے جیسے تو بیسیوں اس کے صدقے ہو جائیں' اس پہ کہیں کوئی آفت نہ آ جائے۔ یہ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ بھانپنے والے نے بھانپ لیا۔ عزیزانِ من! داستانِ صاحبِ ضربِ کلیم میں اس چیز پہ خیال آ رہا ہے جہاں خدا کو انہیں یہ کہنا پڑا تھا کہ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ (20:46)۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' یہاں اس نے یہ کہا کہ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40)۔ پریشان نہ ہو' غم نہ کھاؤ' یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے۔ کہنے والے نے کس سکونِ قلب سے کہا' سننے والے نے کس نفس سے سنا کہ پھر کوئی کسی قسم کے غم اور حزن کے آثار بھی باقی نہ رہے۔ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40)۔ اسی طرح یہاں کہا کہ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ (20:46)۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ پھر خدا نے کہا کہ اَسْمَعُ وَاَرٰی (20:46)۔ میں سب کچھ سنتا ہوں' سب کچھ دیکھتا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں بہرا نہیں ہوں' سب کچھ سنتا ہوں۔ اندھا نہیں ہوں سب کچھ دیکھتا ہوں' یہ تمہارا ساتھی ایسا ہے' اس لیے فرعون تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکے گا۔ یہ وہاں تھا۔ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا (20:35)۔ تو ہم دونوں کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے اور جانتا ہے کہ ہم دونوں مل کر کس طرح اس مہم کو سر کریں گے۔ ایک بات یہ بھی مانگی تھی کہ دیکھنا' ہم جا رہے ہیں' ذرا ہمارا دھیان رکھنا۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! تمہیں پتہ ہے کہ اَسْمَعُ وَاَرٰی (20:46)۔ میں سنتا بھی ہوں' اور دیکھتا بھی ہوں۔ حقائق تو اتنے لذیذ ہیں کہ آگے بڑھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ لیکن بہرحال آگے بھی تو بڑھنا ہی ہے۔ کہا: فَاْتِیٰہُ (20:47)۔ اس کے پاس جاؤ۔ فَقُوْلَآ (20:47)۔ اسے جا کے کہو کہ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ (20:47)۔ ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ہم اپنی طرف سے تمہیں کوئی بات کہنے کے لیے نہیں آئے۔ ہماری ذاتی فرمائش کوئی نہیں' اپنا کام کوئی نہیں ہے۔ ایک پیغام ہے

---

[1] آپؓ اسلام کے پہلے خلیفہ تھے' اصل نام عبداللہ ہے اور صدیق لقب ہے۔ آپ کا دورِ خلافت 11ھ تا 13ھ بمطابق 632 تا 634ء ہے۔
(Rauf, Abdur Dr: Illustrated History of Islam, Ferozsons (Pvt) Ltd, Lahore, 1994,P.37)

[2] اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (9:40)۔ جب اس نے اپنے "صاحب' رفیق" سے کہا: غم نہ کھاؤ۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

[3] حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

تمہارے لیے۔ آج بھی یہی انداز ہے اور اس زمانے میں بھی یہی ایک روایت چلی آ رہی تھی کہ قاصد کو، پیامبر کو، کچھ نہیں کہتے تھے۔ تو وہ جو ان کے ہاں کے آداب ہیں انہیں بھی پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے۔

فرعون کا دعویٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی خدا کا پیغام

عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہم تو صرف قاصد ہیں، پیامبر ہیں، کسی کا پیغام لے کے آئے ہیں اور وہ پیغام ہے: **رَبِّکَ** (20:47)۔ تیرے پروردگار کا۔ لو اس سے بڑی بات اسے اور کیا کہنی تھی یعنی اس کا دعویٰ تو یہ تھا کہ **اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی** (79:24)۔ میں تمہارا رب ہوں۔ اسے کہا کہ ٹھیک ہے تُو ان سے جو کہتا ہے کہ میں تمہارا رب ہوں۔ ''اسیں اوہدے کولوں آئے اں جیہڑا تیرا رب ہے'' [1] عزیزانِ من! سوچیے یہ قرآن ہے۔ جی؟ کیا کہنے کے لیے آئے ہو؟ کہ جی، کچھ نہیں، تم سے کچھ نہیں مانگنے کے لیے آئے، کچھ چھیننے کے لیے نہیں آئے۔ **فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ** (20:47)۔ تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ **وَلَا تُعَذِّبْهُمْ** (20:47)۔ اور ان پر اس قدر سختیاں نہ کرو۔

حاکم کے پاس اگر محکوم نہ رہے تو حکومت کا ہے کی؟

عزیزانِ من! فرعون سے یہ کہا کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے۔ ان پہ عرصہ حیات تنگ نہ کر، ان کو نہ ستا، ان بے چاروں کو عذاب نہ دے، تو یہ بات کہ انہیں ہمارے ساتھ جانے دے، تمہاری مملکت تمہیں سلامت، تمہاری بادشاہت تمہیں مبارک ہو، ہم نہیں چھین رہے۔ تم کو سلامت رہے تمہاری قوم سلامت رہے، حکومت کرو، بادشاہت کرو، مگر انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ جی! بڑی چھوٹی سی بات کہی۔ حاکم کے پاس اگر محکوم قوم کو نہ رہنے دیا جائے تو حکومت کس پر کرے گا۔ یعنی بات یوں ایسی ہے جیسے اس سے کچھ نہیں چھینا جا رہا۔ تو سب کچھ تو چھینا جا رہا ہے۔ حاکم کو تو ایک محکوم چاہیے۔ وہ حاکم کہلا ہی نہیں سکتا جب تک اس کا کوئی محکوم نہ ہو۔ جس پر حکومت کی جائے گی وہ ہوگا تو یہ حاکم ہوگا۔ اگر وہی نہ رہے تو یہ حاکم کا ہے کا رہا؟

مغربی جمہوریت کے خلاف قائداعظم کا مطالبہ

عزیزانِ من! اس دور میں سب سے بڑا فریب جو انسانوں کو، محکوموں کو، دیا گیا ہے وہ مغرب کا یہ نظریہ ہے جسے ڈیماکریسی یا جمہوریت کہا جاتا ہے۔ اس میں بنیاد یہ ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس قوم پہ کوئی دوسرا حاکم نہیں ہوتا، وہ قوم خود اپنے اوپر حاکم ہوتی ہے، منطق

---

[1] ہم اسی کے ہاں سے آئے ہیں جو تیرا پروردگار ہے۔

طور پہ غلط ہے یعنی آپ ہی حاکم ہوتی ہے، آپ ہی محکوم ہوتی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بعینہ یہی بات تھی جو آج سے چند سال پہلے بھارت میں، ہندوستان میں، تحریکِ پاکستان کے دوران، قائدِ اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ (1876-1948) نے کہی تھی۔ وہ ان سے کہہ کیا رہے تھے کہ تمہارا ملک تمہیں مبارک، تمہاری حکومت تمہیں مبارک، تم خوشی سے حکومت کرو، صرف اتنی سی بات کرو کہ یہ جو تم نے یہاں بنی اسرائیل اپنی غلامی میں دبا رکھے ہیں، انہیں الگ میرے ساتھ جانے دو۔ بس حضرت موسیٰ علیہ السلام اتنی سی ہی بات کہہ رہے تھے۔ دیکھا آپ نے کتنی مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ کیوں مخالفت ہو رہی تھی؟ کہ انہیں لے جاؤ گے تو پھر ہم حکومت کس پہ کریں گے، وہ تو ہندو نے مسلمان سے ہزار سال کی غلامی کا انتقام لینا تھا۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندو نے بے شمار قوموں کو ہضم کر لیا

عزیزانِ من! تین چار ہزار سال سے ہندو کی جو تاریخ سامنے آ رہی ہے اس میں کیفیت یہ تھی کہ جو قوم بھی باہر سے آئی، یہ اسے نگل گئی۔ اس لیے وہاں آپ کو ہندو کے علاوہ کوئی دوسری قوم نظر نہیں آتی حالانکہ اس دوران میں، صدیوں میں، سینکڑوں قومیں فاتح کی حیثیت سے باہر سے آئیں، ملک پہ قبضہ کیا، حکومت قائم کی لیکن اس کے باوجود اس ملک میں کسی ایک کا نام بھی الگ قوم کی حیثیت سے نہیں ہے۔ کہیں کہیں ان کی ذاتیں اور گوتیں ہیں، ان سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی کوئی الگ قوم تھے لیکن ہندو سب کھا گئے، ہضم کر گئے، اسی لیے الطاف حسین حالی[1] (1837-1914) نے انہیں اکال الامم کہا تھا یعنی قوموں کو نگل جانے والی۔ لیکن مسلمان ایک سخت ہڈی تھی، یہ انہیں ہضم نہیں کر سکے۔ یہ ان کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی تھی، جس سے یہ بہت ڈرتے تھے۔

مسلمانوں کے لیے تو ہندو دانت پیستا تھا

عزیزانِ من! انگریز کو پاک و ہند سے نکالنے کا سارا داعیہ، حبِ علی نہیں تھا، یہ بغضِ معاویہ تھا۔ ان کے دل میں مسلمان سے بدلہ لینے کا ایک انتقامی جذبہ تھا جس کے لیے وہ چاہتے تھے کہ انہیں نکال کے حکومت اپنے ہاتھ میں کر لیں تو ''پھیر تہانوں دس دیاں گے۔''[2] میں نے تو انہیں دانت پیستے ہوئے دیکھا ہے، عزیزانِ من! میں تحریک پاکستان کے ساتھ درونِ خانہ بھی شامل تھا۔ میں نے پٹیل کو

---

[1] واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے وہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت (حالی)

[2] تو پھر تمہیں پورا پورا بتا دیں کہ ہم دراصل کون ہیں۔

دانت پیستے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ منسٹر بھی [1] تھا: ٹھیک ہے ذرا انگریز کو جا لینے دو' وہاں یہ بات تھی جوان سے کہی گئی تھی کہ انہیں لے کے ہمیں الگ ہو جانے دو۔ تو آپ نے دیکھا کہ اس کی کتنی مزاحمت ہوئی تھی۔ اب تو پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ دور جمہوریت کا ہے' یہ دور علم و بصیرت کا ہے۔ اُس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تو کچھ ایسی بات زبان پہ کھلے بندوں لا بھی نہیں سکتے۔ وہ تو فرعونیت کا زمانہ تھا' وہ کب بنی اسرائیل کو ساتھ جانے دیتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہم جو تمہارے پاس آئے ہیں تو یونہی تم سے دھاندلی سے یہ بات نہیں کہہ رہے یا منوا رہے۔ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ (20:47)۔ ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔

ہم تو دلیل سے بات کرینگے قانون کی بات کریں گے

عزیزانِ من! حضرت موسیٰ و ہارونؑ نے کہا کہ ہم جو تم سے کہہ رہے ہیں اُس کے لیے ہمارے پاس خدا کی طرف سے دلائل ہیں' ہمارے پاس اصول ہیں' ہمارے پاس قانون کی بات ہے۔ بات کر کے دیکھ لو۔ اس کے بعد قرآن نے درمیان کی کڑی چھوڑ دی ہے' درمیان میں یہ آیا ہوگا کہ اگر بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ نہ بھیجا تو پھر ٹکراؤ ہوگا اور اس کے بعد اگلی بات یہ کہی کہ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (20:47)۔ اگر تم اس راستے پر چلو گے جو خدا کا بتایا ہوا ہے تو تمہارے لیے سلامتی ہوگی۔ اسے یاد رکھو کہ پھر سلامتی اسی کے لیے ہوگی جو خدا کے راستے پر چلنے والا ہوگا۔ یاد رکھو! وہی بچ سکے گا۔ آپ نے کئی دفعہ یہ ٹکڑا لکھا ہوا دیکھا ہوگا۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اب یہ ہمارے مولوی صاحبان یہ کہاں لکھتے ہیں؟ یہ ٹکڑا وہاں لکھتے ہیں جس سے انہیں اختلاف ہوتا ہے۔ بزعمِ خویش اسے تو پھر وہ مسلمان سمجھتے ہی نہیں ہیں تو اس کے خلاف جو لکھنا شروع کرتے ہیں تو وہاں السلام علیکم نہیں لکھتے بلکہ یہ لکھتے ہیں: اَلسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ

---

[1] ولبھ بھائی (سردار) پٹیل کے پاس متحدہ ہندوستان میں مرکزی حکومت امورِ داخلہ اور امورِ معلومات و نشریات کی وزارت کا قلمدان تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف منافرت پھیلانے میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہا۔ اس نے شملہ میں کیبنٹ مشن (Cabinet Mission) کی مئی 1947ء میں منعقدہ کانفرنس میں کانگرس کی طرف سے شمولیت کر کے عبوری حکومت کے متفقہ فیصلے کو سبوتاژ کیا۔ اس کے پاس Home Portfolio (وزارت داخلہ کا قلمدان) تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر سبوتاژ کے اس کام کو روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ مرکزی حکومت سے تو دستبردار ہو جائے گا لیکن Home Department (امور اخلہ) چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ مزاجاً مطلق العنان تھا اور مخالفت کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا۔ اپنی وزارت کے دورانِ مرکزی حکومت کے امورِ وزارتِ مالیات و قانون کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے جوڑ توڑ کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ہندو لیڈروں کو اپنا ہمنوا بنا کر پاکستان کے ڈھانچے خاص کر امورِ مالیات کو کمزور کرنے میں ہمہ تن مصروف رہا۔ اس کی للکار کے الفاظ یہ ہیں:

The Indian Union will be so powerful that the remaining portions (East and west Pakistan) will eventually come in. (Chaudhri, Muhammad Ali: The Emergence of Pakistan, Research Society of Pakistan, Lahore, PP.29,83,92 & 334)

اتَّبَعَ الْهُدٰى (20:47)۔اگر تم اس راستے پر چلو گے جو خدا کا بتایا ہوا ہے تو تمہارے لیے سلامتی ہوگی۔ یہ ہمارے ہاں ان کی ایک روش ہوگئی ہے کہ السلام علیکم تو مسلمان سے کہا جاتا ہے۔اب اسے کھلے بندوں غیر مسلم بھی نہیں کہتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا کہ سلام اس کے اوپر ہے جو ہدایت کا اتباع کرے۔تو انہوں نے یہ بات کہی تھی۔ یہ السلام علیکم والی بات نہیں تھی۔السلام علیکم میں السلم کے معنی ہیں کہ پھر سلامت وہی رہے گا' بخیر و عافیت وہی رہے گا' جو الھدیٰ کے مطابق چلے گا۔کہا: اسے یاد رکھ' یہ اس قسم کا ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (20:48)۔لیکن اگر تم پیغامِ خداوندی کو جھٹلاؤ گے اور اس سے سرتابی اختیار کرو گے' تو پھر تباہی اور بربادی کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ہم یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے' خدا نے ہم سے یہ بات کہی ہے کہ یاد رکھو! جو بھی ہمارے قوانین کی تکذیب کرتا ہے یا اس سے گریز کی راہیں نکالتا ہے' وہ تباہ ہو جاتا ہے' یعنی یہ ہے مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (20:48)۔ جو قوانینِ خداوندی کو جھٹلاتا ہے' ان پر عمل نہیں کرتا' ان سے سرتابی اختیار کرتا ہے۔

تکذیبِ دین کا مفہوم

عزیزانِ من! وقت نہیں ہے ورنہ میں آپ سے عرض کرتا کہ تکذیب کیا چیز ہوتی ہے؟ تکذیب ہوتی ہے ''زبان سے کہتے جانا کہ ہم اس پہ ایمان لائے' ٹھیک ہے' لیکن اپنے عمل سے ثابت کرنا کہ یہ بات جھوٹی ہے''۔مثلاً قرآن نے یہ کہا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:21)۔ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' زبان سے قرآن کی یہ آیت پڑھتے جانا' اور ساری کوشش بھی کرنا کہ ظلم کی وجہ سے کھیتی پنپ جائے یعنی خدا کی اس بات کو جھوٹا کر کے بتا دیا جائے کہ دیکھو' پنپتی ہے یا نہیں۔۔اسے کہتے ہیں تکذیب۔اور اگلی چیز یہ ہوتی ہے کہ بظاہر ایسا نظر آئے کہ آپ ٹھیک چلے جا رہے ہیں مگر گریز کی راہیں یوں نکال دینا یا یوں ہو جانا جسے آپ تاویل یا تاویلات کہتے ہیں۔ یہ بھی تکذیب ہے۔اس سے ان کے لیے تباہی ہے۔قرآن اس زمرے میں یہ دونوں چیزیں لے آیا ہے۔ بہر حال' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا تھا کہ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (20:47)۔ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ وہ تو تیرا بھی رب ہے' ہمارا بھی رب ہے' درآنحالانکہ فرعون کا تو خود دعویٰ رب ہونے کا تھا لیکن کہا یہی کہ ہم تیرے رب......نشو ونما دینے والے...... کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون کا ایک سوال کہ وہ کون ہے جسے تم رب کہتے ہو؟

عزیزانِ من! یہ دونوں بھائی فرعون کے پاس پہنچے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا۔اس پر فرعون نے کہا کہ قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى (20:49)۔اے موسیٰ علیہ السلام! پہلے یہ بتاؤ کہ (جس رب کی طرف سے تم یہ پیغام لائے ہو) تمہارا وہ رب ہے کون؟ (تم جانتے ہو کہ ہر قبیلہ اور ہر قوم کا...... دیوتا...... الگ الگ ہوتا ہے۔تمہارا رب کون سا ہے؟) یہاں فرعون نے اسی بات کو دہرایا کہ جس کی طرف

سے تم کہتے ہو کہ ہم پیامبر آئے ہیں وہ ہے کون؟ اچھا! تو پوچھتا یہ ہے کہ وہ ہے کون؟ **قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی** (20:50)۔ موسیٰ نے کہا کہ ہمارا رب' کسی خاص گروہ یا قوم کا رب نہیں۔ ہمارا رب وہ ہے جو ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے (جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ انسانوں تک یہ راہنمائی وحی کے ذریعے آتی ہے جسے لے کر ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔) عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ یہ فقرہ آپ یورپ کے سائنسدانوں سے پوچھیے۔ وہ بتائیں گے کہ کس زمانے میں' کس سے کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ سائنسدان کہیں گے کہ یہ بات کتنی جامع طور پر کہی ہے۔ تم رب کا پوچھتے ہو' جس نے ہر شے کو پیدا کیا۔ آگے یہ بات آئے گی کہ فرعون نے یہ کہا تھا کہ یہ زمینیں کس کی ہیں؟ یہ نہریں کس کی ہیں؟ یہ پانی کس کا ہے؟ یہ تو ہمارا ہے' جس پر موسیٰ نے کہا کہ رب وہ ہے جس نے تمہیں اور ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور تخلیق کے ساتھ اگلی شے یہ کہی کہ **خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی** (20:50)۔ ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر شے کو پیدا کرنے کے بعد ان کے اندر یہ چیز رکھ دی کہ وہ اپنی اپنی منزل پہ کس طرح سے پہنچ سکتی ہیں۔ میرے رب نے ان کے اندر یہ بات رکھ دی۔ انہیں یونہی مشین کی طرح پیدا نہیں کر دیا' بلکہ پیدائش کے ساتھ ہی یہ کیفیت رکھ دی ہے کہ یہ اشیاء منزلِ مقصود تک کیسے پہنچ سکتی ہیں۔

پرندوں کی مثال سے لفظ ھدیٰ کا مفہوم

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی چار ہی دن پہلے تک یہ چڑیا اور چڑے' نہایت امن و سکون سے' اپنے ہاں دانا دنکا چگتے' کھاتے' پیتے' اپنے گھونسلوں میں بسیرا کرتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی اور بات ہی نہیں تھی۔ کوئی کسی قسم کی دوسری نرالی ابنارمل Abnormal۔ معمول سے ہٹی ہوئی چیز یا Extra Ordinary (غیر معمولی) چیز نہیں آئی تھی' لیکن جب یہ بہار کا موسم آیا' ان کے بچے پیدا کرنے کا زمانہ آیا' انہیں کسی نے آ کے نہیں کہا کہ اب وہ زمانہ آ رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ ان کے اندر کس طرح سے وہ تڑپ پیدا ہو گئی۔ وہی چڑے چڑیا یہاں آتے تھے' اڑ کے چلے جاتے تھے۔ اب بہار کے موسم میں یہ سارا دن ایک ایک تنکا چگ چگ کر لاتے ہیں' جہاں کہیں ان تنکوں کو اٹکانے کا ذرا سا نشان نظر آتا ہے' وہاں لا کے جمع کرتے رہتے ہیں' پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ بیس دفعہ ان کے ہاں جو وہ چار تنکے ہیں اٹھا کے پھینک دیجیے وہ پھر انہیں جمع کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انہیں دن بھر' نہ دانہ دنکا چگنے کا' نہ کہیں آرام کرنے کا ہوش رہتا ہے۔ کچھ نہیں' بس لگے ہوئے ہیں وہ صاحب! چلے ہوئے ہیں ایں و آں سے بے خبر اپنے کام پہ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب (1797-1869) بڑے حسین انداز میں یہ بات کہہ جاتا تھا:

چاک مت کر جیب' بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے [1]

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002ص' ۔ 174

کوئی پرندہ اپنے ہم جنس سے اپنی خدمت گزاری کا معاوضہ نہیں مانگتا

عزیزانِ من! یہ اُدھر کا ''اشارا'' ہوتا ہے: لگے ہوئے ہیں پاگلوں کی طرح۔ انہیں نہ کوئی اپنی منفعت کا خیال ہے اور نہ ہی اپنے کسی مفاد کا۔ یہ منفعت و مفاد کا خیال تو آدمی کرتا ہے۔ انہیں اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا' یہاں انہیں منفعت و مفاد کا کچھ پتہ نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد وہ انڈے دیتے ہیں۔ چڑیا انڈے سیتی ہے' چڑا جا جا کے اس کی خدمت گزاری کے لیے لاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے کھانے کا انتظام کرتا ہے۔ اس چڑیا سے کچھ نہیں مانگتا۔ یہ تو انسان ہے جو اس زمانے میں بھی جب کہ وہ بیچاری بیوی محتاج ہو جاتی ہے' یہ اس کا معاوضہ طلب کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں تمہاری ساری ضروریات پوری کرتا ہوں۔ چڑا کبھی چڑیا سے یہ نہیں کہتا' کبھی نہیں کہتا' اس لیے کہ وہ ہدایتِ خداوندی پہ ہوتا ہے۔ یہ کمبخت اِنسان مفادِ خویش کے پیچھے ہوتا ہے۔ دیکھا! ھدیٰ کیا کرتا ہے۔ اگر یہ انسان بھی ہدایت پر ہو تو یہ بھی اسی طرح سے یہ سب کچھ اس زمانے میں اس کی خدمت گزاری کے لیے کرے جس طرح وہ چڑا چڑیا کی کرتا ہے۔ بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے لیے آپ دیکھیں کہ کہیں سے اگر ذرا سا دانہ بھی ملتا ہے تو چڑیا آتی ہے چیں چیں کرتی ہے اور وہ دانہ بچے کے منہ میں ڈال رہی ہے۔ خود بھوکے رہ رہے ہیں' بچوں کو کھلا رہے ہیں۔ کاہے کے لیے؟ پھر اس میں ذرا سے بال و پر نکلتے ہیں تو ''وہ پُھر کر کے اڑ جاندے نیں۔ اے فیر چڑی چڑا ای رہیہ جاندے نیں بیچارے۔''[1] پھر یہ بھی نہیں ہے کہ یہ کچھ صرف ایک دفعہ ہی ایسا ہوا ہو جس پر کہا جائے کہ بھئی! یہ تو بڑی بُری بات ہے' یہ تجربہ تو کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پھر جب وہ اُدھر کا ''اشارا'' ہوتا ہے' وہ پھر وہی کچھ شروع کر دیتے ہیں۔ **اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی** (20:50)۔ رب ہر شے کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے وہ راستہ بتا دیتا ہے' جس پر چل کر وہ شے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتی ہے۔ اسی لیے کہا کہ یہ ھدیٰ ہر شے کے اندر رکھ دی کیونکہ اسے منزل تک پہنچنا ہے۔ سنتے ہو' عزیزانِ من! وقت تو تھوڑا سا ہے لیکن وقت میں مانگ لوں گا۔ سورۃ الشعراء میں اس کی ذرا تفصیل دی ہے۔ (26:17) سے بات شروع ہوئی ہے۔ اگر آپ کے پاس قرآنِ کریم کے نسخے ہیں تو نکالیے۔ یہ بڑی تفصیل سے ہے: **اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ** (26:17)۔ تم بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اس پر فرعون نے یہ کہا ہے کہ **قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّکَ فِیۡنَا وَلِیۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِیۡنَا مِنۡ عُمُرِکَ سِنِیۡنَ** (26:18)۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے بچپن سے اپنے ہاں تمہاری پرورش کی۔ اور تم نے اپنی عمر کا ایک حصہ ہمارے ہاں بسر کیا۔ عزیزانِ من! دیکھیے کہ فرعون کس انداز میں کہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام! تم کیا کہہ رہے ہو' تمہیں یاد ہے کہ ہم نے تم پہ کتنے احسان کیے' تم اتنے سے چڑیا کے بوٹ[2] کی طرح تھے جب یہاں محلات میں آئے تھے۔

---

[1] وہ بچے تو فوراً اڑ جاتے ہیں پھر وہ بے چارے چڑا' اور چڑیا' ویسے کے ویسے ہی' تن تنہا' رہ جاتے ہیں۔

[2] چڑیا کا نوزائدہ بچہ

ہم نے تمہاری پرورش کی' محکوم قوم کے ایک فرد ہوتے ہوئے' شہزادوں کی طرح تم یہاں جیے۔ یہ سب کچھ تمہارے ساتھ کیا۔ اب بھی تم آئے ہو تو ہم نے تم پہ ہاتھ نہیں ڈالا۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (26:19)۔ لیکن تم نے اِن احسانات کا بدلہ یوں دیا کہ خود ہماری ہی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر ڈالا...... تم کیسے ناشکر گزار آدمی ہو؟ عزیزانِ من! انداز دیکھیے۔ فرعون کہتا ہے کہ دیکھتے ہو' ہم نے تم پہ کتنے احسانات کیے اور تمہاری کیفیت یہ کہ ان کا بدلہ ''ایوں آ کے دیتے ہو''[1] کہ بنی اسرآئیل کو میرے ساتھ بھیج دو' جبکہ ہم نے تم پر یہ احسان کیا' وہ احسان کیا۔ فرعون کو پتہ نہیں کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں؟

موسیٰ علیہ السلام نے کہا: سب سے بڑا احسان تو تم بھول ہی گئے

عزیزانِ من! اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: جی' آپ نے جو فرمایا یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں تو ایک بات اور کہوں گا کہ ایک سب سے بڑا احسان ہے' وہ تو آپ بھول ہی گئے' وہ آپ نے یاد نہیں دلایا۔ وہ میں یاد دلائے دیتا ہوں' اِسے بھی ذرا دہرا دیجیے: وَتِلْکَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَیَّ (26:22)۔ تم اپنے احسانات کا بدلہ چاہتے ہو۔ یہ سارے احسانات ہیں جو تم گناتے ہو۔ تم نے سب سے بڑا احسان نہیں گنایا اور وہ یہ ہے کہ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (26:22)۔ پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کے شکنجے میں جکڑے رکھا ہے۔ تم اپنے احسانات کا بدلہ یہی چاہتے ہو۔ اسے بھی تو ذرا گناؤ' تم احسانات شمار کرا رہے ہو۔ قصاب بکرے کو احسان گنا رہا ہے: گھاس کا انتظام کرتا ہوں' دانے کا انتظام کرتا ہوں' تمہاری حفاظت کرتا ہوں' مینہ سے بچاتا ہوں' بھیڑیوں سے بچاتا ہوں۔ احسانات گنا رہے ہو۔ بکرا کہتا ہے: جی! تم ایک بات بھول گئے' وہ چھری رکھی ہے' اس کا بھی ذرا یہاں ذکر کر دیجیے۔ یہ ہے تمہارا وہ احسانِ عظیم! کیا بات ہے! بات خدا کے رسول سے ہو رہی ہے' اسی لیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ ذرا میری زبان کی طلاقت کو بھی تھوڑا سا کھول دیجیے (26:27)' ان سے بات کرنی ہے' کن الفاظ میں بات کی ہے: شکریہ آپ کے احسانات کا لیکن ایک احسان اور بھی ہے وہ آپ بھول گئے تھے۔ وہ میں بتا دوں۔ وہ احسان یہ ہے کہ اس قوم کو اپنے استبدادِ محکومی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ بھی تو ذرا سا احسان گنائیے۔ اس پر بھی فرعون نے کہا تھا کہ مَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (26:23)۔ تو وہ رب العالمین...... تمام اقوامِ عالم کا نشوونما دینے والا...... کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں رب العالمین کی طرف سے ہوں' جب کہ فرعون نے کہا تھا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر احسان جتائے تو انہوں نے کہا کہ تم نے ایک فرد پر جو احسانات کیے ہیں انہیں تو جتاتے ہو لیکن اس کی پوری قوم پر جو ظلم کر رہے ہو' ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟ اس پر فرعون کھسیانا ہو گیا اور بات کا رخ دوسری طرف موڑنے کے لیے کہنے لگا کہ تم جو

---

[1] اس انداز میں' اس طرح دیتے ہو۔

کہتے ہو کہ تم خدائے رب العٰلمین کی طرف سے میری طرف پیغام لائے ہو تو وہ رب العالمین' تمام کائنات کا نشوونما دینے والا' کون ہے؟

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ڈائیلاگ Dialogue (مذاکرات)

عزیزانِ من! یہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا کہ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (26:24)۔ خدائے رب العالمین وہ ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے کی نشوونما کرتا ہے۔ یعنی میرا رب انسانوں کی ہی نشوونما دینے والا نہیں' بلکہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں' اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' ان میں ہر ایک کی نشوونما دینے والا ہے۔ اے فرعون! تم اپنے آپ کو اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى [1] (79:24) کہتے ہو۔ دیکھتے ہو' رب الاعلیٰ کونسا ہوتا ہے؟ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (26:24)۔ سو اگر تمہیں اس کا یقین آ جائے (کہ کائنات میں ہر شے کی ربوبیت خدا کرتا ہے' تو تم اسے بھی بآسانی سمجھ جاؤ کہ خود انسانوں کی پرورش بھی وہی کرتا ہے اور تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اپنی رعایا کے رب ہو' قطعاً بے بنیاد ہے۔ 43:51;79:24۔) اے کاش! تمہیں ان نشانیوں کو دیکھ کر ذرا یقین کرتے کہ رب کس کو کہا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہاں بڑی دلچسپی سے ڈائیلاگ (مذاکرات) ہو رہے ہیں۔ سارے وزراء' درباری اور مصاحب بیٹھے ہوئے ہیں' یہ سامنے کھڑا ہے' یہ بات ہو رہی ہے۔ فرعون سے یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ اس پر فرعون اپنے درباریوں پر ایک نظر ڈالتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (26:25)۔ تم سنتے ہو کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اِس کی باتیں گہری توجہ کی محتاج ہیں۔ انہیں دل کے کانوں سے سنو! عزیزانِ من! یہاں فرعون حضرت موسیٰؑ سے نہیں بات کر رہا' بلکہ وہ اپنے حواریوں سے کہتا ہے: سنتے ہو کیا کہہ رہا ہے؟ سن رہے ہو ذرا۔ ''اوسندے پئے او! کی کیندا پیا اے'' [2] کیا انداز ہے صاحب! فرعون سے جواب نہیں بن پڑا۔ اب ان درباریوں کو انگیخت کر رہا ہے: او! سنتے ہو' کیا کہہ رہا ہے؟ اِدھر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے انداز صحیح بات کہنے والے کا! عزیزانِ من! وہ انہیں بحث میں الجھانا چاہتا ہے' وہ ان سے بات کر رہا ہے یہ گویا فرعون کی بات کو اَن سُنی کر کے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہیں۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (26:26)۔ کہتے ہیں کہ وہ خدا صرف خارجی کائنات کا ہی نہیں' وہ خود تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے آباؤ اجداد (سابقہ فراعنۂ مصر) کا رب بھی وہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علی الاعلان کہتے ہیں کہ تم میرے رب کا پوچھتے ہو کہ وہ کون ہے؟ وہ تو تمہارا رب ہے اور تمہارے باپ دادوں کا بھی رب ہے۔ اب فرعون کہتا ہے کہ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (26:27)۔ فرعون نے اپنے اہلِ دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ لو بھئی! خدا نے تمہاری طرف اپنا رسول بھی بھیجا تو ایک پاگل بھیجا۔ اس طرح فرعون نے اپنے اہلِ دربار سے پھر کہا کہ یہ قاصد آیا ہے' کسی جگہ کا بالکل

---

[1] تمہارا سب سے بڑا رب میں ہی ہوں۔

[2] او! سن رہے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟

پاگل نظر آتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے خدا نے کہا تھا کہ ذرا دھیمے سے بات کرنا، کہیں غصہ ور نہ ہو جانا۔ یہ کچھ سن کے بھی غصہ نہیں آ رہا۔ وہ پاگل کہہ رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی ہفوات ❶ پر پھر کوئی توجہ نہ دی۔ اور اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا: قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنتُمْ تَعْقِلُونَ (26:28)۔ وہ خدا مشرق ومغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا پرورش کرنے والا ہے۔ اگر تم ذرا بھی عقل وفکر سے کام لو تو یہ بات آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ کہا کہ وہ مشرق کا رب ہے، مغرب کا رب ہے، کائنات کا رب ہے او کمبخت! کہیں عقل وفکر سے کام لے کے دیکھ، ان باتوں کا تجھے پتہ چلے کہ رب کسے کہتے ہیں۔

بات کرنے کا طریق کیا ہونا چاہیے؟

عزیزانِ من! وہاں دربارِ فرعون میں کوئی جواب نہیں دے رہا۔ اس سے تو گاڑی دوسری پٹڑی پہ جا پڑتی۔ یہ ہوتا ہے طریق، عزیزانِ من! بات کرنے کا! کہ انسان اپنے پوائنٹ (نکات) پہ رہے دوسرا آپ کو اِدھر اُدھر کی باتوں کے اندر لاکھ الجھائے، مگر وہ اپنا پوائنٹ نہ چھوڑے۔ یہ کچھ وہی کرے گا جس کے سامنے متعین نصب العین ہوگا۔ وہ اپنے پوائنٹ (نکات) کو نہیں چھوڑے گا۔

عزیزانِ من! میں اسی لیے یہ مقام بھی سامنے لے آیا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ جو خدا کی راہنمائی کے تحت بات کرنے کا انداز ہوتا ہے وہ ہوتا یہ ہے کہ وہ اپنے پوائنٹ پر رہے، دوسرا خواہ لاکھ اِدھر اُدھر الجھائے۔ یہ جو عظیم انقلابی مقصد لے کر اٹھتے ہیں ان کا انداز ہی یہ ہوتا ہے خواہ مخالف لاکھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرے وہ اَن سُنی کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جو دکھتی ہوئی رگ ہے۔ یہ انسان کے نازک ترین جذبات کے تار کو چھیڑنا ہے، اسی لیے میں پھر اس سورۃ طٰہٰ کی طرف آ گیا جو زیرِ درس ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے یہ کچھ کہا، کوئی جواب بن نہ پڑا۔ درباریوں، وزیروں، اور مصاحبوں نے بھی دو تین مرتبہ یہ کچھ کر کے دیکھ لیا۔ ان سے بھی کوئی بات بَن نہ پڑی۔

فرعون کی ایک خطرناک چال اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُور نگہی

عزیزانِ من! اب وہ دکھتی ہوئی رگ آئی جسے فرعون نے پکڑا۔ یہ نظر آتا ہے کہ جسے وہ حکمتِ فرعونی کہتا ہے، وہ میکیاوَلی ❷ سیاست

---

❶ بے ہودہ باتیں۔

❷ میکیاوَلی (1469-1527) کے نظریۂ سیاست کی رو سے، سیاست کے اپنے ضوابطِ اخلاق ہیں اور اپنے معیارِ اقدار۔ ہر وہ حربہ جس سے سلطنت کی قوت بڑھے، مستحقِ ستائش ہے اور ہر وہ فریب جس سے کامیابی حاصل ہو جائے درخورِ ہزار تبریک وتحسین۔ یہی جائز وناجائز کا معیار اور حق وباطل کا پیمانہ ہے۔ میکیاوَلی کہتا ہے کہ جس طرح پانی اپنی سطح سے اونچا نہیں جا سکتا اسی طرح انسان اپنی حیوانی سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کی کوششیں غیر فطری ہیں اور تحفظ ذات چونکہ انسان کی حیوانی فطرت کا تقاضہ ہے اس لیے ہر وہ کوشش جو اس تقاضے کو پورا کرنے میں ممد ومعاون ہوا محمود ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ مذموم۔ ''قوت کا نام عدل وانصاف ہے اور حق اسی کا ہے جس کے پاس قوت ہے''۔ یہ میکیاوَلی کا بنیادی اصولِ سیاست ہے۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا، جلد اول، ادارہ طلوع، کراچی، 1955، ص۔ 195)

یہ ہے کہ کسی کے نازک ترین جذبات کے تار کو چھیڑا جائے۔ اسے یہ معلوم تھا کہ یہ بت پرست قوم ہے۔ خود فرعون اس کے یہ سارے حواری، یہ وزیر، یہ امیر اور کابینہ کے یہ سارے منسٹر اور یہ سارے بڑے بڑے افرادِ قوم بت پرست تھے۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات کہی ہے کہ رب تو وہ رب ہے۔ اس سے نیچے کسی کو رب ماننے والے تو مشرک ہیں، کافر ہیں۔ اور وہ تو جہنم میں جائیں گے۔ اب ان کے اسلاف میں، ان کے باپ دادا ہی نہیں، ان کے اسلاف اور بڑے بڑے بزرگ بھی تو بت پرستی میں شامل تھے اور وہ انہی کو اپنا خدا مانتے تھے۔ یہ سب مشرکین میں شامل تھے۔ لہٰذا آپ اس سلسلہ میں دیکھیے کہ یہاں حکمتِ فرعونی کیا کرتی ہے؟ کہا کہ اے موسیٰ! ذرا ٹھہرو، ایک بات کا جواب دیدو۔ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (20:51)۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ جو لوگ پچھلے زمانے میں گزر چکے ہیں (یعنی ہمارے اسلاف) ان کا کیا حشر ہوگا (کیونکہ وہ تمہارے خدا پر ایمان نہیں رکھتے تھے)۔ عزیزانِ من! دیکھیے کہ ''حکمت فرعونی'' کس طرح انسان کے نازک ترین جذبات کے تاروں کو چھیڑتی ہے۔ کہا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ ان کے جو بڑے بوڑھے، بزرگ اسلاف، حضرات، گزر چکے ہیں وہ کس حالت میں ہیں: جنت میں ہیں یا جہنم میں۔ چل بھئی! معلوم ہے کہ وہ کہے گا وہ تو جہنم کے کندے [1] ہیں، جل رہے ہیں۔ فرعون نے درباریوں سے کہا کہ مجھے تو چھوڑ دو بھئی! یہ جو کچھ مجھے کہہ رہا ہے وہ تو میں برداشت کر گیا۔ جتنی گالیاں اس نے دی ہیں یہ تمہارے باپ دادا کو دی ہیں۔ فلاں حضرت صاحب کو، تمہارے فلاں پیرو مرشد کو، جہنمی کہتا ہے۔ یہ کہہ رہا ہے کہ وہ سب جہنم میں ہیں۔ بھڑکا دیا، اور پھر ساری قوم کے اندر پبلسٹی کر دی: یہ دیکھو یہ آیا ہوا ہے، کہتا ہے تمہارے بڑے بڑے جتنے گزر چکے ہیں، یہ جن کو تم علیہ الرحمۃ اور پتہ نہیں کیا کیا نام پکارتے ہو، یہ کہتا ہے کہ یہ سب جہنم میں ہیں۔ یہ سب کو کہتا ہے کہ وہ جہنم میں ہیں یعنی تمہارے باپ دادا جہنم میں، تمہارے بزرگ جہنم میں۔ اس طرح فرعون نے اصل بات ہی لپیٹ دی۔

ہمارے ہاں مذہبی دنیا میں تمام بحثوں کا رخ بھی اس طرف ہوتا ہے

عزیزانِ من! ان حضرات کی جتنی بحثیں آپ کے ہاں یہاں ہوتی ہیں، اسی نکتے پہ ہوتی ہیں کہ فلاں حضرت، فلاں بزرگ جو گزر چکے ہیں، فلاں محدث، فلاں مفسر، فلاں عالم، ان کا یہ ایمان کیسا تھا، وہ ان کو ثابت کرتے ہیں کہ صاحب! ان کے اوپر بھی کفر کا فتویٰ لگا تھا۔ یہ اُن کے بڑوں کو کہتے ہیں کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگا تھا۔ وہ جو بڑے ہیں، ان پر یہی کچھ کہتے ہیں۔ اسی پر ان کی ساری بات ہے۔ پھر یہ اکساتے بھی اسی طرح سے ہیں کہ یہ دیکھو، تمہارے فلاں بزرگ کی شان میں یہ کیا کہتا ہے۔ یہ ہے نازک ترین، ایک دکھتی ہوئی رگ، جس کو چھیڑا جاتا ہے، عوام کو بھڑکانے کے لیے، اشتعال دلانے کے لیے۔ یہ تھی وہ تدبیر، حکمتِ فرعونی، جس کی طرف وہ آیا کہ بات ہم سے تو بن نہیں پڑتی، اس کے دلائل کا جواب نہیں دیا جا سکتا، یہ کرو کہ قوم کے جذبات کو بھڑکا دو تاکہ وہ اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو اور اس کا ایک

---

[1] موٹی لکڑی کے ٹکڑے

ہی طریقہ ہے کہ اس سے پوچھو کہ بتاؤ' ان کے اسلاف اور ان کے بزرگ کس حالت میں ہیں؟ آج جنت میں ہیں یا جہنم میں ہیں۔ فرعون کو پتہ نہیں تھا کہ کس سے بات کر رہا ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ کوئی مولوی صاحب ہیں: میں نے پوچھا اور انہوں نے کہا کہ صاحب! ٹھیک ہے: کفر کی موت مرے' جہنم میں ہیں۔ بات بن گئی' لہٰذا اس چال کے تحت فرعون نے پوچھا: کہو موسیٰ! ان کا کیا حال ہے؟ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ (20:52)۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اس بات کا مجھے کچھ علم نہیں (کہ وہ لوگ کس حال میں ہیں)۔ اس کا علم میرے پروردگار کے نوشتے [1] میں ہے۔ (ان کے معاملے کا فیصلہ' خدا کے نوشتے کے مطابق ہو جائے گا)۔ اس لیے ان کا معاملہ میرے خدا کے ساتھ ہے لیکن اتنا ضرور یاد رکھو کہ لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى (20:52)۔ وہ خدا ایسا نہیں کہ کھو یا جائے یا بھول میں پڑ جائے' وہ نہ بھولتا ہے اور نہ ہی غلطی کرتا ہے۔

ہزار سال سے ہماری اجتماعی سوچ کا رخ

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ کیا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟ قربان جائیں' عزیزانِ من! یہ کوئی پرانے زمانے کی داستان بیان ہو رہی ہے یا ہمارے منہ پہ تھپڑ دیئے جا رہے ہیں۔ عزیزانِ من! ہمارا سارا ہی وقت' ہزار سال' اس میں گزر گیا کہ وہ جو ہمارے ہاں کے اسلاف اور بزرگ تھے' وہ کیسے تھے؟ ساری بحثیں اسی پہ چلی آ رہی ہیں۔ کہیں صحابہ کی بحث ہے' کہیں آئمہ کی بحث ہے' کہیں ان کے بزرگوں کی بحث ہے۔ ہزار سال سے یہ بحث چلی آ رہی ہے۔ ان کے ہاں جاؤ' اگر کسی کی شان میں تذکرے ہیں تو وہ بھی اسلاف کے ہیں۔ اگر یہ تذکرہ کسی کے خلاف چلا آتا ہے تو وہ بھی اسلاف کی بحثیں ہوتی ہیں۔ تو وہ بھی یہ کہ ان پہ انہوں نے یہ لکھا تھا: بالکل کفر تھا' گمراہی تھی۔ انہوں نے یہ کہا تھا: بالکل باطل تھا۔ چلے جا رہے ہیں۔ ساری بحث اس پہ چلتی ہے۔ مَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (20:51)۔ بتاؤ کہ جو لوگ پچھلے زمانے میں گزر چکے ہیں' ان کا حشر کیا ہوگا؟ انہی گزرے ہوئے لوگوں کے احوال کے مختلف پہلوؤں کے متعلق بات اور بحث ہوتی ہے اور جو خدا کی طرف سے ہدایت پاتا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّىْ فِىْ كِتٰبٍ (20:52)۔ اس کا علم میرے پروردگار کے نوشتے میں ہے۔ اور آپ سے بھی قرآن نے یہی کہا تھا عزیزانِ من! کہ جب اس قسم کی کوئی بات سامنے آئے تو یوں الجھانا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ کہو کہ ہمارے خدا نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (2:134)۔ وہ لوگ تھے اپنے وقت میں' یہاں سے چلے گئے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ (2:134)۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ' تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (2:134)۔ تم سے تمہارے اعمال کی بابت پوچھا جائے گا۔ یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے اسلاف کے اعمال کس قسم کے تھے۔ خدا کہتا ہے ہم تم سے

---

[1] دستاویز

قطعاً نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ خدا یہ کہتا ہے کہ ان سے کہا کرو کہ بابا! وہ ٹھیک ہے' وہ تمام اپنے اپنے وقت میں گزر گئے۔ خدا کہتا ہے: **وَلَا تُسْـئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:134)۔ ہم تم سے قطعاً یہ سوال نہیں کریں گے کہ وہ کیسے تھے' انہوں نے کیا کیا تھا' اس کے برعکس ہماری ساری زندگی اس میں صرف ہوجاتی ہے کہ **عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:134)۔ انہوں نے کیا کیا تھا؟ وہ کہتا ہے: بابا! ہم یہ پوچھیں گے ہی نہیں۔ یہ کہتے ہیں: جی کیا اعتبار ہے؟ Out of the context (غیر نصاب) بھی تو یعنی نصاب سے باہر بھی تو' سوال دے دیا کرتے ہیں۔ ''اوتھے ایہہ پوچھ بیٹھیں تے فیر اسیں فیل ہوجاواں گے''[1]۔ بیشک یقین دہانی کراتے رہو کہ نہیں پوچھیں گے۔ یعنی وہ کہہ رہا ہے کہ **وَلَا تُسْئَلُوْنَ** (2:134)۔ ہم قطعاً نہیں پوچھیں گے تم سے' یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ **عَـمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:134)۔ انہوں نے کیا کیا۔ اور ہماری تو ساری عمر اسی میں گزر جاتی ہے کہ **عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:134)۔ انہوں نے کیا کیا تھا؟

مسلمان قوم ہزار سال سے اسی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے

عزیزانِ من! آپ سوچتے ہیں کہ یہی وجہ ہے کہ مسلمان قوم کی کشتی ہزار سال سے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح اس کی گردش تو دن رات اتنی تیز ہو رہی ہوتی ہے مگر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی۔ اس بات میں آپ کی توانائیاں' وقت اور دولت کچھ کم صرف نہیں ہوتی کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟ اس پہ کتابوں پہ کتابیں لکھی جارہی ہیں' اس پہ مناظروں پہ مناظرے ہورہے ہیں' سر پھٹول ہورہے ہیں' مقدمے بازیاں ہو رہی ہیں' اور خدا یہ کہہ رہا ہے کہ **عَـمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** (2:134)۔ بابا! ہم تو پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا ہے اور اس نے کہا ہے کہ بھئی! ان کا معاملہ **عِلْـمُهَا عِنْدَ رَبِّـىْ فِـىْ كِتٰبٍ** (20:52)۔ میرے خدا کے ہاں اعمال نامہ کی ایک کتاب رکھی ہے' ان کا معاملہ تو اس کتاب کی رو سے خدا طے کر رہا ہوگا اور میں تمہیں اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ **لَا يَضِلُّ رَبِّىْ وَلَا يَنْسَى** (20:52)۔ وہ خدا نہ تو بھولتا ہے' نہ غلطی کرتا ہے' جو مجھے یہ بتانے کی ضرورت ہو کہ وہ کیسے تھے۔ یعنی یہ تو اسے بتایا جائے جس کے متعلق یہ ہو کہ شاید کہیں اُس سے بھول چوک ہوجائے تو اُسے بتادیا جائے۔ میرے بتانے کی ضرورت کیا ہے اس خدا کے ساتھ ان کا معاملہ ہے: نہ وہ کسی بات کو بھولتا ہے' نہ حساب کرنے میں غلطی کرتا ہے۔ اس لیے یہ سوال ہی نہیں ہے۔ سوال تو یہ ہے' جو میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

عزیزانِ من! ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 52 تک آ گئے۔ آیت 53 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀......❀......❀

---

[1] اگر انہوں نے وہاں یہ سوال پوچھ لیے تو امتحان میں فیل ہوجائیں گے۔

پانچواں باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 53 تا 60)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا
مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۳﴾ کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۵۴﴾ مِنۡہَا خَلَقۡنٰکُمۡ وَ فِیۡہَا
نُعِیۡدُکُمۡ وَ مِنۡہَا نُخۡرِجُکُمۡ تَارَۃً اُخۡرٰی ﴿۵۵﴾ وَ لَقَدۡ اَرَیۡنٰہُ اٰیٰتِنَا کُلَّہَا فَکَذَّبَ وَ اَبٰی ﴿۵۶﴾ قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا
مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِکَ یٰمُوۡسٰی ﴿۵۷﴾ فَلَنَاۡتِیَنَّکَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِہٖ فَاجۡعَلۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُہٗ نَحۡنُ وَ لَاۤ
اَنۡتَ مَکَانًا سُوًی ﴿۵۸﴾ قَالَ مَوۡعِدُکُمۡ یَوۡمُ الزِّیۡنَۃِ وَ اَنۡ یُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًی ﴿۵۹﴾ فَتَوَلّٰی فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ کَیۡدَہٗ
ثُمَّ اَتٰی ﴿۶۰﴾

عزیزانِ من! آج اپریل 1976 کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 53 سے ہو رہا ہے: (20:53)۔

ایک اہم نکتہ کی وضاحت

بات مسلسل چلی آ رہی تھی اور سابقہ درس میں اسے درمیان ہی میں چھوڑ نا پڑا تھا کہ درس کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ آگے بات شروع کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ پچھلی کڑی پر بھی مختصر الفاظ میں پھر سے نظر ڈال لی جائے تاکہ ذہن میں وہ تسلسل بھی قائم رہے۔ اس تفصیل میں ایک نکتہ ایسا ہے جس کی بار بار وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے بھی اس کا دہرا دینا خالی از فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ بات سورۃ طٰهٰ کی آیت 45 سے شروع ہوئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے آ کر کہا تھا کہ **قَدۡ جِئۡنٰکَ بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکَ** (20:47)۔ میں تیرے رب کی طرف سے کچھ قوانینِ زندگی لایا ہوں' کچھ احکام لایا ہوں' انہیں ذرا غور سے سنو کہ میں کیا کہتا ہوں؟ سوال یہ ہے کہ یہ "مِنۡ رَّبِّکَ" کا لفظ یہاں کیوں آیا ہے؟ خدا کی اتنی صفات موجود ہیں' خود اللہ کا ذاتی نام اللہ موجود ہے تو اللہ کی طرف سے یہ احکام لایا ہوں کی بجائے "مِنۡ رَّبِّکَ" کہا ہے اور پھر فرعون نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہی کہا تھا کہ **فَمَنۡ رَّبُّکُمَا یٰمُوۡسٰی** (20:49)۔ اے موسیٰ! تمہارا رب کونسا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی جواب دیا کہ **قَالَ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ** (20:50)۔ موسیٰ نے کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جو......لہٰذا یہ سوال بڑا غور طلب ہے کہ یہ بات "رب" کے محور کے گرد کیوں گردش کر رہی ہے؟ وہ کیوں نہیں پوچھتا کہ تمہارا معبود کونسا ہے؟

چھٹا باب: **سورۃ طٰہٰ** (آیات 61 تا 70)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰی وَیۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَی اللّٰہِ كَذِبًا فَیُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدۡ خَابَ مَنِ
افۡتَرٰی ﴿۶۱﴾ فَتَنَازَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَیۡنَهُمۡ وَاَسَرُّوا النَّجۡوٰی ﴿۶۲﴾ قَالُوۡۤا اِنۡ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یُرِیۡدٰنِ اَنۡ یُّخۡرِجٰكُمۡ مِّنۡ
اَرۡضِكُمۡ بِسِحۡرِهِمَا وَیَذۡهَبَا بِطَرِیۡقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰی ﴿۶۳﴾ فَاَجۡمِعُوۡا كَیۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡیَوۡمَ
مَنِ اسۡتَعۡلٰی ﴿۶۴﴾ قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِیَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰی ﴿۶۵﴾ قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ
وَعِصِیُّهُمۡ یُخَیَّلُ اِلَیۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰی ﴿۶۶﴾ فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِهٖ خِیۡفَةً مُّوۡسٰی ﴿۶۷﴾ قُلۡنَا لَا تَخَفۡ اِنَّكَ اَنۡتَ
الۡاَعۡلٰی ﴿۶۸﴾ وَاَلۡقِ مَا فِیۡ یَمِیۡنِكَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوۡا كَیۡدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُ حَیۡثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾
فَاُلۡقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوۡنَ وَمُوۡسٰی ﴿۷۰﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1976 کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 61 سے ہو رہا ہے: (20:61)۔

تجدیدِ یادداشت

پچھلے اتوار کو چونکہ درس کا خاص موضوع یومِ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تقریب کی نسبت سے تھا اس لیے تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سورۃ طٰہٰ میں مقام وہ آ گیا تھا جہاں پہلے حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون [1] کی باہمی بات چیت ہو رہی تھی۔ فرعون نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے ساتھ بات چیت اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ ایک دینی راہنما کی حیثیت سے آئے تھے، جسے عام الفاظ میں کہا جائے گا کہ یہ Religious Matter تھا یعنی یہ امورِ مذہبیہ تھے، اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ انہیں امورِ مذہبیہ کے جو ماہرین ہیں، انہی سے بھڑا دیا جائے۔ اس میں ایک خاص سازش پنہاں تھی کہ عوام کو اکٹھا کیا جائے اور وہ اپنے مناظرے میں اس قسم کی باتیں کریں جو ان عوام کے اسلاف کے خلاف جائیں تو وہ خود بھڑک اٹھیں گے اور اس کی تکہ بوٹی کر دیں گے یا ان کے ہاتھوں سے شکست کھا جائیں گے تو پھر بھی میری فتح ہو جائے گی۔ یہ ایک سازش تھی جس کے تابع اس نے یہ کہا تھا کہ بات میری اور تیری نہیں ہے، ایک عام اجتماع ہوگا اور اس

---

[1] فرعون، ملوکیت کا علمبردار؛ ہامان، برہمنیت (Priesthood) کا نمائندہ اور قارون، سرمایہ داری (Capitalism) کا مجسمہ ہے۔ اور ان تمام بتوں کو توڑنے کے لیے عصائے موسوی ہے۔ (طلوعِ اسلام نومبر 1985، ص۔ 64)۔

میں تمہارا مقابلہ ہمارے مذہبی منتریوں یا پجاریوں اور ہامان ❶ اور اس کے جنود سے ہوگا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ بہت اچھا' انہی کے ساتھ بات کر لی جائے گی۔ فرعون نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ بات اجتماع (Gathering) میں ہوگی۔ اب تک جتنا کچھ فرعون کے ساتھ باتوں کی صورت میں ہوا تھا اور فرعون کی کابینہ کے اندر جو باتیں ہوئی تھیں' وہ Inner Circle تھا یعنی وہ درونِ خانہ بات ہو رہی تھی۔ اسی میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی طرف سے اپنے مقابلے میں بلائے گئے مذہبی پیشواؤں سے کہہ دیا تھا کہ **قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا** (20:61)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ یاد رکھو! تم تباہ ہو جاؤ گے۔ تم خدا کے خلاف افترا پردازی مت کرو۔ اپنی طرف سے مذہب تراش کر' اسے اُس کی طرف منسوب مت کرو۔ تمہاری تباہی اور بربادی تمہارا انتظار کر رہی ہے اور وہ اس لیے کہ تم خدا کے خلاف جھوٹی باتیں گھڑتے ہو' خدا کے خلاف افترا کرتے ہو' اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔ یہیں سے بات شروع ہو جاتی ہے کہ ان کے خلاف حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا اعتراض یہ تھا کہ وہ خدا کے خلاف افترا کرتے تھے۔ پھر آگے جو بھی مناظرہ ہونا تھا' مباحثہ ہونا تھا' باہمی گفتگو ہونی تھی' تو اس میں نقطہ ماسکہ' موضوعِ سخن یہی تھا کہ وہ کیا باتیں ہیں جو وہ خدا کی طرف جھوٹ گھڑتے ہیں اور وہ کیسے جھوٹ ہیں۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے لیے یہ سارے اجتماعات ہو رہے ہیں اور فرعون اتنا بڑا انتظام کر رہا ہے۔ کہا کہ یاد رکھو! یہ تمہاری تباہی کی نشانیاں ہیں کہ تم خدا کے خلاف جھوٹ وضع کر کے' اسے خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہو۔ **فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ** (20:61)۔ وہ ایسی سزا دے گا کہ تمہاری جڑ کٹ جائے گی۔ وہ تمہیں آہستہ آہستہ مٹا دے گا۔ اس لیے یاد رکھو! اس کا نتیجہ تو بہت بڑی تباہی و بربادی ہوگا اور یہ تمہاری ہی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک اصول ہے کہ **وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى** (20:61)۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خاسر و نامراد رہتے ہیں۔ جو بھی افترا کرتا ہے' کوئی بات خود وضع کرتا ہے' اسے خدا کی طرف منسوب کرتا ہے' جھوٹ کو سچ کر کے دکھاتا ہے' ملمع سازی کرتا ہے' فریب کاری کرتا ہے اور پھر فریب کاری بھی خدا کے خلاف کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

عزیزانِ من! نظر آتا ہے کہ خواہ یہ باتیں فرعون کی کابینہ کے اندر ہی ہوئی ہوں' ان کا اثر ہوا اور یہ وہی ہوا جو ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "اونہاں نوں پسو ضرور پے گئے۔" ❷ انہیں بات کھٹک گئی کہ معاملہ خطرناک نظر آتا ہے چنانچہ یہ چیز اگلی ہی آیت میں اس سے واضح ہو گئی کہ **فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ** (20:62)۔ ان مذہبی پیشواؤں نے آپس میں رد و کد ❸ شروع کر دی۔ ان میں آپس میں ہی اختلاف

---

❶ ہامان' برہمنیت (Priesthood) کا نمائندہ (طلوعِ اسلام' نومبر' 1985' ص۔ 64)۔

❷ انہیں پسو پڑ گئے۔

❸ حجت' بحث' تکرار

خانہ) کے اندر' کابینہ کے مشیروں کے اندر' ان کے باہمی اجتماع کے اندر' ان میں آپس میں جھگڑا ہو گیا' تنازعہ ہو گیا' اختلاف ہو گیا۔ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰی (20:62)۔اور وہ باہم سرگوشیاں کرنے لگ گئے۔عوام پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔فرعون کے درباریوں کے مجمع (Gathering) کی جب یہ حالت دیکھی تو انہیں خطرہ لاحق ہو گیا۔اور اس پہ انہوں نے مناسب سمجھا کہ ایک خفیہ میٹنگ کی جائے۔ ایسے اجلاس آپ کے ہاں بھی تو ہوتے ہیں۔کہا کہ خفیہ اجلاس ہوں اور ان میں مشورہ کیا جائے کہ کیا کرنا چاہیے۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ معاملہ کیا تھا' اس کی سنگینی کیا تھی' اس کی اہمیت کیا تھی۔یہ یوں ہی ایک جادوگر کا' دوسرے جادوگر کے خلاف بھڑا دینا نہیں تھا۔وہ بات تو ذرا آگے آتی ہے۔معاملہ اتنا خطرناک تھا۔پہلے تو اِدھر تنہا حضرتِ موسیٰ علیہ السلام یا ان کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔اُدھر فرعون اور وہ پورے کے پورے اس کے مشیر تھے' کابینہ تھی' وزراء تھے' دربار کے مصاحبین تھے۔ان میں بات ہوتی ہے تو اس کا بھی ایسا اثر ہو جاتا ہے کہ ان میں اختلاف ہو جاتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ بھئی! اس طرح سے یہ باتیں باہر کرنے کی نہیں ہیں' خفیہ طور پہ یعنی Close Chamber کے اندر میٹنگ کیجیے۔ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰی (20:62) اور اپنے مشورہ کو خفیہ رکھیے' بات باہر نہ نکلنے پائے۔اب جو باتیں باہر نکل گئی تھیں ان سے بھی یہ چیز تھی کہ بنی اسرائیل کا ایک نمائندہ آیا ہے اور اس کے ساتھ اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔اب جو پبلک کا مائنڈ (ذہن) تھا' جو عوام کا دل تھا اُسے بھی اس طرف لانا تھا کہ یہ جو آیا ہے [1] یہ کس قدر خطرناک ہے' یہ جو دونوں بھائی ہیں ان کے ارادے کتنے خطرناک ہیں؟ سنیے عزیزانِ من! بات تو یوں کہیے کہ شاید آج سے چھ یا چار ہزار سال پہلے کی ہو رہی ہے۔لیکن لگتا یہ ہے کہ آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔

قرآن میں سابقہ اقوام کے بیان کردہ نتائج ہر زمانے کے لیے ہوتے ہیں

عزیزانِ من! قرآن واقعات تو پہلی ہی تاریخوں کے لیتا ہے' سابقہ اقوام کے ہی لیتا ہے لیکن ان واقعات کے نتائج تو ہر زمانے میں اسی طرح کے نکلتے ہیں اور اسی طرح زندہ رہتے ہیں۔یہاں دو ہی چیزیں ہیں۔عزیزانِ من! سنیے' ایک تو آلِ فرعون کی' قومِ فرعون کی اپنی حکومت تھی اور بنی اسرائیل ان کے محکوم تھے' دوسری بات یہ کہ وہ بڑی شدید قسم کی مذہب پرست قوم تھی۔اب یہ دیکھیے کہ فرعون یہ دونوں چیزیں کس طرح Cover (احاطہ کرنا) کر رہا ہے۔ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا (20:63)۔انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ دونوں بھائی (موسیٰؑ اور ہارونؑ) کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ یہ باطل مذہب کے پیشوا ہیں اور ان کا ارادہ یہ ہے کہ اپنی فریب کاریوں سے اپنا تسلط جمالیں اور تمہیں تمہاری مملکت سے نکال باہر

---

[1] یہ اشارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔

کریں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ سن رکھو کہ یہ دونوں بھائی کیا سازش لے کر آئے ہیں۔ میں ''سحر [1]'' کے لفظ کی بات آگے کرتا ہوں۔ یہاں کہا کہ یہ سازش لے کر آئے ہیں کہ تمہیں اس ملک سے نکال کر اس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

عزیزانِ من! پہلا جھوٹ یہ ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے تو بات ہی اتنی سی کی تھی کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے' تمہارا ملک تمہیں مبارک' میں تمہیں کچھ نہیں کہتا اور تم سے کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جس قوم پہ تم نے زندگی اس طرح اجیرن کر رکھی ہے' اسے یہاں سے نکل جانے دے۔ سوال اس کی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینے کا نہیں تھا لیکن اگر وہ اپنی قوم سے یہ کہتا کہ یہ اتنا بڑا افساد اس لیے برپا ہو رہا ہے کہ یہ چاہتا ہے کہ اس قوم کو یہاں سے نکل جانے دے تو اس پر ان کا آپس میں ہی اختلاف ہو گیا تھا۔ انہی کے اندر ایک ایسی پارٹی اٹھ کھڑی ہوئی تھی جو یہ کہتی تھی کہ ٹھیک ہے' ہمیں اس بنا پہ آپس میں اس قدر جنگ وجدل کرنے کا' اس قدر خونریزیاں کرنے کا' فساد برپا کرنے کا' کیا فائدہ ہے۔ یہ اپنی محکوم قوم کو لیجانا چاہتا ہے' لیجانے دو۔ خس کم جہاں پاک [2]۔ مگر وہاں پروپیگنڈہ زیادہ تھا' یہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ لاعلم ہے' حضرت موسیٰؑ نے پہلے بات یہاں سے شروع کی ہے کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں اور تمہیں یہ کہنے کے لیے آتا ہوں لیکن فرعون یا اس کا پروپیگنڈہ سیکرٹری یا جسے آج کی اصطلاح میں وزیر اِطلاعات عامہ کہتے ہیں' وہ عوام الناس میں یہ کچھ نہیں کہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ سنتے ہو کہ یہ کیا سازش لے کر آیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان الفاظ میں یہ کہا ہو کہ یہ زبان سے تو یہی کچھ کہتا ہے' عندیہ اس کا یہ ہے اور Discussion (مباحثہ) اس لیے کرنا چاہتا ہے کہ تم سے ملک چھین لے۔ اب تمہارے ہاتھوں سے حکومت جا رہی ہے۔ اگر پورا طبقہ' پوری قوم' جو حاکم تھی' سے کہا جائے کہ تم سے تو ملک چھینا جا رہا ہے' حکومت چھینی جا رہی ہے تو ایک تو یہی چیز کچھ کم نہیں تھی اور پھر اب ساتھ ہامان [3] بھی تو آ گیا تھا۔ پہلی بات تو سیاسی طور پر خالص حکومت ہی کی بات تھی۔ عوام کے جذبات تو سیاست سے کہیں زیادہ مذہب سے وابستہ ہوتے ہیں۔ جو اس سیاست کے زہر سے نہیں مرتا اسے مذہب کے گڑ سے مارا جاتا ہے۔ فرعون نے کہا کہ ان کے عندیئے یہ ہیں کہ تم سے ملک چھین لیا جائے' اپنی حکومت قائم کی جائے۔ وَيَذْهَبَا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (20:63)۔ اور تمہارے مذہب ومسلک کو جو اس قدر اعلیٰ درجہ کا ہے' تباہ کر کے رکھ دیں اور اس طرح تمہارے اربابِ حکومت اور پیشوایانِ طریقت کا تمام شرف واقتدار چھین کر لے جائیں۔ یعنی انہوں نے برملا کہا کہ یہ جو تمہارے ہاں مذہب چلا آ رہا ہے' یہ بہت عظیم مذہب ہے' بہت بلند مذہب ہے' اس کے لیے ''المثلیٰ'' کا لفظ عجیب وغریب ہے۔ یہ لفظ طریق اور مسلک کے لیے بھی تو آیا ہے کہ جیسے اسی آیت میں آیا ہے کہ بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (20:63)۔ تمہارا مسلک ومشرب جو دیگر مسالک ومشارب

---

[1] اس کی خاصی تفصیل پانچویں باب میں بھی آ چکی ہے۔

[2] خس کم جہاں پاک۔ (مثل) نالائق شخص کے کہیں چلے جانے یا مرنے پر کہتے ہیں۔ کوڑا اٹھا تو صفائی ہو گئی۔

[3] مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ۔

پر غالب ہے؛ خود تمہارا مذہب لا جواب ہے‘ بے نظیر ہے‘ اور لفظ ”مثلیٰ“ کے دوسرے معنی ہیں کہ تمہارے اتنے بڑے بزرگوں کا جو طریق و مسلک و مشرب ہے‘ وہ افضل و برتر ہے۔ اس طرح فرعون اسلاف کو بھی ساتھ لے آیا۔

فرعون کے ذہن کی عیاری

عزیزانِ من! فرعون کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے On Merit (اہلیت کی بنیاد پر) بات چھیڑ دی تو ممکن ہے کہ وہ اس بات چیت میں جیت جائے مگر اس کے نزدیک On Merit (بنیادِ اہلیت) سوال ہی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے ہاں کے اتنے اتنے بڑے علمائے کرام‘ اتنے اتنے بڑے بزرگ‘ ایسے بڑے بڑے اسلاف اور ان کا طریق‘ مسلک اور مشرب‘ ان کا راستہ‘ ان کا طریقہ‘ وہ تم سے چھیننا چاہتا ہے۔ اوسنو! یہ کیا سازش ہے! قرآن اس کے لیے المثلیٰ [1] کا کیا خوب لفظ لایا ہے۔ عزیزانِ من! غور کریں کہ پوری مملکت میں کوئی بھی باقی رہ جاتا ہے‘ جسے فرعون نے متاثر نہ کیا ہو۔ وہاں دونوں ہی طبقے تھے۔ ان سے کہا کہ وزارتیں چھنتی ہیں‘ امارتیں چھنتی ہیں‘ سرداریاں چھنتی ہیں‘ یہ سب کچھ جاتا ہے۔ پھر ان سے کہا کہ تمہارا مذہب ختم ہو رہا ہے‘ یہ اسلاف کے طریقے ملیا میٹ کر دے گا‘ سنتے ہو! تو کیا اس سے یہ قوم بھڑک نہیں اٹھی ہوگی! لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ ہم اس پہ فرعونیت کی رو سے‘ استبدادی ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے‘ کھلے میدان میں اس کو موقع دینا چاہتے ہیں کہ اپنی بات ثابت کرے۔ وہ بات اب آئی ہے۔

دروس کے سلسلہ میں زبان کی اہمیت

عزیزانِ من! اگرچہ سحر کے سلسلہ میں سورۃ بنی اسرائیل [2] میں یہ سارے واقعات مشارب آ چکے ہیں اور وہاں میں پوری وضاحت سے بیان کر چکا ہوں لیکن ایک تو بار بار جسے قندِ مکرر کہتے ہیں‘ اس سے بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور پھر درس میں بہت سے ایسے احباب آتے ہیں جو پہلے نہیں آئے تھے‘ اس سلسلے میں ان کے سامنے نئے نئے الفاظ آتے ہیں‘ ان کے لیے بھی‘ جہاں یہ بات آتی ہے‘ کچھ نہ کچھ اس کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے۔ تو اس سلسلے میں پہلا اصول یہ یاد رکھیے‘ جسے میں ہمیشہ دہراتا ہوں اور قرآنِ کریم نے

---

[1] اقرب الموارد میں کلیات کے حوالے سے لکھا ہے کہ مَثَلَ کے معنی فَضَلَ ہے۔ یعنی بڑھا‘ زیادہ ہوا اور غالب ہوا۔ اس اعتبار سے اَمْثَلَ کے معنی اَفْضَلَ اور اَغْلَبَ ہو گئے۔ اس کا مؤنث مُثْلیٰ ہے۔ لہٰذا بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ (20:63) کے معنی ہوئے: ”ایسا مسلک و مشرک جو دیگر مسالک و مشارب پر غالب ہو“۔ ہر غالب قوم اپنے مسلک و مذہب کو افضل اور غالب سمجھتی ہے خواہ وہ کیسی ہی باطل کیوں نہ ہو۔ (نیز دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، 1961، ص 1523)۔ یاد رہے ”اقرب الموارد“ لغت کی مشہور کتاب ہے۔ اسے سعید الخوری الشرتونی اللبنانی نے مرتب کیا تھا۔ اوپر دیا گیا حوالہ اُس نسخہ سے ہے جو بیروت میں 1889ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا تھا۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ ادارت): مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ نبی اسرائیل۔ ادارہ طلوعِ اسلام‘ لاہور‘ 2004ء۔

بھی بار بار کہا ہے کہ ہم نے اسے عربوں کی واضح زبان میں نازل کیا۔قرآن میں زبان کی بڑی اہمیت ہے اور قرآن خود اس کی اہمیت بار بار جتا رہا ہے۔وہ کیوں اسے ایسے بیان کرتا ہے اور پھر ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ ہم ہر رسول کو اس کی اپنی قوم کی زبان میں وحی دیتے ہیں تا کہ وہ اپنی زبان میں بات سمجھ سکے' تو اس لیے زبان کا سمجھنا نہایت ضروری ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! زبان کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس میں جتنے بھی اہم الفاظ آتے ہیں ایک تو ان کے Literal Meaning (لغوی معنی) ہوتے ہیں' ان کے لغوی معنی ہوتے ہیں مثلاً ایک تو پانی کے معنی ہیں وہ پانی جو پینے والا ہوتا ہے۔ٹھیک ہے یہ اس کے Literal Meaning ہیں' لیکن اس کے بعد زبان میں انہی الفاظ کے محاورے ہوتے ہیں' اصطلاحات (Terms) ہوتی ہیں۔پانی تو پانی ہے لیکن جب کہیں کہ ''وہ پانی پانی ہو گیا'' تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ انسان سے پانی کا مٹکا بن گیا' یا وہ سارا پانی ہی تو تھا۔ آپ نے دیکھا کہ زبان پہ زور دینے کے معنی کیا ہیں کہ ''یہ سوچو کہ یہ جو الفاظ ہیں وہ قوم انہیں کن معانی میں استعمال کرتی تھی' لغوی طور پہ ان کے کیا معنی تھے اور اس کے بعد مجازی طور پر' اصطلاحی طور پر' وہ قوم ان الفاظ کو کن معنوں میں استعمال کرتی تھی۔اور پھر اگلی چیز یہ ہے کہ بعض ایسے الفاظ بھی ہیں جنہیں قرآن نے اپنی اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس لیے اگلی چیز یہ ہوگی کہ اس اصطلاح کے قرآنی معنی کیا ہیں۔اب وہ جو بنیادی لغوی معنی Literal Meaning ہیں' وہ بہت پیچھے رہ گئے۔قرآنِ کریم سمجھنے کے لیے' عزیزانِ من! اس فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم میں زبان پہ زور دیا گیا ہے۔

حقیقی (لغوی) اور مجازی معانی پر فوراً اعتراض

عزیزانِ من! اب ذرا سی اپنی بات آ گئی۔وہ بھی سن لیجیے۔زبان کے سلسلہ میں اس چیز کی اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے میں برسوں تک قرآن کو سمجھاتا رہا' درس دیتا رہا' لکھتا رہا۔لیکن جہاں میں نے کوئی ایسی بات لکھی جو عام تراجم سے ہٹی ہوئی تھی' فوراً اس پر اعتراض آیا کہ یہ بات اس کی خود وضع کردہ ہے۔تو پھر میں نے ضروری سمجھا کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کا ایک لغت مرتب کیا جائے اور اس میں کوئی بات اپنی طرف سے نہ لکھی جائے۔ویسے بھی لغت میں تو کوئی بات اپنی طرف سے لکھی ہی نہیں جا سکتی۔لغت میں تو اہلِ زبان کی سند کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں قرآنِ کریم کا یہ اعجاز ہے کہ یہ ہمارے ہاں تک محفوظ چلا آ رہا ہے۔اس کی زبان کا بھی یہ اعجاز ہے کہ جو زبان نزولِ قرآن کریم کے زمانہ میں بولی جاتی تھی' جسے عربی مبین کہا گیا ہے' وہ زمانہ جاہلیہ کے شعراء کے اندر محفوظ چلی آتی تھی۔شاعری میں الفاظ منتقل ہوتے ہیں جبکہ نثر کا مفہوم آگے منتقل ہوتا ہے۔زمانہ جاہلیہ کی شاعری کی بنیادوں پر ہمارے ہاں ایسے ایسے ضخیم مستند لغت مرتب ہوئے ہیں کہ جن میں ایک ایک لفظ کے متعلق بڑی ہی اسناد سے بتایا گیا ہے کہ عرب انہیں اپنے ہاں محاورے کے طور پر' مجازی معنی کے طور پر' کس طرح استعمال کرتے تھے۔اب یہ تو نہیں ہے کہ جب زبان پہ زور دیا جائے تو ہم پانی کے وہی

حقیقی معنی لیں جو یہ گلاس میں پینے والا پانی ہے۔ اگر یہی معنی لے لیں یعنی ساری کتاب میں جہاں پانی کا لفظ آئے، وہاں اس کے یہی حقیقی معنی کرتے چلے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ متعدد مقامات پر نہ صرف یہ کہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی بلکہ اس میں کچھ مضحکہ انگیز صورت پیدا ہو جائے گی۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ وہ تو ''شرم سے پانی پانی ہوگیا'' تو آپ اس کا انگریزی میں کبھی بھی یہ ترجمہ نہیں کریں گے کہ وہ Water and Water ہوگیا۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ یہاں آپ پانی کے اصطلاحی یا مجازی معنی لیں گے، لغوی یا حقیقی نہیں لیں گے۔ [1]

ہمارے ہاں قرآن حکیم کے کیے گئے تراجم کی بنیاد

عزیزانِ من! آپ تو He became water and water پر ہنس پڑے۔ بات ہی ہنسنے کی تھی۔ آپ کے یہ جتنے ترجمے ہیں اور جنہیں آپ بظاہر مستند ترجمے سمجھ رہے ہیں، وہ اسی طرح ہوئے ہیں۔ یہ انگریزی زبان کے بھی اِسی طرح سے ترجمے ہوئے ہیں۔ [2] وہ تو انہوں نے Sale [3] کی بنیاد پر کرنے تھے۔ ان تمام مترجمین نے اپنے تراجم سیل (Sale) کے

---

[1] ''حقیقی اور مجازی معنیٰ'' کی یہ صرف ایک مثال ہے۔ بلند پایہ تصانیف میں اور بھی بہت سے طُرق واسالیب بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں الفاظ کے مجازی معنی مقصود ہوتے ہیں۔ عام طور پر یہ اندازِ بیان، تشبیہات اور استعارات پر مشتمل (Symbolical) ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسلوبِ بیان کے متعلق مشہور ومعروف انگریزی مصنف چیسٹرٹن (Chesterton) کہتا ہے:

Not literally true, but only really true. (Quoted by W.H Urban in "Humanity and Deity, P.117"

[2] قرآنِ کریم کا لاطینی زبان میں میں پہلا ترجمہ کلنی درگاہ کے ایک پادری کے ایما پر بیسل (Basle) سے تھیوڈر بائی بلیانڈر (Theodor Billiander) سے 1143ء میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ بعد میں یہی ترجمہ اٹلی، جرمنی اور ڈچ زبانوں میں چھپا۔ اُدھر فرانسیسی زبان میں اے۔ ڈیو رائیر (A. Du Ryer 1647) نے پہلا ترجمہ کیا۔ بعدازاں یہی ترجمہ الیگزنڈر راس (Alexander Rass 1649) نے انگریزی زبان میں کیا۔ جارج سیل (G. Sale) کا انگریزی ترجمہ 1734ء میں منظر عام پر آیا۔ یاد رہے جارج سیل ایک پادری تھا اور آج تک اس کے ترجمے کے کئی ایڈیشن آچکے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں جے۔ ایم روڈول (J. M. Rodwell) نے قرآن کریم کی سورتوں کی شانِ نزول کی ترتیب سے 1861ء میں ترجمہ کیا اور ای۔ ایچ۔ پامر (E.H. Palmer) کا ترجمہ 1880ء میں مشرق کی مقدس کتب (Sacred Books of the East) میں طبع ہوا۔ انہی میں ای۔ ایچ۔ پامر کی طرز پر بل (Bell) کا ترجمہ قرآنِ کریم بھی شامل ہے۔ قرآنِ پاک کا دوسری یورپی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔ ان تراجم میں آر۔ بلیشر (R. Blachere) کے فرانسیسی زبان (50 -1949) میں کیے گئے ترجمے اور آر۔ پیرٹ (R. Paret) کے جرمنی زبان میں ترجمے (1962) کو خاص شہرت ملی۔

(The new Encyclopedia Britannica, vol- 22 (15th edition), Encyclopedia Britannica, Inc. chicago, p. 10 Islam)

[3] سیل (G. Sale) دراصل قرآنِ کریم کے انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے والے پادری کا نام ہے۔ ان کا یہ ترجمہ سب سے پہلے 1734ء میں منظر عام پر آیا۔

انگریزی ترجمہ کی ہی بنیاد پر کیے۔ دراصل اس متشدد قسم کے متعصب عیسائی پادری (G.Sale) جی سیل نے آپ کے ہاں تراجم کی طرح ڈالی ہے اور ہم تو بھیڑیں ہیں' محکوم تو ہوتی ہی بھیڑیں ہیں۔ انہوں نے جو طرح ڈالی' ہمارے اپنے ہاں کے انگریزی ترجمہ کرنے والے بھی وہی کچھ کرتے گئے اور انگریزی میں ہی کیا' ادھر اردو میں بھی ہمارے ہاں یہی کچھ ہوا۔

میں نے لغات القرآن اور مفہوم القران عربی مُبین کی بنیادوں پر مرتب کیا

عزیزانِ من! پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ اگر قرآنِ کریم کو سمجھنا ہے تو محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات سے قرآن سمجھو۔ اللہ تعالیٰ حکیم الامت ❶ کو کروٹ کروٹ راحت دے کہ انہوں نے یہ دو لفظ میرے کان میں ڈال دیئے کہ ''جاؤ' قرآن سمجھنا ہے تو محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھو۔'' میں نے عرض کیا ہے کہ میں نے محاورۂ عرب کی بنا پر اپنی استعداد و استطاعت تک قرآنِ کریم کا لغت مرتب کیا' جس میں Root یا مادہ دیا' جس کے ذریعے اس لفظ کے مستند Literal Meaning 'لغوی معنی دیئے اور اس کے بعد مستند لغات ❷ کی کتابوں کی سندوں سے یہ بتایا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے ہاں کن کن مجازی معنوں میں استعمال ہوتا تھا اور پھر بتایا ہے کہ ان معنی کی رو سے قرآن کی ان آیات کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے جن میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ یہ لغت مرتب کیا اور اسکی روشنی میں سارے قرآن کا مفہوم مرتب کیا اور جب اس کے بعد بھی وہ تقاضا پھر آگے بڑھا یا تشنگی آگے بڑھی' تو اب میں نے انہی کی روشنی میں قرآنِ کریم کی تفسیر

---

❶ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)۔

❷ مندرجہ ذیل جدول میں اِس لغات القرآن میں استعمال کیے گئے مستند لغات کی کتابوں کی تفصیل دی گئی ہے۔

نمبر شمار	نام لغت اور تفاسیر	نام مؤلف	سال طباعت' مطبع' ملک
1	لسان العرب	ابن مکرم۔ انہیں ابن منظور بھی کہا جاتا ہے (وفات 711ھ)	
2	قاموس	علامہ فیروز آبادی (وفات 816ھ)	
3	تاج العروس	محبّ الدین' ابن الفیض' السید محمد مرتضٰی الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی (وفات 1205ھ)	1306ھ دس جلد' مطبع الخیریہ مصر۔
4	An Arabic English Lexicon (in eight parts)	Edward William Lane	Librairie Du Liban Beirut, 1986
5	المفردات فی غریب القرآن	امام راغب اصفہانی (وفات قریب 502ھ)	1324ھ مطبع میمنیہ' مصر
6	مقاییس اللغۃ	ابن فارس (وفات 395ھ)	1952ء چھ جلد' مصر
7	محیط المحیط	پطرس بستانی	1870ء دو جلد' بیروت
8	فقہ اللغۃ	ابو منصور الثعالبی	1938ء مصر
9	اقرب الموارد	سعید الخوری الشرتونی اللبنانی	1889ء بیروت

کا سلسلہ مطالب الفرقان ❶ کے نام سے شروع کیا ہے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم کو صحیح معنوں میں سمجھنا ہے تو اس کا یہ طریقہ ہے۔

گزشتہ سے پیوستہ

10	منتھی الارب (عربی فارسی کا لغت)	——	1925ء، مطبع اسلامیہ لاہور
11	کتاب الاشتقاق	ابن درید (وفات 321ھ)	——
12	جمھرۃ اللغۃ	ابن درید (وفات 321ھ)	——
13	العلم الخفاق فی علم الاشتقاق	نواب صدیق حسن خان	——
14	الالفاظ المترادفۃ	علی ابن عیسیٰ الرمانی (وفات 384ھ)	——
15	لطائف اللغۃ	احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی (دمشق)	——
16	کتاب القرطین (مشکل القرآن وغریبہ)	امام ابن قتیبہ الدینوری (وفات 277ء)	1355ھ مصر
17	البستان	شیخ عبداللہ البستانی اللبنانی (وفات 1930ء)	1927ء
18	تفسیر کشاف	زمخشری	——
19	تفسیر جلالین	——	——
20	تفسیر المنار	علامہ محمد عبدہٗ	——
21	صحاح	جوہری	——
22	روح المعانی	آلوسی	——
23	تفسیر القرآن	قرطبی	——
24	تفسیر القرآن	تستری	——
25	فتح القدیر	شوکانی	——
26	مفردات القرآن	فراہی	——
27	کتاب التسہیل لعلوم التنزیل	محمد بن احمد بن جزی الکلبی	——

ان کے علاوہ دیگر مضامین اور انسائیکلو پیڈیا وغیرہ بھی ہیں جن کا ذکر اس لغات کے فٹ نوٹ میں کر دیا گیا ہے۔

❶ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مطالب القرآن کی پہلی تین جلدیں محترم پرویز صاحبؒ نے از خود املاء کروائی تھیں۔ اس طرح پہلی جلد اکتوبر 1975ء میں شائع ہوئی، دوسری جلد اکتوبر 1976ء میں اور تیسری جلد کا مسودہ جولائی 1977ء میں مکمل کر لیا تھا۔ یہ جلد سورۃ بقرہ کی آیات 113 تا 284 تک ہے۔ یہ نومبر 1979ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اس سلسلہ کی پہلی پانچ جلدیں ان کی زندگی میں ہی پیشِ نظر قارئین ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکی تھیں۔ جلد ششم طباعت کے لیے تیار تھی کہ آپ 26 فروری 1985 کو اپنے سفرِ حیات کی اگلی منزل کی طرف جادہ پیما ہو گئے چنانچہ یہ جلد ان کے بعد شائع ہوئی۔ جلد ہفتم فروری 1991ء کو طبع ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ اور پھر آپ کی زندگی کے 18 سال بعد (اکتوبر 2003 میں) ادارہ طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام بزمِ طلوعِ اسلام لاہور نے محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے پیش کردہ ہفتہ واری دروسِ قرآن کو مختلف عنوانات کے ساتھ قرآنی مطالب و مفاہیم کے تحت قرطاس پر منتقل کرنے کی ابتدا کی۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق کی زیرِ ادارت اب تک مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ النحل، مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل اور مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الکہف و سورۃ مریم کی یہ قرآنی تفاسیر قارئین

لفظ سحر کا تفصیلی مفہوم

اب آیئے ''سحر'' کے لفظ کی طرف۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''جھوٹی بات کو سچا کر کے بتا دینا' جو اصل میں کچھ ہو' بتایا کچھ اور جائے لیکن یہ ایسے پرکشش' فریب انگیز طریق پہ بتایا جائے کہ بظاہر آنکھ بھانپ نہ سکے کہ یہ کیا ہے''۔ یہ ہیں اس کے بنیادی معنی۔ ان عربوں کے ہاں شاعری تو آسمان پہ پہنچی ہوئی تھی' زبانِ شعر میں مجازی معنی لیے جاتے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ جانتے ہیں کہ جب زبانِ شعر میں سحر کا لفظ آتا ہے یا جب ہمارے ہاں یہ لفظ ہماری زبان کے محاورے میں آتا ہے تو آپ دیکھیے کہ کن کن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے مثلاً جسے یہ سحر البیان کہتے ہیں' وہ مداری یا جادوگری نہیں کر رہا ہوتا۔ عام طور پہ بھی جسے کہتے ہیں کہ صاحب! یہ ''تو جادوگری ہے'' یہاں بھی جادوگری Magic (جادو) کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ یہ وہی لفظ ہے جسے ہم ''مسحور کن'' کہتے ہیں' جسے ہم ''سحر انگیز'' کہتے ہیں' جسے ہم جادو کا سا اثر کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ الفاظ مستعمل ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو یہاں فرعون نے کہا ہے کہ یہ دونوں هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (20:63) ہیں۔ اب میں عرض کرونگا کہ اس کے کیا معنی ہو گئے۔ یعنی یہ جنہیں ساحر کہا گیا ہے یہ اپنے سحر کے زور پہ چاہتے یہ ہیں کہ تمہارا ملک تم سے چھین لیں' تمہارا ایسا بلند طریق' مسلک' مشرب' مذہب تم سے چھین لیں۔ دیکھنا ان کے قابو میں نہ آ جانا۔ یہاں سحر کا لفظ ہے۔ عزیزانِ من! یہ اتفاق ہے کہ ہمارے ہاں اقبال ❶ رحمۃ اللہ علیہ نے سلطنت ہی کے معاملے میں' اور سلطنت بھی وہ جو فرعونوں نے حاصل کی ہوئی ہوتی ہے' کے معاملے میں دو شعر کہے ہیں اور یہی الفاظ لائے ہیں:

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوْک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری ❷

اب اِس جادوگری کی تفصیل بھی انہی کے الفاظ میں سن لیجیے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

[گزشتہ سے پیوستہ] کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ ان مذکورہ تفاسیر میں جا بجا تحقیقاتی حواشی کی تدوین و انتخاب متن میں دیئے گئے بلند پایہ مصنفین' مورخین' مادیین' سائنسدان اور مفکرین کے مستند سنینِ ولادت و انتقال' نفسِ مضمون میں تسلسل و روانی' نیز تکمیل اشعار راقم کی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

❶ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)۔

❷ اقبالؒ: بانگ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' 1996' ص۔ 271۔

آپ نے سمجھ لیا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں اور یہ کہ آپ کے ہاں یہ لفظ کن معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ کیا یہ ساحری ہے؟ کیا وہ حکمران مداری کی طرح ڈگڈگی بجاتا ہے؟ عزیزانِ من! وہ حکمران تو کچھ کرتا ہے۔ یہاں تو اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے (1877-1938) کہا کہ

سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

یہ آج ہی کے دور میں نہیں ہے کہ جادو کے زور پہ سلطنتیں قائم رہتی ہیں' فرعون کے ہاں بھی سحر ہی کے زور پہ یہ سلطنت قائم تھی۔ عزیزانِ من! کوئی انسان دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم نہیں بنا سکتا جب تک کہ ان کے دل میں یہ عقیدہ نہ راسخ کیا جائے کہ یہ حکمران انسان نہیں ہیں' یہ اس سے کچھ اونچے ہیں۔ اسی لیے تو کہا کہ یہ حکمران ظِلُّ اللّٰهِ عَلَى الْأَرْضِ ہے یعنی یہ زمین پر خدا کا سایہ ہے' یہ اوتار ہے' مصر کے بادشاہ دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا تھا۔ فرعون کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے' بلکہ شاہانِ مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن رع (سورج کا دیوتا) اِن سب میں بڑا تھا۔ یہی فرعون اوتار تھا۔ اس لحاظ سے فرعون کا یہ لفظ ہی فاراع تھا یعنی سورج دیوتے کے اوتار۔ اور وہ لفظ ہو یا نہ ہو' وہ تو بنایا ہی یہ جاتا ہے۔ کیا بادشاہ خود اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں خدا کا اوتار ہوں؟ نہیں۔ بلکہ ہامان [1] کی سحر البیانی اس انسان کو خدا کا اوتار بنا دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں؟

بادشاہ کی تاج پوشی ہمیشہ برہمن کے ہاتھوں ہوئی ہے' جسے ہامان سرانجام دیتا ہے

عزیزانِ من! آپ انسان کی پوری تاریخ میں ہر جگہ دیکھیں گے کہ ہر فرعون کے ساتھ ایک ہامان ہوتا ہے۔ راجہ اس وقت تک راجہ نہیں بن سکتا جب تک اس کے ساتھ برہمن' اس کی رکشا [2] کرنے والا نہ ہو۔ وہ اس کی حفاظت کرتا ہے' اس کے ماتھے پر آ کر تلک [3] لگاتا ہے اور اندر کی سازش یہ ہے کہ وہ تخت پہ قدم نہیں رکھ سکتا' اپنے سر پہ تاج نہیں رکھا جا سکتا تاوقتیکہ وہ برہمن کے ہاتھ سے نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہتا کیا ہے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ خود بادشاہ نہیں بنا' اِسے خود حکومت نہیں ملی۔ خدا نے یہ اختیارات دیئے اور ہمیں کہا ہے کہ ہم یہ کہہ کر اسے یہ اختیار سونپیں کہ خدا نے یہ اختیارات ہمیں دیئے اور ہم تمہیں سونپ رہے ہیں۔ اس لیے وہی اس کی تاج پوشی کراتا ہے۔ یہ جتنے رومن Emperors یعنی شہنشاہ تھے اور آج بھی جتنے یورپ میں ہیں' یہ اس دور میں بھی Protector of the Faith (محافظ ایمان) یا Defender of the Faith (دفاعین ایمان) کہلاتے ہیں۔ ان کے ہاں اگرچہ Protestent (پروٹسٹنٹ) مذہب

---

[1] مذہبی پیشوائیت کا نمائندہ

[2] رَکْشا (رک۔شا) [سنسکرت۔اسم۔مونث] حفاظت۔پناہ۔بچاؤ۔

[3] تلک (ت۔لک) [ہندی۔اسم۔مذکر] قَشْقَہ۔ٹیکا جو ہندو ماتھے پر لگاتے ہیں: قشقہ کھینچا' دیر میں بیٹھا' کب کا ترک اسلام کیا۔ (میرؔ)

ہے، پھر بھی ان کے ہاں کے پادری کا' پوپ کا' تو پوچھو ہی نہیں' وہ تو خود ہی خدائی کرتا ہے۔ اتنی عظیم رومن ایمپائر ہے مگر جب تک پوپ آ کے اُسے اپنی Blessing (دعا) نہیں دے دیتا تھا' کوئی بادشاہ مستند طور پہ بادشاہ نہیں بن سکتا تھا' حالانکہ وہ Protestent (پروٹسٹنٹ) ہیں۔ ان کے ہاں لندن میں بادشاہ یا ملکہ کی تاج پوشی دیکھیں گو کہ وہ Protestent (پروٹسٹنٹ) ہیں لیکن اس میں بھی کیفیت یہ ہے کہ تاج پوشی کی رسوم میں پوپ یا پادری کا کتنا بڑا دخل ہوتا ہے' اس کے ہاتھوں سے تاج پوشی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! ہر دَور میں فرعون کو ہامان کی ضرورت ہوتی ہے' دوسرے انسان یونہی تو قابو نہیں آ جاتے۔ وہ جو کچھ ہوتا ہے اسے وہ کچھ نہیں بتایا جاتا' اسے کچھ اور بنا کے بتایا جاتا ہے۔ اسے ہی تو سحر کہتے ہیں اور یہ لفظ پرانی زبانوں میں بھی موجود ہے۔

مندروں کے منتری ہوں یا ایران کے آتش پرست: یہ سبھی ہامان ہوتے تھے

عزیزانِ من! یہ مندروں کے جتنے منتری ہوتے تھے' پجاری ہوتے تھے' یہ ہامان ہوتے تھے۔ ہمارے اس دور کی طرح یا کم از کم انگریز کے دَور کی طرح' یہ بے چارے مسجد کے امام ہی نہیں ہوتے تھے؛ ان کی تو اپنی اسٹیٹ within a state (مملکت میں مملکت) ہوتی تھی' اِن کی خود ایک ریاست ہوتی تھی' ان کا بڑا اقتدار ہوتا تھا۔ قرآن تو "ہامان کے جنوذ" کہتا ہے۔ "جنوں شتونگڑے کیندے نیں" یعنی ہامان کے جنود۔ اور اس ہامان کا بڑا اقتدار تھا۔ دربارِ فرعون میں ان منادر کے یہ منتری تھے' یہ مذہبی امور کے علوم جاننے والے تھے۔ اور یہ چیز تھی کہ وہ غلط بات کو آ کر حق یا صحیح بنا کر بتاتے تھے۔ یہ تھا ان کا سحر۔ اس اعتبار سے ان کو ساحر کہا جاتا تھا۔ ان کی زبانوں میں بھی یہ چیز آتی ہے۔ یہ جو لفظِ Magic (جادو) ہے' یہ تو خود مجوس [1] سے آیا ہے۔ اور اسی طرح یہ جو ایران کا' آتش پرستوں کا' زرتشتی مذہب تھا' ان کے ہاں جو سب سے بڑے مذہبی راہنما ہوتے تھے' وہ مجوس کے ہوتے تھے' ان کی طرف سے یہ لفظ Magic (جادو) بنا ہوا ہے۔ یہ وہی مذہب کی ساحری ہے۔

منطق کی یاوہ گوئی (Absurdity) [2] اور ہمارے دار العلوم

عزیزانِ من! یہ ہے وہ چیز جو یہ ساحری کرتی کیا ہے یعنی وہ آ کر غلط بات کو حق یا صحیح بنا کر بتاتی ہے۔ غنیمت ہے کہ کم از کم ہماری اگلی (Generation)' یعنی نسل کا تو پیچھا چھوٹا' ورنہ اس سے پہلے ہمیں منطق پڑھائی جاتی تھی۔ وہ منطق کرتی یہ تھی کہ باطل کی دلیلوں سے ہر جھوٹی بات کو سچا ثابت کرتی تھی۔ یعنی اسے یوں نہ کہیے بلکہ وہ رسیوں کو سانپ بنا کے دکھا دیتی تھی۔ منطق یا Logic کی رو سے جو کسی کا جی آتا تھا اس کو ثابت کر دیتا تھا۔ وہ حقیقت میں علم کا ایک فن ہے اِسے فن کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا۔

---

[1] مجوس۔ (م۔ جوس) [فارسی۔ اسم۔ مذکر] مجوسی کی جمع۔ آتش پرست۔ زردشت کا پیرو

[2] اِسے علم نفسیات میں Logical Fallacies بھی کہتے ہیں اور نفسیاتی جانچ میں اس کا خوب استعمال کیا جاتا ہے مثلاً یہ سوال کہ "اگر نمازِ جنازہ پڑھتے ہوئے آپ کی پیشانی میں کانٹا چبھ جائے تو آپ کیسے نکالیں گے؟"

عزیزانِ من! ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک ہمارے ہاں کے یہ جتنے مذہبی مکاتب اور دارالعلوم ہیں' ان میں آج بھی اِسی طرح کی منطق پڑھائی جاتی ہے۔ یہی کچھ وہ کرتی ہے۔ وہ اس قسم کے دلائل لاتی ہے کہ انسان چکرا جاتا ہے۔ اور اس طرح جو کسی کے دماغ میں آتا ہے وہ اسے ثابت کر دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال امام غزالیؒ بھی (1059-1111) ہیں۔

منطق میں تصوف کا حصہ اور امام غزالیؒ کا عمل

عزیزانِ من! یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس منطق کے خلاف جو ہمارے ہاں احتجاج بلند ہوا' تو وہ کچھ ایسے ہی تھا جیسے آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا[1] کہتے ہیں۔ اِس منطق کے مخالفین Extreme (انتہا) پہ پہنچے اور تصوف میں آ گئے۔ جو کچھ منطق اپنے دلائل سے کرتا تھا' وہی کچھ تصوف میں مثالوں اور تشبیہات کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ ''آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا'' یہ مثال ہم پہ صادق آتی ہے۔ امام غزالیؒ [2] نے آدھی عمر تو منطق کی رو سے بسر کی۔ وہ ان غلط مفروضوں کو صحیح ثابت کرنے میں بہت بڑے فلسفی تھے' انہوں نے آدھی عمر اس میں بسر کی اور اس کے بعد کی آدھی عمر انہوں نے اپنے ہی خود وضع کردہ یا ثابت کردہ منطقی دلائل توڑنے میں گزار دی۔ چلیے بڑی بات ہے' کچھ تو ہوا۔ لیکن انہوں نے کیا کیا؟ چھوٹے بتوں کی جگہ بڑے بت بنا کے رکھ دیئے۔ تصوف کی دنیا تو تشبیہات سے بھی زیادہ مسحور کن ہوتی ہے اور وہ اُسی میں جا بسے۔

ایک دو مسحور کن تشبیہات کی جادوگری

عزیزانِ من! کہیں وقت ہوتا تو آپ کو بتاتا کہ میں نے اِس میدان میں' اِسی دشت میں' بس یوں سمجھو کہ اپنی عمر ہی گزار دی ہے: کچھ منطقی دلائل میں اور کچھ تصوف میں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ تو خدا کی اس کتاب قرآنِ کریم نے بچا لیا' ورنہ مرشد کی اہمیت کی ایک تشبیہ نے کہ انسان خدا کو براہِ راست کیوں نہیں دیکھ سکتا' فکر و نظر کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے' اسے یہیں تک رہنے دیجیے۔ پھر بھی سہی۔

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے کہ ''تم بُلاؤ'' تو ہم ''جواب دیں گے۔'' مرشد کہنے لگے کہ یہ کیا بات ہے؟ پھر کہا کہ یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ بیٹا! ذرا سورج کی طرف آنکھ کر کے تو دکھاؤ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں؛ کیا سورج نظر آتا ہے؟ کہا کہ جی' نہیں نظر آتا۔ کہنے لگے کہ یہ لو پانی کا پیالہ' دیکھو اس کے اندر تو سارا سورج نظر آتا ہے۔ بیٹا! یہ بات ہے کہ خدا کے ''جلال'' کو مرشد کے ''جمال'' کے Through' کے وسیلے سے' دیکھا جاتا ہے۔ لو' ساحر اس سحر سے' اس جادو سے' پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ ان سے کہا کہ قبلہ! یہ تو

---

[1] ایک مصیبت سے چھوٹا دوسری میں جا پھنسا

[2] امام غزالیؒ (1059-1111)۔ ایران کے ضلع طوس کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: شبیر احمد: تعلیم کی کہانی' کفایت اکیڈمی' کراچی' 1974' ص ص۔ 212-211

جمالِ خداوندی ہے؛ جلالِ خداوندی کیسے ہے؟ کہنے لگے کہ جلالِ خداوندی بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ دیکھیے' ایک مائی نے کپاس دھوپ میں ڈال رکھی ہے' سارا دن دھوپ میں پڑی ہوئی ہے' شام تک زیادہ سے زیادہ وہ کپاس گرم ہوگی۔ بیٹا! اسی کپاس کے اوپر آتشی شیشہ یوں سامنے رکھو کہ سورج کی کرنیں اس میں سے گزر کر کپاس پر پڑیں۔ تم دیکھو گے کہ دو منٹ میں اسے آگ لگ جاتی ہے۔ براہِ راست خدا کا جو جلال ہے' وہ تمہیں زیادہ سے زیادہ تھوڑی سی تپش دے گا۔ یہ جو آتشی شیشہ ہے' اس کے قلب سے' جلالِ خداوندی کی کرنیں گزریں گی تو تم کو جلا کے' بھسم کر کے' رکھ دیں گی۔ سبحان اللہ' سبحان اللہ! یہ لوگ چپک کر رہ جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! ان لوگوں سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ بہر حال' میں کہہ رہا تھا کہ یہ سب سحر ہے اور مسحور کن ہے۔

بھگتی ❶ سازش کی تحریک

عزیزانِ من! برصغیر جنوبی ایشیا میں بے شمار تحریکیں ابھریں ❷ ۔ سحر ہے یا نہیں؟ آپ ان سوالات پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ آپ کس طرح سے ثابت کر سکتے تھے کہ رام بھی وہی ہے' رحیم بھی وہی ہے؟ بدھ مت یا ہندو دھرم بھی وہی ہے اور اسلام بھی وہی ہے؟ کبھی یہ بات ذہن میں نہیں آ سکتی' یہاں سازش سے تحریکیں اٹھائی گئیں۔ بہر حال کبھی ان مقامات پہ آؤں گا تو پھر ان تحریکوں کی تفصیل

---

❶ بھگتی یا بھگتی بمعنی پرہیزگاری' عبادت' عقیدت۔ بھگتی سازش کی تحریک سے مراد وہ تحاریک ہیں جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف عبادت' پرہیزگاری اور عقیدت رام اور رحیم کے نام پر شروع کیں' مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا اور اسلام کو دوسرے مذاہب کے برابر لا کھڑا کرنا تھا۔

❷ مثلاً (ل) سودیشی تحریک۔ 1906ء میں کانگریس کے اجلاس نے اس تحریک کی توثیق کی۔

بظاہر اس کا مقصد غیر ملکی خصوصاً انگلستانی مال کا بائیکاٹ کرنا تھا لیکن درپردہ مسلمانوں کا ساتھ نہ دینے پر ان پر ظلم و ستم برپا کرنا تھا اور ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ یہ تحریک دبی۔ 1908ء میں پھر سر اٹھایا۔ ہندوؤں نے دہشت گردی کا مظاہرہ کیا۔ مسلمانوں کا قتل ہوا۔ 1910ء تک تو یہ شورش ختم ہو گئی۔ لیکن 1911ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ پر ہندو مسلم فساد بڑھ گیا۔ تحریک عدم اعتماد کے خاتمہ کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔

(ب) شدھی ہندو فرقہ پرست تحریک: آریہ سماجی فرقہ پرست شردھانند نے اس تحریک کو ہوا دی۔ اس تحریک کا مقصد برصغیر کے غیر ہندو باشندوں کو ہندو بنانا تھا۔

(ج) سنگھٹن ہندو فرقہ پرست تحریک: ایک ہندو فرقہ پرست جس کا نام ڈاکٹر مونجے تھا' نے سنگھٹن نام کی تحریک چلائی۔ جس کا مقصد فرقہ پرست ہندوؤں کی جماعت کو فوجی تربیت دینا اور پھر انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا تھا۔

(د) برہمو سماج: ہندوؤں کا ایک مکتبۂ فکر جس کی بنیاد 1830ء میں راجہ رام موہن رائے نے بنگال میں رکھی۔

(ر) آریہ سماج: اس کا بانی مول شنکر ولد امبا شنکر گجراتی شیوی برہمن ہے یہ 1827ء میں پیدا ہوا۔ 1845ء میں سنیاسی ہوا۔ 1860ء میں سنیاس چھوڑا اور اپنا نام بدل کر دیانند سرسوتی رکھا۔ اپنے دھرم کی تعریف کی مگر دیگر مذاہب کی برائیاں بیان کیں۔ اس طرح ایک نیا فرقہ پیدا کیا اور اسلام کی مخالفت کی۔

(س) دینِ اکبری: (ص) تمام مذاہب میں عالمگیر سچائیاں یکساں طور پر موجود ہیں۔ ابوالکلام آزاد

[باقی اگلے صفحے پر]

بتاؤں گا کہ آگے چل کر ان سے کیا کیا صورتیں سامنے آئیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام باقی مذاہب سے افضل نہیں ہے بھگتی کی ایک تحریک اٹھائی گئی۔ یہ لوگ مناظروں میں تو یونہی ہار جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے، یہ تو ساحرین کے بس کی بات ہے۔

گنگا ایک گھاٹ تیہرے
کہت کبیر عقل کے پھیرے

یہ تو شروع سے آخر تک ایک ہی گنگا بہے چلے جارہی ہے، بیٹا! یہ جو تمہیں مختلف مذاہب نظر آتے ہیں، مختلف گھاٹ ہیں: کہیں کعبہ ہے، کہیں ہر بھجنے ❶ کے بازار ہیں۔ یہ تو گھاٹ کے نام ہیں۔ گنگا وہی بہے چلی جارہی ہے۔ گھاٹوں کی رو سے گنگا کو مختلف سمجھنا عقل کے پھیرے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ وہ ساحرین ہیں جنہیں بلایا گیا تھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (20:61)۔ تم خدا کے خلاف افترا پردازی مت کرو۔ تم خدا کے خلاف جھوٹ باندھتے ہو۔ بلایا انہیں گیا تھا جو اس جھوٹ کو سچ کر کے دکھا دیں۔ تھا تو وہ جھوٹ ہی، مگر وہ اُسے سچ کر کے دکھا رہے ہیں۔ اب ہمارے ہاں جہاں یہ لفظ آتے ہیں، سحر کے معنی جادو، اور ساحر کے معنی جادوگر ہو گئے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد دربار فرعون میں یہ جتنا مقابلہ ہے، جادو کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ چھوٹے جادوگر ہیں اور ان کے مقابل یہ خدا کے دو اولوالعزم پیغمبر، بڑے جادوگر (معاذ اللہ)، بڑے جادوگر ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ مذہب کس طرح سے عقل و فکر کے سوتے آف کر دیتا ہے۔

عزیزانِ من! میں دو باتیں کرونگا۔ آپ سوچیے کہ کس طرح یہ بات چمک کر سامنے آ جاتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسی منبر سے یہ کہا جاتا ہے کہ جادو برحق، مگر کرنے والا کافر ہے۔ یہ آپ نے بھی سنا ہوا ہے، ایک ایک بچہ اس محاورے کو جانتا ہے۔ واعظ بھی اِسے دہراتے ہیں کہ جادو برحق ہے مگر اس کا کرنے والا کافر ہے۔ اور اس کے بعد حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو سب سے بڑا جادو کرنے والا ثابت کر رہے ہیں، معاذ اللہ۔ کیا کبھی انہوں نے آپس میں بھی ان دو باتوں میں ربط دیا ہے؟

کیا معاذ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سب سے بڑے جادوگر تھے؟

عزیزانِ من! اِسے تو چھوڑیئے کہ جادو برحق ہے یا نہیں۔ مگر اسے سوچیے جو یہ کہتے ہیں کہ جادو کرنے والا کافر ہے۔ اِس لحاظ سے،

[گزشتہ سے پیوستہ] (ہاشمی، انوار: تہذیب کی کہانی، کراچی بک سنٹر، کراچی، 1979، ص ص۔ 426-425، 417-416۔ اور صدیقی، عزیز احمد: ہندو مذہب کی تاریخ اور ہندی مسلمان، کراچی، 2000، ص ص۔ 14,15)

❶ ہر بھجنا: خدا کا نام لینا، مالا جپنا۔ ''ہر'' ہندی لفظ ہے، اسم ہے، مذکر ہے اور معنی ہیں خدا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں' سب سے بڑا جادوکرنے والا یعنی جادوکرانے والا' خدا ہے اور یہ جادوکرنیوالا اتنا بڑا پیغمبر ہے۔ اِدھر ہمارے ہاں دیکھیے کہ یہ حضرات بلند آواز سے منبر سے کہہ رہے ہیں کہ جادوکرنے والا کافر ہے۔ یہ سارا کچھ ہورہا ہے مگر نہ کہنے والوں میں اور نہ سننے والوں میں کوئی سوچتا کہ یہ کچھ کہنے سے بات کہاں جا پہنچی اور جس نے سوچ کے بات کہی اس کے پیچھے ڈگڈگی لگا دی کہ وہ بے دین ہے' کافر ہے' پکڑیئے اور لیجیے! منکرِ حدیث ہے' منکرِ سنت ہے۔ پتہ ہے منکرِ حدیث کس بناء پہ ہے؟ آپ کے ہاں یہ بخاری شریف کی حدیث ہے اور بھی صحیحین حدیث کی کتابوں میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ پر ایک یہودی نے جادوکر دیا تھا۔ آپ ﷺ اس جادو کے اثر سے اتنے مسحور ہو گئے تھے کہ آپ ﷺ کو یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ میں نے فلاں بات کر لی یا نہیں کر لی۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ نماز پڑھ چکا ہوں یا نہیں (معاذ اللہ) وہ رسول' عالم الناس ہیں کہ جن کے سینے کو وحی جیسی نعمت کا مَھْبِطْ بنایا گیا۔ اُن کی کیفیت یہ ہے کہ یہودی ان پہ جادوکرتے ہیں' اور جادو کا اثر ہو جاتا ہے اور اتنا اثر ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ بڑے افسردہ اور مضمحل رہتے تھے یعنی ان کے لیے اس سے چھوٹنے کا' اس کے علاج معالجے کا' کوئی چارہ ہی نہیں تھا' اس غم میں گھلے جا رہے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کے بعد پھر جبرائیل نے آ کے یہ بتایا کہ یہ کرواور وہ کرو۔ اور پھر ان جادوؤں سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ کیا' وہ کیا گیا اور پھر ہمارے ہاں جادو نکالنے کے لیے یہ کچھ کرایا کرتے ہیں کہ فلاں کنویں میں جا کے کھود کے دیکھیے' وہاں ایک چھوارا ہے' چھوارے کے اندر تاگا ہے' تاگے میں یہ کچھ ہے۔ وہ نکالو۔ اس کے بعد انہوں نے وہ نکالا تو اچھے ہو گئے۔ یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے! یہ چیز بتائی جا رہی ہے' سوچیے' عزیزانِ من! جس کے سامنے نبوت کا منصب اور حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی عظمت ہو گی' وہ اسے کس طرح سے مان لے گا۔

میں منکر حدیث کیسے بنا؟

عزیزانِ من! حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی عظمت کو قائم ودائم رکھنے کی یہ تھی وہ تڑپ جس کی بنا پہ میں نے یہ لکھ دیا کہ خدا کے بندو ذرا سوچو تو سہی کہ کیا کر رہے ہو؟ یہ یہودیوں کی سازش ہے کہ اس قسم کی روایتیں انہوں نے تمہاری کتابوں کے اندر داخل کر دیں۔ آپ دیکھیے تو سہی اس یہودی کو کتنا غالب ثابت کیا کہ جس کے سحر سے آپ کا رسول مسحور ہو رہا ہے' مغلوب ہو رہا ہے۔

عزیزانِ من! اس طرح جادو کے اثر سے مسحور ہونے پر اس رسول کی کیا عظمت رہ جاتی ہے! مگر ہم ہیں کہ ایسی احادیث کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں چونکہ بخاری کی حدیث ہے اس واسطے صاحب! میں یوں منکرِ حدیث ہوں' میں منکرِ حدیث!! میں نے کہا کہ صاحب! میں یہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ میں تو قرآن کیطرف سے کہتا ہوں کہ یہ ایسی احادیث صحیح نہیں کیونکہ قرآنِ کریم میں ہے کہ ان کفار کو دیکھو' ان کم بختوں کو دیکھو' کہ یہ تمہارے رسول کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ ان پر کسی نے جادو کیا ہے اور یہ مسحور ہو گیا ہے۔ قرآن تو آپ ﷺ کو یہ کہہ رہا ہے۔ اور تم ہو کہ اس کے برعکس اس امر کی تصدیق کرتے ہو کہ یہ کفار صحیح کہتے تھے (معاذ اللہ معاذ اللہ) خدا غلط کہتا

ہے۔ میں نے کہا کہ یہ قرآن میری دلیل و بنیاد ہے۔ آگے جو چیزیں میں کہہ رہا ہوں' وہ تو اس کی تشریح میں کہہ رہا ہوں۔ میری بات کی بنیاد تو یہ قرآنِ کریم ہے۔ فرمایئے جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کی دلیل و بنیاد کیا ہے؟ اب میں کہاں تک کہتا چلا جاؤں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب کسی حدیث میں اور قرآن کی آیت میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھیے' حدیث اپنے مقام پہ کھڑی رہے گی۔ اس طرح حضور ﷺ کو جادو سے مسحور ثابت کرنا اپنے مقام پہ رہے گا' قرآن کی بات کو اگر اس میں حدیث کے ساتھ تضاد پایا جاتا ہے تو تم قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھ لو۔ یا للعجب!

قیامت کے روز بارگاہِ نبوت میں پیش ہو کر کیا جواب دونگا؟

عزیزانِ من! یہ ہے انکارِ حدیث جس کی بنا پہ فتوے لگتے ہیں۔ ٹھیک ہے' عزیزانِ من! میں ان کے فتوے کی رو سے کافر بن کے تو حضورِ نبی اکرم ﷺ کے سامنے جا سکتا ہوں۔ حضور ﷺ کے سامنے اس حیثیت سے کھڑا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ تم بھی مانتے تھے کہ مجھ پہ جادو کیا گیا تھا اور میں جادو سے مسحور ہو چکا تھا۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہوگا۔ وہ بڑی بلند شان کا مالک ہے' عزیزانِ من! قرآن نے تو کہا تھا کہ **مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ** (6:92)۔ یہ لوگ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگا سکے۔ ان لوگوں نے خدا کی قدر ہی نہیں پہچانی کہ خدا ہوتا کیا ہے۔ میں کہتا ہوں خدا تو بڑی چیز ہے' یہ رسول کی بھی قدر نہیں پہچان سکے کہ رسول ہوتا کیا ہے۔

میری سوچ کسی دوسرے کے لیے سند نہیں ہو سکتی

عزیزانِ من! مجھے اس پہ اصرار نہیں کہ جو میں کہوں وہی آپ مانیں۔ میرے درس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے جو کچھ غور و فکر کے بعد قرآنِ کریم سے سمجھا ہے' اس کی سند یہ ہے جو میں نے ابھی عرض کی کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ یہ عربی زبان میں ہے' خود کہا ہے کہ تصریفِ آیات سے سمجھ میں آئے گا۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جو بات میری سمجھ میں آئی ہے' میں وہ پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو صحیح مان لیجیے' اگر متفق نہ ہوں تو اسے مسترد کر دیجیے' پھٹکار کے رکھ دیجیے لیکن خود غور کر کے پھر کسی نتیجہ پہ پہنچیے۔

اب اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مابین موجود کشمکش کے بارے میں سنیے کہ اس کے معنی کیسے واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے مذہبی مناظروں کو خصوصیت سے مخاطب کیا۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے کہا کہ **فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ** (20:64)۔ اپنے باہمی اختلافات کو چھوڑ کر اس مشترکہ دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے' اپنی تمام ہنر مندیوں اور تدابیر کو یکجا کر لو۔ اور پھر پرا باندھ کر' ان کے مقابلے کے لیے ڈٹ جاؤ۔ اس کا عام پروپیگنڈہ کیا کہ یہ ہے اس سازش کو توڑنے کے لیے جو یہاں ہو رہی ہے۔

آخر فریب انگیز سازش اور خفیہ تدبیروں کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

عزیزانِ من! جادو ہی کا ایک تماشا دکھانا تھا تو ان خفیہ تدبیروں اور فریب انگیز سازش جیسی چیزوں کی کیا ضرورت تھی۔ بڑے بڑے جادوگروں سے کہا جاتا کہ آ ؤ میاں! جادو کا ایک مقابلہ ہوگا۔ یہاں آ کے میدان میں دنگل میں یہ کرو۔ مگر یہ نہیں کیا بلکہ کہا کہ **فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ** (20:64)۔ تمام فریب انگیز ہنرمندیوں سازشوں اور خفیہ تدابیر کو جمع کرو۔ مکائد تو آپ جانتے ہیں۔ یہ لفظ ہمارے ہاں اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں: فریب انگیز سازشیں خفیہ تدبیریں۔ یہ کوئی بہت بڑی چیز ہے جسے خفیہ رکھنا مقصود ہے۔ کہا کہ یہ جو اس قسم کی اپنی ساری خفیہ تدبیریں ہیں **فَاَجۡمِعُوۡا** (20:64)۔ انہیں جمع کرو ان کو اکٹھا کرو جو کسی کے ذہن میں بات آتی ہے وہ کام میں لاؤ۔ اگر جادو سے ہی ہرانا ہوتا تو باقی ساری دنیا سے کیوں کہا جاتا۔ یہاں کہا ہے ''کید'' کہ جن کے مکائد ہیں ان کو اکٹھا کرو جمع کرو۔ دیکھا کس طرح سے قرآن نے یہ ساری بات صاف کردی۔ وہاں تو صورت یہ تھی کہ آ ؤ **ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا** ج (20:64) پھر پرا باندھ [1] کر ان کے مقابلے کے لیے ڈٹ جاؤ۔ پھر صفاً اب انفرادی طور پہ یہ چیز نہ کرو بلکہ اکٹھے ہو جاؤ مل کے مشورہ کرو پھر اس کے سامنے آ کے کھڑے ہو جاؤ۔ تو نظر آتا ہے کہ بنی اسرائیل اگرچہ Minority 'اقلیت' ہی میں تھی لیکن وہاں چونکہ ان میں ایک جماعتی تشخص موجود تھا اس لیے ان کی ایک مؤثر حیثیت تھی اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی عظمت تو اس سے سامنے آتی ہے ورنہ آپ تو ایک محکوم قوم کے فرد تھے یہاں کے بھاگے ہوئے۔ آتے ہیں تو فرعون کے الفاظ میں ''زبان بھی ابھی صاف نہیں ہوئی''۔ تو پھر ان سے ڈر کا ہے کا تھا؟ قرآن میں یہ ہے کہ فرعون کے مشیروں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کا کیا ہے؟ فتنہ کی سرکوبی کر لیجیے پھانسی پہ چڑھا دیجیے آپ کو تو سارے اختیارات حاصل ہیں۔ اس نے کہا کہ تم اس کے عواقب کو نہیں جانتے یہ جو مسئلہ ہے اس کے متعلق میں نے بھی یہ سوچا ہے کہ ان کو جمع کرو اور یہ بات فیصلہ کن تھی۔ **قَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى** (20:64)۔ یاد رکھو! یہ معرکہ بڑا فیصلہ کن ہے جو آج بازی لے جائے گا وہی کامیاب ہوگا۔ اس لیے یاد رکھو! اسے Seriously '(سنجیدگی سے) لو۔ آج جو اس مقابلے میں غالب آ گیا وہی اس ملک کے اندر کامیاب ہوگا۔ ٹھیک ہے بلایا گیا۔ اگلی بات آ گئی: **قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى** (20:65)۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ یعنی وہ سارا کچھ ہو گیا: جشن کا دن مقرر ہو گیا وہ آ گئے۔ یوں تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے وہاں اس ایک واقعہ کی داستان یا کہانی بیان ہو رہی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم ابدی حقائق کو ہر موقعہ پر سامنے لاتا ہے۔

قرآن ابدی حقائق کو ہر موقع پر سامنے لاتا ہے

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ یہ تو کہانی ہی میں ایسے بنیادی نکات بیان کرتا چلا جاتا ہے ایسی ذہنیتیں (Mentalities)

---

[1] پرا باندھنا: قطار بنانا صف باندھنا۔

سامنے لاتا چلا جاتا ہے' جو ابدی ہوتی ہیں اور جن کی طرف ابدی طور پہ اشارے کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ہدایت تو کہتے ہی اس کو ہیں۔ مذہبی منتری یا ان کے علماء یا پیشوا' اپنے مذہب' اپنے طریق' کو غالب ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مثلاً آج کے الفاظ میں اگر کہیۓ' انہی کے الفاظ میں بھی کہیۓ' تو ان کے ایشور پر ماتما کا سچا دھرم تھا۔ ان کے ہاں کا سچا مذہب تھا' ان کے ہاں دینِ خداوندی جیسا وہ کہتے تھے' یہ تھا۔ یہ اس کے محافظ تھے۔ یہ ان کا ایمان تھا کہ اس کو محفوظ رکھنا چاہیۓ' ہر قسم کے خطرات سے مصئون رکھنا چاہیۓ' یہ ان کا ایمان تھا۔

عزیزانِ من! مذہبی پیشوائیت تو ہمیشہ یہی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ تو اس مذہب کے محافظ ہیں۔ چنانچہ جب وہ کسی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ ہم اس سے اپنی کوئی دشمنی یا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! مذہب پر حملہ ہوتا ہے اور ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ گویا وہ بتاتے یہ ہیں کہ یہ ان کا ایمان ہے' یہ ان کا یقین ہے' ایسا کرنا ان کا مذہبی فریضہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو ان کا پیشہ ہوتا ہے' بُلائے گئے ہیں' لائے گئے ہیں' بتایا گیا ہے کہ آج یہ مسئلہ کتنا اہم ہے۔ جو یہاں غالب آ گیا' کامیابی و کامرانی اسی کی ہے۔ سوچ لو۔ کہا: جی ٹھیک ہے' ہم بھی اس کے قائل ہیں' یہ ہوگا۔ ہم آ گئے ہیں۔ بات شروع کرنے سے پہلے ایک چیز ہے جس کا فیصلہ نہایت ضروری ہے' مقدم ہے' پہلی شرط ہے۔ شرط یہ ہے کہ **اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ** (7:113)۔ اگر ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے تو ہمیں کیا ملے گا۔ ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ملنا چاہیے۔ جی! پہلاں اے طے کر لو۔ [1]

مذہبی پیشوائیت کا مطالبہ کہ پہلے ٹھیکہ کرو کہ ہمیں کتنے پیسے دو گے

عزیزانِ من! یہ کہانیاں' جو قرآن بیان کر رہا ہے' بڑی دُور رس نتائج کی حامل ہیں۔ یہاں کہا کہ **اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ** (7:113)۔ اگر ہم غالب آ گئے' تو ہمیں امید ہے کہ **اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا** (7:113)۔ ہمیں اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ ہاں تو پہلی چیز یہ ہے کہ اگر ہم اس مقابلے میں غالب آ گئے تو ہمیں کیا ملے گا۔ یہ وہی ہے جو آج کل باکسنگ میں شاید ہوتا ہے کہ Contract یعنی ٹھیکا طے ہو جاتا ہے۔ جی! طے یہ کرو کہ اگر ہم غالب آ گئے تو کیا ملے گا؟ پہلے یہ بات طے کرو' پھر ہم قدم آگے اٹھائیں گے۔ اب یہاں سے نظر آیا کہ قرآنِ کریم نے' ہر رسول کے تذکرہ جلیلہ کے سلسلہ میں' ہر نبی سے یہ کہلوایا کہ میں تم سے کچھ صلہ نہیں مانگتا۔ لیکن یہاں ہمارے ہاں ''سنت'' یہ ہے کہ اجی! جنازہ پڑھانے کا معاوضہ ہے' مُردے کے قلوں [2] کے ختم کا معاوضہ ہے اور وہ لیتے ہیں۔ یعنی کسی کے ہاں شادی ہو' غمی ہو' کسی قسم کی کوئی چیز ہو' ان کا معاوضہ مقرر ہے۔ اذان دینے کا معاوضہ طے ہے' نماز پڑھانے کا معاوضہ طے ہے۔

---

1. جی ہاں جناب! پہلے یہ طے کر لیں۔
2. سوم کا' مردے کا تیجا۔

عزیزانِ من! نماز پڑھانے میں کیا ہوتا ہے: جو نماز اس نے خود پڑھنی ہے نماز تو وہی ہے۔ وہ ذرا اونچی آواز سے پڑھا دیتے ہیں۔ مگر ظہر اور عصر میں تو اونچی آواز بھی نہیں ہوتی۔ یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے اس نے خود پڑھنی تھی۔ یہ فریضہ تھا جو آپ نے بھی تو ادا کرنا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہماری بات اور ہے، تمہیں اس سے کیا واسطہ! اب تو ہم تمہاری نماز پڑھانے آئے ہیں یعنی پڑھانے کیوں آئے ہو کہ مسجد میں کہیں جگہ ہو یا نہ ہو ہماری جگہ پہلے Reserve (مخصوص) کی ہوئی ہوتی ہے، تو یہ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے محراب میں قیام کی خدائی چٹ لکھی ہوئی ہے، یعنی یہاں کشمکش حضرت موسیٰ علیہ السلام و فرعون میں یہ مقام آیا ہے، یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمیں اس خدمت کے صلے میں کیا دو گے۔ عزیزانِ من! کہتے ہیں: پہلے طے کرو کہ ہمیں کیا ملے گا۔

دنیا میں آج کہیں بھی دین نہیں بلکہ ہر سُو مذہب ہی مذہب چھایا ہوا ہے

عزیزانِ من! یہ ابدی حقیقتیں ہیں جو قرآنِ کریم پیش کر رہا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں بھی دین مذہب بن گیا ہے، اس میں یہی صورتِ حال ہے۔ اب تو دنیا میں ساری جگہ دین مذہب بن چکا ہے۔ اس میں تو اب استثنا بھی نہیں رہی ہے۔ اوروں کو تو ہم روز کہتے ہیں۔ اپنے ہاں بھی یہی صورت ہو چکی ہے کہ ''دین'' کی حفاظت کا معاوضہ مانگتے ہیں، گویا کہ یہ کام ان کے ایمان کا تقاضا نہیں ہے صاحب! یہاں کہا جا رہا ہے کہ ہمیں کیا ملے گا، یہ معاوضہ مانگتے ہیں صاحب! سنیئے، بلی اپنی گھات میں ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے جی! **قَالَ نَعَمْ** (7:114)۔ فرعون نے کہا کہ بے شک تمہیں بھی صلہ ملے گا۔ اور اس کے بعد کہا کہ پاگلو! اتنی سی بات ہی نہ کہ دینا کہ اس کے اتنے اتنے پیسے ''نعم'' ملے گا، وہ بھی ملے گا اور تمہیں پتہ ہے اور کیا ہوگا؟ کہا کہ **وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ** (7:114)۔ اور تم میرے مقربین کے زمرہ میں بھی داخل ہو جاؤ گے، یعنی ہم تمہیں اپنا مقرب بنا لیں گے۔ ''جیہدے اچ دینا وینا کجھ نئیں پیندا۔''[1] انگریز کی سرکار میں ہزاروں کو ''سر'' کا خطاب' ''خان صاحب' کا خطاب' خان بہادر'' کا خطاب ملا' جس میں دینا تو کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ یہ تو کچھ یوں ہے بلی سے ڈرنے والے چوہے سب کو دیئے چلے جا رہے ہیں۔ ''لگدا کی اے ایہدے وچ۔''[2] فرعون نے کہا کہ ہم تمہیں اپنا مقرب بنا لیں گے' اور یہ تو پھر ساحری ہے۔ مقربِ بارگاہِ ملوکیت بننا ایسا جذبہ ہے' ایسی ساحری ہے' کہ وہی چیز تو وہ کہتا تھا کہ کچھ دیں گے۔ وہ کہتے کہ صاحب! جتنا جی چاہے لے بھی لو مگر اپنا مقرب بنا لیجیے۔ یعنی اس نے بھی اس سودا بازی کے اندر سمجھ لیا جیسے ڈنڈی ماری کہ اگر صرف پیسوں کی بات ہوئی تو بہت کچھ دینا پڑے گا' ان کے ان جذبات کو بھی Exploit (ناجائز فائدہ) کرو۔ فرعون نے کہا کہ یہ بھی تو ساتھ ہوگا۔ عوام سے ایک آواز آئی۔ قرآن کی کیا بات ہے' عزیزانِ من! سورۃ الشعرا میں یہ کہا ہے کہ عوام نے کہا کہ یہ تو تمہارا اور ان

---

1. اس میں تو لینا ہی لینا ہے' دینا کچھ نہیں پڑتا۔
2. اس میں خرچ بھی کیا آتا ہے' کچھ نہیں۔

کا معاملہ رہا۔ اگر تم آج غالب آ گئے تو پھر سن لیجیے کہ کیا ہو گا۔ یہ کہا کہ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ (20:26)۔ آج تم غالب آ گئے تو ہم اتنا بڑا جلوس نکالیں گے کہ دنیا یاد کرے گی۔ عوام یہ کہہ رہی ہے' اور یہ ہے بھی حقیقت کہ ہر جادوگر کا جلوس نکلتا ہے۔ جتنا بڑا وہ ہوتا ہے' اتنا ہی زیادہ لمبا اس کا جلوس ہوتا ہے۔ پھر وہ فخر سے بیان کیے جاتے ہیں۔

مقربین درونِ خانہ اپنی اپنی قیمت وصول کرتے ہیں

عزیزانِ من! ان مقربین کو جو اجر ملتا ہے وہ تو درونِ خانہ کی بات ہوتی ہے' وہ تو یہاں اندر کی بات ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ منڈیوں میں ہاتھوں پر پردہ ڈال کر' انگلیوں سے بھاؤ (Rate) کی بات بنائی جاتی ہے'' اوتے جس طرح منڈیاں اچ پا نکلدا اے ناں او چدرتے تھلے ایوں ہتھ کر کے' اوتے ایویں نکلدا ہیگا۔'' ❶ مقربین کی بات تو وہاں یوں آ جاتی ہے' اور اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ کچھ میرٹ (اہلیت) کے لیے کیا جا رہا ہے جبکہ عوام کی جو چیز ہوتی ہے وہ تو پھر کھلا ہوتا ہے' Open ہوتا ہے۔ عوام نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے' ہم یہ کچھ کریں گے: ہم تمہارا جلوس نکالیں گے' تمہیں بڑی Popularity (شہرت) حاصل ہو گی' بڑی شہرت ہو گی' بڑا لمبا جلوس نکالیں گے۔ اب بتائیے جناب! کہ پست جذبات کا وہ کونسا گوشہ تھا جسے Exploit (اچھالا) نہیں گیا' جسے اپیل نہیں کیا گیا۔

میں اپنی قرآن فہمی پر کسی کو مجبور نہیں کرتا

عزیزانِ من! میں یہاں ایک دفعہ پھر عرض کر دوں کہ جو سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے وہی لفظی معنیٰ' حقیقی معنیٰ' Literal Meaning ہی لینے چاہئیں' ابتدائی لغوی معنی ہی لینے چاہئیں تو ٹھیک ہے' انہیں اس کا حق ہے' یہ حضرات وہ معنی لیں۔ ان لغوی معنوں کی رو سے وہ اسے سمجھیں۔ میں نے کہا یہ ہے کہ میرا تو کسی پہ زور زبردستی نہیں' کچھ نہیں' وہ تو جو میں سمجھتا ہوں' اسے پیش کرتا ہوں' اس سے اختلاف ہے ٹھیک ہے' اختلاف کیجیے۔ آپ اپنے ہاں جو معنی سمجھتے ہیں انہی معانی پہ رہیے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ جادوگری کا کوئی ایک معرکہ تھا' تو اس کے معنی جادوگری کے لے لیجیے: وہ ساحرین دربارِ فرعون جادوگر تھے' یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جادوگر تھے' بس اتنی سی بات ہے' پھر قرآن کی وہ آیتیں نہ پڑھیے جن میں کہا گیا ہے کہ یہ کمبخت کہتے ہیں کہ نبی پہ جادو کیا جاتا ہے' انہیں چھوڑ دیجیے۔ بہرحال' قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى (20:65)۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا (مناظرہ کے لیے) تم پہل کرو گے یا جو کچھ ہم نے کہنا ہے' پہلے کہہ ڈالیں۔ ❷ کہا کہ کیا پہلے تم بات شروع کرو گے یا ہم شروع کریں؟ حضرت

---

❶ وہ تو اس طرح ہے جس طرح منڈیوں (Markets) میں اشیا کا بھاؤ (Rate) نکلتا ہے۔ کیا ہوتا ہے؟ وہاں تو انہوں نے چادر کے نیچے اپنے ہاتھ کر کے بس یوں کرنا ہوتا ہے تو وہاں یوں بھاؤ نکلتا ہے۔

❷ یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی اوپر کہا جا چکا ہے' جو قارئین حقیقی معانی کو ترجیح دینا چاہیں' وہ ان الفاظ کے معانی کسی با ترجمہ قرآنِ کریم کے نسخے سے دیکھ لیں۔

موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم سب اس کے لیے بیٹھے ہو، تم نے یہ سارا کچھ کرنے کا انتظام کیا ہے، تم نے یہ اہتمام کیا ہے اس لیے ٹھیک ہے **قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا** (20:66)۔حضرت موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پہل کرو۔اور (اپنے دعاوی کی تائید میں) جو کچھ تمہارے پاس ہے، اسے پیش کرو۔ پہل تمہاری ہے۔ کہو تو سہی تم کہتے کیا ہو، بہت اچھا! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چونکہ ان کی تردید کرنی تھی، اس لیے کہا کہ پہلے اپنی چیزیں تو پیش کرو۔ اب عزیزانِ من! آگے وہ دو لفظ آئے ہیں۔ **فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ** (20:66)۔چنانچہ انہوں نے (حبل اللہ۔ دین خداوندی) کے مقابلے میں اپنا مذہب (حبل) اور موسیٰ کے دعاوی کی تردید میں اپنے دعاوی پیش کیے۔ آیت کے اس حصے میں ایک لفظ ''حبل'' ہے اور دوسرا ''عصا''۔ حبال حبل کی جمع ہے۔ ٹھیک ہے حبل کا لغوی یا بنیادی ترجمہ رسی ہے۔ یہاں اس آیت میں انہوں نے حبل کا ترجمہ رسی کر دیا۔ لیکن قرآنِ کریم میں یہ لفظ اور جگہ بھی تو ہے۔ مثلاً ایک مقام پہ ہے کہ **وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا** (3:103)۔تم سب اللہ کی رسی کو اجتماعی طور پر تھامے رکھو۔ اب یہاں حبل کا ترجمہ رسی کرو، وہ رسی جس سے بان بُنتے ہیں، پھر سوچو کہ بات کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ یہاں اس کے مجازی معنی ہیں۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے تصریفِ آیات کا کہا ہے کہ دیگر مقامات پہ بھی اس لفظ کو دیکھ کر اس کے معنی متعین کرو۔ خود قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے متعلق سورۃ ال عمران میں کہا ہے کہ اس قسم کی قوم جو حبل اللہ۔ دین خداوندی۔ کو چھوڑ دیتی ہے، وہ ذلت اور نکبت میں بھی گزارا کرتی ہے۔ **ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ اَيۡنَ مَا ثُقِفُوۡۤا اِلَّا بِحَبۡلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبۡلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الۡمَسۡكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** (3:112)۔تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ کس قدر ذلت وخواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ دنیا میں اِن کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ بجز اس کے کہ کسی نے انہیں آسمانی کتاب (دینِ خداوندی) کے حامل سمجھ کر پناہ دے دی۔ یا کسی قوم سے انہوں نے کوئی عہد و پیمان کر لیا اور اس کی وجہ سے انہوں نے اِن کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ ورنہ ان کی عام حالت یہی ہے کہ خدا کا عذاب اِن کے پیچھے لگا ہوا ہے اور یہ سخت عتابی اور بدحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی برتی۔ اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ قوم ابھر آتی ہے، اس کو سہارا مل جاتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ سہارے دو قسم کے ہوتے ہیں: (۱) **حَبۡلُ اللّٰهِ** (۲) **حَبۡلُ النَّاسِ** (3:111)۔ایک سہارا تو ''خدا کی رسی'' کا ہوتا ہے یہ حبل اللہ ہے۔ یہ سہارا **لَا انۡفِصَامَ لَهَا** (2:256) ہے۔ اس رسی کا، اس سہارے کا، ٹوٹنا تو ایک طرف، اس میں ''ترخ'' تک بھی نہیں آ سکتی۔ یہ حبل اللہ ہے اور یہ **لَا انۡفِصَامَ لَهَا** (2:256) ہے۔ اور کہا کہ اگر حبل اللہ نہ ہو، دین خداوندی نہ ہو، کوئی انہیں آسمانی کتاب کے حامل سمجھ کر پناہ نہ دے۔ تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اقوام غالب، کوئی بڑی قومیں، اپنے کسی مفاد ہی کی خاطر ایک سہارا دے دیتے ہیں۔ اسے قرآن نے حبل الناس کہا ہے۔ وہاں تو حبل کے یہ معنی آئیں گے۔ یہاں یہ معنی کیوں نہیں آئیں گے؟ یہ صرف اس لیے ہے کہ شروع میں اس کے معنی جادو کر دیا گیا اور پھر دوسری بات ہے کہ جب تک یہ چیزیں داستان میں بیان نہ کی جائیں،

داستان میں کچھ دلچسپی پیدا نہیں ہوتی' لطف نہیں آتا۔ یہ وہی ہے جو اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

ذرا سی بات تھی' اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے ❶

یہ جادوگری وغیرہ سب زیبِ داستاں کے لیے کرتے ہیں۔ ہاں تو ٹھیک ہے جی! یہ کہتے یہ ہیں کہ انہوں نے رسیاں پھینکیں۔اب اس آیت میں دوسرا لفظ ہے: عِصِيُّهُمْ (20:66)۔

عصا کے لغوی اور مجازی معنی

عزیزانِ من! عصا کے لغوی معنی لاٹھی تو میں پہلے بتا چکا ہوں۔ یہ اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔اس کے اصلی معنی ''اجتماع اور ائتلاف'' کے ہیں۔ یہ چیزیں تقویت اور اجتماعیت کا موجب ہیں۔جس نقطے پر کوئی قوم مرکوز ہوتی ہے' جو کسی قوم کا سہارا بنتا ہے' یہ عصا ہے۔ یہ لفظ جماعت کے لیے آتا ہے۔مجازی معنوں میں اس سے مفہوم ''وہ ضابطہ خداوندی ہے جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کے لیے وجۂ تقویت ہو۔'' یہاں بات ہو رہی ہے ایک مناظرے کی۔انہوں نے ان چیزوں کو پیش کیا ہے' جن کے سہارے ان کا باطل مذہب قائم تھا۔وہ انہیں صداقت بنا کر پیش کر رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے جزئی مسائل تھے۔بس حبال اور رسیاں ہی تھیں اور اس کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بیان کردہ' بڑے بڑے اہم اصول تھے جو ان کے لیے عصا کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ سارے پیش کیے اور یہ ٹھیک ہے کہ دوسری طرف انہوں نے بھی باطل کی بات کو نہایت سحر بیانی سے' منطقی دلائل کے تحت' متصوفانہ تشبیہات وتمثیلات کے انداز میں' عقل کو خیرہ کرنے والی چابک دستی سے' پیش کیا۔وہ اُن کا پیشہ تھا۔

ہمارے ہاں مدارس کی حالت: پیاز کے ہر چھلکے کے نیچے پیاز کے سوا کچھ نہیں ہوتا

عزیزانِ من! جو آپ کے ہاں اس قسم کے پیشہ ورانہ متکلم یا واعظ آ جاتے ہیں' کبھی آپ انہیں سنیے۔ان کی یہاں سے وہاں تک رٹی ہوئی تقریریں ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے مدارس ہیں جہاں یہ ساری چیزیں' اسی انداز کی سکھائی پڑھائی جاتی ہیں۔آپ دیکھیے کہ الفاظ کا ایک بحرِ متلاطم ہے جو چلا آ رہا ہے۔ایک کے بعد ایک' ایک چیز کے اندر جتنے بھی دوسرے مرادفات ہیں' وہ لیے چلے آ رہے ہیں۔ آپ ان کی ساری تقریر دیکھ جائیے' اس کے اندر الفاظ کی جادو بیانی ہوتی ہے' سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔بعد میں غور کیجیے تو نظر آتا ہے کہ صاحب! یہ پیاز ہی پیاز تھا۔چھلکے سے چھلکا اترتا چلا جائے' نیچے سے کچھ بھی نہیں نکلتا۔یہ سارا الفاظ کا گورکھ دھندا ہوتا ہے لیکن اس کے اندر نظم وترتیب اور ربط اس طرح سے قائم کیا جاتا ہے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے ہیں۔ یہ غلط واقعات ہوتے ہیں۔ بعد میں آ کر

---

❶ اقبالؒ: بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' 1996۔ص۔ 66۔

سوچتے ہیں تو خود پتہ چلتا ہے کہ یار! بات کچھ بنتی تو تھی نہیں' کچھ سمجھ میں تو نہیں آیا لیکن وہاں پتہ ہی نہیں چلتا وہ تو جادو بیان ہے' جادو کرتا ہے' سحر البیان ہے۔ وہاں تو یہ کیفیت ہے۔

عزیزانِ من! یہ کیفیت تھی جسے یوں بیان کیا اور جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے عوام کی طرف دیکھا کہ ان مذہبی پروہتوں کا اندازِ بیان اس قدر سحر انگیز ہے اور ان پہ تو بڑا اثر ہو رہا ہے تو کیا لفظ ہے جو قرآنِ کریم نے استعمال کیا ہے! قرآن میں ہے کہ **یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِھِمۡ** (20:66)۔ موسیٰ علیہ السلام کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں اِن کے دلائل (محض لفاظی کے زور پر) مؤثر نہ ہو جائیں' ان مذہبی پیشواؤں نے جو یہ جادو بیانی اختیار کی تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے عوام پہ نگاہ ڈالی۔ **یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ** (20:66)۔ یہ خیال گزرا کہ **اَنَّھَا تَسۡعٰی** (20:66)۔ کہیں وہ اس طرح کامیاب نہ ہو جائیں۔[1] شاید یہ بات چل نکلی ہے۔

تَسۡعٰی کے معنی

عزیزانِ من! اپنی ہی زبان میں اس کا یوں ترجمہ کیجیے کہ ''بات چل نکلی ہے' اب دیکھیں کہاں پر ٹھہرے۔'' تسعٰی کا لفظی ترجمہ ہے: چل نکلنا ''سَعَی'' کے معنی ہی یہ ہیں: چلنا اور دوڑنا۔ انہوں نے اس بات پر خیال کیا (**یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ**) کہ عوام پہ اس بات کا اثر ہو رہا ہے' بات تو کچھ چل نکلی ہے' یہ عجیب عجیب سوچ رہے ہیں' اب آپ یہاں جب ماڈرن دَور میں جادو کی طرف آئیں گے تو دیکھیں گے اب وہ جادو والی بات تو ہمارا نوجوان طبقہ نہیں مانتا مگر جب آپ ماڈرن طبقے میں آئیں گے تو آپ کے ہاں ماڈرن تفسیریں ہونے لگیں۔ ان میں کی ایک تفسیر ہے: مرزا محمود صاحب کی ماڈرن تفسیر

مرزا محمود صاحب کی ماڈرن تفسیر

عزیزانِ من! مرزا محمود ماڈرن بن گئے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی (1908-1835) صاحب تو خیر قدامت پرست تھے۔ مرزا محمود صاحب کی تفسیر میں یہ ہے کہ وہ جو رسیاں تھیں' اصل میں ان کے اندر انہوں نے سپرنگ ڈال دیئے ہوئے تھے اور انہوں نے بس یوں کر کے کر دیا جس طرح ''جاپانی کھلونا' ہوندا ہیگا اے۔ سپ جس طرح بنایا ہوندا اے۔''[2] یہ ٹھیک ہے کہ کھلونے میں نقصان بھی ہوتا ہے بس ان جادوگروں نے یوں کر کے چابی دے کر' ان رسیوں کو چھوڑا تو وہ سانپ یوں یوں چل رہے تھے۔ باقی رہا عصا تو وہ لاٹھیوں کے اندر انہوں نے پارہ بھرا ہوا تھا۔ او یہ تفسیر ہے قرآن کی۔ مثلِ موعود[3] کہتا ہے کہ الہام ہوتا ہے۔ گل تے ٹھیک ہیگی اے۔ ایہو جی

---

[1] یہ ان الفاظ کا مجازی مفہوم ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے جو قارئین حقیقی بیان کو ترجیح دینا چاہیں وہ ان الفاظ کے معانی کسی با ترجمہ قرآنِ کریم کے نسخے سے دیکھ لیں۔

[2] جس طرح جاپانی کھلونا ہوتا ہے' جس طرح سانپ بنایا ہوا ہوتا ہے۔

[3] یہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف اشارہ ہے۔

گل تے الہام تے ای آونی اے۔"❶ لیکن یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی وحی شیطانوں کی طرف سے بھی ہوتی ہے: "رسیاں دے اندر سپرنگ دتے ہوئے سن' تے سوٹیاں دے اندر اوناں نے پارہ بھریا ہویا ہیگا سی۔ تے لے آئے سن' جی او تے ایہہ کجھ لے آئے سن۔ پھر اگے دسوٗاے تے اس' وڈے ساحر نے اپنی ڈانگ وچ کی اندر دتا ہویا سی؟ اونہاں نالوں کجھ وڈا دتا ہویا ہونا ناں' ایہہ جیہڑا سوٹا تے جیڑی رسی اگے آنی اے سامنے۔"❷ ملاحظہ فرمائیے کہ یہ کیا کہتے ہیں۔

قوم کی ذہنی پستی کی ایک جھلک

عزیزانِ من! افسوس ان پہ نہیں آتا۔ ان کا تو پیشہ ہی مداری ہے۔ اس پہ بھی افسوس نہیں آتا کہ وہ یوں کر کے ایک روپے کے دو کیسے بنا دیتا ہے۔ ذرا آپ Reason سے کہیے' عقل سے دیکھیے کہ اگر یہ ایک روپے کے دو بنائے تو اپنے گھر میں بیٹھا ہوا مالا مال ہو جائے۔ اور اس کے بعد جو یہ کہتا ہے کہ چمڑے کی جھونپڑی میں آگ لگی ہے دے جا بابا! اللہ کے نام کا پیسہ۔ سیدھی سی بات ہے کہ کبھی کسی نے یہ بات نہیں سوچی کہ اگر یہ ایک روپے کے دو بنائے تو گھر میں بیٹھا مالا مال ہو جائے۔ افسوس ان دیکھنے والوں پہ آتا ہے جو سچ مچ یہ سمجھ لیں کہ واقعی یہ ایک روپے کے دو بنا دیتا ہے۔ افسوس اس قوم پہ آ رہا ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو بھی متبعین یعنی Followers مل جاتے ہیں۔ اس سے آپ سوچیے کہ آپ کی قوم کہاں پہنچ گئی ہے۔ نہ دین کے بلند حقائق تمہاری سمجھ میں آئے اور نہ ہی تمہارا فکری ذہن اتنا بلند ہوا۔ کم از کم ان مضحکہ انگیز باتوں پہ تو ہنس دیجیے۔ آپ اتنا شعور تو رکھیے۔ نہیں صاحب! ہمارے ہاں تو اس پہ بھی سبحان اللہ کا نعرہ ہے اور انہیں مثلِ موعود مانا جاتا ہے' انہیں مامور من اللہ مانا جاتا ہے' اور ان کی کیا بات ہے! یا للعجب!!

ماڈرن عہد کے مفسرین کی تفسیروں میں کیا ہے؟

اگر میں کہیں آپ کو ماڈرن عہد کے اور مفسرین کی تفسیریں بتا دوں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے اندر کس قدر خرافات جمع کی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود ماننے والے انہیں مان رہے ہیں۔ دراصل قوم کے سامنے اس قسم کی باتیں پیش ہی اس وقت کی جاتی ہیں' عزیزانِ من! جب قوم کی ذہنی سطح ایسی پست ہو جاتی ہے تو پھر یہی کچھ ہوتا ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ قوم کی ذہنی سطح یہاں پہنچ گئی ہوئی ہے۔ وہ اس قسم کی خرافات پر بھی یہ نہیں کہے گی کہ تم کیا کہتے ہو بلکہ اس پہ کہیں گے: سبحان اللہ! خدا نے علم دیا تھا لیکن یہ تمہارے' میرے' اتنے سے نارمل (Normal) کی سمجھ میں کیسے آئے' اس کے لیے تو بہت بڑا دماغ چاہیے تھا۔ دراصل انہیں پتہ ہے کہ قوم اس قسم کی ہے' اس لیے جو جی

---

❶ بات تو یہ صحیح ہے ایسی بات تو الہام ہی میں آنی ہوتی ہے۔

❷ رسیوں میں اسپرنگ لگائے تھے اور لاٹھیوں کے اندر انہوں نے پارہ بھرا ہوا تھا۔ وہ تو جناب یہ کچھ لے آئے تھے۔ پھر آگے یہ دیکھو کہ اس بڑے جادوگر نے اپنی لاٹھی میں کیا بھرا ہوا تھا؟ ان رسیوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا ہوگا اس لاٹھی میں جو آگے سامنے آنی ہے۔

میں آ ئے پیش کرو' بس ذرا تھوڑی سی سحر بیانی ہونی چاہیے۔ جو بھی تھوڑی سی ڈگڈگی بجاتا ہے یہ قوم فوراً اس کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ کوئی مامور من اللہ بن جائے' کوئی نبی اور رسول بن جائے' کوئی مثلِ موعود بن جائے' خدا بن جائے' صاحب! وہ اسے مان لیتے ہیں۔ یہاں وہ لوگ بھی تو ہیں جنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ ''اوناں دے وی مرید ہیگے نیں۔'' ❶ جی! وہ تو مصیبت ہوئی کہ ''اگے عہدہ ای مک گیا۔ ہن خدا بن دے بعد ہور کی ہون ہووے۔ نئیں تے پتہ نئیں ہور کی بنناسی اینے۔'' ❷ مناظرے میں یہ مصیبت آجاتی ہے اور پھر یوں شکست ہوتی ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ بات کچھ یوں ہوتی ہے کہ کہ دو مریدوں کے مابین۔ اپنے اپنے پیر کی عظمت و برتری پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ ایک نے یہ کہا کہ میرا پیر قطب ہے۔ دوسرے نے کہا کہ میرا پیر ابدال ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیر غوث ہے۔ دوسرے مرید نے کہا کہ میرا پیر رسول ہے۔ پہلے نے کہا کہ میرا پیر خدا ہے' لہٰذا اس پر وہ دوسرا مرید شکست کھا گیا۔ اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ بھاگا بھاگا اس کے پیر کی طرف گیا اور کہا کہ تم نے کچھ سنا کہ تمہارا مرید تمہارے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس پیر نے کہا کہ نہیں' بتاؤ کیا کہتا ہے۔ کہنے لگا کہ وہ کہتا ہے کہ میرا پیر خدا ہے۔ وہ کہنے لگے: لاحول ولا' توبہ توبہ بابا! نعوذ باللہ! میں ایسا کہہ سکتا ہوں؟ اس کے ہاتھ وہ بات آگئی۔ وہ بھاگا ہوا واپس آیا۔ کہنے لگا: سنو جناب! میں نے تمہارے پیر سے پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرا مرید بالکل بکتا ہے' میں خدا نہیں ہوں۔ وہ کہنے لگا: او کتے دا بچہ کی جاندا اے۔ او خدا اے۔ او جھوٹ بولدا اے۔ ❸

مذہب کا خطرناک حربہ یہ ہے کہ انسانی عقل وفکر کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا جائے

عزیزانِ من! یہ مذہب ہے جس نے دین کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا ہے۔ اس نے دین کو افسانہ بنا دیا ہے۔ مذہب یہ ظلم وستم کرتا ہے کہ قوم کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دیتا ہے' معدوم کر دیتا ہے۔ اس میں مسلمہ یہ بن جاتا ہے کہ صاحب! شریعت میں عقل کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس میں ایمان کا انگریزی ترجمہ Faith کر دیا جاتا ہے جب کہ 'Faith' کا لفظ Reason (دلائل و براہین) کے علی الرغم ❹ ہے۔ انگریزی زبان میں Faith کہتے ہیں: کسی چیز کو آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے' Blindly (اندھے پن سے) تسلیم کر لینا اور مذہب کے پیشواؤں کی یہ بہت بڑی چال ہوتی ہے کہ وہ افراد کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں آف Off (بند) کر دیں۔ یہ جو اس قسم کے معنی یا اس قسم کی تفسیریں پیش کر کے منوائی جاتی ہیں وہ اسی لیے منوائی جاتی ہیں کہ قوم ذہنی لحاظ سے اس سطح پہ آچکی ہوتی ہے۔ اگر قوم کی سطح بلند ہوتی ہے تو پھر یورپ والی بات ہوتی ہے۔ اِن اہل یورپ نے کہا کہ ٹھیک ہے صاحب! آپ اپنے گرجے کی چار دیواری

---

❶ ان کے بھی مرید موجود ہیں۔
❷ خدا بننے کے بعد آ گئے تو کوئی مقام ہی نہیں رہا' اب مزید وہ کیا بنیں؟ ورنہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اسے اور کیا کچھ بننا تھا۔
❸ وہ کتے کا بچہ کیا جانے! وہ خدا ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔
❹ برخلاف

تک رہیے' جو جی میں آئے وہاں جا کے کیجیے' ہمارے معاملات میں دخل نہ دیجیے۔ محکوم قومیں تو بہت پیچھے ہوتی ہیں۔ ہماری آنے والی نوجوان نسل کا جرم صرف اتنا ہی ہے کہ آپ نے اسے کچھ سوچنا سکھا دیا ہے۔ اگر آپ ان نوجوانوں کو جو نہی سوچنا سکھائیں گے تو یہ مذہب سے رسا تڑا کے بھاگ جائیں گے۔

مجھے تو گلہ تجھ سے ہے' یورپ سے نہیں ہے:

عزیزانِ من! آپ کا کون سا نوجوان اس بات کو مانے گا کہ دین کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ رسول کی لاٹھی اژدہا بن جایا کرتی ہے۔ کیا کبھی آپ یہ بات سوچتے ہیں؟ ان بے چارے آج کے نوجوانوں کو گالیاں دی جاتی ہیں؛ کہا جاتا ہے کہ یہ ملحد ہیں' بے دین ہیں۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں کہ اجی! یورپ کی نقل میں یہ سارا کچھ کہہ رہے ہیں۔ ان مذہبی پیشواؤں نے اپنے ذمہ تو کچھ لینا ہی نہیں ہے۔

وہ جو آپ ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں' اس وقت تک تو وہ آپ نے ہم سے منوالیا کیونکہ ہم بدھوؤں کی شریعت میں سمجھنے سوچنے کے لیے عقل کا کوئی دخل نہیں تھا۔ مگر ان نوجوانوں کو تم نے ایک طرف وہ تعلیم دی ہے' جس میں عقل و فکر اور Reason (دلائل و براہین) کام آتی ہے؛ تم انہیں آئن سٹائن [1] (1879-1955) پڑھا رہے ہو' تم انہیں وائٹ ہیڈ [2] (1861-1974) پڑھا رہے ہو اور اس

---

[1] ''زمان و مکان'' (Time and Space) کے متعلق انیسویں صدی تک نیوٹن کے نظریہ کو غیر معتدل سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمان اور مکان کو تمام کائنات میں یکساں اور مطلق (Uniform and Absolute) قرار دیا جاتا تھا۔ آئن اسٹائن نے اس نظریہ کو باطل قرار دیا اور اس کی جگہ یہ بتایا کہ مکان اور زمان کی حیثیت مشاہدہ کرنے والے کی پوزیشن کی حیثیت سے اضافی (Relative) ہوتی ہے۔ اس کے اس نظریہ (Theory of Relativity) نے فلسفہ کے بنیادی اصولوں کو متاثر کیا اور اب یہ اصول قرار پایا ہے کہ یہ مشاہدہ کرنے والا' اپنی ذات میں مطلق ہے۔ ایسی کوئی کائنات ہی نہیں جو مشاہدہ کرنے والوں کے لیے مطلق ہو۔ ہر مشاہدہ کرنے والے کی کائنات اپنی اپنی ہے۔ دنیائے فکر میں اس کے نظریہ اضافیت نے کس قدر مقبولیت حاصل کی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قریب قریب ہر شعبہ علم اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ وسٹر مارک (Westermarck) نے اس پر اخلاقیات کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس کی تائید برٹرینڈ رسل نے اپنی فلاسفی میں کی ہے۔ والٹر لپمین (Walter Lippmann) نے اپنے (Preface to Morals) میں اسے نمایاں جگہ دی حتیٰ کہ Mc Giffert اسے مذہب کے میدان تک لے آیا۔

[2] وائٹ ہیڈ زندگی اور مادہ کے تصورِ ثنویت کی تردید شدومد سے کرتا ہے۔ وہ اس تصور کو اب زہر قرار دیتا ہے جس نے بعد کے فکر انسانی کو بُری طرح مسموم کر دیا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور مادہ دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ کائنات کا عملی طریق کار ہیں۔ یا ایک ہی کپڑے کا تانا بانا ہیں۔ Adventure of Ideas اس کی ایک قابلِ قدر تصنیف ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے کہ ''اس دنیا میں نفوس اور اجسام کو کسی طرح الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ روح کو اس طرح الگ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ہستی کا دارومدار جسمانی نظام پر نہ رہے۔'' (ص۔ 267) یعنی زندگی نظامِ جسمانی کے منتشر ہو جانے سے ختم نہیں ہو جاتی۔

کے بعد تم کہتے ہو کہ صاحب! وہ سب بکواس ہے اور حقیقت یہی ہے کہ وہ لاٹھی اژدہا بن جایا کرتی ہے۔ صاحب! یہ اب اسے کیسے مان لیں؟ انہیں آپ ان کی عقلی سطح کے مطابق سمجھاتے ہی نہیں ہیں۔ تو میں نے گزارش کی ہے کہ مذہب کا کاروبار اس وقت تک ہی چلتا ہے جب تک قوم میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت بیدار نہ ہو۔ جب یہ صلاحیت ہی بیدار نہ ہو تو پھر خواہ کوئی مامور من اللہ بن جائے' خواہ کوئی نبوت کا دعویٰ کر لے' خواہ کوئی خدا بن بیٹھے' جو جی میں آئے آپ بنتے چلے جائیے' یہ قوم پھر مانتی چلی جائے گی۔ ننگ دھڑنگ' جو ہر لحاظ سے بالکل پاگل ہیں' جنہیں ڈاکٹر سرٹیفکیٹ دیتا ہے کہ یہ پاگل ہیں مگر آپ کے نزدیک یہ سب سے بڑے مقربِ بارگاہ الٰہی ہیں۔ وہ گالی دیتے ہیں' یہ ان کی تفسیریں اور تعبیریں ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اور پھر روتے ہیں کہ یہ کیا کر بیٹھے۔ اسی طرح کے ایک فقیر کے پاس کوئی گیا تھا۔ وہاں جا کے اس نے کچھ کہا تو اس نے گالیاں دینی شروع کر دیں' وہ خود تو اس نے ذرا سنیں' اس کے بعد اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا' ایک دو تین چار تک دے مارے' وہ تو پتہ نہیں کہ ٹانگ ٹوٹی' جبھی کہتے ہیں کہ لنگڑا ہو گیا' تو اس سے وہ بھاگ اٹھا۔ بعد میں فقیر نے کہا کہ بدنصیب ہے اگر یہ تین یا چار چوٹیں اور کھا لیتے تو ہندوستان میں تین چار نسلوں تک ان کی سلطنت قائم رہتی؛ اگر سات کھا جاتا تو سات ہزار سال تک انہی کی سلطنت کا ڈنکا بجتا؛ یہ سلطنت انہی کی نسل میں رہتی۔ یعنی ہر سوٹی ہزار سال دی سلطنت دین ڈئی ہوندی اے۔ اے فقیر دی سوٹی ہے جناب! اوہدا عصا اے اوہدا ڈنڈا۔ [1] عزیزانِ من! آپ یہ کچھ مان رہے ہیں۔ اسے تسلیم کر لیجیے۔

نوعِ انسانی کے لیے نبی اکرم ﷺ کا ایک لفظ کے اندر آخری پیغام

عزیزانِ من! میرے رسول عالم الناس نے نوعِ انسانی سے فرمایا کہ قُلۡ اِنَّمَآ اَعِظُكُمۡ بِوَاحِدَةٍ (34:46)۔ (اے رسول!) تم اِن سے کہہ دو کہ میں تم سے کوئی لمبا چوڑا بحث نہیں کرنا چاہتا' نہ ہی کوئی طول طویل لیکچر دینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ او نوعِ انسانی! سن رکھو' میں تمہیں لمبا چوڑا وعظ نہیں کہنا چاہتا' کوئی بات اتنی بڑی نہیں کہنا چاہتا' ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات! کیا انداز ہے' عزیزانِ من! اس کا بڑا Psychological Effect (نفسیاتی اثر) ہوتا ہے۔ آپ اٹھ بھی رہے ہوں' میں یہ کہوں کہ میں نے تم سے صرف ایک بات کہنی ہے' آپ بیٹھ جاتے ہیں لیکن جب یہ کہوں کہ صاحب! ابھی تو میں نے ایک گھنٹہ اور تقریر کرنی ہے' او فیر کیندے نیں' اچھا تسی اے کر دے رہو' ساڈا کام کاج کجھ ہورا اے۔ [2] یہاں کہا کہ میں نے تم سے صرف ایک بات کرنی ہے۔ کھڑے ہو گئے۔ کہا کہ بات وہ ہے جو چلتے پھرتے سننے کی نہیں ہے۔ یہ نہ کرو کہ یوں راستے پہ جا بھی رہے ہیں' یوں منہ کیا اور کھڑے ہو کے سن لیا۔ کہا کہ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ مَثۡنٰى وَفُرَادٰى (34:46)۔ وہ بات یہ ہے کہ خدا کے لیے' ایک

---

[1] یعنی ہر ایک لاٹھی کا کھانا کچھ یوں ہے کہ اُس سے ایک ہزار سال کی سلطنت ملتی ہے۔ یہ ''فقیر'' کی لاٹھی جو ہوئی جناب! یہ لاٹھی تو اس کا عصا ہے۔

[2] پھر وہ کہتے ہیں کہ اچھا آپ یہ کرتے رہیں' ہمارا کام کاج تو کچھ دوسرا ہی ہے۔

ایک، دو دو، کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ زور دے کر کہا کہ خدا کے لیے ایک ایک، دو دو ہی سہی، کھڑے ہو کے، میری بات سن لو۔ انہوں نے بھی کہا ہوگا کہ سن لیں ایک بات ہی تو کہتا ہے۔ کھڑے ہو کے سننے میں حرج کیا ہے۔ سن تو لو کیا بات کہتا ہے۔ عزیزانِ من! رسولِ آخر الزمان ﷺ جس کے بعد قیامت تک رسول نہیں آنا، اور وہ انسانیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میری صرف ایک بات سن لو، میں زیادہ باتیں نہیں کہنا چاہتا۔ کتنی اہم ہوگی یہ بات جو آگے کہنی ہے! عزیزانِ من! ذہنِ انسانی کا تصور وہاں نہیں جا سکتا کہ آگے کیا بات کہنی ہے۔ دین کی اسٹیج (Stage) سے یہ شخص گفتگو کر رہا ہے کہ ایک بات سن لو اور اس کے بعد قیامت تک یہ بات کہنے والا نہیں آئے گا کہ میں آخری بات یہ کہنے والا ہوں۔ کہا: سنائیے، کیا فرماتے ہیں؟ کہا: ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46)۔ اور پھر سوچو! غور و فکر کیا کرو۔ اور آگے یہ ہے کہ اگر تم نے اس بات پہ ہی غور کر لیا جو میں نے کہا ہے تو تم خود شہادت دو گے کہ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ (34:46)۔ اگر تم نے ذرا بھی غور و فکر کیا تو تمہیں نظر آ جائے گا کہ یہ رسول (جو تمہیں دن رات اس قسم کی نصیحتیں کرتا رہتا ہے) کوئی پاگل نہیں ہے۔ یہاں زور دے کر کہا کہ یہ ایک بات کہنے والا کوئی پاگل نہیں تھا۔

عزیزانِ من! حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے صورتِ حال پر غور کیا۔ منطقی دلائل چلے آ رہے ہیں۔ اسلاف کی بزرگی کو، عظمت کو، شان کو (Exploit) (اچھالا) کیا جا رہا ہے۔ تشبیہات، تمثیلات اور استعارات سے باطل کو سچ بنا کے دکھایا جا رہا ہے۔ یہ ان کا فن تھا۔ رسول کا یہ فن ہی نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ سننے والے مسحور ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ معرکہ بہت بڑا تھا۔ ذہن میں یہ تھا کہ یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ جن کا توڑ شاید میرے پاس نہ ہو، ان کو کیسے متاثر کرونگا اور اب بات بڑی عظیم ہے: دنیا میں دوسروں کی سوچ بدل دینا مشکل ترین کام ہے۔

دنیا میں سب سے مشکل کام دوسروں کی سوچ بدلنا ہے

عزیزانِ من! جو شخص کسی مذہب پرست قوم سے وہ کچھ کہتا ہے جو وہ پہلے ہی مانتی ہے تو پہلے ہی وعظ میں لاکھوں ہزاروں آدمی اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی ان باتوں کو مان رہے ہوتے ہیں، وہ تو صرف تھوڑے سے فرق سے وہی کچھ کہتا ہے جو وہ پہلے ہی مانتے ہیں۔ اس کے برعکس، جو انقلابی انہیں اٹھ کے یہ کہتا ہے کہ جو کچھ تم مان رہے ہو، سب غلط، جھوٹ، اور باطل ہے؛ میں جو کہتا ہوں وہ بات مانو۔ شاید پہلی بار تو ایک بھی اس کے ساتھ نہ ملے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ کے نبی علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (6:164)۔ سب سے پہلے میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے؛ میں پہلا آدمی ہوں جسے اس وقت کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں تھا۔ عزیزانِ من! انقلابی کا سیکنڈ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔ وہ تو بت کدے کے پجاریوں کو اور وہاں کے عقیدت مندوں کو، جو سجدہ ریز ہوتے ہیں، یہ کہتا ہے کہ ''توڑ دو ان بتوں کو، نکلو اس مندر سے۔'' کون سنے گا اس دیوانے کی۔

معاف رکھیے' وہ ذکر آ جاتا ہے جو عام طور پہ مجھ سے کہا جاتا ہے کہ صاحب! تم بیں' تیں' چالیس سال سے معروضیت کے فکر قرآن کو عام کرنے کے لیے لگے ہوئے ہو' عقل و دانش کا' Reason (دلائل و براہین) کا استعمال کرتے ہو۔ کتنے لوگ ہیں جو تمہارے پیچھے لگے ہیں؟ بہت تھوڑے۔ جی ٹھیک ہے' مجھے بھی یہ کچھ آتا تھا' میں نے بھی اگر یہ کچھ کیا ہوتا تو ہزاروں لاکھوں آسانی سے پیچھے لگا لیے ہوتے؛ اس کا طریق کار یہ ہے کہ فقط وہ بات کہو جو اگلے مانتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ''وہ تو سارے ہی اس مریض سے کہہ رہے تھے کہ ایتھے پرہیز کرو' ایہدا پرہیز کرو' اینوں اے کھان نوں نہ دیو' اینوں اے کھان نوں نہ دیو یہ سب کچھ۔ اواک بووے اچ کھلوتا اویا کیندا سی: او چھڈو سارے پرہیزاں نوں' ایوں خوامخوہ جڑ ماردے او مریض دی۔ اینوں نہایت عمدہ جیا حلوہ پکا کے دیو۔ مریض اوناں نوں کیندا: اوئے اوہدی وی سنوں' اوئے اوہدی وی سنوں۔''❶ عزیزانِ من! اس کی کون سنے' جو یہ کہے کہ خدا کے سوا کسی اور کی بات نہ مانو اور اس کے برعکس جو اٹھ کے یہ کہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو' وہ بالکل صحیح ہے اور تم تمام راہِ راست پر ہو تو یہ کچھ ماننے والے متبعین اس کے ساتھ پہلے ہی دن کروڑوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔

ملمع سازی کے علاج کے لیے ایک تاؤ دینے کی ضرورت ہے

عزیزانِ من! بات ہو رہی تھی کہ جب مذہبی پیشواؤں نے اپنے دعاوی پیش کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کا اندازِ بیان سحر انگیز ہے۔ ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کہیں ان کے دلائل محض لفاظی کے زور پر مؤثر نہ ہو جائیں تو **فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی** (20:67)۔ اِس احساس سے موسیٰ اپنے جی میں گھبرایا۔ فی نفسہٖ' دل ہی دل میں' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ احساس پیدا ہوا کہ ان کی بات ان پر اثر انداز ہو رہی ہے' یہ ان سے متاثر ہو رہے ہیں اور پھر یہ تو پہلے ہی سے ان کے ماننے والے ہیں' اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ بات اٹھی تو **قُلْنَا**(20:68)۔ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ **لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی**(20:68)۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم ان پر ضرور غالب آ ؤ گے۔ جھوٹ' باطل' اور فریب سے خوف نہ کھاؤ' بات صرف ایک تاؤ دینے کی ہے۔ لہٰذا جب تاؤ دیا جائے گا تو کام ہو جائے گا۔ سو یہاں ساری کی ساری بات ملمع سازی کی ہے جو آخر کار ختم ہو جائے گی اور پھر نیچے سے تانبا نکل آئے گا' تیرے پاس تو وہ آگ موجود ہے۔ اس لیے **لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی** (20:68)۔ مت گھبراؤ' غالب تُو ہی آئے گا۔ اس لیے کہ ہم نے جو وحی کی رو سے تمہیں دلائل دیئے ہوئے ہیں' ان کا مقابلہ یہ رسیاں

---

❶ وہ تو سبھی اس مریض سے کہہ رہے تھے کہ یہاں پرہیز کرو' اس سے پرہیز کرو' اسے یہ کھانے کو نہ دو' وہ کھانے کو نہ دو' ان سب سے پرہیز کرو۔ وہیں دروازے پہ کھڑا ہوا' ایک شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اے! ان پرہیزوں کو ترک کر دو' تم خواہ مخواہ اس مریض کا ستیاناس کر رہے ہو۔ اسے نہایت عمدہ سا حلوہ پکا کر کھلاؤ۔ اس پر مریض ان سے کہتا کہ اے! اس کی بھی سنو تو' سنو تو اس کی بھی۔

نہیں کرسکیں گی۔ وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِکَ (20:69)۔تم ان قوانینِ خداوندی کو، جنہیں تم نے باعثِ یمن وسعادت پایا تھا، روشن دلائل کے ساتھ پیش کرو۔اس بات پہ زور دے کر کہا کہ یمن وسعادت کی رو سے جو تیرے پاس ہے، تو اسے پیش کر۔ یہ جو کچھ پیش کررہے ہیں، وہ سارا باطل کی رو سے پیش کررہے ہیں، کذب کی رو سے پیش کررہے ہیں، شعبدہ بازی کی رو سے پیش کررہے ہیں۔ تیرے پاس تو یمن وسعادت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ یمین کی کیا بات ہے! کہا کہ تو اسے پیش تو کر۔

گھبراؤ نہیں بات تو صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے کی ہے

عزیزانِ من! میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ جتنی بناوٹی چیزیں ہیں، یہ ساری ختم ہوجائیں گی۔ایک ہی تاؤ میں ان کا ملمع اتر جائے گا۔ یہ میں نے اپنی طرف سے نہیں کہا تھا۔ یہ قرآن کے الفاظ تھے: تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا (20:69)۔ یہ مصنوعی پن، جوانہوں نے بنا رکھا ہے، یہ انہیں تیزی سے اچک لے گا؛ یہ انہیں مہارت اور تیزی سے لے جائے گا۔ یہ بناوٹ جو کچھ انہوں نے بنا رکھی ہے، یہ اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے گا۔ یہ مصنوعی مذہب ہے جو پیش کیا جا رہا ہے۔تُو قوانینِ خداوندی کو روشن دلائل کے ساتھ پیش کر، یہ فریق مخالف کے باطل دلائل کو نگل جائے گا۔اِنَّمَا صَنَعُوْا کَیْدُ سٰحِرٍ (20:69)۔ یہ مصنوعی چیز، یہ بناوٹی چیز، سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ یہ ''کید'' ہیں یعنی یہ ان کی خفیہ تدبیریں ہیں۔ جو یہ ساحر بن کر لے آئے ہیں، یہ جادو بیان ہیں۔وَلَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ (20:69)۔ یہ فریب انگیزی، یہ فریب دہی، کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یاد رکھو! بناوٹی باتیں بنانے والا، جھوٹ کو سچ کر کے دکھانے والا، کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔اور قرآنِ کریم کا اگلا لفظ ہے: حَیْثُ اَتٰی (20:69)۔ اس سے کہو کہ جس طرح سے جی چاہے، آ کے دیکھ لے تم کبھی غالب نہیں آ سکتے۔عزیزانِ من! یہاں کہا ہے: حَیْثُ اَتٰی (20:69)۔منطق کی رو سے آ جاؤ، تصوف کی رو سے آ جاؤ، گھڑے ہوئے اپنے خود ساختہ مذہب کے دلائل لے کے آ جاؤ، جدھر سے تمہارا جی چاہے آ جاؤ، تم بناوٹی باتیں بتانے والے ہو۔ یہاں لفظ صَنَعُوْا آیا ہے۔ کہا کہ یہ تیری صنعت گری ہے، بناوٹی باتیں ہیں۔تم یاد رکھو، کبھی غالب نہیں آ سکتے: حَیْثُ اَتٰی (20:69)۔ جدھر سے جی چاہے آ جاؤ، یہ ایک گوشہ نہیں، دین کی مخالفت تو ہر گوشے سے ہوتی ہے۔مگر تم غالب نہیں آ سکتے۔

قرآن کی حقیقت ان سب کو نگل جائے گی

عزیزانِ من! حَیْثُ اَتٰی کی کیا بات ہے! یہ قرآن کی آواز ہے۔آپ دیکھیے ہر گوشے سے اس کی مخالفت ہوگی؛ ہر دَور کا فرعون اس کی مخالفت کرے گا؛ ہر دور کا ہامان اس کی مخالفت کرے گا۔ ہامان کے اندر تو یہ اربابِ شریعت بھی آ جاتے ہیں، اصحابِ طریقت بھی آ جاتے ہیں۔تصوف بھی اس کی مخالفت کرے گا اور قارون [1] بھی اس کی مخالفت کرے گا، سرمایہ داری بھی اس کی مخالفت کرے

---

[1] قارون سرمایہ داری کا مجسمہ ہے۔

گی۔ خدا ان سے کہتا ہے کہ بات کچھ نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں مصنوعی ہیں، بنائی ہوئی ہیں۔ یہ مخالفین کا محاذ ہے۔ اِسی سے حزبِ مخالف اصطلاح ہے۔ بلکہ یہاں کہا کہ وہ کچھ بھی کیوں نہ بنالے، متحدہ محاذ کیوں نہ قائم کرلے، ان میں سے جو جس راستے سے آنا چاہتا ہے، اُسے آنے دیجیے۔ دین کی حقیقت، قرآن کی عظمت، ان سب کو نگل جائے گی اور عزیزانِ من! اب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی بات شروع کی: **فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ** (20:70)۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہی ہوا جو خدا نے کہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اے باطل پرستو! اے جھوٹ کو سچ بنا کر دکھانے والو! اے ان عوام کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھانے والو! اے فرعون کے رعب داب سے متاثر ہو کر اپنے اندر حقیقت اور صداقت کا اعلان کرنے کی جرأت نہ رکھنے والو! سنو، میں کیا کہتا ہوں۔ صاحب! انہوں نے سنایا اور سننے کے بعد **قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ ھٰرُوْنَ وَمُوْسٰی** (20:70)۔ فرعون کے مذہبی پیشواؤں نے اعترافِ عجز کرلیا اور بے اختیار پکار اٹھے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔

عزیزانِ من! اس کے بعد کیا ہوا؟ آج تو وقت ہوگیا، آئندہ اتوار پہ ہم یہ بات اٹھا رکھتے ہیں اور دیکھیے گا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوا۔ سورۃ طٰہٰ کی آیت 70 تک ہم آگئے، 71 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورۃ طٰهٰ** (آیات 71 تا 76)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ ؕ اِنَّہٗ لَکَبِیۡرُکُمُ الَّذِیۡ عَلَّمَکُمُ السِّحۡرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ
اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۫ وَ لَتَعۡلَمُنَّ اَیُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا
وَّ اَبۡقٰی ﴿۷۱﴾ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ
اِنَّمَا تَقۡضِیۡ هٰذِهِ الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿ؕ۷۲﴾ اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِیَغۡفِرَ لَنَا خَطٰیٰنَا وَ مَاۤ اَکۡرَهۡتَنَا عَلَیۡهِ مِنَ
السِّحۡرِ ؕ وَ اللّٰہُ خَیۡرٌ وَّ اَبۡقٰی ﴿۷۳﴾ اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا یَمُوۡتُ فِیۡهَا وَ لَا یَحۡیٰی ﴿۷۴﴾
وَ مَنۡ یَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰی ﴿ۙ۷۵﴾ جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ
تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَ ذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی ﴿٪۷۶﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1976 کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 71 سے ہو رہا ہے: (20:71)۔ یہ داستان مسلسل چلی آ رہی ہے۔ اب ہم اس مقام پہ پہنچ گئے تھے جہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے منادر [1] کے بلند پایہ منتریوں کے ساتھ مناظرہ ہو رہا تھا اور میں گزشتہ غالباً دو تین درسوں میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ میری بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ سوال کوئی جادوگروں کا نہیں تھا اور نہ ہی وہاں جو کچھ اس میدان میں کیا جا رہا تھا، وہ کوئی جادو کا کھیل یا شعبدہ تھا، بلکہ وہ حق اور باطل کا مناظرہ تھا۔ اُدھر ان کا غلط نظام تھا اور اِدھر حضرت موسیٰ علیہ السلام صحیح نظامِ خداوندی پیش کر رہے تھے اور اِن دونوں نظاموں کے متعلق دلائل اور شواہد دیئے جا رہے تھے۔ چنانچہ جب یہ کچھ ہو چکا تو اس کے بعد ہم آگے چل رہے ہیں۔

یہاں کہا جا رہا ہے کہ فَاُلۡقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا (20:70)۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہی ہوا جو خدا نے کہا تھا۔ فرعون کے مذہبی پیشواؤں نے اعترافِ عجز کر لیا اور دو ہی آیتیں آگے چل کر فرعون کے ان منتریوں نے خود ہی یہ کہا ہے کہ مَا

---

[1] مندر کی جمع

جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ (20:72)۔ حقیقت دلائل وبراہین کے ساتھ ہم پر منکشف ہو چکی ہے۔ ہم نے ایسے واضح دلائل وبراہین [1] یعنی بَيِّنٰت دیکھ لیے ہیں اور اس کے بعد تو ہم موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام پر ایمان لانے پر مجبور ہو گئے۔

بات تو رسیوں کے سانپ بننے یا عصا کے اژدھا بننے کی تھی ہی نہیں

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ اگر بات محسوس طور پر یہی ہو کہ ان کے سامنے وہ رسیاں ہوتیں، وہ سانپ بن گئے ہوتے اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا عصا اژدھا بن گیا ہوتا، اس نے ان سب کو نگل لیا ہوتا تو وہ جو اس قدر عوام جمع تھے، جن کا خاص طور پہ اہتمام کیا گیا تھا، انہیں تو فطری طور پر سب سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانا چاہیے تھا۔ یہ دانشور طبقہ تو پھر بھی ذرا سوچ لیتا ہے کہ نہیں، اس کے پیچھے ضرور کوئی چیز ایسی ہوگی۔ اگرچہ اس عمل پر ان کا ذہن بھی بہت جلد ماؤف ہو جاتا لیکن یہ پھر بھی ذرا سوچتے مگر عوام کی تو کیفیت یہ ہوتی کہ وہ فوراً ہی ان پر ایمان لے آتے۔ لہٰذا اگر اس کے یہ معنی لیے جائیں تو وہ جادو کا بہت بڑا کھلا ہوا کھیل تھا۔ اور عوام تو مداریوں کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نہ سمجھ سکتے اور جھٹ سے اُن پر ایمان لے آتے۔ اس طرح تو سب سے پہلے ان جمہور اور عوام کو، جو وہاں جمع تھے، ایمان لانا چاہیے تھا۔ مگر ان میں سے تو کوئی بھی ایمان نہ لایا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ انہوں نے اتنا بڑا معجزہ دکھانے کی بات کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عوام پھر بھی ایمان نہ لائے اور اب دوسرا طبقہ فرعون، اس کے مصاحبوں اور دانشوروں 'Intellectuals' کا تھا۔ ان کے متعلق توقع کی جا سکتی تھی کہ جب اس قسم کے دلائل و شواہد ان کے سامنے آئیں تو وہ ایمان لے آئیں، مگر یہاں تو ان لوگوں میں سے جو Catagory (طبقہ) ساحرین کی ہے صرف وہی ایمان لائی تھی، دوسرے مصاحبوں اور دانشوروں کو بھی ایمان لے آنا چاہیے تھا، مگر وہ ایمان نہیں لائے۔ قرآن نے واضح کیا ہے کہ صرف فرعون کے مذہبی پیشوا ایمان لائے: قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (20:70)۔ وہ مذہبی پیشوا بے اختیار پکار اٹھے کہ ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ اور وہ جو پچھلی دفعہ سابقہ درس میں، میں نے کہا تھا، کہ اس کا ایک ریفرنس (حوالہ) اور ہے، اسے بھی لکھ لیں۔ وہ حوالہ یہ ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14)۔ حالانکہ ان تمام Categories (طبقات) کے لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں، لیکن انہوں نے محض اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کر دیا تھا۔

نشۂ اقتدار کے باعث رعایا کی نظروں میں پست ہو جانے کا خیال ان کے اڑے تھا

عزیزانِ من! قرآن کا انداز تصریفِ آیات کا ہے۔ اسے سامنے رکھیے، اس کے مطابق دیکھیے تو ہر نقطہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ طبعی طور

---

[1] برہان کی جمع بمعنی دلائل

پہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کیوں نہ ایمان لے آئے؟ اگر یہ بات Intellect (عقل) کی تھی، فکری چیز ہی تھی، سوچنے سمجھنے کی چیز تھی تو پھر یہ تو ایک اتنا بڑا طبقہ موجود تھا، کابینہ کے ممبر تھے، مشیر تھے، وزیر تھے، انہیں بھی تو چاہیے تھا کہ ایمان لے آتے۔ اس کا جواب قرآن دیتا ہے کہا کہ وَجَحَدُوۡا بِهَا وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَآ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا (27:14)۔ وہ دل سے تو اس کے قائل ہو گئے تھے کہ بات یہ ٹھیک کہتا ہے لیکن اقتدار کے نشے کی قوت، نخوت، رعونت، اپنی رعایا کے سامنے اس طرح سے پست ہو جانا، ان کے راستے میں حائل ہو گئی۔ یہاں جَحَدُوۡا کا لفظ ہے، جس کے معنی ہوتے ہیں: "ایویں ہن تسی کھوگے کے اس دا ترجمہ کر۔" [1] یہ ہوتا ہے جَحَدُوۡا (27:14)۔ کہ اس چیز سے انکار کر دینا جس کا اقرار دل کے اندر ہو اور اس کا اقرار کرنا جس کا انکار دل کر رہا ہو۔ قرآن کریم نے حقائق کا انکار کرنے والوں کے متعلق متعدد مقامات پر کہا ہے کہ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ (6:33)۔ یہ جانتے بوجھتے (محض ضد اور سرکشی کی بنا پر) قوانینِ خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی بات صاف ہو جائے، بالکل واضح ہو جائے، دل سے مان لی جائے، دل سے اسے تسلیم بھی کیا جائے، مگر پھر بھی انکار کر دے۔ یہ اس جَحَدُوۡا کے ج کے ساتھ ح ہے، یہ وہ ح ہے جو حلق سے نکلتی ہے۔ اب تو یوں کہیے کہ یہ حلق سے نکلا کرتی تھی جب خالص گھی ملا کرتا تھا۔ اب تو جب سے گھی کے نام پہ ڈالڈا رہ گیا ہے اس میں یہ "ح" اور دوسری "ہ" میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا۔

مروجہ اسلام کا بھی یہی حال ہے

عزیزانِ من! یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے اب آپ کے ہاں اسلام رہ گیا ہے یعنی وہی جو آج کل آپ کر رہے ہیں۔ چند دنوں کے بعد ہوتا یہ ہے کہ اصل شے بالکل گم ہو جاتی ہے اور وہ جو اس کی جگہ مصنوعی شے ہوتی ہے، وہ اس کا نام لے لیتی ہے۔ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں میں یہ جو بچے ہیں ان کے سامنے جب گھی کہیں گے تو ان کے ذہن میں بھی نہیں آئے گا کہ اس کے سوا کچھ اور بھی گھی ہوتا تھا۔ آپ کو پتہ ہے کہ پھر یہ کیا کریں گے۔ یہ کتابوں میں گھی کے خواص معلوم کیا کریں گے جو اُن کے سامنے کتب میں لکھے ہوئے ہونگے، بڑے بوڑھوں سے کچھ باتیں بھی سنی ہونگی۔ وہ یہ کہیں گے کہ یہ سب جھوٹ کہتے ہیں صاحب! گھی تو یہ کچھ نہیں کرتا۔ یہ اس کی ان باتوں کی تکذیب کریں گے اس لیے کہ انہوں نے سمجھ ہی یہ رکھا ہے کہ گھی تو یہی ہے۔

حقائق کو ذہنوں میں آنے ہی نہیں دیا جاتا

عزیزانِ من! اب جب یہ گھی یہ کچھ نہیں کرتا تو پھر وہ اس نتیجہ پہ پہنچ جائیں گے کہ خیر! کسی زمانے کی آب و ہوا میں تو یہ گھی وہ کچھ

---

[1] اس کا ترجمہ کرو کہ "اب تم بھی یوں کہو گے (کہ آ گئے نا تم بھی اسی نچلی سطح پر آخر مان گئے نا تم بھی۔)

کیا کرتا ہوگا' وہ احتراماً اِسے صحیح بھی مان لیں گے لیکن کہیں گے یہی کہ اب تو یہ چلا ہوا کارتوس ہے۔ ❶ اب یہ وہ نتائج نہیں پیدا کرسکتا جو کبھی اس نے کیے تھے اور اگر آپ کہیں کہ بھائی! یہ وہ گھی نہیں ہے' ان کی سمجھ میں بھی شاید آ جائے' لیکن وہ جو اتنی مذہبی پیشہ وروں کی ملیں (Factories) لگی ہوئی ہیں' وہ یہ بات ذہن میں آنے ہی نہیں دیتیں کہ یہ جو بناسپتی گھی ہے یہ وہ گھی نہیں ہے۔ پھر یہ ملوں والے بھی اپنے پروپیگنڈا کے زور پہ ہر روز اشتہارات پیش کرتے ہیں کہ یہ گھی ہی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مذہب میں ہوتا ہی یہ ہے کہ یہ لوگ نام تو وہی رکھتے ہیں مگر ہوتا یہ Vegetable یا بناسپتی گھی ہی ہے۔ شروع شروع میں جب یہ انڈیا میں چلا تھا تو وہاں کسی نے یہ بات کہی تھی کہ اس وقت بھاجی گھی سے بنتی تھی اور اب گھی بھاجی ❷ سے بنتا ہے۔ یہ بناسپتی کے معنی ہیں۔ تو عزیزانِ من! یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے' یہ بڑی نفسیاتی چیز ہے اور قرآن کی کون سی بات ایسی نہیں ہے!

دل تو مان لیتا ہے مگر قوت کا نشہ نہیں مانتا

عزیزانِ من! کہا کہ یہ جو مشیروں' دانشوروں' مصاحبوں کی کیٹگری تھی' اس کے متعلق توقع کی جاسکتی تھی کہ جب دلائل وشواہد ان کی سمجھ میں آ گئے تو یہ ضرور اس پہ جھک جائیں گے۔ یہاں قرآن کریم کہتا ہے کہ وہ لوگ دل سے تو مانتے تھے مگر زبان سے انکار کرتے تھے۔ کیا بات ہے! عربی زبان میں اعجاز یہ ہے کہ اس میں الفاظ نے ذرا سا باب بدلا اور بات کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ عربی زبان ہی ایسی ہے۔ فرمایا کہ **وَاسۡتَيۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ** (27:14)۔ حالانکہ انہیں دل میں یقین ہو چکا تھا' یقین تو ان کے دل میں آ گیا تھا لیکن **جَحَدُوۡا بِهَا** (27:14)۔ انہوں نے اُس چیز سے انکار کر دیا' جس کا اقرار ان کا دل کر چکا تھا۔ وہ خوامخواہ اس گال تے جاں دے سن۔ ❸ وہ کیوں ایسا کر رہے تھے؟ اس لیے کہ (27:14) انہوں نے محض اپنی سرکشی اور تکبر کی بنا پر ان سے انکار کیا تھا۔ وہ جو ان کے دماغ میں سرکشی اور اقتدار کا نشہ تھا اور جو دوسروں کے سامنے پست ہو جانے کا خیال تھا' اس کی بنا پر وہ نہیں مانتے تھے' اور جو کہا جا رہا تھا اس سے انکار کیے جا رہے تھے۔ عزیزانِ من! یہ کیسی عجیب وغریب بات ہے! یہ تو ہر دور میں صحیح ہونے والی بات ہے' ہر دَور کا فرعون یہی کرتا ہے۔ کمرے کے اندر ان سے تنہائیوں میں گفتگو کرو' ہر بات پہ یقین کریں گے۔ ان سے کہو کہ باہر جا کے ذرا سڑک پہ بھی یہ بات کہہ دیجیے' تو کہتے ہیں کہ دیکھیے یہ مصلحت کا تقاضا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! ایک گروہ مصلحت فراموش بھی ہوتا ہے اور یہ وہ ہوتا ہے کہ **فَاُلۡقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا** (20:70)۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہی ہوا جو خدا نے کہا تھا۔ فرعون کے مذہبی پیشواؤں

---

❶ یاد رہے ''کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟'' کے عنوان سے پرویزؒ کا طلوعِ اسلام کنونشن سے ایک خطاب بھی ہے۔ اب ادارہ طلوعِ اسلام سے اس خطاب کا انگریزی ترجمہ Is Islam a Failure? کے نام سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

❷ سبزی ترکاری

❸ وہ خوامخواہ انکار والے راستے پر جا رہے تھے۔

نے اعتراف عجز کرلیا۔ وہیں کھڑے ہوئے بے ساختہ پکار اٹھے کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (20:70)۔ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔ اور میں یہ کہوں گا کہ جیسے پرانے زمانے میں کہتے تھے کہ یہ شہرا تنافسق وفجور کا بھرا ہوا تھا اور یہ بچا ہوا ہے اس لیے کہ اس میں ایک قطب ہوتا ہے۔

انسانیت کی بقا انہی شخصیتوں کے صدقے ہے

عزیزانِ من! میں کہتا ہوں کہ تاریخ میں عالمِ انسانیت ان لوگوں کے صدقے میں بچی ہوئی ہے کہ جن میں اتنی جرأتِ ایمانی ہے کہ جب دلائل سے' اپنی آنکھوں سے' دیکھ لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیش کردہ دین حق پر مبنی ہے۔ حق و باطل الگ الگ نکھر کر سامنے آ گئے' تجلیاتِ طور کی ایک ایسی بجلی کوندی کہ جہالت و ضلالت کے ظلمت انگیز پردے یک لخت اٹھ گئے۔ ان کی نگہ بصیرت نے خالقِ ارض و سمٰوٰت کی نشانیوں کو بلاحجاب ونقاب دیکھا تو والہانہ انداز میں سجدہ میں جھک گئے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ (7:120) اور پھر ایسا ہوا کہ (موسیٰ علیہ السلام کی سچائی دیکھ کر) باطل پیشوا بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ اور فرعون کے سامنے کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (20:70) ہم موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم سجدے کی کیا بات کہہ گیا ہے! آپ نے سمجھ لیا کہ سجدہ کسے کہتے ہیں؟ یہ بات نہیں تھی کہ انہوں نے وہاں کھڑے ہوئے زمین پہ ماتھا ٹیک دیا تھا۔ یہ سجداً تو ''حق اور صداقت کے سامنے جھک جانا ہے۔'' یہ ہے وہ حقیقی سجدہ جس کی قرآنِ کریم تلقین کرتا ہے۔ اِس وقت ہمارے دَور کے اِس سجدے اور قرآنِ کریم کے بتائے گئے سجدے کے متعلق بہت کچھ ذہن میں آ رہا ہے۔ ایک سجدہ تو وہ تھا جس کے متعلق مفکرِ اسلام محمد اقبالؒ (1938-1877) نے اس دور میں کہا تھا کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ایک وہ سجدہ تھا۔ ایک یہ سجدہ بھی ہے جس کے متعلق اسی مفکرِ قرآن نے کہا تھا کہ

نخواہم ایں جہاں و آں جہاں را مرا ایں بسکہ دانم رمزِ جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش بوجد آرم زمین و آسماں را [1]

کیا ان بیدار بخت مذہبی پیشواؤں کا درخشندہ طالع تھا جس پر ساری کائنات کی عظمتیں اور ثروتیں قربان کر دی جائیں! وہ سجدہ نصیب ہوا جس سے ان کی خاک آلود پیشانیوں میں رفعتوں کے ہزار عرش جگمگا اٹھے۔ یہی تھا وہ سجدہ جس کے لیے مردانِ حق کی آگاہِ سحر گاہی ان

---

[1] ارمغانِ حجاز ص۔10 نیز کلیات اقبال فارسی' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ص۔892

التجاؤں اور تمناؤں کے ساتھ بابِ رحمت پر دستک دیتی ہے۔ ذرا غور کیجئے گا اس سجدے کی قیمت کتنی بڑی ڈال رہا ہے۔ اِس دنیا اور اُس دنیا' دونوں کی متاعیں ایک طرف' وہ کہتا ہے کہ میرے لیے بس یہی کافی ہے کہ میں زندگی کے راز سے واقف ہوں۔ وہ راز کیا ہے؟ وہ راز یہ ایک ایسا سجدہ ہے جس سے زمین و آسمان بدل جائیں۔ اے دینے والے! مجھے دینا ہے' تو مجھے وہ ایک سجدہ بخش دے کہ جس سے میں زمین و آسمان کو وجد میں لے آؤں۔ دینا ہے تو یہ دے۔ یہی میری التجا ہے' یہی میری تمنا ہے کہ اس قسم کا ایک سجدہ دیدے۔ یہ وہ سجدہ ہے جس سے زمین و آسمان رقص میں آ جائے' جس سے باطل کے ہر ''خدا'' کی اصلیت آنکھوں کے سامنے بے نقاب ہو جائے' وہ سجد جس کے متعلق عزیزانِ من! مفکر اسلام اقبالؒ (1938 - 1877) نے کہا ہے کہ

مسلمانیم و آزاد از مکانیم   بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کز وے   بہائے ہر خداوندے بدانیم ❶

ہم مسلمان ہیں اس لیے ہم زمان و مکان کی حدود کے اندر مقید ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ کرّہ ارض کیا ہے؟ یہ جسے نو آسمان کہا جاتا ہے ہم تو اس پوری کائنات کے حلقہ سے بھی باہر ہیں اور سنیئے' عزیزانِ من! کہا کہ ہمیں تو وہ سجدہ سکھایا گیا ہے جس سجدے سے دنیا کے ہر باطل خدا کو خریدا جا سکتا ہے۔

یہ ایک سجدہ وہ سجدہ ہے جس سے دنیا کے ہر باطل خدا کو خریدا جا سکتا ہے

دنیا کے ہر باطل خدا کی قیمت' ہم جانتے ہیں کہ اُسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔ او میرے اللہ! اف' اس ایک کے آستاں پر سجدہ اور اس سجدے کا نتیجہ یہ کہ دنیا کے ہر باطل خدا کی قیمت معلوم ہو جاتی ہے کہ اسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔ یہ خود تو دوسروں کو خریدتے ہیں مگر یہ وہ سجدہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کتنے میں خریدا جا سکتا ہے۔ سچ کہا تھا اس مفکرِ قرآن علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے کہ

یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عزیزانِ من! اس سے نظر آ جاتا ہے کہ یہ جو اتنے بڑے فلک پیما بُت بنے کھڑے ہیں یہ تو برف کے تراشے ہوئے بُت ہیں۔ سورج کی کرنیں آنے دیجیے' چار کرنیں پڑیں گی' پانی کی طرح بہہ جائیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی قیمت کیا ہے؟ ان کی خدائی کی تو یہ کیفیت ہے کہ ان کے سامنے سجدہ کرتے رہو' جھکے رہو' تو یہ خدا ہوتے ہیں اور اگر ان کے مقابل کھڑا ہو جاؤ تو یہ فنا ہو جاتے ہیں۔

---

❶ ارمغانِ حجاز ص۔ 62 نیز کلیات اقبال فارسی' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ص۔ 892

خوش بختی، دل کی جرأت سے حاصل ہوتی ہے

عزیزانِ من! اس باطل فلک پیابُت کی قیمت کیا ہے؟ فقط تیرا سامنے کھڑا ہو جانا۔ یہ تو تُو نے ہی انہیں خدا بنا رکھا ہے۔ جس سجدے میں تُو جھکا ہوا ہے، اُس سے سر اُٹھا۔ ایک اور آستاں ہے، وہاں سجدہ کر اور پھر یہ دیکھ کہ یہ بڑے بڑے خدا کس طرح خود بخود دُفا ہو جاتے ہیں۔ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا (20:70)۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دلائل پیش کیے تو وہی ہو جو خدا نے کہا تھا۔ فرعون کے مذہبی پیشواؤں نے اعتراف عجز کر لیا۔ ان ساحرین کو یہ سجدہ نصیب ہو گیا۔ کس قدر خوش بخت تھے وہ انسان! خوش بختی تو دل کی جرأتوں سے حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ تو تمہارے ہاتھ کے سامنے ہوتی ہے، ذرا کہیں ہاتھ بڑھائیے۔ یاد رکھو! آسمانوں پر خوش بختیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔

عزیزانِ من! ہم ساحرین کے تحیّر انگریز جذبۂ ایمان کے کیف بار ونشاط آور منظر میں کچھ اس طرح جذب ہو گئے کہ یہ بھول ہی گئے کہ فرعون کی قلبی کیفیت کا جائزہ لے لیں کہ اِس پر اس غیر متوقع انقلاب سے کیا گزری؟ اس میدان مبازرت میں ساحرین کے سحر کی ناکامی ہی کچھ کم الم انگیز نہ تھی۔ اس پر جب دیکھا کہ خود ''ساحرین'' موسیٰ علیہ السلام کے خدا پر ایمان لے آئے ہیں یعنی بزعمِ فرعون، دشمن سے جا ملے ہیں تو آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے دل و دماغ کی حالت کیا ہو گئی ہو گی! ذلت اور ایسی کُھلی ہوئی ذلت! شکست اور ایسی رسوا کن شکست! وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بردہاں سیلاب کی طرح اُمڈا، کہ ہیں! میری ہی موجودگی میں ایسی کھلی ہوئی بغاوت! اس نے گرج کر کہا کہ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ (20:71)۔ تم میرے حکم کے بغیر ربِ موسیٰ اور ہارون پر ایمان لے آئے ہو۔ سوچیے عزیزانِ من! فرعون جیسا مستبد حاکم، بربریت کے زمانے کا وہ دور، پس منظر یہ کہ اس نے اپنے علوٗ رعونت اور کبریائی کے ثابت کرنے کے لیے یہ سارا اہتمام کیا تھا۔ انہیں بتا دیا تھا کہ جو آج غالب آ جائے گا، یاد رکھو! وہ باقی رہے گا۔ جو آج یہاں مغلوب ہو جائے گا، باقی نہیں رہے گا۔ سوچ لو کہاں آ کے کھڑے ہو۔ اس کام کے لیے جشن کیا گیا، دُور دُور سے یہ عوام اکٹھے کیے گئے۔ کیا آپ قرآن کو ان چیزوں کی اہمیت کے لیے دیکھتے ہیں؟ قرآن کا تو ایک ایک لفظ ہمالیہ پہ بھاری ہے۔

قرآن شاعری نہیں کرتا

عزیزانِ من! قرآن شاعری نہیں کرتا کہ یونہی وہ وزن قائم رکھنے کے لیے ایک لفظ لے آتا ہے۔ اس معاملے پر تو یقیناً اُس کی بہت زیادہ تخصیص ہونا چاہیے۔ قرآن کم از کم الفاظ میں کم از کم باتیں کرتا ہے، لیکن یہاں اس نے یہ باتیں اس قدر تفصیل سے کیوں کی ہیں؟ اس لیے کہ یہ زندگی کے اصول ہیں۔ سارے جشن کا یہ سارا نقشہ فرعون کی جستجو کو بتانے کے لیے دیا ہے کہ اس کی کتنی بڑی اہمیت ہے!

غصے میں فرعون کی حالتِ زار

عزیزانِ من! اتنی اہمیت والے ایک اجتماع کے اندر، فرعون کے سامنے اس کے اپنے درباری اعلان کر دیں کہ ہم ربِ موسیٰؑ اور ہارونؑ پر ایمان لے آئے ہیں تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہ مارے غصے کے لال پیلا ہو گیا اور غصے میں مغلوب الغضب شیر کی طرح بپھرا: قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ (20:71)۔ کیا تم ربِ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر ایمان لے آئے ہو؟ اور اگلے کیا الفاظ ہیں! قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ (20:71)۔ میرے حکم کے بغیر ہی۔

خدا پر ایمان لانے سے پہلے مجھ سے پوچھا کیوں نہیں

عزیزانِ من! فرعون نے کہا کہ مجھے اس پہ اعتراض نہیں ہے کہ تم نے یہ کیا ہے۔ مجھے اعتراض یہ ہے کہ ہم سے پوچھے بغیر یہ کیا۔ اعتراض یہی ہوتا ہے کہ خدا پہ ایمان لانا ہے تو ہم سے پوچھ کے لاؤ، ہم اجازت دیں تو پھر خدا کو مان سکتے ہو۔ یہ ہے جرم۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اب یہ کیا ہوا ہے؟ یہ دیکھیے کہ وہ جو ظُلْمًا وَّعُلُوًّا (27:14) تھا۔ یعنی وہ جو سرکشی، تکبر اور پست ہونے کا خیال تھا، وہ جو دل کے اندر یقین تھا کہ یہ سچ ہے، مگر زبان سے انکار ہے، وہ اب کہہ رہا ہے کہ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِىْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (20:71)۔ (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ) تمہارا پیر و مرشد ہے جس سے تم نے یہ سب فریب انگیزیاں سیکھی تھیں (اور یہ جو کچھ کر رہا ہے، سب تمہاری ملی بھگت تھی۔) ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس سے تم نے ''سحر کی تعلیم'' حاصل کی۔ ہم جانتے ہیں کہ اندر سے سازش ہوئی ہے، تم آپس میں مل گئے ہو۔ یہی کہتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ تم ہی دیانتدار سہی چلیے، ہم تو ایمان نہیں لاتے، ان کی دیانت پہ شبہ تو نہ کیا جائے۔ ان کی دیانت پہ شبہ نہ کیا جائے تو ان کے پاس ''باقی کی رہندا ہیگا اے۔'' [1] کہا جائے گا کہ یہ جو اتنے بڑے بڑے منتری تھے جن کو اس زمانے میں اتنا بڑا مقام حاصل تھا، یہ جو مذہبی پیشوا ہوا کرتے تھے، کوئی بھوکے ننگے نہیں ہوتے تھے بلکہ سلطنت ان کی ہوتی تھی اور فرعون نے انہیں اتنے بڑے مقام پر بٹھا رکھا تھا۔ اب اگر وہ مان لیں کہ انہوں نے واقعی حق و صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کے، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر اُن سے یہ پوچھا جائے گا کہ یہ تو اس مقام کے مالک تھے، علم و دانش تو ان کے پاس تھی اور یہ تمہیں ہر معاملے میں آ کے بتایا کرتے تھے تو آج جب انہوں نے حق کو تسلیم کیا ہے تو پھر تم کیوں انکار کرتے ہو؟ یہ سوال Naturally (فطری طور پر) اٹھنا چاہیے تھا۔ دیکھیے، قرآن کس طرح بات کرتا چلا جاتا ہے۔ فرعون نے کہا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے وہ Honestly یعنی دیانتداری سے نہیں ہوا۔ تم اندر سے مل گئے ہو، میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔

---

[1] ان کے پلے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔

فرعون کی سیاست: اِدھر کچھ اُدھر کچھ

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ اس سے پیشتر فرعون نے اپنے درباریوں سے یہ کہا تھا کہ یہ سازش ہے' یہ وعظ و نصیحت کی بات نہیں ہے' یہ مذہبی و ذہبی معاملہ نہیں ہے' یہ تو سازش ہے کہ تمہیں اس ملک سے نکال باہر کریں اور اس کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لیں۔ اور عوام سے کہا گیا تھا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس لیے آیا ہے کہ تمہارے اسلاف کا جو طریقہ چلا آرہا ہے' یہ بہترین طریقہ ہے مگر یہ تمہیں اس سے بہکانے کے لیے ایک نیا مذہب لے آیا ہے۔ عوام کو مذہب کا کہا۔ اپنے اقتدار میں شامل اکابر' وزراء' کابینہ کے ممبران' پارلیمان کے ارکان سے یہ کہا کہ یہ تمہارے ہاتھ سے اقتدار چھیننے کے لیے آیا ہے۔ دیکھ لیجیے عزیزانِ من! یہ جو سیاست ہے' جسے اقبال رحمۃ اللہ علیہ حکمتِ فرعونی کہتا ہے' چار ہزار سال پہلے بھی وہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔

فرعون کی مرضی کے بغیر خدا پر ایمان لانے کا نتیجہ

عزیزانِ من! فرعون اپنے دل میں یقین کے ساتھ' یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سارے مل گئے ہیں' اندر بہت بڑی سازش کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ سمجھتے ہو کس کی اجازت کے بغیر یہ سب کچھ کر لیا ہے' میرے اختیارات کو جانتے ہو' ابھی دیکھو میں تمہیں کیسی عبرت انگیز سزا دیتا ہوں: **فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى** (20:71)۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا (یا تمہیں الٹی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالوں گا) اور تمہیں کھجوروں کے تنوں کے ساتھ لٹکا کر سولی دی جائے گی اور اس طرح تم دیکھو گے کہ ہم دونوں (فرعون اور موسیٰ علیہ السلام) میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔ عزیزانِ من! کس شدت سے کہہ رہا ہے کہ ابھی دیکھو میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں' ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہوں' کھال کھنچواتا ہوں' صلیب بھی دیتا ہوں۔ وہ اس طرح ہے کہ خشک درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ تمہیں باندھ دیا جائے۔ یہ ذلت آمیز سزا ہے۔ ابھی یہ کرتا ہوں۔ کہا کہ اس وقت تمہیں پتہ چلے گا کہ طاقت کس کے ہاتھ میں ہے؟ کس کی سزا زیادہ شدت والی ہے' الم انگیز ہے؟ تم تو میرے علی الرغم موسیٰ اور ہارون کے رب پہ ایمان لے آئے' میں ابھی بتا دونگا۔ تم کہتے ہو کہ اس انکار کی سزا وہاں سے ملے گی تو وہاں کی سزا کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں' یہاں کی سزا تو تم ابھی دیکھ لو گے اور پھر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کی سزا زیادہ شدید ہے' پتہ چل جائے گا' اور عزیزانِ من! یہ جو مستبد' سرکش' ظلم اور علو والے لوگ ہیں' ان کی سزاؤں کا تو پوچھیے نہیں۔ یہ تو بپھرے ہوئے شیر کی طرح ہوتے ہیں۔ دوسرے مقام پہ سورۃ اعراف میں بھی یہ آیا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں یہ چیزیں آئی ہیں' عزیزانِ من! وہاں دیکھیے کہ اِن کے کیا کیا جواب ہیں' انہیں اکٹھا کیجیے۔ پوچھیے نہیں' انسان وجد میں آجاتا ہے کہ اس نے یہ کچھ کہا تو: **قَالُوْا** (7:125) انہوں نے فرعون کی گرج کو نہایت سکون سے سنا' ایک تبسم جاں فزا کے ساتھ فرعون کی دھمکی کو سنا' مسکرائے اور پورے

اطمینان سے کہا کہ ہم اپنے سابقہ باطل مسلک سے منہ موڑتے ہیں۔ یہ ہے ایمان کی جرأت جو انسان کے اندر اس قدر قوتیں پیدا کر دیتی ہے۔ جو انہوں نے جواب دیا ہے اس کے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے' بات سمجھ میں آ جائے گی۔

ہمارا تو اب زاویہ نگاہ ہی بدل چکا ہے: ساحرینِ دربارِ فرعون

عزیزانِ من! یہ بڑا عظیم معرکہ ہے اور عظیم چیزیں ہیں جو قرآن لے آیا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہی کہ **قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ** (7:125) انہوں نے پورے اطمینان سے کہا کہ (ہم اپنے سابقہ باطل مسلک سے منہ موڑ کر) اپنے نشوونما دینے والے کے صحیح مسلک کی طرف پلٹ گئے ہیں۔ (اب ہم اس سے پھرنے والے نہیں)۔ انہوں نے اعتماد و سکون سے کہا کہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ ہمارے اندر کیا انقلاب آ گیا ہے۔ کہا کہ وہ انقلاب یہ ہے کہ اب ہمارا رخ بدل گیا ہے۔ اس سے پہلا ہمارا رخ تمہاری طرف تھا کہ تمہیں یوں خدا بنایا جائے اور یہ ٹھیک ہے کہ ہم تمہیں خدا سمجھتے تھے۔ اب ہمارے قلب کے اندر انقلاب آ گیا ہے۔ اب ہمارا زاویہ نگاہ بدل چکا ہے۔

قلب کی تبدیلی کے بغیر جو کچھ ہوگا فساد ہوگا

عزیزانِ من! ''قلب کے اندر انقلاب کا آ جانا'' یہ کتنے پُر معنی الفاظ ہیں۔ انقلاب تو لفظ ہی قلب سے بنا ہے۔ قلب کی تبدیلی کے بغیر تو فساد برپا ہو سکتے ہیں' انقلاب تو نہیں آتا۔ اب جو انقلاب آیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے رخ بدلا ہے' اب تمہاری طرف سے منہ پھیر کے ہم نے اُس کی طرف رخ کر لیا ہے اور تیری طرف ہماری پیٹھ ہوگئی۔ ایک ہی حرکت میں' عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ ایک رخ بدلنے سے باطل کس طرح سے کٹتا ہے اور حق کیسے آتا ہے! یہ تو زندہ خدا بیٹھا تھا اور وہ جو ہمارے ذہنوں کے بُت کدوں کے خدا ہیں' ان کے احترام کی یہ کیفیت ہے کہ عقیدت مند تو ان کی قبر کی طرف پیٹھ کر کے واپس نہیں آتے۔ آپ نے پتہ نہیں کہ دیکھا بھی ہوگا یا نہیں دیکھا ہوگا اِس گدائے میکدہ [1] نے تو برسوں یہ کچھ کیا ہوا ہے۔ قبر کو پوجتے جاتے ہیں' وہاں سجدہ کیا جاتا ہے' لَوٹتے ہیں تو اُدھر پیٹھ نہیں کرتے' پچھلے پاؤں لَوٹتے ہیں اور ایک انقلاب یہ ہے۔ ایک ہی لفظ میں ساری بات کہہ دی کہ تم ہمیں ڈرا رہے ہو' ہم نے بس کچھ نہیں کیا' بس یوں رخ بدلا ہے' چہرہ اس کی طرف ہو گیا ہے جو ربِ حقیقی ہے' خود بخود ہی پشت تمہاری طرف ہوگئی ہے۔ تمہارا احترام گیا' پھر ختم ہوا قصہ۔ ارے سمجھدار ہوتے تو اتنے سے ہی سمجھ لیتے۔ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ دیکھیے قرآن کیا کیا لفظ لاتا ہے' کیسے نقشہ کھینچ کے سامنے رکھ دیتا ہے! داستان لکھنے والا شاعر بھی کیوں نہ ہوتا' کم از کم پوری نظم کہہ جاتا تو شاید پھر بھی یہ بات ادا نہ ہوتی جو اس نے یہ کچھ کہہ کر پوری کر دی ہے کہ پہلے ہمارا چہرہ تمہاری طرف تھا اور اب پیٹھ تمہاری طرف ہے۔

---

[1] یہ پرویزؒ کا اپنی طرف اشارہ ہے۔

پہلے ہمارا چہرہ تمہاری طرف تھا اور اب پیٹھ تمہاری طرف ہے: ساحرینِ دربارِ فرعون کی للکار

عزیزانِ من! ان ساحرینِ دربارِ فرعون نے کہا کہ بس ہم نے اتنا ہی کیا ہے' صرف پیٹھ تمہاری طرف ہوگئی ہے تو اب تُو ڈراتا کاہے کو ہے' عزت سب ختم ہوگئی' احترام ختم ہوگیا' اب تُو چاہتا ہے کہ مقابلہ ہوجائے۔ کہا کہ یہ چیز تو تم نے سمجھ لی کہ ہمارا رخ کدھر ہوگیا ہے۔ اب دونوں میں تقابل کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں خداہیں' ترجیح کسے دی جائے؟ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا (20:72)۔ (ان ساحرینِ دربارِ فرعون نے فرعون کی گرج کو نہایت اطمینان کے ساتھ سنا اور دل کے پورے سکون سے) کہا کہ جو حقیقت دلائل و براہین کی رو سے ہم پر منکشف ہوچکی ہے' نہ ہم اس پر اپنی باطل پرستی کو ترجیح دے سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اُس خدا سے منہ موڑ کر' جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' تمہارا حکم مان سکتے ہیں۔

ہم خالقِ کائنات کو ترجیح دیں یا تجھے بڑا جانیں؟

عزیزانِ من! دربارِ فرعون کے ساحرین نے کہا کہ اب سوال تقابل کا ہوگیا ہے۔ پہلے تو یہ تھا کہ ٹھیک ہے تُو ہی خدا تھا' کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اب ہمارے سامنے ایک دوسرا خدا آ گیا ہے۔ لہٰذا بات تم سے یہ ہوگی کہ کس کو کس خدا پہ ترجیح دی جائے۔ انہوں نے کہا کہ پہلی چیز یہ ہے: وَالَّذِیْ فَطَرَنَا (20:72)۔ خدا وہ ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اس خدا کی قوتوں کا یہ عالم ہے کہ وہ ساری کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا ہے۔ تیری قوت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ تُو اور ہم اسی خالق کے پیدا کردہ انسان ہیں' ہمارا تو وجود ہی اس کا رہینِ منت ہے' تیرا وجود بھی اس کی صفتِ خالقیت کا رہینِ منت ہے اور یہاں خالقیت بھی نہیں کہا گیا' فاطریت کہا گیا ہے یعنی عدم (Nothingness) سے وجود (Being) میں لے آنے والا۔ اس خدا کے سامنے تیری حقیقت کیا ہے؟ اور پھر یہ کہ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ (20:72)۔ وہ حقیقت دلائل و براہین کی رو سے ہم پر منکشف ہوچکی ہے۔ یہاں بات ہی وہی بَیِّنٰت کی ہے جو میں کہتا ہوں اور پھر یہ ایمان ہم نے یونہی کوئی سنی سنائی بات پہ نہیں کرلیا' تقلیداً نہیں کرلیا' جبراً نہیں کرلیا' بَیِّنٰت پر کیا ہے' دلائل و شواہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہم ایمان لائے ہیں۔ اس ایمان کو تو تم ہم سے چھڑا ہی نہیں سکتے۔ ایک ایک لفظ پر غور کیجیے عزیزانِ من! معانی و مفاہیم کی ایک وسیع دنیا اس میں مضمر ہے۔

جبر کا ایمان کوئی ایمان نہیں ہوتا

عزیزانِ من! تقلیدی ایمان تو ایک مناظرے کی بحث وتمحیص کی نظر ہوجاتا ہے۔ بحث و مباحثہ اور مناظرہ کسی اصول پہ نہیں کرتے۔ اُن شخصیتوں پر جن کا وہ مذہب ہوتا ہے گفتگو کی جاتی ہے۔ اس شخصیت کے متعلق اگر کوئی دوسرا فردِ مقابل ایسی باتیں کردے کہ وہ ذرا ہیچ ہوجائے تو ان کا ایمان ختم ہوجاتا ہے کیونکہ جبر کا ایمان تو ایمان ہوتا ہی نہیں ہے۔ جو ایمان علی وجہ البصیرت قبول کیا جائے' بَیِّنٰت

کی روسے، دلائل کی روسے، شواہد کی روسے، قبول کیا جائے، اس کے بعد دنیا کی کوئی طاقت اس انسان کو اس ایمان سے نہیں ہٹا سکتی۔ اوہام پرستیوں کا ایمان تو چٹکی بجاتے ہی چلا جاتا ہے۔ وہ ایمان تو ایمان ہی نہیں ہوتا۔ وہ اوہام پرستی کی ایک قسم ہوتی ہے۔ کوئی پتھر کے بت پہ ایمان لے آیا، کوئی اَن دیکھے خدا پہ ذہن میں ہی اس طرح سے ایمان لے آیا۔ اس خدا پہ ایمان کی دعوت دینے والے نے تو کہا تھا کہ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (12:108)۔ ان سے کہو کہ میری راہ تو بالکل (صاف اور سیدھی) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف، دلائل و براہین کی روسے، علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں...... میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین ہوں گے، وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔

تقلید کی روش سے بہتر ہے خودکشی

عزیزانِ من! کہا کہ ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو تمہیں اوہام پرستی کی بنا پہ نہیں بلاتے۔ ہمیں بھی ایسی تقاریر آتی ہیں جو تمہیں مسحور کرلیں اور خدا کو منوا لیں لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ تم سے اسلاف کی تقلید کی روسے نہیں منواتے۔ میں تمہارے سامنے علیٰ وجہ البصیرت خدا کو پیش کرتا ہوں، میں بھی ایسا کرتا ہوں، عزیزانِ من! سنیے قرآن کیا کیا لاتا ہے! کہتا ہے کہ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرا اتباع کرے گا وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ آج خاص طور پہ اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ کا بڑا چرچا ہے۔ اتباعِ سنت سے انکار تو کفر ہے۔ قرآن میں خدا کا ارشاد ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)۔ تمہارے لیے رسولؐ کا اسوہ بہترین نمونۂ عمل ہے۔ آپ تو صرف ایک سنت کی بات کہہ رہے ہیں، قرآن تو حضور ﷺ کی ساری زندگی کو نوع انسانی کے لیے قیامت تک بہترین اسوہ حسنہ، ماڈل، قرار دے رہا ہے اور اس کے بعد کون ہے جو اس سے انکار کر کے دعویٰ ایمان کر سکے۔

اصل سوال تو یہ ہے کہ اتباعِ سنت ہے کیا؟

عزیزانِ من! اصل سوال تو سارا یہ ہے کہ اتباعِ سنت کیا ہے؟ لہٰذا جس خدا نے قرآن کو محفوظ کیا تھا، اُسی خدا نے قرآن پر عمل کر کے دکھانے والی شخصیت کی زندگی کو اسوہ حسنہ قرار دیتے ہوئے آپ کی زندگی کو بھی قرآن میں محفوظ کر دیا تھا اور کرنا بھی چاہیے تھا۔ آپ کے ہاں فائن آرٹس (فنونِ لطیفہ) میں Painting (مصوری) کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ وہ Students (طالب علموں) سے مجسمے بنواتے ہیں، تصویریں کھنچواتے ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے ایک ماڈل سامنے رکھا ہوا ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس ماڈل کے مطابق مجسمہ بنایئے، اس کے مطابق Portrait (پیکر، مورت) بنایئے۔ اگر وہ مجسمہ پتھر (Stone) کا ہے تو وہ تو رکھا ہوا ہوتا ہے۔ میری بچی نے Fine Arts (فنونِ لطیفہ) میں داخلہ لیا ہوا تھا۔ میں اس سے پوچھا کرتا تھا کہ پورٹریٹ میں کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگی: باباجان! یہ بڑی مشکل چیز ہے۔ یہ ایک بندہ جو یہاں آپ کے سامنے نظر آتا ہے جس کا پورٹریٹ میں کھینچ کے لے آئی ہوں، اس کے لیے

مہینہ لگا تھا۔ میں نے کہا: پھر؟ کہنے لگی: اس قسم کے لوگ جنہیں اجرت پر لایا جاتا ہے' انہیں صبح سے شام تک یا جتنا وقت ہم اس میں لیتی ہیں' اسی پوز (Pose) میں یوں بیٹھا رہنا پڑتا ہے' اس طرح بیٹھا ہوا وہ شخص ہل بھی نہیں سکتا کیونکہ اس سے ہماری تصویر بگڑ جاتی ہے' یہ نگاہ رنگ تماشا ہے۔ بچی نے کہا کہ بابا جان! یہ ماڈل ذرا ہل جائے تو ہمارا سارے کا سارا رنگ تماشا بکھر جاتا ہے۔

آنکھ بھی نہ جھپک کہ رنگ تماشا ٹوٹ جائے گا

ماڈل کی تو یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے' محسوس شکل میں' ہو۔ پھر تو وہ ماڈل ماڈل رہتا ہے اور اگر کہہ دیا جائے کہ یہ تمہارے لیے ماڈل ہے اور ماڈل وہاں کمرے کے اندر رکھا نہ جائے تو پھر کیا ہوگا؟ پھر وہ ہوگا جو بہتر فرقے بنے ہوئے ہیں۔ ہر اسٹوڈنٹ (طالب علم) اپنے اپنے ذہن کے مطابق ایک پورٹریٹ کھینچے گا۔

بہتّر بہتّر فرقے اور ہر فرقے کا ماڈل الگ الگ

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدائے خبیر و سمیع و بصیر یہ حکم دے کہ رسول کی زندگی تمہارے لیے ماڈل ہے اور اس ماڈل کو قیامت تک کے لیے تمہارے کمرے کے اندر محفوظ کر کے نہ رکھے۔ ایسا حکم دینے والے کے متعلق آپ کیا سمجھیں گے؟ عزیزانِ من! جسے دنیا بھر میں منکرِ اتباعِ رسالت یا سنت کہا جاتا ہے' ہزار علماء نے اُس کے خلاف کفر کے فتوے لگا دیئے۔ اس نے بات صرف اتنی کہی تھی کہ خدا نے حضور ﷺ کی زندگی کو ماڈل بنایا ہے اور خدا نے یہ ذمہ لیا تھا کہ یہ ماڈل تمہارے سامنے قیامت تک کے لیے رہے۔

سنتِ رسول کے لیے معیار قرآنِ حکیم کو ہی بنانا ہوگا

اس ماڈل کے پورے خد و خال خدا کے ذمہ تھے کہ وہ انہیں محفوظ کرتا' لہٰذا اس نے یہ پورے کے پورے خد و خال قندیلِ آسمانی (قرآنِ کریم) میں محفوظ کر دیئے ہیں چنانچہ قرآن سے سیرتِ رسول اللہ ﷺ مرتب ہوسکتی ہے۔ میں نے کہا یہ تھا کہ اس کے علاوہ جتنے بھی اور پورٹریٹ کھینچے ہوئے ہیں انہیں لے آئیے یہ ماڈل جو ہے اسے سامنے رکھ دیجیے۔ اس میں سے جو پورٹریٹ اس کے مطابق ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے' جو اس کے مطابق نہیں ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ سنتِ رسول اللہ ﷺ کو پہلے متعین کر لیجیے۔ ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ بعد میں ہمارے سامنے قرآن کا ماڈل نہ رکھا گیا' یا نہ رہا اور پھر نتیجہ یہ کہ ہر کسی نے اپنے اپنے ذہنوں کے مطابق پورٹریٹ بنا لیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ كُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (30:32)۔ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں' وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سنتِ رسول کو متعین نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر ہر پینٹر (مصور) مست ہو کے اور مگن ہو کے بیٹھ گیا کہ میرا پورٹریٹ صحیح رسول اللہ ﷺ کا پورٹریٹ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ یہ 72 پورٹریٹ جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں وہ ایک شخصیت کے تو نہیں ہو سکتے۔

میں تو سنت کو فرض قرار دیتا ہوں

میں نے کہا کہ آؤ' اس ماڈل کو قرآن کے فریم کے اندر رکھ کے دیکھ لیں۔ جو اس کے مطابق پورا اترے' وہ اسوہ رسول اللہ ﷺ ہے' اس کا اتباع لازم ہے۔ تم تو سنت ماننا کہتے ہو' میں تو اسے فرض قرار دیتا ہوں لیکن وہ ماڈل جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہو وہ بات یقینی ہے اور یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا یہ حکم دے کہ تم ماڈل کا اتباع کرو اور پھر یہ ماڈل ہمارے اور آپ پہ چھوڑ دے کہ تم خود تیار کر لیا کرو۔ یہ تھا' عزیزانِ من! میرا جرم۔ اور یہ ماڈل یا یہ سنت کیا سکھاتی ہے؟ اس کے لیے قرآن کریم میں ہے کہ **قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ** (12:18)۔ ان سے کہو کہ میری راہ بالکل (سیدھی اور صاف) ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں خدا کی طرف' دلائل و براہین کی رو سے' علیٰ وجہ البصیرت' دعوت دیتا ہوں...... میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میرے متبعین (Followers) ہوں گے' وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں' لیکن یہ ایک ایسا ماڈل پیش کرتے ہیں' جس میں کہتے ہیں کہ شرع میں عقل کو دخل نہیں ہے' کیا یہ پورٹریٹ ﷺ کا ہوسکتا ہے؟ جو یہ کہے کہ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں اور یہ بھی حضور ﷺ کی زبان مبارک سے خدا کہلوا دے کہ (انا) میں بھی کرتا ہوں (و من اتبعنی) اور جو اتباعِ سنت کرے گا وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ عزیزانِ من! یہ تھا وہ طریق جو میں نے اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ کی بناء پر علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا۔ یہ ہمارے خلاف دوسرا جرم ہو گیا۔

عزیزانِ من! بات یہاں تک آئی کہ **مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ** (20:72)۔ وہ حقیقت' دلائل و براہین کی روسے' ہم پر منکشف ہو چکی ہے۔ یہاں عجیب چیز کہہ گئے ہیں کہ جس چیز کو ہم نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا کہ وہ حق ہے تو اب محض اس لیے تو یہ دھمکی دے رہا ہے کہ ہاتھ پاؤں کٹوا دونگا' کھال کھینچ دونگا' صرف اس لیے کہ ہم اسے چھوڑ دیں جسے ہم نے علیٰ وجہ البصیرت صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ کیا بات ہے' عزیزانِ من! اگلے لفظ سنیے۔ دھمکی دے رہا ہے تو یہی کہہ رہا ہے کہ ایک ایک کو الگ کر کے صلیب دے دونگا' یہ کچھ کر دونگا۔ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ آج بھی فرعونیت میں یہی ذہنیت (Mentality) کارفرما ہے۔ اس میں سرِ مو فرق نہیں ہے۔

جو ایمان بیّنٰت پر مبنی نہ ہو تو وہ شعبدہ بازی ہے

عزیزانِ من! سنیے اور دربارِ فرعون کے اِن ساحرین کے جواب پہ جھوم جایئے۔ انہوں نے کہا کہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟ **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72) تُو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر' جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ فرعون کی دھمکی' ایمان و ایقان کے ان آہنی پیکروں پر کیا اثر کر سکتی تھی:

وہ چنگاری خش و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

انہوں نے ایک خفیف سی ہنسی سے فرعون کی طرف نگۂ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ کیا کہہ رہے ہو؟ جن حقائق کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں‘ کیا تمہارے ڈر سے ان کی تکذیب کر دیں؟ فرعون! تو کیا جانے کہ ہماری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے؟ تجھے کیا معلوم کہ خدا پر ایمان کی لذت کیسی ہوتی ہے؟ یہ تیری دھمکیاں اور تخویف و ترہیب کی شعلہ باریاں‘ ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ اس لیے: **فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72) جو کچھ تُو کرنا چاہتا ہے‘ کر ڈال۔ جو تیرے جی میں آئے‘ کر گزر۔ تیرے آہنی ہاتھ زیادہ سے زیادہ اس طبعی زندگی تک ہی گلوگیر ہو سکتے ہیں۔ اِس سے آگے تُو کر ہی کیا سکتا ہے؟ کیا بات ہے! یہ ہے حق جو یہ کہہ دے۔

عزیزانِ من! ایمان تو انسان کے اندر یہ قوت پیدا کر دیتا ہے۔ مگر یہ قوت اسی میں پیدا ہوتی ہے جو **بَیِّـنٰـت** پر ایمان لایا ہے۔ جو **بَیِّـنٰت** کی رو سے ایمان نہیں لاتا‘ عزیزانِ من! وہ تو ایک مناظرے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا کہ **فَـاقْـضِ مَـآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72) تُو جو کچھ کرنا چاہتا ہے‘ کر گزر۔ اور دلیل سنیے۔ عزیزانِ من! پوچھیے نہیں یہ معرکہ کتنا عظیم معرکہ ہے اور قرآن نے بھی جس انداز سے اس کو محفوظ کیا ہے پوچھو نہیں وہ کیا انداز ہے! انہوں نے **عَـلٰی بَیِّـنٰت** واضح دلائل و براہین دیکھ کر یہ کہا تھا۔ کہا کہ سن لو‘ جو کچھ ہم تمہیں کہہ رہے ہیں‘ وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ جو تیرے جی میں آئے کر لے۔ اس لیے کہ **اِنَّـمَـا تَـقْـضِـیْ**(20:72) تو جو کچھ ہمارے ساتھ کرنا چاہے گا یا کرے گا وہ کیا ہوگا؟ عزیزانِ من! غور سے سنیے: **تَـقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا** (20:72) وہ تو زیادہ سے زیادہ ہماری اس طبعی زندگی کے متعلق ہی کرے گا۔ تیرا دعویٰ اقتدار تو اس سے آگے جاتا ہی نہیں ہے اور زندگی اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ تیرے اختیارات کی تو حدود ہی متعین ہیں۔ ’’تھرڈ کلاس دا مجسٹریٹ تین مہینے دی قید ہی کر دے گا‘ ہور کی کر لیں گا۔‘‘ [1] اے فرعون! اس سے زیادہ تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ عزیزانِ من! فرعون جیسا مستبد حکمران ہے‘ آپ دیکھیے دنیا میں بڑے سے بڑا بھی جو صاحبِ اقتدار ہوگا‘ اس کا احاطۂ اقتدار اسی دنیا کی زندگی تک محدود ہوگا۔ اس لیے ان ساحرینِ دربارِ فرعون نے بے دھڑک کہا کہ **فَـاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ** (20:72)۔ جو فیصلہ تُو کرنا چاہتا ہے‘ کر ڈال۔ جو تیرے جی میں آئے‘ کر گزر۔ ہم نے تجھے اتنی چھوٹ دیدی کہ جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ کہا کہ ہم نے یہ یونہی مبالغہ نہیں کیا۔ ایسا کہنے میں ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں کہ جو کچھ بھی تُو ہمارے ساتھ کرنا چاہے گا یا کرے گا‘ یہ اسی طبعی زندگی تک ہی محدود ہوگا اور زندگی تو یہاں تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی۔ یہ اتنی سی طبعی زندگی تُو اس آخرت کی زندگی کے مقابلے میں کچھ شے ہی نہیں ہے اتنی جو لامنتہٰی زندگی ہے اس تک تو تیرے ہاتھ کی رسائی ہی نہیں ہے۔ اتنی سی زندگی کے متعلق تُو جو کچھ کرنا چاہے‘ کر دے۔ اس سے بڑھ کر اس زندگی سے جو تیری حکمرانی میں گزارتے ہیں‘ ہم انکار کرتے ہیں۔ **بَیِّنٰت** کا‘ واضح دلائل و براہین کا‘ یہ تقاضا نہیں ہے۔ دلیل سے بات پیش کر دی ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھتے ہیں کہ اگر انہیں محض جادوگر سمجھا جائے تو ان کی بات تو وہیں ختم ہوگئی تھی۔ یہ کیا دلائل دیئے جا رہے ہیں! آپ ان کے یہ دلائل ملاحظہ فرمائیں اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کے دلائل کی بنا پہ ایمان نہ لائے ہوتے‘ تو کبھی یہ کچھ نہ کہتے۔

---

[1] مجسٹریٹ کلاس تین تو صرف تین مہینے کی ہی سزا دے سکے گا اس سے بڑھ کر وہ اور کر ہی کیا سکتا ہے۔

ضد تو وہ کرتا ہے جس کے سامنے بیّنٰت نہ ہوں

جھگڑے کے اندر آدمی ضد میں آ جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو یہ کہہ دیتا ہے کہ ''کر لا جو کچھ تو کرنا ای''[1] یعنی یہ تو آدمی کسی کے پوچھنے پر کہہ ہی دیتا ہے کہ تم ایسا کیوں کہتے ہو، تمہیں کیا غرض ہے، ٹھیک ہے کر لو۔ لیکن یہ تو کہتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کریں گے۔ تمہاری ضد ہے تو ہماری بھی ضد ہے۔ عزیزانِ من! جس نے بَیِّنٰت دیکھے ہوں وہ ایسی بات نہیں کرتا۔ وہ جو اس کا فیصلہ کرتا ہے دلیل و براہین سے کرتا ہے۔ چار ہزار سال پہلے بھی اور آج بھی یہ اتنی محکم دلیل ہے۔ ایمان دلائل و براہین کی رو سے ہونا چاہیے۔ وہ ایمان کس بات پہ لائے تھے؟ اِس بات پہ کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی بڑھتی ہے۔ وہ ایمان ہی اس بات پہ لائے تھے کہ زندگی تو بہت آگے چلتی ہے۔ اب یہ ابھی آتا ہے کہ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (20:73)۔ خدا کا قانون ہی بہترین اور باقی رہنے والے نتائج کا حامل ہے۔ یہ اگلی ہی آیت میں تو آیا ہے۔ بہر حال انہوں نے فرعون کو واضح کر دیا تھا کہ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (20:73)۔ تیرا فیصلہ ہماری اسی دنیا کی زندگی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تیری دسترس میں ہے ہی کیا؟ سو اس زندگی کی ہم پرواہ نہیں کرتے کیونکہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے اور اس زندگی پر تمہیں کوئی اختیار نہیں ہے۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود[2]

اے فرعون! تیرا حیطہ اقتدار اسی طبعی زندگی تک ہے۔ ہنس کے کہا ہوگا، مسکرا کے کہا ہوگا کہ جناب! اپنے آپ کو بہت صاحبِ اقتدار سمجھتے ہیں، ذرا اپنے اقتدار یا اپنی سلطنتوں کو تو دیکھیے کہ آپ کہاں ہیں اور اسکے بعد یہ دیکھیے کہ زندگی کی جوئے رواں کہاں تک جاتی ہے، وہاں تک تو تمہارا ہاتھ ہی نہیں پہنچ سکتا۔ تُو ڈراتا کس بات پہ ہے، تو دھمکیاں کس بات کی دیتا ہے؟ اتنی سی بات یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ یہ سزا دوں گا، ٹھیک ہے۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (20:72) تُو جو کچھ کرنا چاہتا ہے، کر گزر۔ تیرا فیصلہ بہر حال ہماری اسی زندگی سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تیری دسترس میں کچھ نہیں۔ سو اس زندگی کی ہم پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس کے برعکس زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے۔ اس زندگی پر تمہیں کوئی اختیار نہیں۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ (20:73)۔ ہم اپنے نشوونما دینے والے پر ایمان لا چکے ہیں۔ اُس سے ہماری دعا یہ ہے کہ وہ ہماری سابقہ غلطیوں کے مہلک اثرات سے ہماری حفاظت کر دے۔ بالخصوص باطل پرستی کی اس خطا کارانہ روش کے اثرات سے جس پر چلنے کے لیے تم نے ہمیں مجبور کر رکھا تھا۔ ہاں پہلی بات یہ ہے کہ تیرے سامنے تو اس جرأت اور بے باکی سے ہم کھڑے ہیں کہ اس سے تیری قیمت ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔

---

[1] جو کچھ تجھے کرنا ہے، تو کر گزر۔

[1] پیامِ مشرق، ص۔ 192 نیز کلیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ص۔ 362

آپ غور کیجیے' عزیزانِ من! کہ اس کی طرف پشت کرنے کی بات جس کے متعلق ابھی دس منٹ پہلے اُس نے یہ کہا تھا کہ ''آ وٗ'' ہم غالب آ کے رہیں گے۔ اُس نے بتا دیا تھا کہ انعام دے گا' اس نے کہا تھا کہ مقرب بناؤ نگا۔ وہ کہنے لگے کہ شکریہ' ہم یہ کچھ ضرور کریں گے۔ جس خدا کی یہ کیفیت تھی' ذرا اس کی طرف سے منہ موڑا اور دوسری طرف رخ کیا تو کہا کہ ہم اس کے حضور واقعی ندامت سے کھڑے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی بَیِّنٰت سے نہیں بسر کی۔ مَآ اَکۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ (20:73)۔ ہم نے تو وہ زندگی ......سحر آفرینی کی خطا کوشی سے ...... تیرے مجبور کرنے پر بسر کی' باطل پرستی کی اِس خطا کارانہ روش پر چلنے کے لیے تم نے ہمیں مجبور کر رکھا تھا۔ ہم تو تیرے جبر کی بنا پہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس پر ہمیں اتنی بڑی ندامت ہے کہ ہم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے۔ اکرھتنا یعنی جبر سے مانی ہوئی صداقت' عزیزانِ من! ایمان ہی نہیں ہوتا کیونکہ لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ (2:256) دین میں جبر نہیں ہے۔ اسے انسانوں کو اپنے دل کی رضا مندی سے قائم اور اختیار کرنا چاہیے۔ اسے جو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرے' وہ علیٰ وجہ البصیرت کہے کہ مانو' اس میں اکراہ کا کیا دخل؟ یعنی وہ اپنا یہ جرم کہتے ہیں کہ تمہارے سامنے' خدا کے حضور' ہم کھڑے ہیں۔ ہم اس کا آمنا سامنا نہیں کر سکتے' اسے منہ نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے کہ وہ یہ کہے گا کہ تمہاری جرأتوں کو کیا ہو گیا تھا۔ تم نے اس کے جبر سے' ڈر کے' مجبوراً باطل کو اختیار کیے رکھا۔ کہا کہ ہمیں تو اس سے اتنی ندامت آتی ہے کہ اس کو ہم منہ بھی نہیں دکھا سکتے بجز اس کے کہ ہماری نگاہیں نیچی ہیں اور اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! اے خدائے رحیم! یہ ساری' جتنی بھی خطائیں ہم کر چکے ہیں' اس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔

ساحرینِ دربارِ فرعون کی طرف سے اقرارِ جرم اور فرعون کا شکریہ

ساحرین دربارِ فرعون نے فرعون سے کہا کہ ایک بات کے لیے البتہ ہم تمہارے بھی شکر گزار ہیں کہ تم نے ہمارے خلاف وہی فردِ جرم مرتب کی ہے جس کے ہم مرتکب ہوئے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی غور طلب بات ہے۔ وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا (7:126)۔ تم ہمارے خلاف اس کے سوا اور کونسا جرم عائد کر سکتے ہو کہ جب ہمارے سامنے نشو ونما دینے والے کی کھلی کھلی آیات آ گئیں تو ہم نے انہیں سچا تسلیم کر لیا۔ اگر یہ جرم ہے تو ہم دل و جان سے اس جرم کے اقبالی ہیں۔ یعنی تمہاری دانست میں ہم نے یہ جرم کیا ہے کہ ہم تمہاری اجازت کے بغیر خدا پر ایمان لائے۔ شکریہ کہ تُو نے یہی فردِ جرم عائد کی ہے ورنہ اگر کسی اور طرح سے کوئی اور جرم ہم پر عائد کر دیتا تو ''فیر تیرا کی کر لیندے''[1] یا اگر تُو ہمیں کسی اور جرم میں دھر لیتا تو یہ ہمارے لیے بڑی ذلت کی بات تھی۔ تیرا شکریہ' تُو نے اس معاملے میں بلند کردار کا ثبوت دیا ہے کہ تُو نے وہی جرم عائد کیا ہے جو ہم نے کیا ہے۔

---

[1] پھر ہم تمہارا کیا کر لیتے۔

فرعون موجودہ تہذیب کے تقاضوں سے واقف نہ تھا

اے فرعون! تُو کیا جانے کہ ہماری نگاہوں نے کیا دیکھا ہے! تمہاری نگاہ میں ہم اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔لیکن اسے سن رکھو کہ اس جرم کرنے پر نہ ہم پشیمان ہیں اور نہ معذرت خواہ ہیں' بلکہ ہمیں اس بات پر فخر ہے اور تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے یہی جرم عائد کیا ہے۔عزیزانِ من! اسے ذہن میں رکھیے کہ اصل میں وہ دورِ جہالت کا فرعون تھا۔ابھی وہ یہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ صحیح جرم عائد کر کے نہیں پکڑا کرتے' وہ آج کی تہذیب کا زمانہ نہیں تھا' اب تہذیب کے تقاضے کچھ اور ہو گئے ہیں۔وہ وحشت اور بربریت کا زمانہ تھا۔ وہ جو اکبر ❶ کہہ گیا ہے وہ اسی جہالت کی طرف اشارہ کر کے کہہ گیا ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

آج تو اس دور میں کالج کی سوجھی ہوئی ہے' یہ دورِ تہذیب ''ذبح ابناء'' کا ہے' وہ دورِ جہالت بچوں کے ''قتل'' کا تھا' اور فرق یہ ہے کہ اگر اس نے اِن ساحرینِ دربارِ فرعون کو مجرم قرار دیا ہے تو اس نے جو ان کا حقیقی جرم سمجھا ہے اُسی کے خلاف ان پر جرم عائد کیا ہے۔

جرم کے سلسلہ میں آج کی مہذب دنیا ایسا نہیں کرتی

قرآن ہے' عزیزانِ من! کیا بات ہے! وہ کہتا ہے کہ یہ چیز بھی کم از کم باعث شکر گزاری ہے کہ تُو نے جرم وہی عائد کیا ہے کہ جو تو سمجھتا ہے کہ ہم نے کیا ہے۔اور یہ کہ اس جرم پر ہم نادم نہیں ہیں۔ہمیں اس پر فخر ہے' ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ اگر تُو ہمیں کسی اور جرم میں یونہی فریب میں دے کے لپیٹ لیتا تو ہم کیا کر لیتے' دوسروں کی نگاہوں میں بدنام ہوتے' ذلیل ہوتے' ورنہ آج کی مہذب دنیا تو اس قسم کے جرم عائد کرتی ہے کہ جس سے مجرم معاشرے کے اندر ذلیل ہو جائے۔اگر یہ کہا جائے کہ صاحب! انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت' بیّـنٰت سے خدا کے متعلق دیکھ لیا کہ واقعی وہ صداقت ہے اس لیے یہ اُسے خدا مان رہے ہیں اور ہم اس لیے انہیں پھانسی دے رہے ہیں کیونکہ اگر انہیں علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو ان سے یہ سارا معاشرہ خراب ہو جائے گا' آج کیا مجال ہے جو یہ بات کہی جائے۔جرم کے سلسلے میں آج کی ''تہذیب یافتہ دنیا'' یہ کچھ نہیں کرتی۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا ایک طریق یہ بھی ہے

عزیزانِ من! قرآن کو اس طرح سے پڑھا کیجیے' اس طرح سے سمجھا کیجیے۔کیا بات کہہ گئے ہیں کہ ہم اس چیز پر آپ کے شکر گزار

---

❶ اکبر الہ آبادی (1921 - 1846)۔ان کا نام سید اکبر حسین ہے۔شاعری کی مقبولیت کے باعث ''لسان العصر'' حضرت اکبر الہ آبادی کے نام سے معروف ہوئے۔وہ اپنی طنزیہ و ظریفانہ شاعری میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

ہیں اور ہمیں اس بات کی خوشی ہے' اس بات پر اطمینان ہے کہ تم نے ہمارے خلاف ایک جرم عائد کیا جو ٹھیک ہے۔ ہم اس وقت مجرم کی حیثیت سے تمہاری عدالت میں پیش ہوئے ہیں۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کہا کہ ایک یہ تمہاری عدالت ہے' ایک اس کا جرم ہے' اس میں بھی مجرم پیش ہوتے ہیں۔ ایک اور عدالت بھی ہے۔ عزیزانِ من! اب دونوں عدالتوں کا تقابل دیکھیے۔ کہنے لگے کہ ہمیں خوشی ہے کہ اگر تُو ہمیں مجرم سمجھتا ہے تو اس کی بھی ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ پرواہ اس بات کی کرنی چاہیے کہ انسان خدا کے حضور مجرم کی حیثیت سے نہ جائے۔ اس لیے کہ **اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا** (20:74)۔ جو شخص اپنے نشوونما دینے والے کے ہاں مجرم بن کر جائے گا **فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ** (20:74) اس کے لیے جہنم کا الم انگریز عذاب ہوگا۔ آج ہم تیری عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی بات ہی نہیں ہے بلکہ ہمیں فخر ہے۔ لیکن مرجانے کا مقام وہ ہے کہ ہم خدا کی عدالت میں' ایک مجرم کی حیثیت سے' پیش ہوں۔ ہم وہاں کی عدالت سے بچ گئے ہیں۔ اب جو تیری مرضی ہے کر لے۔ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! کیا یہ جادوگر تھے؟ کیا یہ مداری تھے؟ آپ سوچیے کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک مجرم وہ ہوگا جو وہاں ہوگا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے لیے وہ بات نہیں ہے' اس لیے کہ جو وہاں مجرم بن کے جائے گا تیرے ہاں تو سزا یہی ہوئی کہ تم ہاتھ پاؤں کاٹ دو گے' سولی پہ چڑھا دو گے' طبعی جسم میں یہ کرو گے' اس کے لیے **فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ** (20:74)۔ جہنم کا الم انگیز عذاب ہوگا۔ اتنی سی بات کہنے پہ' عزیزانِ من! روح میں کچھ کپکپی سی پیدا نہیں ہوتی کہ یہ لفظ ہمارے ہاں جہنم اور دوزخ کثرتِ استعمال سے کچھ فرسودہ سا ہو گیا ہے۔ یہ جو ہم دوزخ کی سزا' جہنم کی سزا' کہتے رہتے ہیں' اس لیے کہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کسی لفظ کو اتنا استعمال کرتے رہیں اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ قرآن نے صرف جہنم نہیں کہا اور انہوں نے ہی صرف جہنم نہیں کہا' عزیزانِ من! سنیے مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد آپ کیا محسوس کرتے ہیں' میری تو روح بہرحال اس جواب سے وجد میں آ جاتی ہے کہ جو اُس عدالت میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہو جہنم اس کی سزا ہے۔ تیری جو سزا تھی' اس سزا کے بعد تو یہ ہوا کہ تُو نے وہ سزا دی اور موت واقع ہو گئی' بات ختم ہو گئی۔ کہا کہ اس کا جہنم وہ ہے کہ جس میں **لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی** (20:74)۔ انسان نہ زندوں میں شمار ہوگا' نہ مردوں میں۔ وہاں نہ موت آتی ہے' نہ زندگی ہوتی ہے۔ تیری سزا دو منٹ کی سزا۔ جبکہ جہنم کی سزا تو وہ سزا ہے کہ جس میں **لَا یَمُوۡتُ فِیۡہَا وَ لَا یَحۡیٰی** (20:74)۔ نہ زندگی ملتی ہے' نہ موت ہی آتی ہے۔

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا[1]

---

[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوان غالب' جہانگیر بک ڈپو لاہور' 2002' ص۔ 37

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے' شبِ غم بُری بلا ہے — مجھے کیا بُرا تھا مرنا' اگر ایک بار ہوتا

اس جہنم میں نہ موت آتی ہے اور نہ زندگی......

عزیزانِ من! کہیں نوٹ کر لیجیے تاکہ جیسا میں نے کہا ہے کہ اس جہنم کے تصور سے ''جس میں نہ موت آتی ہے' نہ زندگی ہوتی ہے'' کبھی تو رونگٹے کھڑے ہوں۔ اِس جہنم میں یہ ہے کہ نہ موت آتی ہے' نہ اس میں زندگی ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پہ جہنم کی Description (وضاحت) ان الفاظ میں ہے کہ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14:17)۔انہیں چاروں طرف سے موت کے سامان دکھاتی دیتے ہیں (اور وہ چاہتے بھی ہیں کہ انہیں موت آجائے تاکہ اس عذاب سے چھٹکارا مل جائے) لیکن انہیں موت بھی نہیں آتی۔ بلکہ موت آنے کے بجائے اس عذاب کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔عزیزانِ من! اس کیفیت میں موت چاروں طرف سے آتی دکھائی دیتی ہے مگر مرتا نہیں۔اس کے بعد مجھ میں تو ہمت نہیں ہے: ''ہر طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن مرتا نہیں۔'' عزیزانِ من! عربی زبان میں قرآن کا انداز تو چھوڑ دیئے' میں پوچھتا ہوں کہ یہ دوٹکڑے ہیں کیا کوئی فکرِ انسانی یہ چیزیں کہہ سکتا تھا؟ نہیں' قطعاً نہیں۔لاریب خدا کے سوا کوئی یہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔انسانی فکر نے بھی جہنم کے کئی نقشے کھینچے ہیں۔ٹھیک ہے' مجھے نیوٹن (Newton: 1642-1727) کا جہنم بھی یاد ہے۔ٹھیک ہے' یہ دوٹکڑے ہیں پہلی چیز یہ کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى (20:74)۔ اس میں نہ موت ہوگی' نہ زندگی ہوگی۔ یہ ایک چیز ہے' دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (14:17)۔ ہر طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن مرے گا نہیں۔یہ ہے' عزیزانِ من! دو لفظوں میں جہنم۔اِن ساحرینِ دربارِ فرعون نے یہ سارا قصہ کہہ کر ختم کر دیا کہ وہاں اُس جہنم میں لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰى (20:74) انسان نہ زندوں میں شمار ہوگا' نہ مُردوں میں۔آج ہم بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1877- 1938) خود جہنم میں کھڑے ہیں اور دوسروں کو یہ کہہ رہے کہ تم جہنم میں جاؤ گے' اسے دوزخ میں بھیجا جائے گا' اسے پھینکا جائے گا حالانکہ ہم تو خود اس دوزخ کے اندر ہیں۔

عزیزانِ من! اب تو دوزخ کہیں تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔جہنم کی Description (وضاحت) کے متعلق ایک جگہ قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكٰفِرِينَ (9:49)۔جہنم کی آگ صداقتوں کا انکار کرنے والوں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور اِس میں پڑے جل بھن رہے ہیں۔ان صداقتوں سے انکار کرنے والوں کو تو اس وقت وہ اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ پھر سنیئے' کہا یہ ہے کہ یہ اس وقت گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔فرق یہ ہے کہ اس وقت یہ نہیں دیکھتے مگر وَرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ (45:10)۔ جہنم کے شعلے ان کے سامنے بھڑک رہے ہیں' جہنم انہیں دیکھ رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ آخر کیا ہوگا؟ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36)۔اُس وقت جہنم ابھر کر سامنے آجائے گا لیکن وہ صرف دیدۂ بینا کے لیے۔یعنی اس کے لیے جس میں حقائق کے مشاہدہ کی صلاحیت ہو۔بات تو اتنی ہے کہ اس وقت اتنا ہی ہوگا کہ دیکھنے والے کے لیے ہم جہنم کو ابھار کے سامنے لے آئیں گے۔

قوموں پر عذاب کی غیر محسوس کیفیت

عزیزانِ من! یہ عذاب ایک عرصے تک قوموں پر غیر محسوس طور پر مسلط رہتا ہے۔ وہ عذاب تو اس قوم کو دیکھ رہا ہوتا ہے لیکن قوم کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اس لیے یہ اس عذاب کو نہیں دیکھتیں اور پھر جب مہلت کا وقفہ ختم ہوتا ہے تو وہ ابھر کر دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ کہیں باہر سے نہیں آتا۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ پہلے وہ عذاب انہیں دیکھ رہا تھا' یہ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ بس ہم اسے ذرا تھوڑا سا ابھارتے ہیں' Manifest (ظاہر) کرتے ہیں تو یہ بھی دیکھنے لگ جاتے ہیں لیکن لِمَنْ یَّرٰی (79:36) یہ نظر اسے آتا ہے جو دیکھنا چاہے۔ اِسے وہی دیکھتا ہے جس میں دیکھنے کی قوت ہوتی ہے یہ لِمَنْ یَّرٰی (79:36) سے یعنی دیکھنے والے کے لیے وہ جہنم بُرِّزَتْ (79:36) ابھر کے سامنے آجاتا ہے یعنی جہنم تو آج بھی موجود ہے لیکن غیر مرئی (Invisible) ہے' اُس وقت وہ ابھر کے سامنے آجائے گا۔ یہ ہے وہ دیکھنے والا جسے قرآن نے کہا ہے کہ جب وہ جہنم سامنے آئے گا اُسے دیکھ کر وہ بیتابانہ چیخ اٹھے گا۔ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (78:40)۔ اور کہے گا کہ اے کاش! میں زندگی اور شعور' احساس اور ذمہ داری کا حامل ہونے کے بجائے مٹی کا تودہ ہوتا یا پہاڑ کی چٹان ہوتا' جیتا جاگتا' محسوس کرنے والا انسان' نہ ہوتا۔ جی' کہا کہ جہنم تو وہ ہے جس میں لَا یَمُوْتُ فِیْھَا وَلَا یَحْیٰی (20:74)۔ انسان نہ زندوں میں شمار ہوتا ہے' نہ مردوں میں۔ اور یہاں اے فرعون! تیری سزا پانچ منٹ میں فیصلہ کر دے گی۔ اگر یہی ایمان ہے کہ زندگی اسی طبعی دنیا کی زندگی ہے جیسا کہ تیرا ایمان ہے تو اتنی سی سزا ہی ہے' جو تُو دے گا اور اگر بَیِّنٰتٌ' واضح دلائل و براہین' دیکھنے کے بعد ہم اس سے انکار کر دیں تو پھر اس کی سزا وہ جہنم ہے کہ جس میں نہ زندگی ہے' نہ موت اور دوسرا یہ کہ موت ہے جو چاروں طرف سے آتی دکھائی دیتی ہے مگر آتی نہیں۔ انسان مرتا نہیں ہے۔ ان آرزوؤں کے باوجود وہ کہتا ہے کہ کاش! میں لاش ہوتا' مٹی کا تودہ ہوتا' یعنی محسوس کرنے والا انسان نہ ہوتا تو میں اس عذاب سے بچ جاتا۔ لیکن اُس وقت اس چیخ و پکار سے کیا ہوگا؟ اُف! یہ قصہ یوں نہیں ہوگا۔ یہ ہے جہنم کا ایک رخ۔ اِس کے برعکس مرنے والوں کے لیے تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ

جہنم کے اس الم انگیز رخ کے برعکس ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ موت کے اُس رخ کے لیے قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وَمَنْ یَّاْتِہٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَھُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی (20:75)۔ جو لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی متاعِ گراں بہا لے کر اس کے حضور جائیں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے بلند مدارج ہوں گے۔ سبحان اللہ! اور جو ان صداقتوں پر ایمان لے آئے' ان آزمائشوں کے باوجود جو اس وقت تم نے ہمارے سامنے پیش کیں ایمان ہی نہیں' پھر اس کے بعد قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ (20:75)۔ عمل صالح بھی کیے تو فَاُولٰٓئِکَ لَھُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی (20:75)۔ اُن کے مقامات کا کیا پوچھتے ہیں! وہ بہت بلند ہیں۔ فرعون

نے اپنے متعلق کہا تھا کہ انا ربکم الاعلٰی (79:20)۔ میں تمہارا اعلیٰ نشوونما دینے والا ہوں۔ کہنے لگے کہ تو کیا اعلیٰ ہے؟ نام سے ہے۔ یہ اعلیٰ تو اعمالِ صالح سے ہوتا ہے، اس سے بلند مدارج ہوتے ہیں۔ الدرجت العلٰی تیرا تو اس کے مقابلے میں کوئی درجہ ہی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے مقابلے میں وہی لفظ استعمال کیا ہے

جنت اور دوزخ کی کیفیات کو تشبیہات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے

جنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَکّٰی (20:76)۔ اِن کے رہنے کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ یہ اس کا صلہ ہے جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی۔ یہ تھی وہ جنت جس کا یہاں تذکرہ آیا ہے۔ کبھی اس موضوع پہ آؤنگا تو بتاؤنگا کہ قرآن نے جنت اور دوزخ کو تشبیہات کے انداز میں ہی بیان کیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں تشبیہات سے ہی بات سمجھی جائے گی۔ سنیے تَزَکّٰی کیا ہوتا ہے؟ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰہَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰہَا (91:9-10)۔ (انفس و آفاق میں کارفرما یہ تمام پروگرام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ) جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی، وہ کامیاب و کامران ہو گیا، اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی، اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور اُبھرنے نہ دیا اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلۂ زندگی افسردہ ہو گیا، اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں۔ وہ اس چقماق [1] کی طرح ہو گیا، جس میں آتش افروزی کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے، اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔ کہا کہ ہر انسانی بچے کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پہ ذات کی صلاحیت دی جاتی ہے۔ فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَتَقۡوٰىہَا (91:8)۔ انسانی ذات کے اندر، اس انداز سے اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو (غلط روش پر چل کر) اپنے اندر انتشار یعنی Disintegration of Human Personality پیدا کر لے اور چاہے تو اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم سے مستحکم تر ہوتی چلی جائے۔ عزیزانِ من! پوچھیے نہیں کہ ہمارے ہاں اس کے کیا کیا معنی کیے جاتے ہیں۔ یہ Potentiality (صلاحیت) انسان کی ذات کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ یہ مضمر صلاحیتیں ہیں۔

قرآنِ حکیم میں ہمارے ہاں کے کشف والہام وغیرہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں

عزیزانِ من! یہ جو ہمارے ہاں الہام ہوتا ہے، کشف ہوتا ہے، قرآن میں اس الہام و کشف کے لیے کہیں کوئی لفظ آیا ہی نہیں۔ ایک ہی جگہ یہ لفظ ''الہام'' آیا ہے اور وہ انسانی ذات کی مضمر صلاحیتوں کے متعلق ہے۔ ''لَہِمَ یَلۡہَمُ لَہۡمًا'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی کے

---

[1] چقماق یا چقمق: ایک پتھر جس سے آگ نکلتی ہے۔

اندر کوئی چیز رکھ دینا' اور یہیں یہ لفظ الہام ایک ہی دفعہ آیا ہے۔ انسانی ذات کے اندر دونوں Possibilities' یعنی دونوں ممکنات رکھ دیئے گئے ہیں۔ ''فجورہا'' فجر کے معنی ہوتا ہے Disintegrate ہو جانا' انتشار ہو جانا' فجر کہتے ہی طلوع سحر کو ہیں۔ اس سے ظلمت چھٹ جاتی ہے۔ اور دوسری تقوٰہا ہے یعنی Integrate (مکمل) ہونا۔ یہ اس کی Form (صورت) ہے۔ یہ دونوں Possibilities' امکانات' اس کے اندر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اب انسان کے اپنے بس کی بات ہے کہ اس کو Integrated Personality (نشوونما یافتہ ذات) بنالے' مستحکم' محکم بنالے یا اسے Disintegrate (پارہ پارہ' ٹکڑے ٹکڑے) کر دے' جسے آپ انتشار یا تحلیل کہتے ہیں۔ یہ بات لمبی ہو جائے گی۔ میں بات وہ کہہ رہا ہوں: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:9-10)۔ جس نے ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران رہا اور جس نے ذات کی نمو دنہ کی' وہ ناکام و نامراد رہا۔

انسانی ذات کے تزکیہ کا لفظ اور اس کا مفہوم

عزیزانِ من! قرآن کریم عام طور پہ ذات کی نشوونما یا اس کے غیر نشوونما Undeveloped رہنے کی تشبیہات بڑی عمدہ محسوس شکل میں دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ انسانی ذات کے اندر فجور یعنی Disintegration (انشقاق) اور تقویٰ یعنی Integration' (مکمل' نشوونما یافتہ) دونوں صلاحیتیں رکھ دی جاتی ہیں۔ چاہے تو یہ ضابطۂ خداوندی سے ہم آہنگ رہ کر اپنی ذات میں ارتکاز (Crystallisation) پیدا کرتا جائے اور چاہے تو اس سے الگ ہٹ کر اپنی ذات میں تشتت وانتشار Disintegration' پیدا کرتا جائے۔ اب انسان سے کہا جاتا ہے کہ اب تیرے اختیار میں ہے کہ ان دونوں میں سے جسے چاہے اپنے لیے منتخب کرلے۔ اور آگے تمثیل ہے' مثال ہے' دانے کی تشبیہ ہے۔ دانے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ برومند ہو کے پودا بن جائے' درخت بن جائے' اس میں برگ و بار آ جائیں' اس کی Development ہو جائے' اس کی نشوونما ہو جائے۔ عربی زبان میں اس کے لیے لفظ ہی تزکیہ یا زکّٰی ہے۔ اس کے معنی ہیں: Growth , Development یا نشوونما پا جانا' تکمیل تک پہنچ جانا' کسی بیج کا درخت بن جانا۔ اسی لیے کہا کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (91:9)۔ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کرلی' وہ کامیاب و کامران ہو گیا' اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی۔

افلح کا مفہوم اور ذاتِ انسانی پر مادی بوجھ کا انسانی ذات سے تعلق

افلح کا لفظ فلاحت سے ہے جس کے معنی کسان ہے' کھیتی ہے' زراعت ہے۔ اس کی کھیتیاں پروان چڑھ گئیں جس نے اس بیج کے اندر کی صلاحیت کی نشوونما کر لی۔ جس نے اس صلاحیت کی نشوونما دے لی' اس کی کھیتی پک گئی۔ اور اس کے مقابلے میں دوسری چیز یہ ہے کہ جس نے قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (91:10)۔ اس صلاحیت کو مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی' اس کا شعائرِ زندگی افسردہ ہو گیا' اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ (Dormant) کی خوابیدہ رہ گئیں۔ یہاں قرآنِ

کریم نے ساری بات پوری کر دی' عزیزانِ من! طریق بتا دیا' وہ جب بیج بوتے ہیں' تو ہر پانچویں' دسویں دن آ کے' اونوں گوڈی کر دے نیں۔ [1] یعنی وہ مٹی کو یوں یوں ہلا کے' گوڈی کر کے' نرم کرتے ہیں۔ اوپر سے مٹی کے ڈلے ہٹاتے ہیں' اس مٹی کو نرم کرتے ہیں۔ وہ پہلی کونپل جو اس سے پھوٹتی ہے' کمزور سی ہوتی ہے' سوئی کے نوک کی طرح۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ کونپل کو ابھرنے میں' زمین سے باہر آنے میں' دقت نہ ہو' مجبوری نہ ہو کیونکہ اس کی نشوونما تو زمین کے نیچے نمکیات اور پانی کی نمی کے fill (پورا) کرنے سے ہوتی ہے' اس کے ذریعے یہ بیج اگتا ہے لیکن اس کے بعد اسے ہوا کی' روشنی کی' حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو ضروری ہے کہ وہ نمکیات پانی کو لیے ہوئے اوپر آئیں۔ انسانی ذات کی نشوونما کی کیفیت بھی یہی ہوتی ہے' اُسے اقدارِ خداوندی کی ضرورت ہوتی ہے تو خیر اب کسی کسان نے جو بیج بویا ہے اگر اس کے اوپر مٹی کا موٹا سا ڈلا [2] آ جائے' تو وہ بیج (Seed) نہیں اُگے گا۔ اس میں اُگنے کا امکان ہے' Potentiality (صلاحیت) تو برابر کی ہے لیکن وہ اُگے گا نہیں۔ اس کے برعکس دوسرے کسان نے جو مادی بوجھ اس بیج (Seed) کے اوپر مٹی کے ڈلے کی صورت میں آ گیا تھا' اسے ہٹا دیا۔ یہ ننھی سی کونپل ابھر آئی۔ اسے تزکیہ کہتے ہیں۔ یہ کونپل مٹی کے ''بڑے سے ڈلے' تودے'' کے نیچے دب گئی تھی۔ اسے اس نے ہٹا دیا۔ کونپل اُبھر آئی۔ یاد رکھیے' مٹی خبیث نہیں ہے' مادہ خبیث نہیں ہے۔ مٹی کے بغیر تو یہ بیج کونپل بنتا ہی نہیں ہے۔ اسی طرح خباثتوں کے مادی بوجھ انسانی ذات پر پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ انسان کو انہیں الگ کرنا ہوتا ہے۔ اسے تزکیہ کہتے ہیں۔ مادی دنیا کے ہر جائز و ناجائز مفادات کا بوجھ انسانی ذات پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس سے بچا کر انسانی ذات کی نشوونما کرنا ہوتا ہے۔ اس مادی زندگی کے بغیر انسان کی ذات کی نشوونما اس سطحِ زندگی پہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تو بیج کو مٹی میں ملاؤ گے تو اُبھرے گا۔ میز پہ رکھ چھوڑ یئے' شیشے میں رکھ چھوڑ یئے' اسے کسی ایک صندوقچی میں رکھ چھوڑ یئے' یہ بیج اُگے گا ہی نہیں۔ وہ تو مادے کے ساتھ ملوث ہوگا' مادے کے ساتھ ملے گا تو اُگے گا۔ اس لیے جسے یہ مادہ پرستی' جی! مادہ پرستی کہتے ہیں' بس کہیں سے یہ ایک لفظ سن رکھا ہے اور پھر مادہ سے نفرت کا تصور اپنا لیا۔ آپ کے ہاں کا یہ سارا قصہ ویدانت یا تصوف کا ہے جو مادی یا مادہ پرستی کو قابلِ نفرت بنائے ہوئے ہے۔

افراطِ زر کے بوجھ سے بھی ذات کا یہ انمول بیج تباہ ہو جاتا ہے

اس سطحِ ارض پر مٹی کے بغیر تو بیج ہی نہیں اُگتا' دنیاوی یا مادی مفاد کے بغیر انسانی ذات کی نشوونما ہو نہیں سکتی۔ بس اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ اس کے اندر مناسب پانی دیا جائے' وہ پانی بھی زیادہ نہ دیا جائے کہ بیج (Seed) ہی گل جائے۔ یہ جو آپ کے ہاں افراطِ زر ہے تو یہ آپ نے اپنی ذات کو دولت کا ''ایناں پانی دتا' اس کھیتی نوں' اینا پانی دتا کہ او بیج ای گل گیا۔ ایناں ساریاں دے بیج گلے اوئے ہوندے

---

[1] ہر پانچویں دسویں دن آ کر گوڈی کرتے ہیں۔

[2] بڑا سا ٹکڑا

ہیگے نیں۔ فیر گلیاں وچوں' جدوں تہانوں پتہ اے ناں' پھیر بو آندی اے [1] ۔'' لیکن اگر آپ اس مٹی کو قابلِ نفرت سمجھیں اور بیج سے الگ رکھ دیں' تو بیج دبے کا دبا ہی رہ جائے گا۔ اگر اِسے صحیح تناسب سے مٹی میں رکھا جائے' صحیح معنی میں اِسے اتنا ہی مناسب پانی اوپر سے دیا جائے جس سے وہ نہ دبے اور نہ سڑے تو یہ بیج نشو ونما پا کے اوپر آ جائے گا۔ یہی صورتِ حال انسانی ذات کی نشو ونما کی ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جس نے یہ نہ کیا اور اِسے اتنا زیادہ دبا دیا کہ پھر اسے دبا ہی دیا تو وہ **قد خآب** ہو گیا۔

لفظ خآب کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! ''خاب'' کے قرآنی مفہوم میں اتنی جلدی نہ کیجیے۔ اس کا یہ ترجمہ نہیں ہے کہ اس کا بیج خراب ہو گیا تو یہ ختم ہو گیا۔ خآب تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کا مفہوم ان عربوں سے پوچھیے۔ پتہ نہیں یہ قوم بلا تھی۔ ان کے ہاں مشہور تھا' ہمیں بھی یہ پڑھایا جاتا تھا اور پھر یہ حقیقت بھی تھی کہ پہلے زمانے میں آگ جلانے کے لیے ماچس نہیں ہوتی تھی' ایک چقماق جسے پتھر کہتے ہیں وہ ہوتا تھا۔ اس پتھر سے دوسرے پتھر کو رگڑا کرتے تھے تو یہ کہتے تھے کہ اس چقماق سے چنگاری نکلتی ہے۔ میں Scientifically (سائنسی انداز میں) عرض کرونگا کہ یہ بات ہی کچھ اور تھی۔ بہر حال یہ چلا آ رہا تھا کہ چقماق کے اندر آگ ہوتی ہے اور اس میں سے چنگاری نکلتی ہے۔ چقماق جب ناقص ہو جاتا تھا تو اس کو یہ کہتے تھے کہ اس کے اندر وہ حرارت اور آگ تو ہے لیکن اس میں سے چنگاری باہر نہیں آتی تو ایسی صورت میں جس کے اندر وہ حرارت تو ہو لیکن حرارت کی نمود نہ ہو سکے' عربی زبان میں اسے **خـآب** کہتے ہیں۔ کہا کہ جس بیج کے اوپر مٹی کا اتنا بڑا ڈلا آ جائے کہ بیج کے اندر وہ صلاحیت تو ہو مگر پھر اس کی نمود نہ ہو وہ صلاحیت دبی کی دبی رہ جائے' باہر نہ آئے۔ یہ ''خاب'' ہے۔ اسی لیے کہا کہ **خَـابَ مَـنْ دَسّٰـهَـا** (91:10)۔ جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور اُبھرنے نہ دیا' اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلۂ زندگی افسردہ ہو گیا۔ اس کی انسانی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ گئیں۔ وہ اس چقماق کی طرح ہو گیا جس میں آتش افروزی کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔ اور اس کے برعکس جو لوگ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی متاعِ گراں بہا لے کر اپنے نشو ونما دینے والے کے حضور جائیں گے تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے بلند مدارج ہوں گے۔ ان کے رہنے کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔ **ذٰلِکَ جَـزٰٓؤُا مَـنْ تَـزَكّٰـی** (20:76)۔ یہ صرف اس کا صلہ ہو گا جس نے اپنی ذات کی نشو ونما کر لی۔ اس طرح کہا کہ ہم اس مادی زندگی کو' اس اقتدار کو' اس سلطنت کو' اور اس مملکت کو' قابلِ نفرت نہیں سمجھتے۔ انسانی ذات کی نشو ونما کے لیے یہ بڑا ضروری ہے لیکن اتنا ہی ہے کہ اس سے اتنا ہی کام لیا جائے جس سے اس کی

---

[1] اتنا پانی دے دیا' اس کھیتی کو اتنا پانی دے دیا کہ وہ بیج ہی گل سڑ گیا۔ اِن سب کے بیج ہی گلے ہوئے ہوتے ہیں پھر آپ کو معلوم ہے کہ ان گلے سڑے بیجوں میں بد بو ہی آیا کرتی ہے۔

نمود ہو جائے اور ڈلے کی طرح' مادی تودے کی طرح' اوپر سے دبا کے نہ بیٹھ جائے۔ لہٰذا اے فرعون! تیری ذات کی یہی کیفیت ہوئی ہے' یہ دبی کی دبی رہ گئی ہے۔

انسانی ذات کی صلاحیتوں کی عظمتوں کی بلندی

ہم نے اپنی ذات سے اتنا ہی کام لینا ہے کہ اس کی نشو ونما کرنی ہے۔ اس کا نتیجہ جنّت ہے۔ یہاں وہی ایک پودے کی تشبیہ دی ہے جس سے باغات بنیں گے۔ باغات کھل کھلا کے ہنسیں گے' ان میں زندگی اور شادابیوں کی بہاریں آئیں گی۔ ان کی یہ کیفیت ہوگی کہ نیچے سے پانی رواں ہوگا اور یہ باغ ہر موسم میں پھل دے گا۔ انسانی ذات کے اس پیڑ کے لیے ہم نے یہ کچھ کیا ہے۔

عزیزانِ من! اس کے بعد قرآن اگلا Chapter (باب) لے آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم' بنی اسرائیل' کی تعلیم وتربیت پر لگے رہے اور پھر ہم نے وقت مقررہ پر **وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِىْ** (20:77)۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات مصر سے نکل جاؤ۔ اس طرح پھر وہ وقت آ گیا جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اب تم اپنی قوم کو یہاں سے باہر لے چلو۔ اس سلسلہ میں ہمارے ہاں عصا کا وہی قصہ زیادہ عام ہے کہ عصا کو سمندر پہ مارنے اور سمندر کے پھٹ جانے کے بعد بیچ میں سے چلا جانے کے متعلق ہے۔ اب یہاں اگلی آیات میں اسی کا ذکر ہے۔

عزیزانِ من! اس چیز کو بیان کرنے سے پہلے ایک بات درمیان میں رہ گئی۔ ایمان تو آپ نے دیکھ لیا کہ سامنے پھانسی' صلیب' سولی ہے' اتنا بڑا عذاب' اتنی بڑی سزا ہے فرعون جیسے کی دھمکی ہے۔ یہ سب کچھ سامنے ہے لیکن وہ ہیں کہ تبسم کناں ہیں کہ تُو کیا ہے۔ ایک یہ ایمان ہے' ایک یہ ذات تھی جس میں یہ خوبی تھی۔ اس کے مقابلے میں ایک ایمان فرعون کا بھی ہے۔ آپ حیران ہونگے کہ میں فرعون اور ایمان کی بات کر رہا ہوں۔

فرعون کے ایمان پر قرآن حکیم کا تبصرہ

عزیزانِ من! جی! فرعون اور ایمان کی بات ہے۔ قرآن نے اسے بھی محفوظ کر لیا ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہ اس لیے ہے کہ

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا ❶

کیا بات ہے اس کی تشبیہات کی! یہ جو Contrast (چیزوں کا مقابلہ تضاد سے کرنا) ہوتا ہے' اس سے یہ جلوہ بہت زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اگر آپ نے زیادہ روشنی لینی ہوتی ہے تو آپ اس کے پیچھے وہ ٹین کا Cover (ڈھکنا) رکھتے ہیں۔ اس سے روشنی Reflect

---

❶ مرزا اسد اللہ خان غالب: دیوان غالب' جہانگیر بک ڈپو لاہور' 2002' ص۔ 59

(منعکس) ہوکر آتی ہے۔ قرآنِ کریم اپنے اندر یہ انداز بھی رکھتا ہے اور بڑا موثر انداز ہوتا ہے۔ Contrast (مقابلۂ تضاد) سے یہ چیز اُبھر کر نمایاں ہو جاتی ہے۔ پہلے رات کی تاریکیوں کو اندھیریوں کو اس طرح بیان کیا جائے کہ خوف آنے لگ جائے۔ پھر اس میں سے سورج کی پہلی کرن جب آتی ہے تو پھر پوچھیے نہیں کہ وہ کس قدر تابندہ تر ہوتی ہے۔ ایک طرف قرآن نے ساحرین کا یہ ایمان بتایا اور دوسری طرف فرعون کا ایمان بھی بتایا تاکہ Contrast (تقابل) سے اصل چیز تو سامنے آ جائے۔ آگے چل کے میں عرض کرونگا۔ یہاں صرف وہ واقعہ عرض کرتا ہوں کہ جب فرعون اس سمندر میں ڈوبنے لگا حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (10:90)۔ جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے، موت سامنے آ کے کھڑی ہوگئی ہے، قرآنِ کریم کہتا ہے کہ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (10:90)۔ فرعون پکار اٹھا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا کسی کا اقتدار نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں۔ اِلٰــہ بس وہی ایک ہے، میں بھی ان میں ہوتا ہوں جو اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ یوں کہیے کہ اس نے پکار کر کہا کہ میں ایمان لایا ربِ موسیٰ پر۔ ٹھیک ہے اگر یہاں ہم یا آپ ہوتے یا مولوی صاحب ہوتے تو گلے سے لگا لیتے۔ کہتے کہ سبحان اللہ، دیکھیں مرتے وقت کلمہ نصیب ہو گیا، جی! تف ہے اس اقرار پر، اس ایمان پر!

فٹے منہ تیرا[1]

عزیزانِ من! ہمارے مروجہ اسلام میں ہماری انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ مرتے وقت کلمہ نصیب ہو۔ اوناں نوں ساری زندگی بےشک نہ ہووے، مردے ہوئے ہووے۔[2] مرتے وقت کسی کو کلمہ نصیب ہوا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ وہ فرعون تھا۔ ٹھیک ہے مرنے سے کچھ وقت پہلے کلمہ نصیب ہو، تاکہ مہلت کا وقفہ پورا ہونے سے پہلے انسان کو عمل کا وقت مل جائے اور تخریبی اعمال کے ضرر رساں نتائج سے بچنے کے لیے وہ عمل کر سکے۔ اب کلمہ تو نصیب ہو گیا لیکن اُدھر ہم یا آپ یا ہمارے مولوی صاحب تو کھڑے ہوئے نہیں تھے کہ سبحان اللہ کہتے۔ وہاں تو خدا ہے۔ فرعون نے ایمان لانے کا کہا ہے اُدھر سے جواب آیا: فٹے منہ تیرا۔ جواب ملا: آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (10:90)۔ ہاں! اب تُو ایمان لایا حالانکہ پہلے تُو برابر نافرمانی کرتا رہا اور تُو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا۔

کم بخت موت کے ڈر سے ایمان لا رہا ہے۔ لعنت تیرے اس ایمان کے اوپر! قرآن نے اس کا یہ ایمان، اس کے منہ پہ دے

---

[1] تف ہے تجھ پر

[2] بےشک انہیں ساری زندگی کلمہ نصیب نہ ہو، مگر مرتے وقت ضرور نصیب ہو۔

مارا۔ عزیزانِ من! قرآن نے اس قسم کے ایمان کے متعلق یہ کچھ کہہ رکھا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ وہ جو میں نے کہا ہے کہ اسلام مذہب کے لیے ایک چیلنج ہے۔ میری تو ایک کتاب کا نام ہی Islam: A Challenge to Religion ہے۔ Religion (مذہب) کی دنیا کسی کی بھی ہو' وہ عیسائیت ہو' ہندو دھرم ہو' کچھ بھی ہو' اس میں ہر ایک Appreciate تحسین کرتا ہے کہ ٹھیک ہے بھئی! آخری وقت ہی سہی' ایمان تو لے آیا۔ لیکن یہ تو خدا ہے' یہ خدا کا دین ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ کمبخت! تُو ایمان لایا جب مہلت کا وقفہ ختم ہو چکا۔ اس کے لیے دلیل ہے۔ اسے آپ توبہ کہیں گے۔ تُو پہلی روش سے ہٹ گیا' اب دوسری روش کا اقرار کیا۔ قرآن تنہا ''توبہ'' کو تو کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اسے تو وہ کہتا ہے کہ اس توبہ کے بعد کچھ کرنا ہے۔ اس ''کچھ کرنے'' کے لیے شرطیں لازم ہیں۔ ان کے بغیر دمِ واپسیں ❶ ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔

قرآنِ حکیم ایمان کو عمل سے مشروط کرتا ہے

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ اس کی کیا شرطیں لازم تھیں؟ میں اس کے متعلق سمجھایا کرتا ہوں کہ عرب اپنے ہاں توبہ کا لفظ ان معنی میں استعمال کرتے تھے کہ دوراہے (Cross- Roads) پہ آ کے آپ کا قدم غلط راستے پر اٹھ گیا اور آپ غلط راستے پہ چل پڑے۔ کچھ دُور جا کر خود محسوس ہوا' سنگِ میل کو دیکھا' کسی چلنے والے سے پوچھا' کسی طرح سے یہ محسوس ہو گیا کہ یہ راستہ غلط تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اسے صحیح راستے پہ چلنے کی واقعی خواہش' تڑپ اور تجسس ہے تو پہلا کام یہ کرے کہ وہ وہاں سے واپس اسی چوراہے پہ' اسی دوراہے پہ آئے' جہاں سے غلط قدم اٹھا تھا۔ یہ جو وہاں سے یہاں واپس آنا ہے اسے عرب توبہ کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ واپس یہاں دوراہے پہ پہنچ کے کیا وہ اپنے گاؤں واپس پہنچ گیا' اپنی منزل پہ پہنچ گیا جہاں اس نے جانا تھا؟ کہا کہ نہیں پہنچا۔ اس کے بعد اب وہ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ (20:75) صحیح راستے کے اوپر چلے' پھر یہ پہنچے گا۔ یہ دوسری شرط ہے۔ پہلی شرط واپس دوارہے پر آنا' جہاں سے قدم غلط سمت رکھا تھا۔ سارے قرآن میں یہ دو چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر یہ وہاں یا ادھر دوراہے پر نہیں چلے گا تو پھر یہاں کھڑے ہو جانا کچھ معنی نہیں رکھتا۔ ''یا اللہ! میری توبہ' یا اللہ! میری توبہ'' کے کچھ معنی نہیں۔ یہ تو بہر حال اتنا بھی نہیں ہے کہ واپس لَوٹ کے وہاں آ جائے۔ اسی راستے پر چلتا جائے' تسبیح پھیرتا جائے ''یا اللہ! میری توبہ کہتا جائے۔'' یہ سب بے کار ہے۔ بے شک وہ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّىْ مِنْ كُلِّ ذَنْۢبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ کی تسبیح کرے۔ پھر کہے کہ شام نوں تھک تھکا کے میں نے تسبیح پھیری سی اج۔ ❷

---

❶ دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے ۔ عزیزو! اب تو اللہ ہی اللہ ہے۔

❷ میں نے آج شام کو تھک ہار کر یہ تسبیح کی تھی۔

اور تصور یہ ہوا کہ اللہ بخش رہا ہے۔ تے پھیر ٹھیک ہے تینوں پنڈ بَچا لے گا۔ ❶ عزیزانِ من! ایسا نہیں ہے انسان جس منزل پہ بھی پہنچے گا تو وہاں اس کے لیے عمل صالح کی پہلی شرط ہوگی اور اگر کیفیت یہ ہو' اسے توبہ ہی کہہ لیجیے گا' کہ جب اس کے بعد چلنے کی' عمل کرنے کی' نہ ہمت رہی' نہ وقت رہا اور نہ گنجائش رہی ہو اور موت سر پر کھڑی ہو تو اس وقت کی توبہ کا فائدہ کیا ہوا؟ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اس کی توبہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! منزل پہ پہنچنے کے لیے عملِ صالح شرط ہے اور اگر کیفیت یہ ہو کہ اسے توبہ ہی کہہ لیجیے کہ یہ ایسے وقت میں کی کہ اس کے بعد چلنے کی نہ ہمت رہی' نہ وقت رہا' نہ گنجائش رہی' موت آ گئی تو اس توبہ کا کیا فائدہ ہوا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ توبہ اس کی نہیں ہے جو پلٹ کے' اس دوراہے' پہ آ کے مر جائے' اس کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ توبہ اسی کی ہے جس کے پاس اتنا وقت ہو کہ جو اس نے وہاں نقصان اٹھایا ہے' غلط راستے پہ چلنے سے' صحیح راستے پہ چل کے اس کی تلافی کر لے' توبہ اس کی ہے۔ اور اس اعتبار سے قرآن نے یہ کہا ہے کہ فرعون نے تو موت کو دیکھ کے یہ کہا۔ ایسے وقت میں اگر کوئی شخص اپنی اس چیز سے توبہ کرے کہ پھر عملِ صالح کے لیے وقت ہی نہ ہو تو کہا کہ اس کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے۔ قرآن یہ بتا رہا ہے کہ اس دلیل کے تابع بھی یہ توبہ بے معنی چیز تھی' لیکن جو پھٹکار پڑی ہے وہ یہ ہے کہ موت کو دیکھ کر یہ تمہاری توبہ ہو رہی ہے!

ساحرین کے ایمان لانے میں اور فرعون کے ایمان لانے میں یہی فرق تھا

عزیزانِ من! یہاں یہ دونوں ہی چیزیں آ گئیں۔ ایک تو یہ کہ توبہ کی کیفیت یہ ہے کہ ہیئت کو دیکھ کر نہیں' بلکہ موت کو دیکھ کر توبہ کی جا رہی ہے۔ اکراہ کی رو سے' جبر کی رو سے' لایا ہوا ایمان' ایمان ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے ایسے وقت توبہ کرنا کہ وہ مر رہا ہے' اس کے بعد فرصت ہی نہیں' گنجائش ہی نہیں' وقت ہی نہیں ہے کہ اپنے ان نقصانات کی تلافی کر سکے جو پہلی غلط روش کے نتیجے میں مرتب ہوئے تھے۔ اس لیے بھی یہ توبہ نہیں تھی لیکن قرآن نے جو کہا ہے وہ ان دونوں کا تقابل ہے۔ کہا کہ دیکھو! ایک یہ ساحرین تھے' جو گرجتے' بپھرتے ہوئے فرعون کے سامنے تھے۔ ایک ایمان اِن کا تھا اور اس کے باوجود مسکرا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تُو اور تیرا یہ عذاب کیا شے ہے؟ یہ جرأت ہے۔ ایک ایمان اس شخص کا ہے جو زندگی بھر اتنا بڑا مستبد رہا اور جب موت سامنے آئی تو وہ اتنا بودا اور اس قدر بزدل نکلا کہ پکار اٹھا: میں ایمان لایا اے موسیٰ! تیرے رب پر۔

ہٹلر جیسے ڈکٹیٹر کا انجام

عزیزانِ من! قرآن یہ کہتا ہے کہ معبودانِ باطل بڑے بزدل ہوتے ہیں۔ ہر دور کے یہ مستبد حاکم' یہ ڈکٹیٹرز' بڑے ہی بودے ہوتے ہیں۔ ان کی تو ساری قوت دوسروں کے سہارے پہ ہوتی ہے۔ کتنا بڑا تھا وہ ہٹلر (1945-1889) ❶ کہ جب کہیں ریڈیو پر اس کی تقریر آیا کرتی تھی تو دنیا دہل جاتی تھی۔ ابھی اس زمانے میں ٹی وی نہیں آیا تھا۔ تو واقعی در و دیوار ہل جایا کرتے تھے۔ یہ اس کی کیفیت تھی اور اُس نے دنیا کی بڑی بڑی غالب اقوام کو تھرتھرا دیا تھا۔ نظر آتا تھا کہ اس شخص کی اتنی بڑی فوجی طاقت ہے لیکن کیفیت یہ ہے کہ جب یہ نظر آیا کہ چاروں طرف سے موت آرہی ہے تو بزدلی کا یہ عالم رہا کہ اس نے خودکشی ❷ کر لی۔

بزدل آدمی صرف موت سے ہی نہیں ڈرتا' وہ تو زندگی سے بھی ڈرتا ہے

عزیزانِ من! میں بیچ میں اپنی بات نہیں لاتا۔ یہاں پچھلی کنونشن میں میری بچی نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس بچی کو صحت دے' زندگی دے' وہ بچی عجیب چیزیں کہہ جاتی تھی۔ اس بچی کا ایک فقرہ یہ تھا' غالباً یہ بات یقینِ محکم کے متعلق تھی۔ اور یقینِ محکم کے متعلق اس

---

❶ تو پھر ٹھیک ہے۔ تجھے اہلِ گاؤں بچا لیں گے۔

❷ Hitler, Adolf (1889 - 1945) was an Austrian-born founder of the German Nazi Party and Chancellor of the Third Reich (1933-45). Hitler served in the German Army in World War I. He joined the German Workers' Party and by 1921 had gained the leadership of it, renaming it the National Socialist German Workers' Party. He was arrested after the "beer hall putsch" in Munich in 1923, and spent some months in prison where he wrote the major part of ***Mein Kampf***. By 1930 he had built the Nazi Party into the second largest party in Germany. He Lost the 1932 presidential election to Hindenburg, but a few months later the Nazis won most seats at a general election and in January 1933, Hitler was appointed Chancellor. He brought every German institit.ion under the totalitarian control of the Nazi Party. In September, 1939, Hitler's troops invaded Poland, causing the outbreak of World War II. By the spring of 1945 Germany faced defeat. On April 29, Hitler married his mistress, Eva Braun, and the next day they committed suicide. (Reader's Digest, 1990, P. 723).

کے خطاب کا آخری فقرہ یہ تھا کہ ''خودکشی کرنے والے کے متعلق میں یہ تو نہیں بتا سکتی کہ وہ موت سے ڈرتا ہے یا نہیں لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ زندگی سے ضرور ڈرتا ہے۔'' عزیزانِ من! ضعفِ خودی والا تو زندگی سے قدم قدم پہ ڈر رہا ہوتا ہے۔ ہٹلر کو اگر زندگی سے ڈر نہ ہوتا، خودکشی نہ کرتا، فرعون کو اگر زندگی سے ڈر نہ ہوتا تو وہ اس طرح سے یہ کچھ نہ کہتا۔

عزیزانِ من! سورۃ طٰہٰ کی آیت 76 تک ہم آ گئے اور اس کے بعد وہ واقعہ آئے گا جب یہ سمندر کے کنارے پہنچے ہیں اور بقول ہمارے ہاں کے عام یقین کے وہ سمندر پھاڑ دیا اور یہ گزر گئے۔ اگلے درس میں سنیئے گا کہ قرآنِ کریم اس واقعے کے متعلق کیا کہتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

آٹھواں باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 77 تا 82)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا
تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿77﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا
غَشِيَهُمْ ﴿78﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿79﴾ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ
وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ﴿80﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ
هَوٰى ﴿81﴾ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿82﴾

عزیزانِ من! آج مئی 1976 کی 23 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 77 سے ہو رہا ہے: (20:77)۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کشمکش حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ ہم اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں ان کا ساحرین سے مناظرہ ہوا۔ جب وہاں کے مندر کے ان پروہتوں نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے پیش کردہ دلائل و براہین پر غور کیا تو وہ ان کے مسلک اور دین کی صداقت کے قائل ہو گئے اور انہوں نے وہیں اپنے ایمان لانے کا اعلان کر دیا۔ اس پہ فرعون' جس انداز سے بھڑک اٹھا' وہ آیات پچھلے درس میں ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ یہ سلسلہ وہاں ختم ہوا اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم' بنی اسرائیل' کی تعلیم و تربیت میں لگ گئے۔ اب یہاں سے اگلی کڑی ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا کہ: **وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا** (20:77)۔ (پھر وقت مقررہ پر) ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات (مصر سے) نکل جاؤ اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جاؤ جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ [1]

---

[1] بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے ابتدا ہی میں یہودیوں کی طرف سے تورات کا جو نیا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے' اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحیرۂ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اُس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا۔ اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت سے اُسے Sea of Reeds کہتے ہیں۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع تھا۔ حوالے کے لیے ملاحظہ ہو:
Announcement made by Mr. Lisser Zussman E xecutive Director of the Jewish Publications Society of America, Daily Telegraph, September 1962.

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سینا کے صحراؤں کی طرف سفر

ہم نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اب بنی اسرائیل کو راتوں رات یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔ یہ ہے وہ جسے بنی اسرائیل کی ہجرت کہیں گے۔ یہ مصر سے سینا ❶ کے صحراؤں کی طرف ان کا انتقالِ مکانی ہے۔ اور یہاں مروجہ مفہوم میں پھر وہی ہمارے سامنے عصائے موسوی آتا ہے اور وہی اس کی اعجاز فرمائیاں آتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اِضۡرِبۡ بِّعَصَاکَ الۡحَجَرَ (2:60)۔ اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اپنے عصا سے سمندر کو مارا اور اسی بنیاد پہ یہاں کہا جاتا ہے کہ وہ سمندر دو حصوں میں بٹ جائے گا اور درمیان میں سے جو راستہ نکلے گا اس میں سے تم بنی اسرائیل کو لے کے پار ہو جاؤ' چنانچہ وہ اس طرح سے انہیں لے کر دوسری سمت چلے گئے اور پیچھے سے فرعون اور اس کے لشکر آئے۔ انہوں نے بھی دیکھا کہ راستہ خشک ہے۔ وہ بھی اس میں آئے اور جونہی اندر آئے' پانی چڑھ گیا اور غرق ہو گئے۔ یہاں پھر جو کچھ کرایا جا رہا ہے وہ اس عصا سے ہی کرایا جا رہا ہے یعنی ذہن اِدھر ہی منتقل ہوتا ہے کہ اس عصا کے اندر کوئی چیز تھی' ورنہ یہاں تو بہت آسان تھا کہ جب تم جاؤ گے تو ہم سمندر سے کہیں گے کہ راستہ دیدو اور اس طرح سمندر پھٹ جائے گا اور راستہ مل جائے گا' وہاں سے تم گزر جانا۔ سیدھی بات تھی لیکن نہ خدا کی طرف سے یہ ہے کہ ہم یہ کچھ کہہ دیں گے' نہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے ہے کہ تم سمندر کے کنارے کھڑے ہو جاؤ اور کہو کہ میرے اللہ کے حکم سے پھٹ جاؤ' وہ پھٹ جائے۔ نہیں' ایسا نہیں کہا گیا بلکہ مروجہ مفہوم کے مطابق کہا جاتا ہے کہ تم وہ عصا مارو۔ پہلے بھی تو اس میدان میں جتنا کچھ آپ کے سامنے آیا ہے' اس عصا نے ہی کیا ہے' یہاں بھی وہی عصا آتا ہے اور اِسی سے سب کچھ کرایا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اس قسم کے مقامات بڑے غور طلب ہوتے ہیں۔ یہاں کھڑے ہو کر' رک کر' سوچنا چاہیے کہ عصا کا لفظ کیوں کہا گیا۔

لفظ عصا کا مفہوم

عزیزانِ من! عربی زبان میں عصا کے معنی لاٹھی ہی کے نہیں بلکہ جماعت کے بھی ہیں۔ عصا (لاٹھی) کو عصا اس لیے کہتے ہیں کہ اِسے انگلیاں مجتمع کر کے' مضبوطی سے پکڑا جاتا ہے۔ ❷ عصا کے یہ معنی آپ پچھلے درس میں بھی سن چکے ہیں کہ اس کے معنی جماعت کے ہیں' گروہ کے ہیں۔ عربی زبان میں ضرب کے بنیادی معنی تو مارنے کے ہوتے ہیں لیکن یہ لفظ بڑے ہی متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان معنی میں ان کے ہاں ایک معنی ''چلنا یا سفر کرنا'' بھی آتے ہیں۔ مثلاً ضَرَبَ فِی الۡاَرۡضِ کے معنی ہوتا ہے: ''سفر

---

❶ ملاحظہ کیجیے: Reader's Digest Universal Dictoinary, 1990. P.1420

❷ تاج العروس اور امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن''۔

کرنا۔"❶ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ و ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ متعدد مقامات میں آیا ہے۔ ان کے ہاں یہ عام معنوں میں "سفر کرنے" کے لیے بولا جاتا تھا' اور پھر جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ زبان کے اعتبار سے تو پوچھیے نہیں کہ وہ قوم کیا تھی۔ بات بڑی صحیح ہے کہ یہ راستہ چلنے میں پاؤں سے راستے کو "مارتے" ہیں۔ ہمارے ہاں بھی جو"پامال کرنا" ہے وہ یہی تو ہے جو ضرب کا ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ فارسی والوں نے کیا ہے' یہ عجمی ذرا نازک مزاج ہوتے تھے۔ انہوں نے راستے کو اوندھنا ہی کہا' آہستہ خرام بلکہ "مخرام"❷۔ تو یہ جوان کی آہستہ خرامی تھی' اس کی وجہ سے انہوں نے راستے کے لیے پامالی ہی کہا اور وہ تو عرب تھے' اس لیے انہوں نے راستے کے متعلق لفظ "ضرب" ہی بولا ہے۔

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ عربی زبان میں ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ راستہ طے کرنے کے لیے بولتے تھے۔ یہ تو عجیب قوم تھی۔ ان کے ہاں خود راستے کے لیے "طریق" کا لفظ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ لفظ طریق کا مادہ "طرق" ہے اور اس کے بنیادی معنی بھی کسی چیز کو کھٹکھٹانا ہے' تھپتھپانا ہے اور اس طرح انہوں نے پھر ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ سے "سفر کرنا" مراد لیا ہے۔

لفظ طریق اور طارق کے معنی

عربوں نے طریق سے بھی یہ مراد لی ہے کہ وہ پاؤں سے اس کو تھپتھپاتے ہیں' کھٹکھٹاتے ہیں۔ اِس کھٹکھٹانے کی جہت سے طارق کا لفظ ہے۔ طارق ان کے ہاں "اس مہمان کو کہا جاتا تھا جو بغیر اطلاع کے رات کے کسی حصے میں آئے اور باہر آ کے دستک دے۔" اس دستک کے اعتبار سے اس مہمان کے لیے لفظ طارق تھا❸ اور یہیں سے یہ بات سامنے آ گئی کہ یہ جو صبح کا ستارہ نمودار ہوتا ہے یہ اُسے طارق کہتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ یہ آ کر صبح کو دستک دیتا ہے کہ جاگو' باہر نکلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ صاحب! یہ عرب عجیب قوم تھی۔ میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ ان کے ہاں عربی زبان میں ضَرَبَ فِي الْاَرْضِ کے معنی ہیں: "سفر کرنا" اس اعتبار سے اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (2:60) کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی جماعت کو لے کر سمندر کی طرف جاؤ' اپنی جماعت کے ساتھ سمندر کی طرف چل نکل۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! میں یہاں قرآنِ کریم کے سمجھنے کے طریق کی ایک بڑی اہم بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ جہاں بھی آئیں' ان سے یونہی آگے نہیں بڑھ جانا چاہیے۔ اگر آپ اس پہ غور کریں گے تو آپ کو وہاں سے غور کرنے کے لیے اس کے معنی

---

❶ تاج العروس' محیط المحیط اور لین کا انگریزی لغت (An Arabic-English Lexicon)

❷ بہت ہی نرم رفتار

❸ محبّ الدین' ابن الفیض' السید محمد مرتضیٰ الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی کی مشہور تالیف تاج العروس۔

کا سراغ مل جائے گا۔ مثلاً آپ دیکھیے کہ مجھے کہاں سے یہ Clue (اتا پتا' سراغ) ملا' کہاں سے سراغ ملا کہ کھڑے ہو کے بات سوچو۔ سورۃ الشعرا میں (26:60-62) میں یہی ذکر چلا آ رہا ہے۔ وہاں یہ کہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کو لے کے نکلے' آگے سمندر تھا اور پیچھے سے فرعون کا لشکر چلا آ رہا تھا۔ بنی اسرائیل گھبرا اٹھے: فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (26:61)۔ جب فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ لو! ہم پھنس گئے۔ سامنے پانی ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اب ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں۔ یہ چلا اٹھے کہ مارے گئے' ہم پکڑے گئے' دبوچ لیے گئے' آگے سمندر کا پانی ہے' پیچھے فرعون کا لشکر آ گیا ہے اور درمیان میں ہم گِر گئے ہیں۔ وہ چلا اٹھے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ قَالَ كَلَّا (26:62)۔ گھبراؤ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا' ایسا قطعاً نہیں ہوگا کہ تم دھر لیے جاؤ۔ كَلَّا عزیزانِ من! عجیب لفظ ہوتا ہے۔ یہ ''ہرگز ایسا نہیں ہوگا' قطعاً ایسا نہیں ہوگا'' کے معنوں میں آتا ہے۔ پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (26:62)۔ جس خدا (نے مجھے اس طرح مصر سے نکلنے کا حکم دیا تھا' وہ اب بھی) میرے ساتھ ہے' میں تنہا نہیں ہوں' میرے ساتھ میرا خدا بھی ہے۔ بہت اچھا ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ چلتے ہیں۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا خود ہی وہ سمندر پھاڑ دے گا' وہاں سے نکل جائیں گے؟ یہ لفظ ہے جہاں پہ کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ کہا کہ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (26:62)۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے گا؟ سَيَهْدِيْنِ (26:62) وہ مجھے ضرور کوئی ایسا راستہ بتا دے گا جس سے ہم بلا خوف وخطر اپنی منزل تک جا پہنچیں۔ وہ ضرور کوئی ایسا راستہ ہمیں بتائے گا جہاں سے ہم حفاظت سے چلے جائیں۔ یہ ہے وہ خاص نکتہ جس پہ کھڑے ہو کر سوچنا پڑتا ہے۔

خاص راستے کی ضرورت کے لیے اس کی تلاش کیوں؟

عزیزانِ من! اگر اس سمندر کو معجزانہ طور پہ ہی پھٹ کے راستہ دینا تھا تو کسی خاص راستے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ تم سمندر کے کنارے چلے چلو' میرا رب میرے ساتھ ہے' وہ سمندر کو پھاڑ دے گا' راستہ نکل آئے گا۔ لیکن نہیں' سَيَهْدِيْنِ کہا ہے کہ وہ یقیناً مجھے سلامتی کی راہ دکھائے گا۔ عزیزانِ من! غور کیجیے! صبر واستقلال' سکون وطمانیت' اعتماد علی اللہ کے کیسے محکم قلعے ہیں جن کے اندر حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو محفوظ ومصئون پاتے ہیں۔ قوموں کی قیادت کے لیے انہی جوہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ خدا کی معیت کرتی کیا ہے۔ کہا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے۔

رب ساتھ ہو کر کیا کرتا ہے؟ وہ اس قسم کی کرشمے سازیاں نہیں کرتا کہ سمندر کو پھاڑ کر معجزانہ طور پر راستہ بنا دے۔ عزیزانِ من! سَيَهْدِيْنِ (26:62)۔ وہ راستہ دکھاتا ہے۔ یہاں بات تو کسی راستہ دکھانے کی ہے۔ وہ راستہ کونسا تھا جو خدا نے اس وقت دکھایا جب حضرت موسیٰ نے کہا کہ سَيَهْدِيْنِ (26:62)۔ وہ یقیناً مجھے کوئی ایسا راستہ دکھا دے گا جس سے ہم بلا خوف وخطر اپنی منزل تک جا پہنچیں

گے۔قرآن کا تو انداز ہی یہ ہے کہ یہ خود دوسرے مقامات پر اس کی تشریح کرے گا کہ راستہ کونسا دکھایا تھا۔ذرا راستے کی بات کے لیے آج کے جغرافیے کو بھی ذہن میں لے آیئے' اگرچہ وہ اس دَور سے ذرا مختلف ہو گیا ہے۔مصر سے صحرائے سینا کی طرف' راستے میں' بحیرہ قلزم یا بحرِ احمر Red Sea پڑتا ہے۔یہ بحرِ احمر (Red Sea)' بحر ہند سے الگ ہو کر' عرب اور مصر کو' دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا' بحرِ روم کی طرف بڑھتا جا رہا ہے حتیٰ کہ اخیر میں پہنچ کر یہ بحرِ احمر دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔بائیں طرف کی شاخ جو ذرا بڑی ہے' آج نہر سویز کے ذریعہ بحر روم سے ملا دی گئی ہے لیکن حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں نہر سویز موجود نہ تھی یعنی یوں سمجھو کہ آج Red Sea بحر احمر یا بحر قلزم کے اگلے سرے کو نہر سویز کے ذریعے بحیرہ روم سے ملا دیا گیا ہے جہاں سے سیدھے بحری جہاز آتے جاتے ہیں۔اس زمانے میں یہ بحرِ روم سے ملا ہوا نہیں تھا۔یہ نہر سویز [1] تو حال ہی کی نکالی ہوئی ہے۔یہ بحیرۂ قلزم یا بحرِ احمر وہیں تک جاتا تھا' وہاں بھی یہ پورے کا پورا سیدھا سمندر میں نہیں جاتا تھا۔آگے جا کے یہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔اب بھی وہ دو شاخیں ہیں اگر آپ بحر روم کی طرف رخ کیے ہوئے ہوں تو بائیں ہاتھ کی طرف جو شاخ ہوگی' آپ سوچیے وہ مصر کے ساحل کی طرف ہوگی اور دائیں ہاتھ کی شاخ سینا کی طرف ہوگی' جہاں آج یہ فلسطین اور بنی اسرائیل وغیرہ ہیں۔یہ انہی دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی وادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔بحرِ احمر کا یہ حصہ آج ایک بحر عمیق ہے لیکن دنیا میں مرورِ زمانہ سے' جو جغرافیائی تغیر و تبدل پیدا ہو رہے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔خشکیاں پانی میں اور پانی خشکی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ابتدائی ادوار میں یہ تبدیلیاں بہت زیادہ واقع ہوا کرتی تھیں۔بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق بحر احمر زمانۂ قدیم میں متعدد جزیروں سے پٹا ہوا تھا۔

عزیزانِ من! آپ یہ ذہن میں رکھیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بحیرہ قلزم کی اُس شاخ سے مصر کی طرف سے آئے تو آگے یہ دوسری شاخ پڑتی تھی۔درمیان میں اور آخری حصہ میں پہنچ کے وہاں سمندر نہیں تھا' خشکی آ گئی ہوئی تھی۔اول تو یہ کہ سمندر ہی بحیرہ قلزم جیسا تھا۔اس کی بھی شاخ چھوٹی سی تھی پھر آگے جا کے تو خشکی مل گئی۔سمندر کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کراچی میں جا کے اس چیز کا پتہ چلا۔مدوجزر یا جوار بھاٹا یا جسے آپ tide کہتے ہیں' وہ اس کے Beach (ساحل) پہ' کنارے پہ کھڑے ہو کے' آپ دیکھیے تو آپ کو پتہ چلے گا حالانکہ وہاں سمندر اتنا زیادہ طوفانی نہیں ہوتا' اس میں زیادہ جوش نہیں ہوتا' یہ بڑا خاموش سا ہوتا ہے' وہ سکوت میں ہوتا ہے' اس حالت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہاں مد آتا ہے تو پانی چڑھتا ہے۔یہ پانی چڑھتا جاتا ہے اور پھر جب اترتا ہے تو وہ نیچے سے خشک زمین نظر آتی ہے۔قرآن نے دوسری جگہ رَهْــوًا (44:24) کہا ہے اس سے یہ حقیقت ابھر آتی ہے۔کیا بات ہے ان عربوں کی! یہ تو صحرا کے رہنے والے تھے' کبھی کبھی جب وہ سمندر جاتے تھے تو یہ کچھ دیکھتے تھے۔انہوں نے مدوجزر کو بھی دیکھا۔انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ

---

[1] یہ نہر 165 کلومیٹر (103 میل) لمبی ہے۔فرانسیسی انجینئر فرڈیننڈ ڈی لیسپس (Ferdinand di Lesseps) نے نہ صرف اس کی پلاننگ کی بلکہ 1859ء سے 1869ء تک اس کی تعمیر کی نگرانی بھی کی۔(Reader's Digest, 1990, P.1513)

زمین کبھی اونچی ہوجاتی ہے۔اور کبھی نیچی ہوجاتی ہے تو یہ جوزمین کا اونچا اور نیچا ہونا تھا' یہ اسے یوں سمجھتے تھے کہ جب پانی آتا ہے تو یہ نیچے چلی جاتی ہے اور پھر جب یہ پانی نیچے ہوجاتا ہے تو یہ اُبھر آتی ہے۔ یہ اس طرح پانی کا اوپر جانا اور پھر نیچے چلے جانا تھا اور اس طرح پانی کے جانے کے باعث خشک زمین کا اُبھر کے سامنے آنا ہے۔اسے یہ لوگ رَهْـوًا کہتے تھے۔اس کا مادہ ''رھو'' ہے۔اس طرح رھواً کا لفظ قابلِ غور ہے۔اس کے ایک معنی ہوئے ہیں ''پُرسکون یعنی جب سمندر کا جوش باقی نہ رہے اور وہ پُرسکون ہوجائے'' اور دوسرے معنی ہیں ''وہ جگہ جہاں سے سمندر پیچھے ہٹ جائے اور اس طرح وہ خشک راستہ ہوجائے۔'' یہ دونوں صورتیں سمندر میں مدوجزر کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔

مدوجزر کی طرف راہنمائی

عزیزانِ من! اب جو خدا نے یہ راستہ دکھایا ہے اس کے متعلق موسیٰ سے کہا کہ فَاَسْـرِ بِـعِبَادِیْ لَیْـلًا (44:23)۔رات کے وقت ان کو لے کر نکل جا۔ اِنَّـكُـمْ مُّتَّبَـعُـوْنَ (44:23)۔تیرے پیچھے یہ لوگ آئیں گے لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وَاتْـرُكِ الْبَـحْـرَ رَهْوًا (44:24)۔جب تم سمندر کے کنارے پہنچو گے تو اس کا پانی پیچھے ہٹا ہوا ہوگا۔یعنی کہا کہ وہاں جاؤ' جہاں سمندر کی رھوا کی کیفیت ہے اور یہی وہ الفاظ یہاں آئے جو آیت زیر نظر ہے۔فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا (44:23)۔ ان کو اس راستے پر لے چل جہاں وہ سمندر یَبَسًا ہے۔وہاں لفظ رھواً تھا۔اب یہاں لفظ ''یبساً'' ہے۔اس تصریف آیٰت سے ''یبساً'' کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے یعنی سمندر کی وہ جگہ جو خشک ہوچکی ہو۔آپ کو معلوم ہے کہ ''یابس'' کے معنی ''خشک ہونا'' ہوتا ہے۔عزیزانِ من! پھر دیکھیے اس زبان کی کیفیت! جو چیز شروع سے خشک ہو یہ اسے ''یابس'' نہیں کہتے ''یبس'' نہیں کہتے۔''یبس'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کبھی تر اور پھر خشک ہوگئی ہو۔یہ وہی رھواً ہے جس پر عزیزانِ من! قرآن نے بار بار زور دیا ہے اور بار بار میں دہراتا ہوں۔یہ عربی زبان ہے؛ آپ عربی مبین میں جائیے تو تصریفِ آیات کی رو سے قرآن بول اٹھے گا۔یہاں کہا تھا کہ سَيَهْـدِيْنِ (26:62)۔میرا رب تمہیں راستہ دکھائے گا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد ہوا کہ اور آگے بڑھ جاؤ اور بنی اسرائیل کو اس طرف لے جاؤ جہاں جوار بھاٹے کی' مدوجزر کی' کیفیت ہے۔کبھی وہ ''تر'' ہوتا ہے' کبھی ''خشک'' ہوتا ہے' کبھی وہاں پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہے' کبھی اتار ہوتا ہے۔ یہاں (20:77) اور (44:24) سے مترشح ہوتا ہے کہ اس سمندر میں کسی مقام پر خشک راستہ نکلنے کا بھی امکان تھا یا اس راستہ کا سراغ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بذریعہ وحی منکشف ہوا تھا۔دراصل جب پانی اترا ہوا ہو تو وہاں درمیان میں اتنی سی تو جگہ تھی۔کہا کہ اس وقت انہیں وہاں سے لے کر نکل جاؤ جب پانی اترا ہوا ہو۔اس کے بعد جب فرعون کے لشکر آئے تو وہ یہ سمجھ کے کہ خشکی ہے' یہاں سے تو وہ سامنے پار گئے ہیں' وہ سامنے نظر بھی آرہے تھے۔قرآن کہتا ہے کہ سامنے کنارے پر پورا ٹیلے کا ٹیلا ان کا نظر آرہا تھا۔اس کے لیے دیکھیے يَبَسًا اور رَهْـوًا کا مفہوم تو انہوں نے کہا کہ ہم بھی اسی طرف جائیں گے۔وہ نیچے اترے تو اتنے میں وہ جیسا کہ انگریزی میں کہتے ہیں Time and tide wait for none (وقت اور ''وقت کا دھارا'' کسی کا انتظار نہیں کرتے۔) کہ یہ مدوجزر بھی کسی کا انتظار نہیں کیا

کرتا۔ تو وہ جونہی سمندر میں اترے ہیں' پانی کے اوپر چڑھنے کا وقت آ گیا' وہ غرق ہو گئے۔

سمندر کے پھٹنے کا قصہ تورات کا ہے' قرآن کا نہیں ہے

عزیزانِ من! یہ جو سمندر کے پھٹنے کا قصہ تھا' یہ تورات میں تھا' اور یہیں سے ہمارے ہاں چلا آ رہا ہے۔ بہرحال' جب سے تورات مرتب ہوئی ہے' اس وقت سے اس میں یہی قصہ چلا آ رہا تھا۔ قرآنِ کریم نے وہاں یہ چیز کہی ہے کہ یہ سمندر کا پھٹنا نہیں تھا بلکہ وہ تو ایک خشک راستہ تھا' جہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے گئے تھے اور یہ راستہ پانی کے اترنے سے نکل آیا تھا۔

تورات کا موجودہ ایڈیشن کیا کہتا ہے؟

عزیزانِ من! یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ انتہائی مختصر الفاظ میں قرآنِ کریم نے اصل حقائق پر سے پردہ اٹھا دیا۔ تورات کا اب جو Latest Edition (جدید ترین ایڈیشن) امریکہ سے شائع ہوا ہے' اسے چند ہی سال[1] ہوئے ہیں۔ اس میں انہوں نے ترجمہ بھی بدلا ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ اس کے نیچے نوٹ یہ دیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل سمیت بحیرہ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنی قوم کو اس مقام سے پار لے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا۔ اور وہاں بہت سا سرکنڈا اگا ہوا تھا۔ سرکنڈا تو سمندر کے اندر نہیں اگتا۔ وہ اس کے اس کنارے پہ اگتا ہے جہاں پانی آئے جائے۔ تو انہوں نے یہ لکھا ہے کہ اسے Red Sea نہیں بلکہ اس سرکنڈے کی نسبت سے اسے Sea of Reeds کہتے ہیں یعنی سرکنڈے والا سمندر۔ یہ مقام موجودہ نہر سویز کے قریب واقع ہوا تھا۔ انہوں نے اب تورات میں یہ لکھ دیا ہے کہ اب تحقیقِ جدیدہ نے یہ بتایا ہے کہ یہ جو Red Sea itself (خود بحرِ احمر) تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے اندر سے نہیں گئے تھے بلکہ اس کی اس شاخ کے کنارے سے اس مقام سے گئے تھے جسے اب Sea of Reeds (سرکنڈے کا سمندر) کہا جاتا ہے۔ وہاں کچھ دلدل نما سی زمین تو تھی' اس وقت سمندر والا پانی نہیں تھا' یہ وہاں سے لے کر پار گئے تھے۔ اب تورات میں انہوں نے اس چیز کی ترمیم کی ہے۔ یہ اعلان' امریکہ کی جیونش پبلیکیشنز سوسائٹی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسٹر لیسر زوسمان (Lisser Zussman) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس تحقیق کی رو سے قرآن کی بیان کردہ تفصیل اور بھی زیادہ قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے چودہ سو سال پیشتر یہ کہا تھا' جب دنیا میں کسی نے بھی یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ تو رَهْوًا اور يَبَسًا کا طریق تھا' مدوجزر کا طریق تھا' جس سے وہ لے کے گئے تھے۔

لیکن ہم ابھی تک بدستور وہیں کھڑے ہیں

عزیزانِ من! حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے تو اپنے ہاں وہ ترمیم کر لی لیکن آپ کے ہاں بدستور وہی کچھ کہا جا رہا ہے۔ یہ

---

[1] یہودیوں کی طرف سے تورات کا یہ ایڈیشن 1962 میں شائع ہوا ہے۔ (پرویزؒ' برقِ طور' 1993' ص: 91)۔

کیوں ہے؟ وہ تو تحقیق کے قائل ہیں، غور و فکر کے قائل ہیں، نئی نئی باتیں لے آتے ہیں لیکن آپ کے ہاں تو متقدمین جو لکھ چکے ہیں ان سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنا بھی کفر ہے۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ متقدمین کے جغرافیے میں، جو ان کے ہاں پڑھایا جاتا تھا، ''تین ہی [1] برِاعظم تھے۔ اس زمانے میں آسٹریلیا اور امریکہ ابھی دریافت نہیں ہوا تھا۔ آج تک وہاں تین ہی برِاعظموں والا جغرافیہ چلا جارہا ہے۔ او کہو بابا! یہ تو پانچ [2] ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، یہ تو نہیں ہوسکتا، ایسا کہنا تو متقدمین کے طریق کے خلاف ہوگا۔ یا للعجب۔ عزیزانِ من! ٹھیک ہے جی! کہ انہوں نے تورات میں ترمیم کرلی ہے۔ یہ انہوں نے اپنی Independently (آزاد، بے لاگ) تحقیق کی ہوگی مگر میں کہتا ہوں کہ یہاں آپ کے ہاں تو چودہ سو سال پیشتر سے قرآن حکیم کے اندر یہ کچھ لکھا ہوا موجود ہے مگر متقدمین ہی کو تسلیم کیا جارہا ہے کیونکہ وہ یہ کچھ لکھ گئے ہیں۔

ہم آج بھی قرآن کے بیان کردہ حقائق کی بجائے امام طبری کی تفسیر کو ہی قبول کیے ہوئے ہیں

عزیزانِ من! اب چونکہ متقدمین میں امامِ طبری [3] (310ھ-244ھ) اہمیت کے حامل ہیں اور بقول ان کے وہ قرآن کی جو تفسیر کر گئے ہیں وہ حرفِ آخر ہے۔ چونکہ امامِ طبری نے لکھا ہوا ہے کہ سمندر پہ عصا مارا، سمندر پھٹ گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو وہاں سے لے گئے، اب ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔ بھئی! قرآن میں یہ لکھا ہے۔ کہنے لگے کہ ٹھیک لکھا ہے، سوٹا مارا تھا تو زمین خشک ہوگئی قرآن نے یہی لکھا ہے اور کیا لکھا ہے، ٹھیک ہے جی! اور پھر یہاں تفسیر میں تو پوچھیے نہیں، جو وہاں زیبِ داستان کے لیے

---

[1] آج دنیا کے سات براعظم ہیں اور آبادی کے لحاظ سے ذیل میں دیئے گئے جدول میں لکھے گئے ہیں:

نمبر شمار	نام براعظم	آبادی کے لحاظ سے نمبر	نوٹ: اوشینیا میں حسب ذیل ملک
1	ایشیا	ا۔ 60. 68%	شامل ہیں:
2	افریقہ	۳۔ 12.42%	ا۔ آسٹریلیا
3	شمالی امریکہ	۵۔ 5.12%	۲۔ پاپوآ نیوگنی
4	جنوبی امریکہ	۴۔ 8.40%	۳۔ نیوزی لینڈ
5	انٹارٹکا	۷۔ Nil	۴۔ جزائر مارشل
6	یورپ	۲۔ 12.98%	۵۔ فی جی
7	اوشینیا	۶۔ 50%	۶۔ کیری بتی

[2] یہ 1976ء کی بات ہے۔

[3] ان کا پورا نام ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہے۔ یہ طبرستان کے تھے۔ (حوالہ: حضرت علامہ تمنا عمادی و دیگر علمائے کرام: امام زہری (حدیث و سیرت کے مدون) و امام طبری (تفسیر و تاریخ کے مدونِ اول) تصویر کا دوسرا رخ، کراچی، ص۔۳۱۳)۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (زیرِ نگرانی)۔ مطالب الفرقان فی دروس القرآن، سورہ بنی اسرائیل، 2004، ص۔269

لکھ دیا گیا ہے اور متقدمین کا یہ کچھ لکھنا بڑی چیز ہوتی ہے۔ اس میں لکھا یہ ہے کہ فرعون کا لشکر کنارے پہ آ گیا تو وہ گھوڑوں کو بڑھا رہے تھے اور Horse Sense (گھوڑے کی حسِ لطیف) تو آپ کو معلوم ہے۔ گھوڑے کی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ فرعون کا گھوڑا آ گے نہ بڑھتا تھا' رک گیا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا ہوگا کہ خطرہ ہے تو سمندر کو پھاڑ دینا' ان کو پار لیجانا' اور انہیں غرق کرانے کی یہ ساری اسکیم ہی فیل ہو رہی تھی۔ فرعون کا گھوڑا اِن سب سے بھی کاریگر نکلا' وہ آ گے نہیں بڑھ رہا تھا۔ لہٰذا گھوڑے پر جبریل علیہ السلام سوار ہو کے آئے اور انہوں نے اپنا گھوڑا آ گے بڑھا دیا اور گھوڑوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اگر اگلا گھوڑا آ گے بڑھے تو اس کے پیچھے پیچھے ان کے گھوڑے بھی چلے اور پیچھے سے حضرتِ میکائیل ان کو چابکوں سے ہانک رہے تھے۔ چلو' جی! یوں انہیں یہ جبریل اور ان کا گھوڑا یا گھوڑی' جو آ گے گئی' لے گئے۔ اس سے بھی بڑا ایک معجزہ سرزد ہوا لیکن وہ چار آیتیں آ گے جا کے آتا ہے۔ ابھی نہیں بتانا چاہتا۔ آپ جانتے ہیں کہ اگر وہ پہلے ہی بتا دیا تو وہ پرچہ پہلے سے آؤٹ ہو جائے گا تو اس میں لطف نہیں ہوگا۔ مجھے آج تک یاد ہے مگر میں مولانا حضرت صاحب کا نام نہیں لوں گا۔ وہ دلی میں اپنے وعظ میں بہت زیادہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے وہاں حالی کی مسدس [1] کا وہ مشہور شعر پڑھا کہ:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

تو انہوں نے شعر میں پڑھا: یہ پہلا سبَق تھا کتابِ ہدیٰ کا

مولانا اسلم جیراجپوری ساتھ چلے آ رہے تھے۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ مولانا! شعر نہ پڑھا کریں' اگر پڑھا کریں تو صحیح شعر پڑھا کریں۔ آپ تو عربی بھی جانتے ہیں' آپ نے شعر میں سَبَقْ کو سُبَقْ پڑھا ہے تو آپ شعر نہ پڑھا کریں۔ ساتھ ہی ایک دوسرے مولانا صاحب بھی تھے۔ کہنے لگے: جی نہیں' شعر تو پڑھنے چاہئیں' ان سے ''لُطف'' بڑھ جاتا ہے۔ اس پر مولانا اسلمؒ نے کہا کہ جی پھر دونوں مل کے پڑھا کریں۔ مولانا اسلم جیراج پوریؒ کی بڑی شگفتہ طبیعت تھی۔ اسی لیے کہا کہ مل کے پڑھا کریں کیونکہ اِن سے ''لُطف'' بڑھ جاتا ہے۔ جی ہاں' لطف نہیں بلکہ لُطَف۔ یا للعجب! تو میں نے کہا تھا کہ میں وہ بات آ گے چل کے عرض کرونگا' یہاں کہنے سے وہ

---

[1] الطاف حسین حالی (1914-1837) کے کلام کا سب سے عمدہ نمونہ 'مسدس مدو جزر اسلام' ہے' جس میں مسلمانوں کے ماضی اور حال کا جائزہ ایسے دلی درد اور سچے جذبۂ محبت سے لیا ہے کہ یہ نظم شائع ہوتے ہی تمام ملک میں مقبول ہوگئی اور آج تک اس کی مقبولیت برقرار ہے۔ خود سر سید احمد خاں (1898 -1817) نے جن کی تحریک پر حالی نے یہ مسدس لکھا تھا' اس کو اپنے لیے ذریعۂ نجات قرار دیا ہے۔ اس بند کے چھ مصرعے یوں ہیں:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتۂ وِلا کا
یہی ہے عبادت' یہی دین و ایماں — کہ کام آئے دنیا میں' انساں کے انساں (مسدس حالی' ص:52)

''لُطف'' باقی نہیں رہتا۔ یہ سنا ہے تو ایک بات اور بھی سنتے جائیے۔ کیا مقامات ہیں یہ! لیکن یہ یاد رہے کہ قرآن حکیم کے متعلق ہمارا بھی صدیوں سے یہی انداز ہے۔

حضور ﷺ کی زبانی اپنے ساتھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے صاحب کے لفظ کا استعمال

عزیزانِ من! قرآن کریم تو ذرا ذرا سی بات میں بھی موتی بکھیر جاتا ہے۔ سلسلۂ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ جب بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معیت میں راتوں رات مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور پوچھٹے فرعون کا لشکر ان کے تعاقب میں چل نکلا۔ فریقین نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا کہ لو! ہم پھنس گئے۔ اب ہمارے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: گھبراؤ نہیں: **كَلَّا** (26:62)۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا کیونکہ **اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ** (26:62)۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ یہاں ''معی'' واحد متکلم کا صیغہ ہے یعنی میرے ساتھ میرا رب ہے' ان کا نام نہیں لیا۔ قرآن میں ایک جگہ اور بھی ''رب کا ساتھ ہونا'' آیا ہے۔ سورۃ توبہ میں (9:40) وہ غار کا مقام ہے ❶ جہاں ہجرت کے سفر میں حضورِ نبی اکرم ﷺ (570-632) اور وہ' جنہیں قرآن نے ان کا **لِصَاحِبِهٖ** کہہ کر پکارا ہے' ساتھ ہیں۔ یہ حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (571-634 A.D) ہیں۔ وہاں کیفیت کچھ ایسی ہوئی کہ باہر سے کچھ پاؤں کی آہٹ آئی' اس ساتھی کی پیشانی پر کچھ پریشانی کے آثار نمودار ہوئے' اپنے لیے نہیں' اس ساتھی ﷺ کی حفاظت کے لیے جو کائنات میں انسانیت کی عزیز ترین متاع ہے۔ عزیزانِ من! میں یہ چیز محض عقیدت کی بناء پہ نہیں کہتا۔ قرآن نے کہا ہوا ہے کہ اگر نبی تمہیں اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو تو تم مومن نہیں ہوسکتے۔ یہ مومن تھے انہیں نبی اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس حالت میں اس کے ساتھ صرف اس کا ایک رفیق تھا۔ اس رفیق کی پیشانی پر کچھ گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ متردد دکھائی دیا کہ مبادا رسول کو کوئی گزند پہنچے۔ اس وقت **اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ** (9:40) وہ دونوں اپنی حفاظت کے لیے غار ❶ میں چھپے بیٹھے تھے۔ غور فرمائیے' قرآن کہتا ہے کہ

---

❶ قریش نے جب دیکھا کہ اسلام مدینہ میں قوت پکڑتا جارہا ہے اور ان کے لیے ایک زندہ خطرہ بن رہا ہے تو انہوں نے دارالندوہ میں ایک اجلاسِ عام کیا۔ جس میں ہر قبیلہ کے رؤسا شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ کسی نے کہا کہ حضورؐ کو قید کر دیا جائے۔ کسی نے کہا کہ جلاوطن کر دینا کافی ہوگا۔ ابوجہل نے کہا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک شخص منتخب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر حضورؐ کو قتل کر دے۔ اس صورت میں آپؐ کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور بنو ہاشم کے لیے سارے قریش کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی۔ نبی اکرمؐ کو مخالفین کے ان اداروں کا علم ہو چکا تھا۔ آپ نے بمشاورت حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے سامان مکمل کر لیے۔ دوسری طرف مخالفین بھی اپنی قرارداد کے مطابق اس فکر میں تھے کہ موقعہ پا کر آپ کا (معاذ اللہ) خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی حضور کو یقیناً اس کا علم ہوگا۔ بالآخر ایک بات طے پا گئی کہ آپ مکہ کو چھوڑ دیں۔ شب ہجرت میں کچھ رات گئے حضورؐ اللہ کی حفاظت پر کامل یقین رکھتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ حسب تجویز حضرت ابوبکرؓ بھی آپ سے مل گئے۔ صبح قریش نے دیکھا کہ حضورؐ گھر میں نہیں ہیں۔ انہوں نے حضرت علیؑ جنہیں آپؐ امانتیں واپس کرنے کے لیے چھوڑ گئے تھے' کو کچھ وقت ستایا لیکن پھر چھوڑ دیا [باقی اگلے صفحے پر]

اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ (9:40) اس نے' اس سے' دل کے پورے اطمینان سے کہا۔ عزیزانِ من! رسول نے اپنے ''صاحب'' سے کہا۔ یہاں لفظ ہے: لصاحبہٖ کیا بات ہے لفظ ''صاحب'' کی! خدا کی وحی ہے' رسول کی زبان سے اس ساتھی کے لیے ''لصاحبہٖ'' کا لفظ آ رہا ہے۔ کیا مقام ہے ان لوگوں کا صاحب! لصاحبہ کا یہ لفظ عربی زبان کے اندر بھی ہمیشہ بڑے اور بزرگ کے لیے آتا ہے۔ آج بھی ہماری زبان میں ''صاحب'' کا یہ لفظ انہی معنوں میں آتا ہے۔ آپ یہ جانتے ہیں' خیر قرآنِ کریم نے انہیں لصاحبہٖ کہا ہے۔

یارِ غار کے متعلق مَعِیَ کے لفظ کی بجائے معنا کا استعمال

عزیزانِ من! صورت حال یوں ہے کہ بظاہر بے یار و مددگار ہیں۔ ہجرت کے اس سفر میں اس کے ساتھ صرف اُس کا ایک رفیق ہے۔ دونوں ہی اپنی حفاظت کے لیے غار میں ہیں اور دشمن تعاقب میں ہے۔ ایسے عالم میں بھی اسے خدا کی نصرت پر ایسا محکم یقین ہے

[گزشتہ سے پیوستہ] اور حضور کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہ 27 صفر 13 نبوت (مطابق 12 ستمبر 621ء) کا واقعہ ہے کہ مکہ سے دائیں جانب تین چار میل کے فاصلے پر' پہاڑ کی چوٹی کے اوپر ایک غار ہے (جسے غارِ ثور کہتے ہیں) حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ صبح سے پہلے پہلے اُس غار میں جا چھپے۔ دشمن تعاقب کو نکلے تو اُسی طرف ہو لیے حتیٰ کہ وہ اتنے قریب آ گئے کہ ان کے پاؤں کی آہٹ غار میں سنائی دیتی تھی۔
تین شب و روز حضورؐ نے اپنے ''یارِ غار'' کے ساتھ یہیں بسر کیے۔ چوتھی شب حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے سواری کو اونٹنیاں آ گئیں اور آپ آگے روانہ ہو گئے۔ قریش نے حضورؐ کی گرفتاری پر سو اونٹ کا انعام مشتہر کر رکھا تھا۔ بریدہ اسلمی' ایک قبیلہ کا سردار' اس انعام کے لالچ میں حضورؐ کی تلاش میں نکلا۔ حضورؐ کو راہ میں پا لیا۔ جب سامنے آیا اور ہم کلام ہوا تو اثر و جذب کا ایک تیر تھا جو سیدھا دل تک اتر گیا اور اپنی قوم کے ستر (70) آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا۔ جوشِ مسرت سے اپنی سفید پگڑی نیزہ پر باندھ کر اس کاروانِ رشد و سعادت کے آگے آگے چل پڑا۔ اس طرح رواں دواں' نور و نکہت کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لیے یہ قافلۂ جذب و سرور مدینہ کی طرف بڑھتا گیا اور 8 ربیع الاول 13 نبوت (مطابق 23 ستمبر 621ء) کی صبح مدینہ کے قریب جا پہنچا۔ مشتاقین کی جماعت حسبِ معمول انتظار کے بعد واپس لوٹ چکی تھی۔ ایک یہودی نے دور سے دیکھا تو قرائن و آثار سے معلوم کر لیا کہ یہ وہی قافلہ ہے جس کے انتظار میں اتنے دنوں سے انصار کی آنکھیں فرشِ راہ بن رہی تھیں۔ اس نے آواز دی کہ ''اہلِ عرب! لو جس کا تم انتظار کر رہے تھے وہ آ گیا۔'' مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر انصار کے کچھ خاندان آباد تھے' اس بستی کو قباء کہتے ہیں' حضورؐ یہاں پہنچے۔ یہاں سب سے پہلا کام مسجد کا تعمیر کرنا تھا۔ یہی مسجد قباء ہے۔ چودہ دن کے بعد آپ شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں بنی سالم کے محلّہ میں جمعہ کی نماز ادا فرمائی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں جوشِ مسرت میں دف بجاتیں اور یہ استقبالیہ نغمہ گاتی تھیں کہ

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا مَا دَعَی اللّٰہِ دَاعٍ

خلوص و محبت کے ان روح پرور نظاروں میں یہ کاروانِ حسن و خوبی یثرب کی بستی میں داخل ہوا جس کا نام' اس کے بعد مدینۃ النبی ہو گیا۔ ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھیں حضورؐ کی میزبانی کی سعادت کس کے نصیب ہوتی ہے۔ یہ شرف حضرت ایوب انصاری کے مقدر میں تھا جہاں اب مسجد نبوی ہے۔ حضرت ایوبؓ کا مکان اس سے متصل تھا' آپ وہیں فروکش ہو گئے۔ یہ ہے شب ہجرت کا وہ واقعہ اور یہ ہیں وہ ''یارِ غار'' جنہیں قرآنِ کریم نے آپ ''لصاحبہٖ'' کہہ کر پکارا ہے۔ [ماخوذ از پرویزؒ معراجِ انسانیت' 1949' ص ص۔ 376-372)

کہ جب اس کا رفیق اس خیال سے کہ رسول کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے' متردد دکھائی دیتا ہے تو اس سے دل کے پورے اطمینان سے کہتا ہے کہ **لَا تَحْزَنْ** (9:40)۔ غمگین مت ہو' پریشان مت ہو۔ اِسے میں دہرادوں کہ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ **اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ** (26:62)۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے' اور یہاں کہا کہ **لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** (9:40)۔ خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ وہاں کہا تھا کہ میرا خدا اکیلا میرے ساتھ ہے کیونکہ ابھی ان کا ایمان ایسا نہیں تھا جو خدا ان کا بھی ساتھی ہوتا' وہاں اکیلے موسیٰ ؑ ہی کا ساتھی تھا۔ یہاں معی کا لفظ یعنی صرف میرے ساتھ آیا ہے۔ یہاں وہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کی زبان میں کہہ رہیں۔ **مَعِیَ** نہیں کہا بلکہ **مَعَنَا** (9:40) کہا ہے یعنی کہا کہ خدا ہمارے دونوں کے ساتھ ہے۔ عزیزانِ من! سعادت ساتھ دے تو قرآن پڑھا کیجیے۔ یہاں کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** (9:40)۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے اور حضرت موسیٰ ؑ سے کہا کہ **فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ** (20:77)۔ انہیں سمندر کے اُس حصے سے پار لے جا' جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ یہاں ہم اپنے درس میں اپنی اس آیت پہ آ گئے' جہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **طَرِيْقًا فِى الْبَحْرِ يَبَسًا** (20:77)۔ اپنے ان ساتھیوں کو اُس راستے پر سے لے کر جاؤ جو تمہیں وہاں لے جائے گا جہاں سمندر کا پانی خشک ملے گا' تمہیں جہاں خشک راستہ ملے گا اور وہ راستہ رھوًا کے ذریعے سے خشک ہوگا۔ یاد رکھنا' وہاں جا کے کنارے پہ نہ بیٹھے رہنا' وہاں پانی اتنی سی دیر کے اندر پیچھے ہٹ کے دوبارہ آ جایا کرتا ہے۔ یہ رھواً ہے۔ دوسری جگہ کہا کہ **لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى** (20:77)۔ اس طرح نہ تجھے تعاقب کرنے والوں کی گرفت کا خدشہ ہوگا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا خوف۔

بنی اسرائیل کو نعمتوں کی یاد دہانی

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ بنی اسرائیل راتوں رات نکلے' قومِ فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔ ایسے میں بنی اسرائیل کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سمندر ہے۔ ذرا اندازہ لگایئے اس حالت کا کہ پیچھے فرعون اور اس کا لشکر جرار' تباہیوں کا ایک ہجوم اپنے ساتھ لیے امڈے چلا آ رہا ہے' سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور ان کے درمیان بنی اسرائیل کی قوم! تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا تھا کہ **اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ** (26:61)۔ ہم یقیناً پکڑے گئے' ہم گرفت میں آ گئے۔ کہا: نہیں **وَّلَا تَخْشٰى** (20:77)۔ تمہیں نہ تو ان کی گرفت کا کوئی غم کرنا چاہیے اور **وَلَا تَخٰفُ دَرَكًا** (20:77)۔ اور نہ ہی ڈوبنے کا اندیشہ ہونا چاہیے۔ دونوں خطروں کے متعلق ممنونیت کا اعلان کر دیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ مصر سے نکل گئے تو **فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ** (20:78)۔ فرعون نے اپنے لشکروں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا لیکن سمندر کے پانی کا ریلا ان پر چھا گیا اور انہیں غرق کر دیا۔ کیا عجیب نقشہ ہے کہ فرعون آگے گیا۔ کیا بات ہے! پانی نے انہیں ڈھانپ لیا جیسے پانی ڈھانپا کرتا ہے۔ یہ کوئی خارق عادت بات نہیں ہے۔ **وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى** (20:79)۔ ساری عمر یہ شخص' یہ سربراہ' یہ لیڈر' اپنی قوم کو غلط راستوں پہ ہی ڈالتا رہا۔ اب بھی غلط ہی راستے پہ ڈال دیا۔

عزیزانِ من! یہاں پھر نبی اکرم ﷺ کے زمانے کے یہود کو مخاطب کیا: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ عَدُوِّکُمْ (20:80)۔ بنی اسرائیل! تم دیکھو تو سہی' کس قدر ہماری نعمتوں نے تمہیں سرفراز کیا تھا: اتنے بڑے دشمن سے کس طرح تمہیں نجات ملی ہے۔ وَ وٰعَدْنٰکُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ (20:80)۔ اور طور کی دائیں جانب (موسیٰ پر وحی کی تھی' جس میں) تمہارے لیے مستقبل کی کامرانیوں کے وعدے تھے۔ اسے یوں کہیے کہ وہاں سے ہم تمہیں طور کے اس دامن میں لے گئے جو بڑی بابرکت زمین تھی' یمن وسعادت والی تھی' امن وسکون والی تھی۔ اس طرح ہم تمہیں وہاں لے گئے۔ قرآن نے اس قسم کے دشمن کے فولادی پنجۂ استبداد سے رہائی کو بھی خدا کی نعمت قرار دیا ہے۔ یہ صرف اس کی غلامی اور استبداد کے پنجے سے چھوٹنا' رہا ہونا' ہی ہے۔ یہ ''حصہ لا'' ہی ہے۔

پاکستان کی شکل میں آزادی کی نعمت

عزیزانِ من! غلامی اور استبداد کے پنجے سے رہائی صرف اسلام کے نظامِ حیات کا ''حصہ لا'' ہے۔ حقیقت میں یہ ابھی خدا کی وہی نعمت ہے' وہی بخشائش ہے' وہی نوازش ہے' جو آج سے ستائیس اٹھائیس سال پہلے [1] ہمارے حال پہ بھی اس نے فرمائی تھی۔ بنی اسرائیل کو فرعون جیسی ایک مستبد قوم کے پنجہ استبداد سے نجات ملی تھی۔ عزیزانِ من! فرعون جیسی استبدادی قوت اور سلب ونہب سے نجات نہیں تھی۔ یہ تو ہندوؤں جیسی تنافر وتناقض آگیں [2] اور کینہ پرور فطرت رکھنے والی قوم بھارت کے ہندوؤں کی سازش کے پنجے سے' بہ حفاظت چھڑا کے یہاں لانا تھا۔ یہ بھی ''حصہ لا'' تھا۔ قرآن نے اسے نعمتِ خداوندی قرار دیا ہے۔ اس لیے کہا کہ اَنْجَیْنٰکُمْ مِّنْ عَدُوِّکُمْ (20:80)۔ تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دلائی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہے؟ کہا: لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ یہ محض اس لیے ہے کہ وہاں تمہارے لیے اس کا امکان نہیں تھا کہ تم بتا سکتے کہ ہم کیسے کام کر سکتے ہیں۔ جب اس کے لیے کہا جاتا ہے تو تم کہتے ہو کہ ہم تو غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ان کے محکوم ہیں' ان کے ماتحت ہیں۔ جیسا یہ حکم دیتے ہیں' ہم کرتے ہیں' ہمیں امکان ہی نہیں ہے اس لیے ہم اس طرح سے قوم کو آزادیاں دلا دیا کرتے ہیں تاکہ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ دیکھیں کہ تم کیا کام کرتے ہو' کیسے کام کرتے ہو۔ وہاں تو برٹش انڈیا کے دورِ حکومت میں ہر وقت وہ عذر ہوتا ہے کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔ قید کی کوٹھڑی میں بند' قیدی سے اگر یہ کہا جائے کہ میاں! تم یہ کام کیوں نہیں کرتے' وہ کام کیوں نہیں کرتے' وہ کہے گا کہ کیا کہہ رہے ہو صاحب! اس قید کی حالت میں میرے پاس وہ امکانی صلاحیت اور اس کام کے کرنے کا وہ امکان کہاں ہے کہ میں یہ کروں اور وہ کروں۔

---

[1] 1947ء میں

[2] نفرت اور توڑ جوڑ سے بھری ہوئی

قدرت نے ہمارے عذر کو' ہماری مشکل کو' حل کر دیا

عزیزانِ من! قدرت نے ہمیں اِس قید سے رہا کرا کے' باہر نکال کے' خطۂ پاکستان دے کر' کہہ دیا کہ لو بھئی! وہ عذر تو اب ختم ہوا۔ تم پھر وہ کچھ کر کے دکھاؤ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں جو اس طرح دشمن سے نجات ملتی ہے تو اس میں اس قوم کی اپنی کوئی کاریگری نہیں ہوتی' وہ تو کسی صاحبِ ضربِ کلیم کی معرکہ آرائیاں ہوتی ہیں جس کے صدقے میں یہ ہو جاتا ہے۔ میں بلاتمثیل عرض کرونگا کہ یہاں نبوت کا سوال نہیں ہے' قوموں کو اس قسم کے رہنما مل جاتے ہیں' جو اپنی قوم کو دشمن سے نجات دلا دیتے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938 - 1877) اور قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح (1948 - 1876) نے یہی کام کیا تھا۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں مودودیؒ کا کردار

عزیزانِ من! بات سے بات نکل آتی ہے' اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ اس پاکستان میں اب کیا ہو رہا ہے' یہ کوئی قصہ پارینہ نہیں ہے' یہ کوئی دس ہزار سال پہلے کا قصہ نہیں ہے' ابھی کل کی بات ہے۔ پاکستان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ خود پاکستان اور ہندوستان کے اندر ابھی صدہا نہیں' ہزارہا نہیں بلکہ لاکھوں لوگ زندہ موجود ہیں جو اس تحریک کے اندر تھے۔ سیدھی سی بات ہے کہ یہ بندۂ درویش خود اس تحریک میں شامل تھا۔ اور ان میں سے جو اس وقت میرے اس مجمع کے اندر بیٹھے ہیں' ایسے لوگ موجود ہیں' جنھوں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ یہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہاں جماعت اسلامی کے رہبر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1978-1903) نے تحریک پاکستان کی سخت ترین مخالفت کی تھی۔ ان کی تحریریں موجود ہیں۔ ❶ پہلے دن سے اقبالؒ نے جداگانہ مملکت کا تصور دیا تو انہوں نے مخالفت کی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مسلمانوں کو الگ مملکت ملتی ہے یا وہ ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے اندر ایسی قوم جذب ہو جائے تو ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سب کی سب تحریریں اب ان کی کتاب ''سیاسی کشمکش حصہ سوم'' کے اندر موجود ہیں۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کہا یہ تھا کہ صاحب! یہ صرف خطہ زمین کی بات نہیں' یہ صرف مسلمانوں کی الگ مملکت کی بات نہیں' یہ اس خطے میں قرآن کے مطابق مملکت کے قیام کی بات ہے۔ اقبالؒ یہ بات 1930ء سے لے کر دمِ واپسیں تک کہتا گیا۔

---

❶ مطالبۂ پاکستان کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے تھی۔ مثلاً (۱) ان کی مشہور تالیف ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش......حصہ سوم (اور 1941ء ایڈیشن) ص ص: 132-131 (۲) روئداد جماعت اسلامی۔ حصہ پنجم' ص ص: 65,154 (۳) روزنامہ امروز مورخہ یکم دسمبر 1976ء۔ (۴) جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار ''تسنیم''' ۱۶' ۲۰ دسمبر 1955 (۵) ترجمان القرآن کی پہلی پاکستانی اشاعت (بابت جون 1948' ص: 60۔ (۶) ترجمان القرآن اگست 1948۔ یہ چند ایک حوالے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: طلوع اسلام جنوری 1983۔ ص ص: 40-18 اور طلوع اسلام فروری 1983۔ ص ص: 26 - 13 نیز پرویز صاحب کی سالانہ کنونشن 1976ء کا خطاب۔

علامہ اقبال اور قائداعظم کے اعلانات

عزیزانِ من! جب قائدِ اعظمؒ (1876-1948) نے تحریکِ پاکستان کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی تو 1937ء سے 1947ء تک وہ اپنی ہر تقریر و تحریر میں کہتے گئے کہ اس سے مقصد کسی خطہ زمین یا الگ مملکت کا حاصل کرنا نہیں ہے، یہ ایک ایسے خطہ زمین کا حاصل کرنا ہے جہاں ہم قرآن کے مطابق مملکت متشکل کر سکیں۔ سینکڑوں صفحات پر مشتمل ان کی یہ تقریریں اور تحریریں آج بھی موجود ہیں، ❶ پہلے دن سے موجود ہیں، 1940ء کا ریزولیشن موجود ہے۔ یہی مقصد 1941ء میں مدراس میں دہرا گیا۔ قائداعظمؒ کا اتنا بڑا خطبہ صدارت موجود ہے۔ 1930ء کا اقبالؒ کا خطبہ صدارت موجود ہے۔ سب یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ ہم یہ خطہ زمین اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم یہاں قرآن کے مطابق مملکت کی تشکیل کر سکیں۔ لیکن مولانا مودودیؒ (1903-1978) نے اس ''سیاسی کشمکش'' میں شروع سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ یہ ایک ''کافرانہ حکومت'' بنے گی۔ ان کے یہ الفاظ تھے: ''مسلمانوں کی کافرانہ حکومت۔'' انہوں نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ اپنے مضامین میں لکھتے چلے آئے ہیں۔ یہاں پاکستان آنے کے بعد اب کوئی منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ سکتا کہ جو شخص دس سال تک ایسی مخالفت کرتا چلا آئے، اسے ''مسلمانوں کی کافرانہ مملکت'' ❷ کہے، اس سے بڑی مخالفت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہاں بڑی دشواری تھی، کیا کہتے؟ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں آنے کے بعد یہ ڈگڈگی بجائے چلے جا رہے ہیں کہ صاحب! ہم نے تحریک پاکستان کی بالکل مخالفت نہیں کی تھی۔ یا میرے اللہ! یہ کہنا کہ انہوں نے تحریک پاکستان کی بالکل مخالفت نہیں کی تھی، سراسر غلط ہے۔ تین سال ادھر کا ذکر ہے کہ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو ❸ (1923-1979) نے کراچی میں ان کی کتاب ''سیاسی کشمکش حصہ سوئم'' سے ان اقتباسات کو پڑھ کے سنا دیا۔ اس میں اب تک یہ چیزیں موجود ہیں۔ اس زمانے میں یہ لکھتے چلے آئے، اتنی سخت مخالفت کرتے چلے آئے۔ آج آپ کہتے ہیں کہ مخالفت نہیں کی تھی۔ مودودیؒ صاحب (1903-1978) نے اب بیان دیا ہے کہ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ابھی اس کا اعلان نہیں ہوا تھا کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی۔ ان کی اسی سیاسی کشمکش کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ مسلم

---

❶ قائداعظمؒ کو قرآن مجید کے ساتھ کس قدر والہانہ وابستگی تھی اور ان کا قرآنی مطالعہ کس قدر گہرا تھا اس کے لیے زیادہ نہیں تو (کم از کم) طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ دو پمفلٹ: قائداعظمؒ اور قرآن مجید اور کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ ملاحظہ کر لیے جائیں۔

❷ ''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام رائج ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے زیادہ قابل لعنت۔'' (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم، ص ص۔ 132 - 131)

❸ یہ وہ دور تھا جب 1973ء کے آئین کے تحت دوبارہ پارلیمانی نظام حکومت لایا گیا اور 14/ اگست 1973 کو ذوالفقار علی بھٹو نے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا (ڈوگر ولی محمد اور شاہد محمود، 2004، ص۔ 15)

لیگ کے کسی لیڈر کی تقریر وتحریر یا کسی ریزولیشن میں آج تک یہ نہیں کہا گیا کہ یہ اسلامی ❶ مملکت بنے گی۔ یہ کچھ اس میں لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو (1928-1979) کی اس تقریر کے جواب میں بیان دیا کہ یہ ٹھیک ہے' یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی 1940ء میں یہ اعلان نہیں ہوا تھا کہ یہ اسلامی مملکت بنے گی۔ دھڑلے سے یہ لکھا جاتا ہے اور یہ بات بڑی معقول نظر آتی ہے کہ ایک تو یہ کہ یہ اس سے پہلے کی بات ہے دوسرا یہ کہ جب وہ ریزولیشن پاس ہوگیا تھا تو پھر ہم نے مخالفت نہیں کی۔ مجلّہ طلوعِ اسلام میں اس کے جواب میں مسلسل لکھا گیا کہ یہ جو آپ نے لکھا ہوا ہے کہ مسلم لیگ کے کسی لیڈر نے یا مسلم لیگ نے آج تک یہ نہیں کہا جسے آج کہتے ہیں کہ یہ 1940ء کے ریزولیشن سے پہلے کی بات ہے یہ ترجمان القرآن فروری اور مارچ 1941ء میں لکھا ہوا ہے' لاہور ریزولیشن کے ایک سال بعد۔ یہ کتاب جس میں یہ کچھ موجود ہے' اس کا پہلا ایڈیشن اگست 1941ء میں شائع ہوا تھا' اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن آج تک شائع ہوتے چلے آرہے ہیں' یہی کچھ اس میں ابھی تک لکھا ہے' اس میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی' 1940ء سے 47ء تک جو آپ کہہ رہے ہیں کہ ریزولیشن پاس ہونے کے گویا بعد مخالفت نہیں کی تھی جب کہ پہلے کی بات تھی' آپ تو مسلسل ہر سال ہر مقام پر یہ دہراتے چلے گئے کہ یہ کافرانہ اور فاسقانہ مملکت ہوگی۔ آپ مسلسل سات آٹھ سال تک یہی دہراتے چلے گئے۔

مودودیؒ کا 1947 میں فرمان

اپریل 1947ء میں جب پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہوگیا تھا' یہ مملکت وجود میں آنے والی تھی' اور تین جون 1947 کو اس کا اعلان بھی ہوگیا تھا' اپریل 1947ء کی غالباً سولہ' سترہ یا 27,26 تاریخ تھی' اُس دن ان کا ایک جلسہ ہوا۔ اس میں مودودیؒ صاحب سے ان کے اپنے ہی لوگوں نے سوال کیا کہ کیا اب ہمیں اس مسلم لیگ کا ساتھ دیدینا چاہیئے' اب تو یہ وجود میں آرہی ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ یہ بات اپریل 1947ء کی ہے۔ عزیزانِ من! جواب دیا کہ جب آپ اور ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ تحریک غیر مسلمانہ ہے' غیر اسلامی ہے' اس میں آپ ہم سے کس طرح توقع کرسکتے ہیں کہ ہم ان کا ساتھ دیں۔ اپریل 1947ء میں چند ہی دنوں یا یوں کہیے کہ چند ہی مہینوں بعد پاکستان وجود میں آرہا ہے۔ پاکستان تو 14 اگست 1947 کو وجود میں آگیا۔ نیشنلسٹ علماء اور وہاں کے تمام کانگرسی

---

❶ یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا کہ: ''افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو (ص 37)...... ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں' سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے (ص 78)...... جن کی عملی زندگی میں اور جن کے خیالات' نظریات' طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم اور 1941 ایڈیشن۔ نیز طلوع اسلام فروری 1983' ص۔ 17)

ممبروں نے حمیت اور غیرت کا ثبوت دیا' وہ وہاں رہے یہاں نہیں آئے کیونکہ وہ مخالفت کر رہے تھے مگر یہ پوری کی پوری جماعت وہاں سے اٹھ کے یہاں چلی آئی۔

جماعت اسلامی کا اگست 1948 کا پرچہ

پاکستان آنے کے بعد جماعت اسلامی کا ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون 1948ء میں شائع ہوا۔ اس مجلّہ میں انہوں نے تحریکِ پاکستان کا پورا جائزہ لیا ہے۔ جائزہ لینے کے بعد یہ کہا کہ یہ داستان ان ''لوگوں کا منہ کالا'' کر دینے کے لیے کافی ہے' جنہوں نے وہاں غیر منقسم پاک و ہند میں دس سال قوم کو تباہ کر دیا۔ ❶ یہاں آنے کے بعد اگست 1948ء میں اسی پرچے کا دوسرا نمبر شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ چیز لکھی کہ یہ آبرو باختہ لیڈر' یہ مداریوں کا ٹولہ' قوم کو تباہ کر کے یہاں لے آیا؛ نہ ہم یہاں کے رہے' نہ ہم وہاں کے رہے۔ ❷ میں نے یہ گزارش کیا ہے کہ 1947ء تک ہندوستان میں ہی نہیں' پاکستان بننے کے بعد بھی' یہ چیزیں موجود ہیں جبکہ اِن کی طرف سے جواب دیا جاتا ہے کہ وہ مخالفت میں نے اس زمانے میں کی تھی جب ابھی 1940ء کا ریزولیشن پاس نہیں ہوا تھا۔ ان پہ تو افسوس نہیں مگر افسوس اس پر ہے کہ ساری جماعت کے اندر کوئی ایک رجلِ رشید بھی نہیں جو اٹھ کے کہہ دے کہ صاحب! اب تو آپ ہم باہر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے' یہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں یا کر رہے ہیں' یہ سب تحریر و تقریر میں موجود ہے۔

جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہے۔ یا للعجب!

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا؟ اگر یاد نہیں تو سن لیں کہ جواب کیا تھا؟ اُن کی طرف سے اس کا جواب یہ تھا کہ ''زندگی کی بعض ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔'' یہ تو واجب ہو گیا تھا یعنی یہ نہیں کہ یہ عبادت ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ شریعت میں فرض کے بعد واجب کا لفظ ہوتا ہے۔ ترکِ وجوب بڑا گناہ ہوتا ہے یعنی اگر ایسے موقع پہ سچ بول دیا جائے تو خدا کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہ دھڑلے سے جھوٹ بولتے رہے۔ یہاں کراچی میں کہہ دیا کہ میں نے یہ اس زمانے میں کیا تھا جب 1940ء کا ریزولیشن پاس نہیں ہوا تھا۔ ان کے ہاں پروپیگنڈے کی مشینری اتنی بڑی ہے اور یہ اتنے زور سے ڈھول

---

❶ اصل الفاظ یوں ہیں جو انہوں نے تحریک پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے تھے: ''یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔'' (ترجمان القرآن بابت جون 1948' ص 60' نیز طلوع اسلام بابت فروری 1983' ص۔ 17)۔

❷ ان کے اصل الفاظ ملاحظہ کریں: ''اس پورے گروہ میں سے ایک کو بھی نہ نکلا جو بازی کھونے کے بعد سر دے سکتا۔ یہ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی تھی' جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔'' طلوع اسلام بابت فروری 1983 نے بھی اپنے ص ص۔ 18-17 پر اسے درج کیا ہے۔

بجاتے ہیں کہ طوطی کی آوازیں تو کوئی سن ہی نہیں پاتا اور پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ ان طوطیوں کو اس طرح Wet - paint (عرق آلود) بنا دیا گیا ہے کہ کوئی ان کی بات سننے ہی نہ پائے۔ اور اب وہ بات ہے جو چلائی جا رہی ہے کہ ہم نے مخالفت نہیں کی۔ یہاں چار ہی دن کی بات ہے کہ انہوں نے' مئی کے شروع میں منعقد ہونے والی وکلاء کانفرنس کے پہلے اجلاس میں بانیانِ پاکستان کے متعلق یہ چیز کہدی کہ وہ تمام کے تمام ایسے ہی تھے یعنی وہ بداخلاق تھے' وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہاں قانونِ شریعت نافذ ہو۔ وہ جوان کا 'سب' کہنے کا انداز ہے' اس پہ ملک میں کچھ لے دے سی ہوئی۔

پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا: اقبالؒ' مودودیؒ اور قائداعظمؒ......ایک نعرہ

عزیزانِ من! اس وکلاء کانفرنس کے تین چار دن کے بعد موجودہ امیر جماعت اسلامی' میاں طفیل محمد صاحب' نے اپنے ہی جلسے میں تقریر کی۔ اس تقریر میں یہ کہا کہ پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا: اقبالؒ' مودودیؒ صاحب' اور قائداعظمؒ۔ ہم نے کہا کہ چلو' تیسرا حصہ ہی سہی' ان بیچاروں کے حصہ میں کچھ تو آیا۔ تشریح ملاحظہ فرمائیے کہ ان دونوں کا حصہ کیا تھا؟ کہا کہ اقبالؒ نے تو صرف یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کی الگ مملکت ہونی چاہیے اور بس! یعنی جیسے اور مملکتیں ہیں ان میں ایک اور مملکت ہونی چاہیے اور یہ کہ انہوں نے اس کے خلاف لکھا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک اس کو کوئی اہمیت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی یہاں الگ مملکت بن جائے یا ہندوؤں کے اندر یہ جذب ہو جائیں۔ لہٰذا اقبالؒ نے تو اتنا ہی کیا ہے۔ جب انہوں نے ڈانٹ دی تو اس کا تو دم نکل گیا۔ وہ تو چلے گئے کہ میں کیا کر بیٹھا۔ اس کے بعد رہ گئے: دو۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کا نظریہ' جو اس کی بنیاد ہے' وہ مودودیؒ صاحب نے دیا اور قائداعظم نے اس نظریئے کے مطابق یہ مملکت حاصل کر لی۔ جی' انجینئر یہی [1] تھے وہ تو [2] یونہی بیچارہ راج مزدور تھا۔ ''روز رات نوں آ جاندی سی پوچھن نوں: جی' کل اے کند کس طرح نال اسارنی اے؟ تے فیر ایہہ دسدے سن۔ ایہدے اچ آ لکھیا او یا اے' چل او ئے۔'' [3] وہ ان کے نظریئے کے مطابق یہ مملکت حاصل کر رہے تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ خود ان کی اپنی ہی جماعت یہ کہتی کہ بھئی! یہ ہمارے ہی نظریہ کو Carry out (عمل میں لانا) کر رہے ہیں' ہمیں ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے بلکہ بہت زیادہ ان کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ انہی کے نظریئے کے مطابق مملکت حاصل کر رہے تھے' مگر یہ تھے کہ بار بار انہیں گالیاں دے رہے تھے کہ یہ غیر اسلامی ہے' کافرانہ ہے۔ ارے! تمہارے نظریئے کے مطابق مملکت بن رہی ہے' تم اِسے کافرانہ کہہ رہے ہو! ہاں' کبھی تو منہ سے سچی بات نکل ہی جاتی ہے۔ کیا کر رہے ہو تم؟ 1947ء تک کہتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ جب یہ مملکت بن بھی گئی یعنی بقول ان کے انہی

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903- 1978)

[2] قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876- 1948)

[3] یہ پوچھنے کے لیے روزانہ رات کو آ جاتے تھے کہ جی' یہ دیوار کل کس طرح تعمیر ہوگی؟ تو پھر یہ بتاتے تھے۔ اس میں یہی کچھ لکھا ہوا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

کے دیئے ہوئے نظریئے کے مطابق قائداعظمؒ نے ایک مملکت بنائی تو اپریل 1947ء میں کہہ رہے ہیں کہ یہ غیر اسلامی ہے اور اب بن چکنے کے بعد یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مملکت تین شخصیتوں نے بنائی: اقبالؒ، مودودیؒ اور قائداعظمؒ۔ بن چکنے کے بعد قائداعظمؒ گئے ہونگے کہ جناب! حضور کے نظریئے کے مطابق، تعمیل ارشاد میں، میں نے وہ مملکت بنادی ہے۔ کہنے لگے: ارے تمہاری ایسی کی تیسی۔ یہ جون 1948ء کا قصہ ہے۔ یہ اس سے پہلے کی ساری تحریک اور اس کی داستان ہے۔ وہ (معاذ اللہ) تمہارا منہ کالا کر دینے کے قابل ہے، تمہارے یہ کرتوت ہیں اور ہم سے صلاح مانگنے کے لیے آ گئے ہو، آبرو باختہ قیادت قوم کو تباہ کرنے والے! نکل جاؤ یہاں سے۔ وہ بیچارہ یہاں سے نکل گیا، زیارت کے جنگلوں میں جا بیٹھا اور وہاں سے اس کی لاش ہی آئی ہے۔

امیرِ جماعت اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کا بیان

چار دن ہوئے ہیں کہ امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب کا یہ بیان شائع ہوا ہے کہ پاکستان تین شخصیتوں نے بنایا۔ تین میں سے دو کی تو یہ کیفیت ہے کہ اقبالؒ نے تو صرف الگ مملکت کا تصور دیا، نظریہ دیا کہ یہ مملکت یوں بنی چاہیے اور قائداعظمؒ کا صرف یہ کریڈٹ ہے کہ انہوں نے اس تصور کو، اس نظریئے کو، Carry out (انجام تک پہنچانا) کیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا، عزیزانِ من! کہ پرانی باتوں کو تو آپ چھوڑ یئے کہ صاحب! ہم اِدھر اُدھر نہیں جاتے، ہمارے اس دور میں جس طرح سے تاریخ مرتب ہو رہی ہے، اسے دیکھیے اور ان کی جماعت میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس وقت تک یہ نہیں کہا کہ صاحب! کم از کم ہمیں اتنا تو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ کتنا جھوٹ؟ خود مودودیؒ صاحب سے یہاں یہ سوال ہوا کہ آپ نے اس تحریکِ پاکستان میں، اس مملکت کے بنانے میں، کیا حصہ لیا تھا؟ ان کا جواب موجود ہے کہ ٹھیک ہے کہ یہ پاکستان مسلم لیگ ہی نے حاصل کیا تھا، اس کا سہرا انہی کے سر ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہم نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ یہ بھی موجود ہے۔ اب یہ بھی ہے کہ انہی کے نظریئے کے مطابق تو یہ سب کچھ بنا تھا اور یہ بھی موجود ہے کہ بنانے والا قائداعظمؒ تھا۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اقبالؒ بیچارہ تو 1938ء میں ہی مر مرا گیا۔ مگر قائداعظمؒ کو پاکستان بننے کے بعد، اس کی زندگی میں کہا جا رہا ہے کہ تمہارا منہ کالا کر دینے کے لیے کافی ہے جو کچھ تم کر کے آ گئے ہو (معاذ اللہ)۔ عزیزانِ من! کل کو تاریخ انہی کے ہاتھوں سے مرتب ہو گی۔ آج اس وقت نصاب کی جتنی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں، یہ انہی کی مرتب کردہ ہیں اور اسلامیات کے نام سے جو سازش ہو رہی ہے، یہ بھی انہی کا کیا دھرا ہے۔

منزل انہیں ملی جو رفیقِ سفر نہ تھے

کل کو نصاب کی کتاب میں تحریکِ پاکستان کی تاریخ بھی انہی کی آ جائے گی۔ آج تو اسے ذرا شرم و بے شرمی کہہ لو کہ ان دو کا نام ساتھ لے دیا ہے کہ چلو اقبالؒ نے اتنا سا کہہ دیا اور قائداعظمؒ نے یہ کر دیا۔ نظریہ تو بہرحال ان کا تھا، کریڈٹ تو اسی کو جاتا ہے جس نے اس

دور میں یہ نظریہ دیا۔ آپ دیکھیے گا کہ جب بھی وہ تاریخ بنی' پتہ نہیں ہم ہونگے یا نہیں' اس وقت اس تاریخ میں ان دونوں کا نام ویسے ہی حذف ہوجائے گا' وہ ❶ اکیلا ہی رہ جائے گا۔ جسے اللہ کا شاہکار کہا جاتا ہے وہ تو ایک ہی ہوسکتا ہے۔ عزیزانِ من! شاہکار ہمیشہ ایک ہوتا ہے' کسی فنکار کا ماسٹر پیس (Master Piece) ایک ہی ہوتا ہے' اللہ کا شاہکار تخلیقِ کائنات سے لے کر اس وقت تک اس کی تخلیق کا ایک ہی ماسٹر پیس' ایک ہی شاہکار ہے۔ درمیان میں کوئی اور ہے ہی نہیں' رسالت مآب صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بھی نہیں ہیں۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ آخر جھوٹ بولنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے پرویز کو کافر قرار دیئے چلے جاؤ' اپنے جھوٹ کی ڈگڈگی بجائے چلے جاؤ' پرویز کو گولی ماردو۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اس ساری قوم کے اندر کوئی ایک بھی رجل رشید نہیں ہے جو پوچھ لے کہ صاحب! اس قدر یہ حالت! اس قدر یہ ہتک! آخر یہ کچھ کیوں کیا جارہا ہے! یہاں کسی کو چھوڑا ہی نہیں جارہا۔

الیکشن میں حصہ لینا بالکل کافرانہ عمل ہے

یہاں آتے ہی انہوں نے فتویٰ دیدیا کہ الیکشن میں حصہ لینا کافرانہ عمل ہے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم الیکشن جیت نہیں سکیں گے' ان کا تو بقول ان کے جو کچھ فیصلہ ہوتا ہے وہ تو ''دین کے مطابق ہوتا ہے۔'' اس لیے انہوں نے دین کے مطابق فیصلہ دیدیا کہ اسلام کی رو سے الیکشن میں حصہ لینا بالکل کافرانہ عمل ہے' غیر اسلامی ہے اس لیے اب یہاں جو شخص کسی مقصد کے لیے امیدوار بن کر اٹھتا ہے اور ٹکٹ لیتا ہے تو اس کا اٹھنا بھی غیر اسلامی' اسے ووٹ دینا بھی خلافِ اسلام۔ انہوں نے یہ اعلان کردیا۔

مودودی صاحب کی نظر میں حضرت علی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کی لغزش؟

عزیزانِ من! اِن حالات میں ایک شخص کی جو شامت آئی تو اس نے مودودیؒ صاحب سے یہ پوچھ لیا کہ صاحب! اگر یہ اسلام کے مطابق ہے تو حضرتِ علی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ نے جو اپنے آپ کو خلافت کے لیے بطور امیدوار پیش کیا تھا ان کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ سنیے عزیزانِ من! رسائل و مسائل ان کی کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں لکھا ہوا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خلافت کے لیے کھڑے ہوئے تھے لیکن سُن رکھیے کہ ان بڑے بڑے بزرگوں کی جو نیک روشیں ہیں ہمیں ان کا اتباع کرنا چاہیے لیکن ان کی لغزشوں کا اتباع نہیں کرنا چاہیے' انہیں تو اپنے بڑے بڑے حسنِ عمل کی بدولت ان لغزشوں سے بھی معافی مل جائے گی اور یہ بخشے جائیں گے۔ اگر ہم نے ان لغزشوں کا بھی اتباع کیا تو ہماری تو خیریت نہیں ہے' اس لیے ہم ان کی ان لغزشوں کا اتباع نہیں کرسکتے' یعنی حضرت علیؓ کی لغزشوں کا ہم اتباع نہیں کرسکتے۔

الیکشن کے متعلق فتویٰ

عزیزانِ من! وقت گزرا۔ حالات پلٹے تو اگلے ہی الیکشن کے وقت انہیں حالات بہتر نظر آئے۔ اعلان کروایا کہ جماعت اسلامی

---

❶ اشارہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی طرف ہے

الیکشن میں حصہ لے گی' اپنے امیدوار کھڑے کرے گی۔ کہا گیا کہ صاحب! یہ آپ کیا کہہ رہے؟ کہنے لگے کہ غور کرنے والے دیکھیں گے کہ یہ عین اسلام کے مطابق ہے' اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ ٹھیک ہے جی' تو پھر وہ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کی لغزش تو لغزش نہ رہی۔ ان کا اس فتویٰ کے مطابق کھڑے ہونا کوئی لغزش نہ رہی۔ انہوں نے آج تک کہیں یہ نہیں لکھا کہ مجھ سے وہ لغزش ہوگئی تھی اور میں خدا سے' اِن سے اور قوم سے' معافی مانگتا ہوں۔ یہ کہیں نہیں کہا گیا۔ اور یہ بھی کہیں نہیں ملتا کہ انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا ہو کہ میں نے کہیں غلطی کی تھی۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر! کیا شانِ استغنا ہے۔ عزیزانِ من! ہم اس دَور سے گزر رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ کتابیں' یہ ہیں وہ تفسیریں' جو دنیا میں پتہ نہیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں چھپ رہی ہیں' باقی زبانوں کے اندر ان کے ترجمے ہو رہے ہیں' یہاں پاکستان میں بیٹھے ہوئے یہ بیانات دیئے جا رہے ہیں' ساری جماعت سن رہی ہے' لوگ سن رہے ہیں۔ آپ حضرات جناب مودودیؒ صاحب کے اس قسم کے خود ساختہ اسلام اور متضاد حکمتِ عملی کی ایک مکمل اور واضح تصویر مولانا کوثر نیازی مرحوم کے اُس خط میں ملاحظہ کریں جو انہوں نے 17 سال کے طویل عرصہ کے بعد جماعت سے الگ ہونے پر مودودیؒ صاحب کو تحریر کیا تھا۔ [1]

---

[1] تضادِ عملی کے چند پہلو: تضادات کا شکار ہوئے جانے کے سارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لیے صحابہؓ تک کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا مگر اب ہم اپوزیشن سے مل کر امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ صالح نمائندہ پنچائتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو، پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے' اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر ''غیر صالحین'' کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائد اعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے' صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویری ووچر گلی گلی فروخت کیے۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا۔ اب ہم پارلیمانی نظامِ جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں۔ پہلے ہم علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے۔ اب ان کی صدارت تک کے لیے کوشش کرتے ہیں پہلے ہم اپوا کے زبردست ناقد تھے اب انہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظّم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں۔ پہلے ہم طلباء کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے۔ اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں۔ پہلے ہم جلسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے اب غلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لیے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اب انہی عدالتوں کو ہم عدل وانصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے۔ اب انہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔ میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط' یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانیے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کیے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب ترک واختیار کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا، کون ہماری دینی فکر پر بھروسہ کرے گا۔
(محمد اشرف ظفر: مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی (طبع دوم) اشرف پبلی کیشنز و مکتبہ اخوت، لاہور ۱۹۸۷ء ص ص ۳۰۰ تا ۳۰۱)

دیکھنا تو یہ تھا کہ اس آزادی کے بعد ہم نے کیا کیا؟

عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش میں بات چلی تھی کہ یوں بھی اللہ کا ایک دستور ہے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ وہاں اس نے کہا تھا کہ خدا کا قانونِ مکافات ہے۔ سننے والے سن لیں کہ **فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ** (26:57-58)۔ ہم نے فرعون اور اس کے سردارانِ قوم کو ان کے باغات اور چشموں سے اور ان کے خزانوں اور مناصب و مدارج سے نکال باہر کیا۔ پھر سن لو کہ ایسا ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ ان سے چھن چکا ہے۔ **وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ** (26:59)۔ اور اس کے مالک بنی اسرائیل بنا دیئے گئے۔ ہم نے بنی اسرائیل پہ احسان کرنا چاہا تو انہیں اس پنجہ استبداد سے نکال کے ایک آزاد سرزمین میں لے گئے۔ کاہے کے لیے؟ تا کہ دیکھا جائے کہ وہ جو کہتے تھے کہ ہمیں اگر آزادی نصیب ہو گئی تو ہم یہ کریں گے اور ہم وہ کریں گے تو انہیں آزادی دے کر دیکھ لیجیے کہ پھر یہ کیا کرتے ہیں۔ یہ جو بار بار قرآن میں آیا ہے: **يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ** (2:40)۔ اے بنی اسرائیل! تم ہماری ان آسائشوں، راحتوں، سرفرازیوں اور سربلندیوں کو یاد کرو جو ہم نے تم پر نچھاور کی تھیں۔ یہ اس لیے آیا ہے کہ تم تو وہاں یہ کہا کرتے تھے کہ اگر کہیں ہمیں یہ آزادی مل جائے تو پھر دیکھیے ہم کیا کرتے ہیں۔ ہم نے تمہارے ہاں کی جو حجت تھی وہ بھی پوری کر دی اور تمہیں آزادی بھی دیدی اور یہ اسی لیے دی تھی کہ تم جو کہا کرتے تھے تو تم کس حد تک اس پہ پورا اُترے ہو اور یہ کچھ تو ہر جگہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے یہ کیا اور تم نے یہ کیا، ہم نے یہ کیا۔ اور اس کے بعد بھی تم یہ چیز کہتے ہو کہ خدا نے ہم پہ ظلم کیا ہے۔ کیا خدا انسانوں پر ظلم کرتا ہے؟ نہیں، خدا کسی پہ ظلم نہیں کرتا۔ انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ خدا نے تو تمہیں ان نعمتوں سے سرفراز کیا تھا جو تمہارے کسب و ہنر کا بھی نتیجہ نہیں تھیں اور آج ہم سے کہتے ہو کہ خدا نے ہم پہ ظلم کیا۔ اِسے یاد رکھو کہ جو ناانصافی کی چیز ہے وہ یہ ہے کہ تم عطا شدہ نعمتوں کو اپنے کسب و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہو۔ لہٰذا عزیزانِ من! یہ جو قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کی نعمتوں کا قصہ ہے اور ان کے خلاف جرائم کا تذکرہ آتا ہے یہ کوئی عہدِ پارینہ کی داستان نہیں ہے۔ یہ تو اپنی ہی داستان ہے۔

یہ تو ہماری اپنی داستان معلوم ہوتی ہے

عزیزانِ من! ارے یہ تو اپنی ہی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اسی طرح پاکستان کا یہ خطہ زمین ملا تھا۔ یہ **نَمُنَّ عَلٰى** تھا، یہ احسان اے باری تعالیٰ دا۔[1] یہ صرف اس لیے تھا تا کہ **لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ** (10:14) ہم دیکھیں کہ پھر تم کیا کام کرتے ہو۔ جو آج کہتے ہو کہ ہمیں آزادی مل جائے، تو ہم یہ کریں اور ہم وہ کریں۔ عزیزانِ من! اگر دیکھا جائے تو کیا پھر قدم قدم پہ ہم سے یہ نہیں

---

[1] یہ پروردگار کا احسان تھا، اور ہے۔

پوچھا جا رہا کہ تم تو یہ کہتے تھے کہ اگر ہمیں آزادی مل جائے' اس کی امکانی قوت حاصل ہو جائے' تو ہم یہ کر کے دکھائیں' ہم وہ کر کے دکھائیں' پھر تم نے کیا کر کے دکھایا۔ یہ ہے وہ داستان' جو قرآنِ کریم نے اس ایک آیت میں سمو دی کہ **يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى**(20:80)۔اے قوم بنی اسرائیل! ہم نے اس طرح تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دلا دی تھی اور طور کی دائیں جانب (موسیٰ علیہ السلام پر وہ وحی کی تھی جس میں) تمہارے لیے مستقبل کی کامرانیوں کے وعدے تھے۔ نیز تمہارے لیے صحرائے سینا میں ''من وسلوٰی'' مہیا کر دیا۔

من وسلوٰی کیا ہوتا ہے؟

عزیزانِ من! بنی اسرائیل کو نجات ملی۔ وہ وادئ سینا میں آ گئے۔ ٹھیک ہے' یہ بے برگ و گیاہ زمین تھی لیکن دیکھیے تو سہی' وہاں فطرت کی طرف سے تمہیں رزق کی اتنی آسائشیں ملیں۔ یہاں من وسلوٰی کے الفاظ آ گئے۔ یہاں من کا لفظ آیا ہے۔ **مَنَّ** ہر اس احسانِ الٰہی کو کہتے ہیں جس کے حاصل کرنے میں کسی قسم کی محنت ومشقت نہ اٹھانی پڑے۔ **مَنَّ عَلَيْهِ** کے معنی ہیں: اس پر احسان کیا یعنی بلا مزد و معاوضہ کچھ عطا کر دیا۔ **اِمْتَنَّ عَلَيْهِ** کے بھی یہی معنی ہیں۔ قرآنِ کریم میں وحی کو بھی **مَنَّ** سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے بلا کسب و ہنر محض وہبی طور پر عطا ہوتی ہے۔ یہ **مَنّ** کا لفظ اس شیر خشت کے لیے بولا جانے لگا ہے جو میٹھی میٹھی گوند ہوتی ہے' اسے ترنجبین کی قسم کی میٹھی گوند بھی کہتے ہیں' جو درختوں پر جم جاتی ہے۔ یہ گوند ان صحراؤں میں' جھاڑیوں پہ' خود بخود لگ جاتی ہے۔ یہ بڑی لذیذ ہوتی ہے۔ میں نے اسے کھایا ہے۔ شروع میں شام کے سفیر ہوتے تھے۔ وہ کبھی کبھی دعوت کیا کرتے تو اس میں وہ **مَنَّ** بھی کھلاتے تھے۔ یہاں دوسرا لفظ ''سلوٰی'' آیا ہے۔ سلوٰی دراصل بٹیر کی قسم کا پرندہ ہوتا ہے۔ وہ بھی صحراؤں میں عام ہوتا ہے۔ ویسے سلوٰی ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو تسلی دے' چنانچہ شہد کو بھی السلوٰی کہتے ہیں اور گوشت کو بھی۔ امام راغب [1] نے کہا ہے کہ السلوٰی سفید رنگ کا ایک پرندہ (بٹیر کے مشابہ) ہے جو سینا کی وادیوں میں بنی اسرائیل کو کھانے کو ملتا تھا۔ امام راغب نے مزید کہا ہے کہ اس سے مراد ''ہر وہ شے ہے جو وجہ تسلی ہو۔'' اس طرح بنی اسرائیل مصر سے صحرائے سینا میں آئے تو وہاں تو ابھی کوئی چیز نہیں تھی' کوئی کارخانہ نہیں تھا' کوئی بجلی نہیں تھی' پانیوں کی کوئی ایسی اچھی جھیلیں نہیں تھیں۔ تو یہ کچھ' جو نباتاتی شیرینی اور پرندوں کا گوشت' کھانے کے لیے نہایت خوش گوار غذا کی صورت میں تھا' کھانے کے لیے خود دے دیا۔ یہ جو قرآن کے بنیادی الفاظ تھے' اصل میں اب وہ ان چیزوں کے لیے بولے جانے لگے تھے اس میں بھی تو بات مضمر ہے۔

---

[1] امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا بڑا ہی مقبول اور مشہور لغت ہے اور بڑا مختصر ہے۔ یہاں پہ یہ امام راغب کے اُس لغت کا حوالہ ہے جو مطبع میمنیہ (مصر) میں 1324ھ میں چھپا تھا۔

''مَنّ'' کے معنی ہی احسان کے ہیں

عزیزانِ من! ''منّ'' کے معنی ہی ''احسان مندی'' کے ہیں۔ اسے آپ ممنونِ کرم بھی کہتے ہیں' وہیں سے لفظ منّ کے معنی آئے ہیں اور سلوٰی تو ہے ہی وہ چیز جو تسکین کے لیے ہو۔ یہ چیزیں بطورِ احسان دیں تا کہ ادھر سے تمہاری پریشانی دور ہو جائے کہ کھائیں گے کیا؟ کہا کہ كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (20:81)۔ جو خوشگوار چیزیں تمہیں دی جا رہی ہیں' انہیں کھاؤ پیو۔ یہاں کہا یہ تھا کہ یہ کچھ مَا رَزَقْنٰكُمْ ہے یعنی ہم نے یہ سب کچھ تمہیں کھانے کے لیے دیا ہے۔ کہا کہ رزقِ حلال کھانا بھائی! تو نظر آیا کہ جو اس کا دیا ہوا ہے' آگے چل کے وہ بھی حلال یا حرام ہو سکتا ہے یعنی ایک تو یہ کہ وہ شے بالذات حرام ہے مثلاً خنزیر۔ وہ تو رہی ایک چیز۔ یہ جو مَا رَزَقْنٰكُمْ ہے یعنی ہم نے تمہیں جو رزق دیا ہے' اس کے لیے یہ کہا کہ اسے طیب طریق سے کھانا' اسے حلال طریق سے کھانا۔ یہ بڑی چیز ہے۔

رزقِ حرام اور رزقِ حلال کی تعریف

عزیزانِ من! اس کا دیا ہوا رزق بھی اگر غلط طریق سے یعنی اس کے قانون کے خلاف کھایا جائے تو وہ بھی حرام ہو جاتا ہے۔ اسی کو تو حرام کی روزی کہتے ہیں۔ اب وہ مَا رَزَقْنٰكُمْ گنا یا جا رہا ہے کہ تم نے اسے حرام کیسے کر دیا۔ یہاں تو ایک لفظ آیا ہے کہ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ (20:81)۔ اس باب میں حدود شکنی مت کرو۔ اور یہ ایک لفظ ہے: طَغٰى۔ آپ کو معلوم ہے کہ دریاؤں اور نہروں کا وہی پانی ہوتا ہے جو آگے ندی نالے' جنوں کیندے نیں' [1] بنا تا ہے۔ یہ وہ نالیں ہوتی ہیں جو کھیتوں میں جاتی ہیں۔ یہ نالی وہی ہوتی ہے جس کا پانی ساحلوں کے اندر بہتا ہے اور ہر جگہ وہ پانی طیب زندگی پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ ساحلوں سے اچھل جائے تو وہ پانی تباہیاں لے آتا ہے۔ یہی طغٰی ہے۔ اس لیے کہا تھا کہ اس باب میں یعنی کھانے پینے کے سلسلے میں حدود شکنی نہ کرنا۔

لَا تَطْغَوْا فِيْهِ کا مفہوم

رزق طیب کے متعلق کہا کہ تمہیں اس کی ایک اصولی بات بتا دیں اور وہ یہ ہے کہ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ (20:81)۔ اسے سیلاب نہ بننے دینا' حدود کے اندر رکھنا۔ قربان جاؤں قرآن کے۔ ایک لفظ ہے صاحب! یہ آپ کے ملک پر جتنی تباہی آئی ہوئی ہے' یہ اسی اصول سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ ہم روز یہ لفظ استعمال کرتے ہیں کہ سیم وزر کا سیلاب آیا ہوا ہے' دولت کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ یہی تو تَطْغَوْا ہے۔ سیلاب آ جاتا ہے تو وہی پانی جو ممدِ حیات ہوتا ہے' وہی مرگ آفریں ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ موت بنتا ہے' عزیزانِ من! تو پھر وہ گاؤں میں مندر اور مسجد کی تمیز بھی نہیں کرتا۔ قرآن نے یہی کہا ہے کہ اس فتنے سے ڈرو جب وہ آیا کرتا ہے تو پھر وہ انہی تک محدود نہیں رہا کرتا جو ظالمین تھے' جن کے ظلم وستم کی وجہ سے وہ آتا ہے' وہ تو سبھی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ (20:81)

---

[1] جنہیں کہتے ہیں۔

اس بات میں، یعنی کھانے پینے میں، حدود شکنی کبھی نہ کرنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو برباد ہو جاؤ گے۔

تورات کا ایک خوبصورت بیان

ہاں، عزیزانِ من! حدود شکنی کرنے کا یاد آ گیا۔ یہ تورات میں ہے۔ اِن تحریف شدہ کتابوں میں بھی کہیں کہیں بچے کھچے آثار ایسے ملتے ہیں کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے قوم سے کہا تھا کہ تم باہر جاتے ہو، باہر کھلی ہوئی اِن جھاڑیوں میں بھی رزق بکھرا پڑا تھا۔ وہاں اسے صرف اکٹھا ہی کرنا تھا اور یہ جو وہاں پرندے پھر رہے تھے انہیں تو صرف پکڑنا ہی تھا۔ تورات میں ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ جاؤ، یہ کچھ اکٹھا کرو، اکٹھا کرنے کے بعد یہاں لا کے رکھو، اور ان میں سے ہر شخص اتنا لے کر جائے جتنے آدمی، جتنی نفریاں، اس کیمپ کے اندر ہیں۔ یہ نہیں کہ تم جتنا اکٹھا کرلو، وہ تم سارا لے جاؤ، بلکہ یہ کہا کہ وہ سب پہلے یہاں لاؤ اور پھر اس میں سے ہر فرد اپنی ضرورت کے مطابق لے کر جائے اور اس کے آگے ہے کہ یاد رکھو! اگر کسی نے اپنی ضروریات سے زیادہ لے لیا اور وہاں جا کے جمع کر لیا تو اس رزق میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ یہ سب کچھ تورات میں ہے۔ یہ ہے **لَا تَطۡغَوۡا** (20:81)۔ یعنی حدود شکنی کبھی نہ کرنا۔

قرآن حکیم کا معاشی نظام

عزیزانِ من! یہی قرآنِ کریم کا معاشی نظام ہے، یعنی خدا کے دیئے ہوئے رزق اور اس کی نعمتوں کو اپنی بھرپور محنتوں سے جا کر اکٹھا کرو، اکٹھا کر کے شام کو انہیں اپنے اپنے گھر نہ لے جاؤ، وہاں لا کے جمع کر دو اور اس میں سے اپنے اپنے گھرانے کی ضروریات کے مطابق لیتے چلے جاؤ۔ رزق حلال ہو گیا۔ اس کے برعکس جتنا لُوٹ کا مال سمجھ کر کسی کے ہاتھ لگا، وہ اسے اپنے ہاں لے گیا۔ یہ رزقِ حرام ہو گیا۔ اس لیے کہ یہ **تَطۡغَوۡا فِيۡهِ** ہو گیا۔ اس طرح اگر یہ رزق **تَطۡغَوۡا فِيۡهِ** ہو گیا تو یاد رکھو کہ **فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ** (20:81)۔ اگر ایسا کرو گے تو (خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے) تم پر ہلاکت انگیز عذاب آ جائے گا۔ یہ وہی خدا ہے جس نے احسان کے طور پہ یہ کچھ دیا۔

غضب کے معنی

عزیزانِ من! ''غضب'' کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز کا جھلس کے رہ جانا، وہ جو اس [1] نے کہا ہے:

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

---

[1] علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938)

یہ اُس نے فطرت کے تقاضوں کے مطابق کہا ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو بات دوسری طرف نکل جائے گی۔ ہم تمہارے عمل کی کھیتیوں کو جلا کے رکھ دیں گے۔ اگر ایسا کیا تو **وَمَنۡ یَّحۡلِلۡ عَلَیۡہِ غَضَبِیۡ فَقَدۡ ھَوٰی** (20:81)۔ یاد رکھو! جس قوم پر وہ ہلاکت انگیز عذاب آ جائے' وہ ذلت کی پستیوں میں گر جایا کرتی ہے۔ تمہیں بتائیں کہ جن پہ خدا کا فضل نازل نہیں ہوتا ہے ان کی کیفیت کیا ہوا کرتی ہے؟ **فَقَدۡ ھَوٰی** (20:81)۔ وہ ذلت کی گہرائیوں میں گر جایا کرتی ہے۔

ھوٰی کا قرآنی مفہوم

یہ ''حرص وھوا'' کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ ہم بولتے بھی ہیں۔ یہ وہی لفظ تو ہے۔ اب پھر آیئے اس عرب کی زبان کی طرف۔ یہ عرب ھوٰی اس چیز کو کہتے ہیں ''جیسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی پتھر کو چھوڑ دیا جائے تو وہ پہلے تو شروع شروع میں' آہستہ آہستہ گرتا ہے' پھر اس کا اپنا ہی Momentum (معیارِ حرکت) اُسے اتنا زیادہ تیز کر دیتا ہے کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ نیچے لڑھکتا ہے۔ اس طرح جو چیز تیزی سے پستی کی طرف آ رہی ہو عرب اسے ھوٰی کہتے ہیں'' اور اسے ان پست جذبات کے لیے استعمال کرتے تھے' جو انسان کو شرافت کے بلند معیار سے' پستیوں میں گرا دے۔ کہا کہ اگر رزق کی یہ کیفیت ہوگئی تو اس طرح تم سب کچھ لُوٹ کر لے جاؤ' مگر یاد رکھنا! اس کے نتیجے میں پھر خدا کا غضب نازل ہو جایا کرتا ہے اور اس کے بعد قوم اپنے جذبات کی پرستش کرنے لگ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار انسان کے یہ جذبات اسے شرفِ انسانیت کی چوٹیوں سے پستیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ ہے **فَقَدۡ ھَوٰی** (20:81)۔ ذلت کی پستیوں میں جا گرنا۔

اس پستی کا' اس ذلت کا' علاج

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' مایوس نہیں ہونے دیتا' ابدی طور پر کسی کو راندۂ درگاہ نہیں کرتا۔ اس لیے کہا کہ **وَاِنِّیۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ** (20:82) ان پستیوں سے نکلنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنی غلط روش کو چھوڑ کر پھر خدا کے متعین کردہ صحیح راستے کی طرف آ جائے۔ جب کوئی قوم غلط روش اختیار کرتی ہے تو اس روش کے مضر اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ اثرات اس حد تک آگے بڑھ جائیں کہ ان کی ہلاکت یقینی ہو جائے' اگر وہ قوم اس غلط روش کو چھوڑ کر قانونِ خداوندی کے مطابق صحیح روش اختیار کر لیتی ہے تو اس سے اس پر دہرے اثرات مرتب ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک تو اس کی سابقہ روش کے مضر اثرات سے اس کی حفاظت ہو جاتی ہے اور دوسرے اسے زندگی کے خوشگوار نتائج ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ کوئی بات نہیں' پھر ہم حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیں گے' حفاظتی تدابیر دیدیں گے' گھبراؤ نہیں' مایوس نہ ہو۔ یہ کس کے لیے ہوگا؟ اس کے لیے ہوگا جو **لِمَنۡ تَابَ** (20:82)۔ جو حفاظتی تدابیر کی طرف لوٹ آئے گا۔ میں سمجھا چکا ہوں کہ'' **تَابَ** '' کہتے ہیں کہ وہاں سے لوٹو' لاؤ جو سارا کچھ' زیادہ اکٹھا

کیا تھا' لوٹ آؤ' اس طرف جہاں سے غلط قدم اٹھے تھے اور اس طرح جو سارا کچھ اکٹھا کیا تھا وہ وہاں مرکز کے اندر جمع کرا دو۔ وَ اٰمَنَ (20:81) اور ایمان لاؤ اس بات پہ کہ اتنا ہی حلال ہے جتنا ضرورت کے لیے کافی ہو اور اس کے بعد وَ عَمِلَ صَالِحًا (20:82) ایسے کام کرو جن سے اپنے اور انسانیت کے بگڑے کام اور بگڑے معاملات' سنور جائیں۔

یہ ہوگا وہ عمل جسے صالح عمل کہا جاتا ہے

عزیزانِ من! کہا کہ اس کے بعد پھر محنت کرنے لگ جاؤ۔ اب تمہارا یہ عمل ہوگا کہ بھرپور محنت سے کماؤ لیکن لو اتنا ہی جتنے کی تمہیں ضرورت ہے۔ یہ عملِ صالح ہے۔ اصلاح کے تو معنی ہی ''ہمواریاں پیدا کرنا'' ہوتا ہے۔ اے جنوں سہاگہ کیندے او ناں تسی پنجابی اچ' او اینا ں دا عمل صالحا ہونداا ے۔ [1] وہاں تھا: فَقَدْ هَوٰی (20:80) کہ جو حدود شکنی کرتا ہے وہ پستی میں گر جاتا ہے اور یہاں ہے کہ ثُمَّ اهْتَدٰی (20:82) تو اس کی سابقہ لغزشوں کے تباہ کن نتائج سے' اُس کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لیے اس راستے پر قائم و دائم رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے متعلق آپ کہیں گے کہ انسان خدا کی بتائی ہوئی رہنمائی کے پیچھے چل رہا ہے۔ بہر حال درمیان میں خدا کے قانونِ مکافات کی یہ بات آ گئی۔ بات یہ چلی آ رہی تھی کہ بنی اسرائیل صحرائے سینا میں آ کے بس گئے۔

غلام قوموں کا طرزِ حیات اور روشِ زندگی

قرآن یہ بتاتا ہے کہ جب قومیں ایک مدت تک غلامی کے شکنجے میں جکڑی رہتی ہیں تو ان کے دل کی گہرائیوں تک حاکم قوم کی روش' عادات و دساتیر' اور اخلاق و عادات رچ بس جاتی ہیں حتیٰ کہ ان کے عقائد تک ان کے خون کے اندر حلول کر جاتے ہیں۔ اب آگے قرآن یہ بتا رہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل انبیاء کرام کی قومیں تھیں۔ پے در پے' پیہم ان کے اندر انبیاء کا سلسلہ جاری رہا۔ اگر نسلی اعتبار سے ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہی لے لیا جائے تو اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ایسے ایسے جلیل القدر انبیاء آئے جن میں حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام وغیرہ' شامل ہیں۔ ان کا ذکر تو قرآن میں بھی ہے اور تورات کے اندر' جنہیں انہوں نے اپنے Prophets یا نبی کہہ کے پکارا ہے' بہت سے ہیں' ان کے صحیفے بھی موجود ہیں۔ تو گویا یہ وہ قوم تھی جسے انبیاء کی قوم کہا جاتا ہے۔ وہاں انہوں نے اپنا الگ تشخص بھی برقرار رکھا تھا یا شاید یوں کہو کہ اس حاکم قوم نے ان کو اچھوت بنا کے چھوڑا تھا کہ ان پہ حکومت کریں۔ بہر حال یہ الگ قوم کی حیثیت سے موجود تھی' بچی کھچی سہی' انبیاء کی تعلیم بھی موجود تھی۔ اس کے برعکس یہ جو مصری تھے' یہ قبطی [2] کہلاتے تھے۔ یہ بُت پرست تھے۔ ان کے ہاں جو سب سے بڑا بُت ہوتا تھا' اُس کا سر گائے کا یا بیل کا یا

---

[1] یہ وہی ہے جسے آپ پنجابی میں ''سہاگہ'' کہتے ہیں' وہ ان کا عمل صالح ہوتا ہے۔

[2] قبطی: یہ قدیم مصری قوم ہے یعنی قبط سے متعلق ہے۔ یاد رہے مصر کا قدیم نام قبط تھا۔

سانڈ کا ہوتا تھا۔ یہ دیوتا حورس کہلاتا تھا۔ آگے چل کے میں عرض کرونگا کہ یہ جو قرآنِ کریم میں عزیر ❶ کا ذکر ہے' یہ اسی بت کا نام تھا۔ ان کے ہاں یونانی میں اس بت یعنی دیوتا کو Osiris یعنی عزیرس کہتے تھے۔ بہرحال یہ اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام انہیں وہاں سے نکال لائے اور قرآن کریم کا یہ بتانا کتنا بڑا احسان ہے کہ انہیں سمندر میں سے اس طرح سے بہ حفاظت یہاں لے آیا گیا۔ یہاں آ کے ''من وسلویٰ'' یوں کھانے کے لیے دینا اور آزادی کی فضاؤں کے اندر سانس لینا' کتنا بڑا احسان ہے۔ یہ یہاں آئے تو قرآن نے جو پہلی بات کی ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں یہاں لے کے چلے آئے تو پہلا ہی گاؤں جو سامنے آیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں ان میں قبطی کی ہی قومیں بستی ہیں۔ ❷ ان کے ہاں ایک بُت ❸ ہے اور دیکھا کہ وہ اُس بُت کی پرستش کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام! ہمیں بھی ایسا بت بنا دو' ہم بھی پرستش کریں گے۔ انہوں نے کہا: او فٹے منہ تہاڈا ❹ عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے محکوم قوم کے اندر! غلامی سے عقائد تک ان کے دل میں یوں پیوست ہو جاتے ہیں کہ خدا کے ایک اتنے عظیم القدر پیغمبر سے درخواست کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی بُت بنا دیجیے۔ عزیزانِ من! ابھی تو انہوں نے درخواست کی ہے کیونکہ بت بنانے کا سامان نہیں تھا۔ ذرا آگے چلیں گے تو ہم دیکھیں گے کہ جب بُت بنانے کا سامان ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ بت بنوا کر نہیں دیا بلکہ انہوں نے ڈانٹ دی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ کوئی بات نہیں' بُت بنوا کے نہ دے' ذرا آگے چلو ہم خود بنا لیں گے۔ بات یہاں سے شروع ہوگئی کہ جب انہیں بُت بنانے کا سامان میسر آیا تو پھر انہوں نے کیا کیا؟ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے تو فرمائش کی' انہوں نے تو ڈانٹ دیا' انہوں نے بنوا کے نہیں دیا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بُت بنائے جاتے تھے یا وہ بہرحال خریدے جاتے تھے۔ صرف ایک بُت مندر میں رکھا جاتا تھا' جگہ جگہ بُت بکھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔

---

❶ یہ مصر کا ''عزیر دیوتا'' تھا جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہروڈوٹس نے آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل' اس دیوتا کا نام Osiris یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء (Nouns) کے بعد ''س'' ہمیشہ زائد ہوتی ہے۔ مصر کے آثارِ قدیمہ میں اس کا نام ''ایزاری'' آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سانڈ بیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ''ایزارہاپی'' یعنی عجل عزیر تھا۔ اس بچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ''فتاح'' یعنی خالق خدا کا اوتار اور (بیٹا' ابن) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ کی غیر حاضری میں شروع کر رکھی تھی۔ اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہوگئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد' شمالی سلطنت کے بادشاہ یربعام اول (933ق م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دیا اور سونے کے دو بچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' 1961' ص۔ 1161)

❷ مصر سے نکلتے وقت کچھ غیر اسرائیلی بھی ساتھ ہو گئے تھے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لا چکے تھے۔ ان میں سمیری قوم کا ایک آدمی تھا۔ یہ سمیری قوم عراق سے نکلی تھی اور مصر تک ان کے تعلقات تھے۔ (پرویزؒ: برق طور' 1993' ص۔ 98)

❸ یہ حورس کا دیوتا تھا جس کا چہرہ گائے جیسا ہوتا تھا۔ (پرویزؒ: برق طور 1993' ص۔ 98)

❹ تف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر!

ہمارے فکر وخیال کے بت کدے

اب ہمارے ہاں غیر منقسم پاک و ہند میں یہ مسلمان جو 1947ء میں اس طرح سے تباہ حال ہو کر' واہگہ [1] پار کر کے' یہاں پاکستان آئے' یہاں تو گلی کوچے میں بُت موجود تھے: فلاں حضرت صاحب کا مزار' فلاں کا جھنڈا' فلاں کی قبر' فلاں کا یہ قصہ۔ یہ سب کچھ پہلے سے موجود تھا۔ بس اتنا ہی تھا کہ وہ [2] تھوڑے بت پرست تھے اور یہ زیادہ تھے۔ 1947ء میں یہاں پاکستان میں جس قدر مزارات تھے' آج یعنی 1976ء میں دیکھ لیجیے کہ اس کے مقابلے میں ان کی تعداد کتنی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس دور میں نئے ولی تو پیدا نہیں ہوئے' مگر وہ ہوا جو کرامت حضرت پیر گیارہویں والے کی چوروں قطب بنا دیندا ہوندا اے' ایتھے چوروں قطب' وہ مزار والے ولی تو نظر آئے۔ [3] وہ نئے پیر تو نہیں بنے لیکن آپ یہ تو دیکھیے کہ آپ کے ہاں کتنے مزارات بن گئے! اور پھر خاص اہتمام سے آپ کے ہاں حکومت کے احکامات کے تحت یہ محکمہ اوقاف وجود میں آیا۔ یہ فرسودہ قبریں بکھری ہوئی تھیں' ڈھے رہی تھیں' ان کا نام ونشان بھی نہیں تھا' خود زمانے کے تقاضوں سے وہ سارے بُت کدے مٹ رہے تھے۔ اس محکمہ اوقاف نے خود کوشش کر کے (کروڑوں کی لاگت سے) انہیں نئے سرے سے استوار کیا اور کر رہے ہیں۔ ان پہ سفیدیاں کیں' عرسوں کے لیے جھنڈے لگائے اور آج بھی لگا رہے ہیں۔ آج بھی ان کے لیے فنڈز مہیا کیے جاتے ہیں' یہاں سے وہاں تک ڈھولکیں بجائی جا رہی ہیں' قدم قدم پہ آپ کے ہاں' یہاں سے وہاں تک' یہ بُت کدے تعمیر ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہاں تازہ بہ تازہ یہ داستان بنی اسرائیل کیوں بیان کی جا رہی ہے؟ یہ تو مٹی اور پتھر کے وہ بت ہیں جو آپ کو یوں نظر آ جاتے ہیں' لیکن وہ بُت جو آپ کے ذہن و فکر و خیال کے بُت کدوں کے اندر ڈھلتے ہیں' ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے! انہی بت کدوں پہ نہ جاؤ جو یہاں معمار بنا رہے ہیں۔ یہاں تو انسانی فکر ہر آن ایک نیا بت تراش لیتی ہے۔ پھر کسی طرح سے کسی ایک بت کی پرستش سے رسی ٹوٹتی ہے' تو دوسرا تراش لیا جاتا ہے' پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جاتے ہیں' اور اس بت پرستی کا دائرہ کہاں تک محیط ہے؟ یہ دائرہ حریم کعبہ تک محیط ہے۔ عزیزانِ من! بنی اسرائیل نے تو صرف ایک بُت بنوانے کی فرمائش کی تھی' آپ دیکھ رہے ہیں یہاں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ خدا نے کہا تھا کہ ہم دیکھیں گے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ دیکھا ہے کہ ہم کس قسم کے کام کرتے ہیں؟ پھر ہم روتے ہیں کہ تباہیاں آ رہی ہیں' بربادیاں آ رہی ہیں' جسے خدا کا غضب کہتے ہیں' وہ ہو رہا ہے۔ بہرحال اس کے بعد اگلی آیت میں یہ چیز ہے کہ اس داستان کے اس حصے کو بھی یاد کر کہ وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى (20:83) جب ایک دفعہ موسیٰ (طور پر حاضر ہوا تو

---

1. پاکستان اور ہندوستان کا درمیانی اسٹیشن
2. ہندو
3. جو گیارھویں والے پیر کی کرامت سے چور قطب بن جاتے ہیں۔ یہاں چوروں سے قطب بنے۔ وہی مزار والے ولی یہاں نظر آئے۔

ہم نے کہا کہ) تو اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں جلدی سے کیوں چلا آیا؟ ابھی کچھ وقت اور ان کی تربیت کرنی تھی۔

عزیزانِ من! اب یہاں سے وہ بات شروع ہوتی ہے جس میں بتایا ہے کہ پھر انہوں نے خود ایک بت بنایا تھا' نہیں بلکہ یہ کہیے کہ وہ بت بنایا نہیں تھا ان کو بھی بنا کے دیا تھا۔ بت تراش ساتھ ہوتا ہے۔ وہ تو اپنے ساتھ لاتے ہیں' اسے تو چھوڑتے ہی نہیں۔ یہ ہمارے وہاں جتنے بڑے بڑے بت پرست تھے' انہوں نے اس پاکستان کے بننے کی مخالفت کی تھی اور جب پاکستان بن گیا تو پھر یہ سارے کے سارے اپنے تیشے اور ہتھکنڈے لے کے یہاں چلے آئے۔ اب گھڑ رہے ہیں' ایک ایک بت گھڑتا چلا جا رہا ہے۔ اب اگلے درس میں یہ بات آئے گی کہ انہوں نے پھر ان کے لیے خود انہی میں سے کس طرح ایک بت تراش کے دیدیا۔ ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 82 تک آ گئے' عزیزانِ من! 83 سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

نواں باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 83 تا 95)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝۸۳ قَالَ هُمْ اُولَاۗءِ عَلٰٓي اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝۸۴ قَالَ فَاِنَّا قَدْ
فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝۸۵ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ڬ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ
يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ڛ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝۸۶ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا
فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝۸۷ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ڬ
فَنَسِيَ ۝۸۸ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ڏ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝۸۹ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ
قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ
عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝۹۱ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ
اَمْرِيْ ۝۹۳ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّىْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ
تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝۹۴ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝۹۵

عزیزانِ من! آج مئی 1976 کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰهٰ کی آیت 83 سے ہو رہا ہے: (20:83)۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی مسلسل داستان چلی آ رہی ہے۔ مقام وہ آ گیا ہے جہاں یہ مصر سے نکل کر' فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کر کے' سینا کے صحراؤں میں' آزاد فضا میں' بال کشائی کے لیے آ گئے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے دو نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام تو یقینی طور پہ ساتھ ہیں اور کہا جاتا ہے کہ آگے چل کر حضرت شعیب علیہ السلام بھی ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جن کے ہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی شادی ہوئی تھی' وہ حضرتِ شعیب علیہ السلام تھے۔

پہلے یہ دیکھیے کہ یہ قوم کیا تھی؟ یہ نبیوں کی اولاد اور اولاد بھی خالص نبیوں کی تھی کیونکہ یہ بنی اسرائیل غیر بنی اسرائیل میں شادی نہیں کیا کرتے تھے۔ یہ قوم کتابوں کی وارث تھی۔ یہ مصر میں آ کے رہی تو اس نے اپنا الگ تشخص بھی باقی رکھا لیکن اتنا عرصہ یہ اس قوم میں رہی جو حاکم قوم تھی۔ یہ تو وحی کی حامل قوم تھی۔ اِس پوری تعلیم و تربیت کے خلاف اہلِ مصر کی معاشرت' ان کا طرزِ تمدن اور بود و ماند ہی اختیار

نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان کے عقائد تک بھی اپنا لیے اور عقائد میں بھی بنیادی عقیدہ توحید کا آتا ہے' اِس نے وہ بھی اپنا لیا۔ اس قسم کی توحید پرست قوم خالصتاً بُت پرست ہوگئی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام ان کو لے کر نکلے ہیں تو پہلے ہی راستے میں کوئی گاؤں آیا۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی بُت پرستوں کی قوم بُت کی پوجا کر رہی ہے۔ یہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر کھڑے ہوگئے کہ ہمیں بھی ایک ایسا ہی بُت بنوا دیجیے۔ اقبالؒ (1938 -1877) نے ہم لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ یہاں جو آ کے مسلمان رہے تو

خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ ❶

مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ

عزیزانِ من! ماحول کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اسی لیے خدا پرست یا دین کی حامل قوم کی بھی مسلسل تعلیم و تربیت ہوتی رہنی چاہیے۔ آج اگر ہم بھی جو پِٹ ہوئے اور دین کچھ کا کچھ بن کے رہ گیا تو اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ جو غیر قومیں شاباش مسلمان ہوئیں' بالخصوص یہ ایرانی مسلمان تو ہو گئے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہوا' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نام کے تو مسلمان ہو گئے۔ لیکن اپنے تمام عقائد وتصورات' نظریات اور تخیلاتِ زندگی جو پہلے تھے وہ انہیں ساتھ لے کے آئے' بس ان کا نام ہی بدلا۔ انہوں نے اپنا نام اب ''دیوداس'' کی جگہ ''عبدالرحمٰن'' رکھ دیا اور یہی جتنی ''دیوداسی'' تھی' اب اسلام بن کے آگے چل پڑی۔ اس کے بعد وہ جتنے جوہر اور صلاحیتیں دین نے پیدا کی ہوئی تھیں' آہستہ آہستہ وہ بھی سلب ہوتی گئیں یعنی خود عرب بھی تھے وہ بھی عجمی ہو گئے۔ یہ اثر ہوتا ہے دوسری اقوام کی صحبت کا۔ اور پھر اگر وہ اقوام غالب ہوں تو ان کا تو پوچھو ہی نہیں! محکوم اقوام تو ہمیشہ کرگسوں کی بستی ہوا کرتی ہیں۔ یہ وہی کچھ ہے جو علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938-1877) نے کہا تھا:

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

عزیزانِ من! کرگسوں میں پلنے کا قوموں پر یہ اثر ہوتا ہے۔ اور پھر حاکم قوم کا تو ہر انداز اپنے اندر شانِ محبوبیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ بہر حال' بات یہ ہو رہی تھی کہ جب مصر سے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر سینا کی وادی میں آ گئے' تو پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی مقصد کے لیے تھوڑے سے دنوں کے لیے قوم سے الگ ہوئے۔ وہ الگ ہوئے تو انہوں نے بنی اسرائیل کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا۔ حضرتِ ہارون علیہ السلام جو نبی ہیں' صاحبِ کتاب ہیں' سے کہا کہ هٰـرُوْنَ اخْـلُـفْـنِیْ (7:142)۔ میرے بعد میری جانشینی کرنا اور وارننگ (تنبیہ) دی تھی کہ وَلَا تَتَّبِـعْ سَبِیْـلَ الْمُفْسِدِیْنَ (7:142)۔ اور دیکھنا! ان میں ایسا شرارتی عنصر بھی ہے جو انتشار پیدا کرنا چاہتا

---

❶ ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ (اقبالؒ)

ہے'ان کی راہ نہ چلنا' اُن سے محتاط رہنا۔ اس بات کو کھول کر بتا دیا کہ یاد رکھو! میں ابھی ان کے اندر اس قسم کے Elements' عناصر ' دیکھ رہا ہوں جو بڑے سازشی ہیں خاص طور پہ ان کا دھیان رکھنا کہ کہیں وہ انہیں گمراہ نہ کر دیں۔ وہ تھوڑے سے وقت کے لیے ادھر گئے۔ اور انہوں نے بچھڑے کا بُت بنایا اور اتنے میں ہی اس کی پرستش شروع کر دی۔ ابھی آگے اس کی تفصیل آتی ہے لیکن یہاں اس کی ذرا وضاحت ضروری ہے کہ یہ سانڈ یا بیل یا گائے کی شکل کا بُت تھا' جس کی یہ پرستش کر رہے تھے۔ یہ مصریوں کا اور اہلِ فرعون کا' سب سے بڑا دیوتا تھا جس کی یہ سب پرستش کرتے تھے۔

بچھڑے کا بُت بنالیا

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ایک عجیب غلط فہمی چلی آتی ہے اور ضمناً ذکر آ گیا ہے تو اس کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ توبہ میں ہے کہ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ (9:30) (یہ اہل کتاب وہ ہیں کہ ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آ جانے کے بعد بھی ان کی حالت یہ رہی کہ ان میں سے) یہودیوں نے مصری دیوتا عزیر (Osiris) کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ (9:30)۔ اور عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا۔ اس طرح عیسائی تو حضرتِ مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہی ہیں اور قرآن میں یہ ہے کہ یہودی عزیر کو ابن اللہ کہتے ہیں۔ اب یہ بات کہ یہ عزیر کون تھا جسے یہ ابن اللہ کہتے تھے؟ یہودیوں نے تو وہیں اس کی تردید کر دی تھی۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو عزیر کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ اب ہمارے ہاں روایات اور تفاسیر میں اس کے متعلق عجیب قسم کی وضاحتیں آتی ہیں جن میں سے کوئی بھی قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ ہمارے ہاں انہوں نے عزیر کو عزرا سمجھا۔ یہودیوں کے عزرا کا بہت بڑا مقام ہے۔ یہ جو ان کے ہاں کی مروجہ تورات ہے' یہ اسی نے مرتب کر کے دی تھی۔ خود مروجہ تورات کو عہد نامہ عتیق (Old testament) کہتے ہیں۔ [1] اس کے سلسلہ اول کو کتبِ موسیٰ کہا جاتا ہے۔ عزرا (فقیہہ) نے اسفارِ موسیٰ وغیرہ کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں عزرا نبی کی دو کتابیں (عزرا اول و دوم) خود اپنے متعلق ہیں۔

---

[1] کہا جاتا ہے کہ عزرا نبی۔ (یاد رہے کہ یہودی لٹریچر میں نبی کا لفظ قرآنی اصطلاح کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ اس سے ہیکل کا ایک اعلیٰ منصب مراد تھا۔ تورات میں عزرا کو فقیہہ کہہ کر پکارا گیا ہے)۔ نے تورات یعنی سلسلہ اول کی پانچ کتابوں ...... اسفار...... (پیدائش' خروج' احبار' گنتی' استثناء) کو از سر نو مرتب کر کے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلم بند کیا۔ عزرا نے ان کتابوں (اسفار) کو کس مواد (Material) سے از سر نو مرتب کیا تھا' تاریخ اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ عزرا (فقیہہ کے بعد) نحمیاہ نبی نے سلسلہ دوم کی چھوٹی بڑی 22 کتابوں کو جمع کیا۔ اس کے بعد فلسطین کی طرف یونانیوں کا سیلاب آیا اور 168 ق م میں انٹونیس (انطاکیہ کے یونانی بادشاہ) نے مقدس صحیفوں کو جلوایا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے مقدس صحیفوں کو از سر نو جمع کیا گیا اور اس مرتبہ پہلے دو سلسلوں کے ساتھ سلسلہ سوم کی 12 کتابوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ (پرویزؒ: مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں' 1996' ص ص۔ 21-17)

منصب نبوت اور پیش گوئیاں

عزیزانِ من! پہلی بات تو یہ یاد رکھیے کہ یہ جو یہودیوں کے ہاں نبی کا لفظ آتا ہے' یہ ضروری نہیں ہے کہ قرآن نبی کا لفظ جن معنی میں استعمال کرتا ہے یہ اسی معنی میں استعمال کر رہے ہوں۔ وہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بھی نبی تھے' وہ انہیں نبی کہتے تھے لیکن ان کے ہاں' ان کے ہیکل میں' ان کے مندر میں' ان کی پرستش گاہ میں' ایک منصب تھا جسے وہ منصبِ نبوت کہتے تھے۔ اس کے معنی تھے: پیش گوئیاں کرنا' قسمتیں بتانا' ہاتھ دیکھنا' فالیں نکالنا۔ یہ اسے پیش گوئی کے معنی میں لیتے تھے اور پھر ہمارے ہاں بھی انہی کی دیکھا دیکھی نبی کے معنی پیش گوئیاں کرنے والا لے لیا گیا' اور نبوت کا مدار پیشگوئیوں پر رہ گیا۔ ہمارے ہاں کی جو پنجابی نبوت [1] ہے اس کا تو سارا مدار ہی پیش گوئیوں پر ہے یعنی اس لفظ کے معنی ہی یہ لے لیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مادے کے اعتبار سے یہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن نبی کی قرآنی اصطلاح کا یہ مفہوم نہیں ہے۔

نبی کے معنی ہی مقام بلند پر فائز ہونا ہے

قرآنِ کریم نے جو نبی کہا ہے' وہ پیش گوئیاں کرنے والا نہیں ہے۔ وہ "نَبْوَۃٌ" سے ہے' جس کے معنی ہیں: مقامِ بلند پر فائز ہونا' ایسے مقام پہ جس کی تشریح نبی اکرم ﷺ نے خود فرما دی۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس واقعہ کی! اس میں نبوت کے صحیح معنی آجاتے ہیں۔ نبوت ملنے کے بعد پہلی دفعہ حضور ﷺ نے قریش کو آواز دی۔ ہوا یہ تھا کہ آپ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ٹیلے پہ کھڑے ہوگئے اور وہ آواز دی جو' ان عربوں کے ہاں طریقہ تھا: جہاں کوئی دشمن آ رہا ہو' بہت بڑا خطرہ اٹھ کے آ رہا ہو' تو جو آواز دیتے ہیں وہ آواز آپ نے دی۔ قریش بھاگے ہوئے چلے آئے۔ نیچے آ کے کھڑے ہوگئے۔ کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ نے فرمایا کہ اگر میں یہ بات کہوں کہ پہاڑی کے اس پار ایک بہت بڑا لشکر ہے' جو حملہ کرنے کے لیے آیا ہے تو کیا وہ صحیح مانو گے؟ انہوں نے کہا کہ مانیں گے۔ مانیں گے کیوں نہیں۔ آپ کہنے لگے کہ کیوں صحیح مانو گے؟ قریش کہنے لگے کہ آپ نے ساری عمر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ بڑی چیز ہے۔ آپ نے کہا کہ ایک اور بات بھی ہے! تم اس مقام کے اوپر ہو جہاں تم صرف اِدھر کی باتیں دیکھ رہے ہو' میں اس مقام پہ ہوں جہاں اِدھر کی باتیں دیکھ رہا ہوں اور اُدھر کا بھی دیکھ رہا ہوں' تو اس کی بات زیادہ سچی ہوگی جو دونوں طرف دیکھ سکے۔ کہنے لگے کہ ہاں ٹھیک ہے۔ اس پر آپ صلعم کہنے لگے کہ مقامِ نبوت وہی ہوتا ہے کہ جو اس دنیا پہ بھی نگاہ رکھتا ہو' اُس دنیا پہ بھی اُس کی نگاہ ہو اور اس علم کو وحی کہتے ہیں اور اس کی رو سے میں تمہیں کہنے والا ہوں کہ یہ تیغ و تفنگ والا لشکر تو اِس طرف سے نہیں آئے گا۔ تم زندگی کی جس روش پہ چل رہے ہو' وہ تمہیں تباہ کر دے گی۔ نبی کے بات سمجھانے کی کیا بات ہے! میں تو وہ بات آگے چل کے بتاؤں گا کہ قریش نے کیوں نہ مانا؟ حقیقت میں چچا ابولھب یا

---

[1] اس سے اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کی طرف ہے۔

دوسرے اپنے ہی تو تھے۔ انہوں نے کہا کہ اس کام کے لیے صبح صبح ہم کو بلایا تھا؛ ہم نے کہا کہ کوئی دشمن آ رہا ہے۔ بہر حال مجھے کہنا یہ تھا کہ نبوت کا یہ صحیح مقام اس لفظ نَبُوَۃٌ سے ہے۔ یہ ایسے مقامِ بلند پہ کھڑا ہونا ہے کہ ادھر کی دنیا پہ بھی اس کی نگاہ ہو کیونکہ اس نے یہیں کے معاملات تو سنوارنے ہیں لیکن وہ ان معاملات کو اُدھر کی دنیا کے حقائق کی روشنی کے اندر ہی سنوارے گا' اسی لیے حالی [1] نے بڑے ہی صحیح معنوں میں کہا ہے کہ:

اتر کر حِرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

تلاشِ حقیقت میں غاروں میں جانے والی روایت بھی صحیح نہیں ہے

عزیزانِ من! میرے نزدیک یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے کہ آپ تلاشِ حقیقت میں تھوڑے سے ستو اور پانی لے کے غاروں میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں جا کے گیان دھیان میں بیٹھے رہا کرتے تھے اور پھر وہیں ایک دن آپ کو نبوت کا انکشاف ہوا۔ یہ چیز صحیح نہیں ہے۔ عربوں کے ہاں اس کا رواج ہی نہیں تھا' اس کا سوال ہی نہیں تھا۔ ان کے ہاں اس وقت تک تصوف آیا ہی نہیں تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ان قریش وغیرہ کے ہاں ہر قسم کے غلط عقائد تو ملتے ہیں' لیکن یہ چیز کہ غاروں میں جا کے تپسیا کرنا' گیان دھیان کرنا' اور خلوت کدوں میں جانا یہ کچھ عیسائیوں کے Saints (پادریوں) کے ہاں تو موجود تھا مگر عربوں کے ہاں یہ چیز بالکل موجود نہیں تھی۔

تصوف کی آمد' خانقاہوں کی ایجاد اور کشف والہام کے قصے

عزیزانِ من! جب بعد میں ہمارے ہاں تصوف آیا ہے' انہوں نے اپنے ہاں خانقاہیں ایجاد کیں' خلوت کدے آئے اور انہوں نے وہاں غاروں میں زاویوں اور دائروں کی صورت میں بیٹھ کے چالیس چالیس دن کے چلے کرنا شروع کیے تو اس کی کہیں سے سند نہیں ملتی تھی۔ اس کی سند کے لیے اس قسم کی روایتیں گھڑ لی گئیں کہ صاحب! رسول اللہ ﷺ بھی یہی کیا کرتے تھے یعنی آپ کو نبوت بھی ان ریاضتوں اور چلوں کے صدقے میں ملی تھی' انہیں بھی وہ کشف والہام اسی طرح ملتا ہے' بس اُنہیں یعنی رسول اللہ کو ملنے والا کشف والہام ذرا تھوڑا اونچے درجے کا ہے اور انہیں ملنے والا یہ ذرا چھوٹے درجے کا ہے لیکن اس کے حاصل کرنے کا طریقہ تو وہی تھا۔ وہ بھی غاروں میں ستو اور پانی لے کر جایا کرتے تھے اور ہم بھی اب ستو اور پانی لے جا کر اسی طرح کے غاروں میں چلے کرتے ہیں اور خلوت کدوں میں چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی وہاں گیان دھیان کچھ اس قسم کا کیا کرتے تھے' ہم بھی اسی طرح سے مراقبے اور ریاضتیں کرتے ہیں۔ انہیں ایک دن انکشاف ہو گیا' اسی طرح سے ہمیں بھی انکشاف ہوتا ہے۔ اپنے اس کشف والہام اور اس خانقاہیت کی دلیل کے لیے یہ کچھ وضع کیا

---

[1] مولانا الطاف حسین حالی (1837-1914): مسدس حالی' تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور' ص:15

گیا کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح غاروں میں جا کے تپسیا[1] کیا کرتے تھے (معاذ اللہ) عزیزانِ من! جس نبوت کے متعلق قرآن حضور ﷺ سے یہ کہہ رہا ہے کہ تُو تو کل تک یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں، نبوت اور ایمان ہوتا کیا ہے، لیکن وہ جو غاروں میں جا کے تیاریاں کر رہا ہؤا اسے تو معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ میں یہ کر رہا ہوں اس لیے اس کا آخری نتیجہ یہ ہوگا۔ انہیں تو وہ کہے گا کہ میں کل تک اس حیثیت سے مانا جاؤں گا۔ یہی تو وہ چیز ہے کہ یہ علم خارج سے آنے والا ہوتا ہے، اس کے لیے یہ شخص یوں خلوت کدوں میں تیاریاں کر کے اس کو حاصل نہیں کرتا۔ یہ چیز تو اکتسابی ہوگئی جسے آپ اور یہ تصوف والے کشف اور الہام کہتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں سوائے اس کے کہ یہ ایک خود فریبی ہے۔ لیکن اگر آپ نبوت کو بھی اسی کیٹگری میں، اسی زمرے میں، شمار کرتے ہیں اور نبوت حاصل کرنے کا طریقہ وہی بتا رہے ہیں جو سادھوؤں اور سنیاسیوں کا، فقیروں کا، سینٹس کا، ہوتا تھا تو پھر ان دونوں میں فرق کیا ہوا۔ عزیزانِ من! ہمارے خلاف یہ بڑی سازش ہوئی ہے۔ نبی اس طرح سے غاروں میں جا کے تپسیا نہیں کیا کرتے تھے تاکہ انہیں نبوت مل جائے۔ یہاں ہمارے لٹریچر میں یہ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چراتے چراتے آگ کی تلاش میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے آواز مل جاتی ہے تو وہ کونسے غاروں میں بیٹھے تھے، بہر حال بات میں نبوت کی کہہ رہا ہوں کہ نبی مقامِ بلند پہ فائز ہوتا ہے۔

یہودیوں کے ہاں نبی کا تصور

عزیزانِ من! یہودی جسے نبی کہتے تھے وہ ان کے ہاں ہیکل میں ایک منصب ہوتا تھا اور یہ بھی کہ وہ اپنے ہاں ان دونوں (نبی بحثیت ہیکل کے منصب دار اور رسول اللہ) میں فرق نہیں کرتے تھے۔ ان کے ٹیمپل میں ان کے ہیکل، میں منصب دار ہوتے تھے، وہ اسے بہت بڑا مانتے تھے۔ وہ پیشن گوئیاں (Prophasies) کیا کرتا تھا۔ وہ عبرانی اعتبار سے اسے نبی کہا کرتے تھے۔ یہ وہ ہیں جو آپ کو تورات میں نبی کے لفظ ملتے ہیں۔ یہ حضرات اس طرح انبیاء کرام نہیں تھے جیسے قرآنِ کریم نے بتایا ہے، بلکہ حقیقت میں یہ وہ نبی تھے، جو ان یہودیوں کے ہاں ہیکل میں منصب دار ہوتے تھے۔ یاد رکھیے، قرآن نے یہ تو کہا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں نبی بھیجے ہیں۔ مجمل طور پہ تو ہم مانیں گے کہ ہر قوم میں نبی آئے جنہیں وہ اپنے مذہب کا بانی کہتے ہیں، ہم ان کا احترام کریں گے کہ ہاں ہوسکتا ہے کہ یہ بھی اپنے وقت میں نبی ہوں لیکن متعین طور پر اسی کو نبی کہیں گے جسے قرآن نے نبی کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن یہاں جو عزرا تھے انہیں تو قرآنِ کریم نے نبی کہہ کے نہیں پکارا۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا ہے کہ یہودیوں کے ہاں عزرا کو نبی بھی کہا جاتا ہے، انہیں عزرا فقیہہ بھی کہا جاتا ہے۔ اصل میں عزرا (فقیہہ) نے عہد نامہ عتیق (Old Testament) کو محض حافظہ کی مدد سے از سر نو تحریر کیا کیونکہ ان کتابوں کے تمام نسخے

---

[1] خدا کی بندگی، سخت ریاضت، گناہوں کا کفارہ

تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو چکے تھے۔ ❶ عزرا (فقیہہ) کی کتابیں تورات میں شامل ہیں۔ تو ہمارے ہاں کے روایت کرنے والوں میں یا بعد میں مفسرین نے یہ سمجھا کہ یہ جو عزیر ہیں یہ حقیقت میں عزرا ہے؛ اس پر ان یہودیوں نے پھر اعتراض کر دیا کہ ہم تو عزرا نبی کو بھی ابن اللہ نہیں مانتے؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عزیر یہودیوں میں بڑی عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ ❷ بہر حال یہ بات الجھاؤ میں رہی؛ قرآن کریم نے صرف یہ کہا ہے کہ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ (9:30) یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔ قرآن کریم نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔ نہ ہی زمرۂ انبیائے کرام میں ان کا نام لیا ہے۔ اس لیے ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ آپ قرآن کی اصطلاح میں نبی تھے یا نہیں۔ آگے چل کے تحقیق ہوگی تو یقینی طور پہ یہ معلوم ہو جائے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ کوئی عزیر ہے جسے یہ یہودی مانتے تھے البتہ تحقیق کے بعد ہم بتائیں گے کہ یہ کیا تھا۔

انسان کی خام خیالی اور خدا کا تصور

اہل مصر کا جو سب سے بڑا دیوتا تھا آپ اسے سانڈ کہیے؛ بیل کہیے؛ گائے کہیے؛ بچھڑا کہیے؛ اس کا سر بیل کا ہوتا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ جتنی بھی Agriculturist (زراعتی) قومیں تھیں؛ جن کی معیشت کا مدار زراعت پہ تھا؛ وہ بیل کو دیوتا بنا دیتی تھیں تاکہ وہ محفوظ رہے جیسے ہندوستان کے آریہ۔ جب یہ یہاں آئے تو ان کے ہاں سورج کی حرارت؛ دریا کا پانی؛ اور بیل بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ تو ان چیزوں کی Protection (حفاظت) کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ انہیں دیوتا بنا دیا جائے۔ اسی طرح سے؛ اس قسم کے موسم میں؛ جہاں گرمی شدت کی پڑتی ہو؛ پیپل بھی دیوتا؛ بڑھ بھی دیوتا؛ بنا دیا گیا۔ یہ بڑے بڑے درخت ہیں جن کے سایہ تلے بیٹھنا ہوتا ہے اس لیے انہیں دیوتا بنا دیجیے تاکہ لوگ انہیں لوٹ کھسوٹ کے ہی نہ لے جائیں۔ اس طرح سے انسان کی خام خیالی؛ یوں خدا کے تصور میں ڈھلی۔

عزیزانِ من! عام طور پہ آپ قبر پر دیواریں بناتے ہیں؛ یہ اینٹیں ہیں۔ آپ ان دیواروں اور اینٹوں کو دیکھ لیجیے گا اگر یہاں چوکیدار نہ بٹھایا ہو تو چھ مہینے میں ایک اینٹ بھی باقی نہیں بچتی۔ اور اگر انہی دیواروں کا مقبرہ بنا دیا جائے تو آپ وہاں دیکھیے گا کہ لوگ آکر سجدے کرتے ہیں؛ اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ جیسے میں نے کہا تھا کہ وہ جو زرعی قومیں تھیں؛ ان کے جو سیانے تھے؛ انہوں نے یہ سوچا کہ یہ جو

---

❶ دراصل یہ سائیکلو پیڈیا آف بائبلیکل لٹریچر (Cyclopedia of Biblical Literature) میں کیٹو (Kitto) کا بیان ہے جو پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی کتاب ''مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں'' کے صفحہ 19 پر درج کیا ہے۔

❷ جب یہودی بابل کی اسیری کے بعد یروشلم میں واپس آئے تو کتاب مقدس (تورات کا مجموعہ کتب) ان سے ضائع ہو چکا تھا۔ کتاب نحمیاہ (باب 8) میں تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تورات کے سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو عزرا نبی نے (یا عزرا فقیہہ) نے دوبارہ مرتب کیا۔ موجودہ تورات میں خود کتاب عزرا بھی موجود ہے جس میں عزرا نبی نے بتایا ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو کیسے از سر نو مرتب کیا۔ یہ قریب ساڑھے چار سو سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ (پرویز: لغات القرآن جلد سوم؛ 1961 ؛ ص ص۔ 1160 - 1159)

چیزیں ہیں انہیں مقدس بنا دو' انہیں دیوتا بنا دو۔ یہ کرنا انہیں لوٹ' کھسوٹ سے بچانے میں مدد دے گا۔ ایسے ہی ہوا۔ اسی لیے گائے کا ہندوؤں کے ہاں ذبح کرنا حرام ہے۔ یہ بات زراعت کی وجہ سے ہی ہے کیونکہ اگر گائے کو ذبح کر کے کھاتے چلے جائیں تو ان کے ہاں بیل ہی پیدا نہ ہوں۔ اول تو دودھ دینے والی گائے ہی ختم ہو جائے' دوسرا یہ کہ بیل پیدا نہ ہوں اور بالآخر زراعت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زراعتی معیشت کو بحال رکھنے کے لیے' جن اشیاء پر معیشت و زراعت کا دارومدار تھا' انہیں دیوتا بنا دیا۔

گائے کو ماتا' گنگا کو دیوی' پیپل کو دیوتا' بنا دیا گیا لیکن کیوں؟

عزیزانِ من! انہیں محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے اس کا طریقہ یہ سوچا کہ گائے کو ماتا بنا دیجیے' گنگا کو دیوی بنا دیجیے تا کہ پانی ضائع ہی نہ کریں' پیپل کو دیوتا بنا دیجیے تا کہ لوگ پتے وغیرہ کھسوٹ کے نہ لے جائیں۔ ان مصریوں کے ہاں بھی چونکہ زراعت ہی معیشت تھی اس لیے نیل کی پرستش تو ہوتی تھی اور اس میں آپ کو پتہ ہے کہ یہ ہر سال ایک انسان کو دریائے نیل کی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے تا کہ اس کی طغیانیوں میں فرق نہ آ جائے یعنی دریا کے پانی کے بہاؤ کے لیے زندگی کو قربان کیا کرتے تھے۔ انہی میں یہ ایک سانڈ دیوتا تھا جسے آپ بیل کہیے' گائے کہیے' بچھڑا کہیے' اس کے سر کی شکل سانڈ کی سی ہوتی تھی۔ یہ اس کی پرستش کرتے تھے۔ ان چیزوں کو اس لیے دیوتا بنا دیا کہ وہ بحفاظت رہیں اور ان کی معیشت قائم و دائم رہے۔ اب یہ تحقیق ہوئی ہے کہ ان کے ہاں یونانی میں عزیر کا نام کیسے آیا۔ اس کی تفصیل نیچے درج ہے۔

طغیانیوں کے بچاؤ کے لیے انسانوں کو بھینٹ چڑھانا

یونانی زبان میں اسماء ہوتے ہیں' یہ Nouns ہوتے ہیں' یہ نام ہوتے ہیں' اور ان کے آخر میں جو ''ایف'' آتا ہے وہ درحقیقت ''ی'' ہوتا ہے۔ یونانی میں ''اسرا'' دراصل عبرانی میں ''اسری'' تھا۔ وہ ''عزرا'' تھا۔ عبرانی میں ''عزری'' ہے۔ اس لیے یونانی کا ''اسرا'' عبرانی کا ''اسری'' اور اس طرح یونانی ''عزرا'' عبرانی کا ''عزری'' تھا۔ یہی ''عزری'' مصر میں ''عزیز'' تھا۔ مصری اس کی پوجا کرتے تھے' پرستش کرتے تھے اور اس دیوتا کو ابن اللہ مانتے تھے۔ یہ بنی اسرائیل مصر میں اسی کی پرستش کرتے تھے۔ ان مصریوں کی دیکھا دیکھی وہ بنی اسرائیلی بھی [1] اسے یہی کچھ مانتے تھے۔ اس طرح یہ اس عزیر کو ابن اللہ مانتے تھے جس کا اب آگے انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔

عزیزانِ من! کیا بات ہے اس قرآن کی! اب ان کے ہاں جو انسائیکلوپیڈیا آ رہا ہے اس کے اندر یہ چیز ہے کہ وہ یہی عزیر تھا جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات

---

[1] مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (بچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی۔ (پرویز: لغات القرآن جلد سوم' 1961ء۔ ص۔ 1161)۔

واضح ہوگئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود تھا۔ لیکن ان کے ہاں غلطی یہ ہوگئی کہ انہوں نے ''اسرا'' کو ''اسری'' لیا اور پھر ''اسری'' کو عبرانی میں اسیری لکھا۔ اور اس طرح لفظ عزیر کو اسیر لکھ دیا اور اس ''اسیر'' کا ترجمہ ''قیدی'' کر دیا گیا۔ یہ ان کی تحقیق ہے۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ یہاں یوں غلطی ہوگئی ہے؛ یہ عزیر ہے اور یہ ہے جسے وہ ابن اللہ مانتے تھے۔ اب اس سلسلہ میں ہمارے ہاں کوئی تحقیق نہیں کی۔ ابھی پتہ نہیں ہے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں یہ عزیر حضرتِ عزیرؑ بنے ہوئے ہیں اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں تو عزیر نام رکھتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ عیسائی حضرتِ مسیحؑ کو ابن اللہ مانتے تھے اور مسیح بھی ہمارے انبیاء کرام میں سے تھے اور یہودی عزیر [1] کو ابن اللہ مانتے ہیں۔ یہ بھی نبی ہی تھے۔ ٹھیک ہے جی! ہمارے ہاں نام رکھا جاتا ہے' ایک دشواری یہ ہوگئی کہ باپ کا نام زبیر ہے' بیٹا پیدا ہوا تو آپ کو معلوم ہے کہ صاحب! شاعری تو ان کے ہاں رگ وریشہ میں رچی ہوئی ہے۔ کیا کریں؟ زبیر کا ہم کافیہ عزیر ہوگا۔ ٹھیک ہے جی۔ بیٹے کا نام عزیر رکھ لیا۔ بہرحال' میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے کہ یہ عزیر کیا ہے جس کو ابن اللہ مانتے تھے؟ اب انہوں نے اس چیز کو تسلیم کیا ہے کہ واقعی یہ اسری تھا اور اسے ''اسرا'' کہتے تھے۔ وہاں یہ وہی ہے' جو اسری سے عزری بنا۔ یہ وہی لفظ ہے جو عزری سے عزیر بنا اور اس کو ابن اللہ مانا جاتا تھا۔ قرآن چودہ سو سال پہلے یہودیوں کی موجودگی میں کہتا ہے اور یہودی انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں' تحقیق کرو' پھر تمہیں اپنے متعلق کچھ پتہ چلے گا۔ کیا بات ہے قرآن کی کہ ان کے ہاں کی جو غلط چیزیں ہیں یہ ان کی بھی تصحیح کر رہا ہے' اور یہودیوں سے قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ ہماری آنکھ سے دیکھو:

ہماری آنکھ سے دیکھو جو تم کو بتلائیں
ادا تمہاری جو تم بھی کہو کہ ہاں کچھ ہے

ان کے ہاں کے عزیر کے متعلق تحقیقات قرآن دیتا ہے اور خود ان کے ہاں کے جو محققین (Researchers) ہیں وہ بھی قرآن کی تصدیق کرتے ہیں یا ان یہودیوں کی تردید کر رہے ہیں۔ بہرحال یہ تھا کہ عزیر دیوتا کی پرستش ہو رہی تھی۔

---

[1] مصر کے آثار قدیمہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے' عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم وبیش چار ہزار سال قبل مسیح' عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوند اعلیٰ ''آمن رع'' کی نسل سے اور خداوند ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے ایک صحیفہ برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔ ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عزرا نبی۔ (پرویز: لغات القرآن جلد سوم' 1961' ص۔ 1161)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توجہ مبذول کروانا

اب بات یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جیسی انقلابی شخصیت کے سامنے سو پروگرام ہوتے ہیں۔ان کے لیے انہیں تخلیہ چاہیے' کہیں علیحدگی بھی چاہیے۔قرآن نے یہ بتایا کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو وادئ سینا میں چھوڑ کر کسی کام کے لیے طُور پر آ گئے۔قرآنِ کریم بات یہاں سے شروع کرتا ہے کہ اُدھر گئے تو خدا نے ان سے کہا: **وَمَآ اَعْجَلَکَ عَنْ قَوْمِکَ یٰمُوْسٰی** (20:83)۔اور (داستان کے اس حصے کو بھی یاد کرو) جب ایک دفعہ موسیٰؑ (طُور پر حاضر ہوا تو ہم نے کہا کہ) اے موسیٰ! تو اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں جلدی سے کیوں چلا آیا۔ابھی کچھ وقت اوران کی تربیت کرنا چاہیے تھی۔عزیزانِ من! قرآن کے بات کہنے کا کیا انداز ہے! اوئے تینوں ایہڈی چھیتی پئی ہوئی ہیگی سی' اونہاں نوں ایسے طرح چھڈ کے تر آیاں ہیگا' چھیتی پئی ہوئی ہیگی۔ [1] اوہ! کیا بات تھی جس کے لیے تم نے یہ کیا کہ انہیں اتنی جلدی چھوڑ کے ویسے ہی چلے آئے۔**قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓی اَثَرِیْ وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضٰی** (20:84)۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ وہ میرے پیچھے' میرے نقشِ قدم' پر ٹھیک چل رہی ہے (اس لیے میری اس عارضی غیر حاضری سے کچھ حرج نہیں ہو گا)۔میں جلدی اس لیے چلا آیا کہ (تجھ سے مزید احکامات حاصل کر کے) ان کے مطابق عمل پیرا ہوں (اور یہ پروگرام جلد از جلد تکمیل تک پہنچ جائے) اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں' وہ میرے نقشِ قدم پہ' میری تعلیم پہ' میری تربیت' پہ چل رہے ہیں۔یہاں قرآنِ کریم نے ''اَثَــرِیْ'' کہا۔یعنی کہ وہ میرے نقشِ قدم پہ چل رہے ہیں۔اور میں نے تو اتنی سی بات کی ہے کہ تیرے جو احکام ہیں' ان سے ہم آہنگی کے لیے' کچھ پروگرام بنانے کی' کچھ پروگرام سوچنے کی فکر کی ہے' یا اس قسم کی چیزیں ہیں کہ تجھ سے مزید احکامات حاصل کر کے ان کے مطابق عمل کروں اس لیے وہاں سے آ گیا تھا۔**قَالَ** (20:85)۔خدا نے کہا کہ ہاں' تم تو یہ سمجھ کے آ گئے تھے کہ کچھ نہیں لیکن پتہ بھی ہے کہ تمہارے پیچھے کیا ہوا؟ کہنے لگے: کیا ہوا؟ کہا کہ **قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَکَ مِنْۢ بَعْدِکَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ**(20:85)۔تیرے پیچھے تیری قوم ایک مصیبت میں پھنس گئی ہے اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔ہوا یوں تھا کہ تیرے بعد آتے ہی' وہ تیری قوم فتنے میں مبتلا ہو گئی اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا' تباہ کر دیا۔

---

[1] اے حضرت! تجھے آنے کی اتنی جلدی تھی کہ تم انہیں اسی طرح چھوڑ کر چلے آئے ہو۔کیا تجھے اتنی ہی زیادہ عجلت تھی؟

سامری کون تھا؟

عزیزانِ من! میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ سامری کیا ہے؟ یہودیوں کے ہاں تو یہ ایک قوم ہے [1] جو اسرائیلی قبائل میں سے ہے۔ اس طرح سامری اس قبیلہ سے متعلق تھا۔ لیکن اگر اَلسَّـامِرِیُّ کی اصل سَـمَرٌ ہے تو عربوں کے ہاں اس کے معنیٰ ''داستان گو'' یعنی قصے کہانیاں کہنے والے کے ہیں۔ ان کے ہاں ''س م ر'' کا الگ مادہ ہے اور یہ ہوتا ہے: داستاں گو' واعظ' وہ جو راتوں کو نانی اماں بچوں کو سلانے کے لیے کہانیاں سناتی ہیں۔ انہی خطوط پر قوموں کو سلانے کے لیے جو داستانیں سناتا ہے اس کو یہ عرب سامری کہا کرتے تھے۔ ہر واعظ سامری ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں کی یہ وعظیں' یہ داستانیں' پھر یہ قصے: آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟

عزیزانِ من! قصے سنانا' داستانیں سنانا ہے' کچھ زیبِ داستاں کے لیے بڑھا بھی دینا' سامریت ہوتی ہے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ وادیٔ سینا میں سامری ساتھ آ گیا۔ بس ان سامریوں کے بڑے دلکش قصے ہوتے ہیں۔ وہ قصے کرتے کیا ہیں؟ یہ قصے انسانی ذہن کو بچپن کی سطح پہ رکھتے ہیں: کالی پری تے لال دیؤ سبز پری تے کوہ کاف۔ یہ کہانیاں بچوں کی Imagination (تصور) سے دیکھیے کہ کہاں لے جاتی ہیں۔ یہ سامری اس قسم کے سارے تصورات ذہنوں کے اندر راسخ کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی یہ جنات اور دیوؤں کے اور یہ پریوں کے قصے کم نہیں ہوتے تھے' بس وہ کرتے یہ ہیں کہ ان قصوں' کہانیوں میں تھوڑا سا تقدس پیدا کرنے کے لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام ساتھ رکھ دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے' اس سے ان قصوں میں تقدس کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اپنے تعویذوں پہ نقوشِ سلیمانی تو

---

[1] یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ چھوت چھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی (جس میں یہ رہتے ہیں) بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں: کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی۔ صاحب محیط نے (اپنی لغت محیط المحیط میں) لکھا ہے کہ السامرة فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے چھو جانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ (اس کے لیے دیکھیے 20:97) اس جگہ قرآنِ کریم میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکایا تھا' ایسا ہی کچھ آیا ہے۔ لیکن عصرِ حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا۔ (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا)۔ حضرت مسیح سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم جو جنوب سے آئی تھی' عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی' سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن نے سامری کہہ کر پکارا ہے (20:85)۔ مصر میں حضرت موسیٰؑ کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی (20:96)۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' 1960' ص۔ 900)

آپ نے دیکھا ہوگا۔ انہوں نے نقشِ سلیمانی نام رکھا ہوا ہوتا ہے۔ بہرحال سامریت جس طرح' قوموں کو گمراہ کرتی ہے اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ ❶

انقلابی تو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کی امانت تصور کرتا ہے

عزیزانِ من! جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تیرے پیچھے تیری قوم ایک مصیبت میں پھنس گئی ہے اور سامری نے اسے گمراہ کر دیا ہے تو فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا (20:86)۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو افسوس کرتا ہوا' اور غصے سے بھرا ہوا' اپنی قوم کی طرف لوٹا۔ نظر آ رہا ہے کہ اتنے بڑے انقلابی کو ایسا غضبان ہونا چاہیے تھا۔ اس نے اس قوم کے پیچھے جان ماردی۔ کیا یہ چھوٹا انقلاب ہے فرعون جیسی قوم کے دستِ تظلم سے بچا کے ایک محکوم قوم کو باحفاظت لے کے چلے آنا؟ تربیت اتنی کی تھی کہ قرآن نے کہا ہے کہ وہاں مصر کے دوران ہی شروع کر دی تھی۔ ابھی کوئی مرکز ملت نہیں تھا' الگ بنانے نہیں دیتے تھے؟ وہاں وہ بنانے کیسے دیں گے؟ تو وہاں انہوں نے کہا تھا کہ کوئی بات نہیں' اپنے اپنے گھر کو قبلہ بنالو۔ یوں تربیت شروع کی۔ ساتھ لے کے نکل آئے۔ یہاں کم از کم دو پیغمبر تربیت کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے بعد یہ کہ یونہی رخ ذرا ادھر کو ہوا اور انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ غصے کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس کے بعد یہ کہتے کہ جاؤ' جہنم میں جاؤ' مجھے اپنی جان کھپانے کی کیا ضرورت پڑی ہے' تمہاری خاطر میں نے یہ کچھ کیا' اگر تمہاری یہی کیفیت ہے تو ٹھیک ہے: جاؤ۔

نبوت تو استقامت' بلند نگہی' اور بلند ظرفی میں اپنی مثال آپ ہوتی ہے

عزیزانِ من! یہ حقیقت ہے کہ نبی ایسا نہیں کہتا۔ اسے غصہ بھی آتا ہے: اسفًا' تاسف ہوتا ہے کہ ''اوہو! یہ قوم کیا کر رہی ہے۔'' نبی کا منصب بڑا ہی ہمت شکن ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! غصے میں آ کے وہ ان کو چھوڑ نہیں دیتا۔ قرآنِ کریم نے بھی ایسے مقام پہ جب یہ دیکھا تو ایک دفعہ کہا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (26:3)۔ اے رسول! یوں نظر آتا ہے کہ تو ان کے پیچھے اپنی جان گھلا دے گا کہ یہ ایمان کیوں نہیں لاتے۔ قرآن کہہ رہا ہے' عزیزانِ من! کہ تو جان گھلا دے گا اور جب آخر میں یہاں سے چھوڑ کے جانا پڑا ہے تو وہاں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ کتنی حسرتوں کے ساتھ تُو ان کو دیکھ رہا ہے کہ یہ کیسے تباہ ہو رہے ہیں۔

---

❶ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر' قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو قعرِ مذلت میں گرتے چلے گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہمارے ہاں دین نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لیے نامانوس شے قرار پا چکے ہیں۔ (پرویز: لغات القرآن جلد دوم' 1960' ص۔ 900)

نبوت کی حسرت بھری اداؤں کو لاکھوں سلام

عزیزانِ من! نبی کے دل کی وہ حسرت بھی حقیقت میں خدا کے رنگ کی ہی ایک جھلک ہے کیونکہ خود خدا نے بھی یہ کہا ہے کہ یہ بندے اپنے ہی اعمال کے بدلے میں سزا پانے کے بعد جہنم میں جاتے ہیں۔ **یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ** (36:30)۔اف! کس قدر تاسف انگیز ہے انسانوں کی حالت۔ خدا بندوں کو یہ کہہ رہا ہے۔ اُسے غصہ نہیں آ رہا' حسرت آ رہی ہے۔ بہرحال نبی کا اپنی قوم کے ساتھ یہ تعلق ہوتا ہے اور وہ قوم یہ کچھ کرتی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ بھی آ رہا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ ہیں: **غَضۡبَانَ اَسِفًا** (20:28)۔ وہ جیسے مریض کی بے احتیاطی پر ڈاکٹر کو غصہ آیا کرتا ہے۔ غصہ بھی آ رہا ہے' ڈانٹتا بھی چلا جا رہا ہے' انجیکشن بھی تیار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یا جیسے ماں کی ماما بچے کی ضد پر یہ کچھ کیا کرتی ہے۔ ٹھیک ہے اس کو بتا بھی رہی ہے' کبھی تھپڑ بھی مار رہی ہے' تھپڑ ایسے یوں کر کے پیار سے مارتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہے جا رہی ہے کہ ستیاناس' آج تو نے کھٹا کھا لیا ہے۔ اس کے ساتھ ذرا ذرا گلے کو مل بھی رہی ہے۔ یہ چیز **غَضۡبَانَ اَسِفًا** ہے۔ یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! کس قدر متضاد ذہنیتوں کے ردِ عمل کو ایک جگہ بیان کر جاتا ہے۔ خالی تاسف ہی تاسف ہو تو وہ علاج کچھ نہیں کرتا۔ غصہ آئے تو چھوڑ کے چلا جاتا ہے: مگر یہاں آیا ہے: **غَضۡبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوۡمِ اَلَمۡ يَعِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ وَعۡدًا حَسَنًا** (20:28)۔ افسوس کرتا ہوا اور غصے سے بھرا ہوا لوٹا اور ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا گل کھلا دیا؟ کیا تمہارے نشو ونما دینے والے نے تم سے زندگی کی خوش گواریوں کے وعدے نہیں کیے تھے؟ کیا بات ہے!

عزیزانِ من! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پہلے تو یہ بات بتاؤ کہ کیا تمہارے خدا نے تم سے خوشگواریوں اور سرفرازیوں کے وعدے نہیں کر رکھے تھے کہ یہ ملے گا اور وہ ملے گا؟ کیا اس نے یہ کچھ نہیں کہہ رکھا تمہیں اپنی مرادیں مانگنے کے لیے ایک اور معبود تراشنا پڑا؟ کیا جو خدا نے وعدے کر رکھے ہیں کہ میرے قوانین کی اطاعت کرو تو یہ کچھ تمہیں ملے گا' اس پہ ایمان نہیں ہے جو تمہیں اس کی ضرورت پڑ گئی کہ خانقاہ پہ جاؤ' اس مزار پہ جاؤ' اس آستاں پہ جاؤ' اس حضرت صاحب کے پاس جاؤ کہ مجھے یہ ملے اور مجھے وہ ملے؟ کیا خدا نے یہ نہیں کہہ رکھا کہ یہ کرو گے تو یہ مل جائے گا؟ پہلی ہی چیز جو عزیزانِ من! خدا کو چھوڑ کر معبود بنانے کی ذہنیت ہوتی ہے' جو اندر ردِ عمل ہوتا ہے' وہ یہی ہے کہ اس کی وجہ سے ہمیں فلاں فلاں مرادیں ملیں گی' فلاں منافع ملیں گے' فلاں کامیابی کی صورتیں پیدا ہونگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم سے خدا نے یہ کہہ رکھا تھا کہ یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کیا تمہیں اس پہ یقین نہیں رہا کہ اور آستانے تلاش کرنے پڑ گئے؟ عزیزانِ من! سنتے چلے جائیے۔ یہ نہیں کہ گل سن'[1]۔ بات تو قرآن بنی اسرائیل کی سنا رہا ہے لیکن کہہ ہم سے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ خدا کے ان وعدوں پہ یقین نہیں رہا کہ ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اور آستانے تلاش کر رہے ہو۔ **اَفَطَالَ عَلَيۡكُمُ**

---

[1] میری بات سنو۔

الْعَهْدُ (20:86)۔کیاان وعدوں کے پورا کرنے میں کوئی لمبا عرصہ لگ گیا تھا(جوتم اپنے خدا سے ناامید ہو گئے اوراس کی جگہ اورمعبود تراش لیا!)اور کیا کوئی بڑی لمبی مدت گزر گئی تھی کہ صاحب! بہت سجدے کر کے دیکھ لیے ٹکریں مار مار کے دیکھ لیا کہ خدا پہ ایمان سے کچھ نہیں بنتا' اس لیے ایک اور خدا کی تلاش میں جا پڑے۔کیا بہت لمبا عرصہ گزر گیا تھا؟ کیا تم مایوس ہو گئے تھے؟ **اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ** (20:86)۔یا کیا تم نے جان بوجھ کر تہیہ کر لیا ہے کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کر رہے' اس لیے تم نے مجھ سے یوں عہد شکنی کی! پھر سنو! کہ کیا تم نے اپنے ہاں یہی ٹھان لی ہے کہ خدا کا غضب آ کے ہی رہے گا؟ اس کے علاوہ تو مجھے اور کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔اب میں یہی کہوں گا کہ تم نے اپنے دل میں ٹھان لی ہے کہ وہ ہم کو تباہ کیوں نہیں کرتا۔جو میں نے تم سے کہا تھا' کیا اس کے خلاف جان بوجھ کر تہیہ کر لیا ہے؟ یہ ہے **فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ** (20:86)۔جو میں تم سے کہہ کے گیا تھا' اس کے خلاف تم نے یہ کیا۔**قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ** (20:87)۔اس پر انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنی مرضی سے عہد شکنی نہیں کی (بلکہ معاملہ دوسرا پیش آ گیا۔مصری قوم کی دیکھا دیکھی) ہم نے زیب وزینت کے جو زیورات وغیرہ پہن رکھے تھے (وہ شہری زندگی تک تو ٹھیک تھے لیکن اس صحرائی زندگی میں جہاں دن رات کا سفر درپیش رہتا ہے اور بود و ماند بڑی سخت ہے) وہ زیورات ہم پر مفت کا بوجھ بن رہے ہیں چنانچہ ہم نے اس بارِ دوش کو اتار پھینکا۔یہ خیال ہمارے دل میں سامری نے ڈالا تھا۔

مذہبی پیشوائیت کی وعظیں' انسان کی سوچ کو' عقل کو' اور شعور کی قوت کو' مفلوج کر دیتی ہیں

عزیزانِ من! سنیے' یہ مذہبی پیشوائیت کیا کرتی ہے؟ اس قسم کی داستانیں سناتی ہے' اس قسم کے وعظ کہتی ہے' جو ان کے اپنے متبعین کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب کر دیتی ہے' حکمت معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔بڑی عجیب چیز ہے! اور عزیزانِ من! کہاں کون سی چیز عجیب نہیں ہوتی! یہ مذہبی پیشوا سوچنے سمجھنے کی قوت یا صلاحیت کو سلب کر دیتے ہیں۔یہ جتنے بھی ان کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں یہ محض تقلیداً ہوتے ہیں۔ان میں سے کوئی بھی سوچ سمجھ کر ان چیزوں کے پیچھے نہیں لگا ہوا ہوتا۔بس ٹھیک ہے' یہ ان کے ہاں کی عقیدت ہے' لگے ہوئے ہیں' باتیں ہیں' چلے ہوئے ہیں بڑے خوش کن' اور پھر اس کے بعد تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ہپناٹائز کر کے اِن سے کیا کیا کام نہیں کرا لیتے: ان کے کہنے پر جانیں دیدیتے ہیں' مال و دولت تو کوئی شے ہی نہیں ہے' سنیے کہ قرآن کے نزدیک اس قوم کا جواب کیا ہے؟ کہا: اے موسیٰ علیہ السلام! تم نے ہم سے کہا ہے **فَاَخْلَفْتُمْ** یعنی ہم نے خلاف ورزی کی ہے جب کہ ہم نے خلاف ورزی اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں کی۔ہمیں پتہ نہیں کہ اس نے ہمیں کیا کر دیا کہ ہم اس کی باتوں میں آ گئے۔سامری یہ کچھ کرتے ہیں۔

قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ ہم نے اپنے اختیار و ارادے سے نہیں کیا۔او بھئی! کیا کر دیا اس نے؟ سنیے کیا کرتے ہیں

یہ! اِن کا سارا وعظ اس پہ ہوتا ہے کہ ''یہ دنیا ناپائیدار ہے' مال و دولت یوں آنی جانی چیز ہے' یہ تو نعش ہے جس کے گرد یہ کتے منڈلا رہے ہیں' تمہارا گھر تو اگلی دنیا کا گھر ہے' یہاں کا یہ جتنا مال و دولت ہے' یہ خدا کے راستے میں دیدو۔ چنانچہ یہ کچھ کر کے' جس ویلے اوہسم جاندے ہیگے نیں' ❶ تو پھر کہتے ہیں کہ اب دیکھیے کہ یہاں ہم نے ایک مسجد بنانی ہے' یہاں دارالعلوم کھولنا ہے' یہاں مکتب کھولا جائے گا' اس کے لیے خدا کی راہ میں یہ ضرورت ہے یعنی جو مال و دولت پر اتنی تنقید ہو رہی تھی وہ اس لیے ہو رہی تھی کہ تمہاری نگاہوں میں وہ قابلِ نفرت ہو اور وہ سارے کا سارا اتار کے یہاں مجھے دے جاؤ۔ اس کے لیے کہا کہ وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ (20:87)۔ لیکن ہم نے زیب و زینت کے جو زیورات وغیرہ پہن رکھے تھے' ہم وہاں مصر سے آتے وقت کچھ جو تھوڑا بہت زیور اپنے ساتھ لے آئے تھے' وہ زیورات وغیرہ ہم پہ مفت کا بوجھ بن رہے تھے۔ اس سامری نے ہمیں وعظ کہہ کہہ کے یہ کچھ کرایا۔ اس کا مقصد تو زیور حاصل کرنا تھا' لہٰذا کہا کہ تم یہ زیور کیا کرو گے؟ تمہارے لیے یہ زیور وبالِ دوش بنا ہوا ہے۔ کیوں اِسے اٹھائے اٹھائے پھرتے ہو؟ تمہیں یہ زیور کیا کام دے گا؟ یہ جہنم میں تپایا جائے گا اس سے مارے جاؤ گے' تم نے یہ کچھ کیا کرنا ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد پھر' اس نے کہا کہ اتارو اور مجھے دو' میں تمہارے لیے' تمہارا ایک معبود بنا دونگا۔ قوم نے اتار کر دے دیئے۔

چاندی اور سونے کے ان دروازوں پر ایک پیسہ بھی ان کا اپنا نہیں ہوتا

عزیزانِ من! آپ کے ہاں یہ جتنے معبود بنے ہوئے ہیں' ان کے بنانے والے ایک پیسہ بھی اپنی جیب سے خرچ نہیں کرتے۔ یہ سارے ہی اس قوم کے زیور ہوتے ہیں' جو وہاں بیچ بیچ کے چاندی اور سونے کے دروازے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ عجیب چیزیں ہیں جو قرآن کہے چلا جا رہا ہے۔ یہ ان کی کمائی کا ایک ایسا ذریعہ بنتا ہے کہ جن پر ان کا اپنا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ کیا ہوتا' البتہ یہ انہیں اس کے عوض میں جنت لے لے کے دیتے رہتے ہیں۔ عزیزانِ من! جہاں بھی یہ بچھڑا بنتا ہے' وہ ہمیشہ قوم کے زیور سے بنتا ہے۔ پھر یہ اس کے متولی ہو جاتے ہیں اور' خود کبھی اس کے اندر ایک پیسہ تک نہیں دیتے۔

جنت کے حصول کا ایک سستا نسخہ

عزیزانِ من! مجھے ابھی یاد آیا کہ سرحد ❷ میں ایک مولانا عرب کہلاتے تھے۔ بڑے قرآنی اور بڑے بلند قسم کے آدمی تھے۔ وہ مردان میں رہتے تھے۔ میں اُن سے ملا ہوں۔ عجیب قسم کا شخص تھا۔ اِن پر کفر کا فتویٰ لگا۔ یہاں تو کفر کا فتویٰ' بہرحال' متشابہات تک رہتا ہے لیکن پٹھانوں کے ہاں تو یہ فتویٰ محکمات تک پہنچ جاتا ہے۔ ان کے خلاف جب مولوی لوگوں نے کفر کا فتویٰ لگایا تو ایک مولوی صاحب

---

❶ جب وہ دل کی رضامندی سے تیار ہو جاتے ہیں' جس طرح جانور (گائے' بکری' بھینس وغیرہ) دودھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

❷ پاکستان کا شمال مغربی صوبہ' مردان اس کا ایک مشہور شہر ہے۔

نے وعظ میں کہہ دیا کہ جو شخص اس کو جا کے قتل کر آئے گا' اُسے جنت مل جائے گی اور ایک شخص صبح ہی اٹھ کے آپ کے پاس چلا آیا۔ پوچھا: کیسے آئے ہو؟ کہنے لگا: جی' چھرا لے کے آیا ہوں' تمہیں قتل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ کہنے لگے: بھئی' مجھے کیوں قتل کرتے ہو؟ کہنے لگا: مولوی نے کل وعظ میں کہا تھا کہ جو مولوی عرب کو قتل کر آئے گا' اسے جنت مل جائے گی۔ کہنے لگے: تمہیں یقین ہے۔ کہنے لگا: جی' بالکل مل جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ بھئی! ذرا ایک بات مولوی صاحب سے پوچھ آؤ اور وہ یہ کہ ان سے کہنا: کیوں جی! کیا آپ کو جنت کی ضرورت نہیں ہے جو آپ نے ہمیں جنت کا بڑا آسان سا ایک نسخہ بتایا ہے کیا آپ وہاں نہیں جانا چاہتے؟ کہا کہ اگر وہ مولوی کہے کہ ہم وہاں نہیں جانا چاہتے تو وہ خود کافر ہے جو جنت میں نہیں جانا چاہتا ہے۔ اور اگر وہ جانا چاہتا ہے تو اس سے کہو کہ جناب! آپ خود جا کے مولوی عرب کو کیوں نہیں مار دیتے' جنت میں سیدھے چلے جاؤ' ہمیں کیوں یہ نسخہ بتا رہے ہو۔ وہ گیا۔ دوبارہ نہیں لوٹا' اور نہ ہی وہ مولوی صاحب۔

عزیزانِ من! یہ انہیں جنت دینے کے راستے بتاتے ہیں۔ کہنے لگے کہ سارا زیور سامری کو دے دیا اور اُس نے ہمارے لیے یہ بنا دیا: فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ (20:88) سامری نے (ان زیوارت کو لیا اور انہیں گلا کر) ایک بچھڑا سا بنا دیا۔ وہ تھا تو محض ایک بے جان دھڑ لیکن سامری نے ایسا بنایا کہ اس میں سے (جیتے جاگتے) بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ لوگ اسے دیکھ کر پکار اُٹھے کہ یہ ہمارا بھی معبود ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی۔ لیکن یہ (سامری) اس بات کو بھول گیا (کہ موسیٰ علیہ السلام آ کر کیا کہے گا۔) ہاں تو عزیزانِ من! ایک نہایت اچھا سا بچھڑا بنا دیا۔ کہا: یہ ہے تمہارا الہ؛ تمہارا بھی اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی۔ یہی ہے اصل میں وہ الہ جو تمہیں بتا تا نہیں تھا۔ اپنے ہاں چھپا کے رکھ رہا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ وہ یہ ہے لیکن فَنَسِيَ (20:88) یہ بھول گیا کہ جب موسیٰ علیہ السلام آئے گا تو وہ کیا کرے گا۔ اونے کھل لا چھڈنی سی۔ [1] عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیئے قرآنِ کریم درمیان میں اپنی ایک بات لاتا ہے: باطل کے الہ کی اور الہ حقیقی کی۔ کہا کہ تم اپنے دیوتا کے ہاں جا کے اپنی ساری مرادیں مانگتے ہوئے اپنی ساری باتیں کرتے ہو کہ جی یہ کر دیجیے' جی وہ کر دیجیے۔ اس سے یہی کہے جانا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کے ایک ایک ٹکڑے میں ہمارے لیے عجیب چیز آتی جاتی ہے۔ یہ بُت کے سامنے بیٹھے ہوئے اپنی ساری باتیں کرتے چلے جائیں گے' وہ سامنے سے کچھ نہیں کہتا' بولتا ہی نہیں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ انسان پسند ہی اس قسم کے خدا کو کرتا ہے کہ اس کے جو جی میں آئے وہ اُسے کہتا چلا جائے' وہ راستے میں ٹوکے ہی نہیں کہ تم یہ کیا کرتے ہو' تم وہ کیوں نہیں کرتے۔ بُت تو ٹوکتا ہی نہیں ہے' اس لیے اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ جو جی میں آیا اس سے جا کے کہتے چلے جایئے' اس نے آگے سے کچھ کہنا ہی نہیں۔ یہ وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ بُت بنا بیٹھا ہے' وہ آگے سے کچھ نہیں کہتا' سامنے

---

[1] اس نے تو اس کی کھال ادھیڑ دینی تھی۔

سے کچھ نہیں کہتا کہ کم بختو! اپنے کرتوت تو دیکھو، یہ کچھ مانگتے ہو، کیا اس کے لیے Deserve (حق دار) بھی کرتے ہو؟ وہ نہیں کہتا، اس لیے مطمئن ہو کے آ جاتے ہیں کہ ہم نے سب کچھ کہہ دیا ہے اور یہ ہو جائے گا لیکن وہاں سے تو جواب ہی نہیں آتا Response (جواب) نہیں آتا۔ یہ ہے اس کی نفسیات اور یہ بڑی گہری سوچ کا تقاضا کرتی ہے۔

زندگی تو بات بات پر رسپانس (جواب) چاہتی ہے

عزیزانِ من! اگر آپ طالبعلم ہیں تو یہ بڑی غور کی چیز ہے۔ یہ نفسیات کا مسئلہ ہے کہ زندگی کی نشانی Response (جواب، رد عمل) ہوتی ہے، یعنی یہ کہ وہ جواب دے۔ یہ نہیں ہے کہ تم بس کہتے ہی چلے جاؤ، کہتے ہی چلے جاؤ۔ کیا پتہ ہے کہ وہ سنتا ہے یا سنتا ہی نہیں۔ قبرستانوں میں، قبروں پہ بھی جا کے تم کہتے ہو اور بتوں کو بھی کہتے ہو، تو یہ تمہاری ذہنی چیز ہے۔ یہ ایک بڑی اہم چیز ہے کہ کیا ادھر سے بھی اس کا کوئی ریسپانس (جواب) ہوتا ہے؟ اگر کوئی ہے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعی سنتا ہے اور اس میں واقعی زندگی ہے۔ لہٰذا اصل چیز ریسپانس (جواب) ہے۔ یہ کہا کہ **اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا** (20:89)۔ کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ (بچھڑے میں سے آواز تو نکلتی ہے لیکن) وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ پوچھا کہ کیا انہوں نے اتنی سی بات پہ بھی غور نہ کیا کہ یہ تو وہاں جا کے اپنی سب آرزوئیں اس کے سامنے کہتے تھے اور وہ ان کو جواب میں کچھ نہیں کہتا تھا؟ جو جواب میں کچھ نہ کہے وہ تو مردہ ہوتا ہے، زندہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ہی دلیل ہے، عزیزانِ من! جتنے باطل کے خدا بنائے ہوئے ہوتے ہیں، ان سب کے لیے یہی دلیل ہے کہ **اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا** (20:89)۔ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ یہ خدائے حقیقی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ جب بھی کوئی بلانے والا بلاتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں، Response (جواب) تو حیات کی دلیل ہے۔ **اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186)۔ جب بھی کوئی شخص اپنی راہنمائی کے لیے مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

خدا تعالیٰ قرآنِ کریم کے ذریعے جواب دیتا ہے

عزیزانِ من! یہاں پھر ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ صاحب! یہ تو قرآن کا دعویٰ ہی دعویٰ ہے، ہم تو پکار پکار کے تھک گئے، مر گئے! اس نے ہماری ایک بھی نہیں سنی۔ ہمیں تو کبھی اس نے جواب نہیں دیا۔ بڑے ہی مایوس کن حالات میں، مصیبت زدہ کی کیفیت سے پکار پکار کے، اس سے فریادیں تک کیں اور اس کی طرف سے ہمیں جواب تو کبھی نہیں ملا اور بات ٹھیک ہے، کبھی اس کی آواز تو ہمارے کانوں میں نہیں آئی۔ لیکن جواب کا طریقہ یہی تو نہیں ہوتا۔ آپ کو خطوں کے ذریعے بھی تو جواب ملا کرتا ہے۔ وہ بھی تو کلام ہی ہے کہ جس کو آپ جواب کہتے ہیں اور جب وہ اسے کہے کہ اس کا جواب اس طریق سے نہیں ملے گا، بلکہ آپ کو یہ جواب خط کے ذریعے مل رہا ہے تو تمہیں اس پر غور تو کرنا ہوگا۔ یہی تو رسپانس (جواب) ہوگا۔

قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ جس بات کے لیے بھی آپ اس کو پکاریں گے' اس کا جواب آپ کو اس کے اندر سے ملتا ہے۔ بولتا ہے۔ خدا نے اپنے اس جواب کو کلام اللہ کہا ہے۔ سیدھی سی بات ہے' جواب کلام ہی کو کہتے ہیں۔ اس نے یہ کہا تھا کہ وہ بُت تو بات ہی نہیں کرتا' جبکہ آپ اسے بات ہی کرنے کے لیے کہتے ہیں تو کیا بات کے لیے یہ کوئی ضروری ہے کہ آپ بلائیں تو دوسری طرف سے آواز ہی آپ کے کان میں آئے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ خط کے ذریعے بھی تو آپ کو بات کا جواب مل جاتا ہے اور اس طرح کلام کو اگر کسی نے محفوظ کر دیا ہو' ریکارڈ کر دیا ہو' آج کی اصطلاح میں کہہ رہا ہوں ٹیپ ریکارڈر میں بھر دیا ہو' جبکہ اس دور کی تو صورت ہی یہ تھی کہ کتاب کی شکل میں' قرطاس کی شکل میں' دے دیا ہو' خط کی شکل میں دیدیا ہو' محفوظ کر کے دیدیا ہو' تو پھر تم اعتراض یہ کرو کہ فلاں بات کے متعلق میں نے پوچھا تھا اس کا جواب مجھے نہیں ملا' ہم بتائیں گے کہ اس نے قرآن میں آپ کی بات کا جواب دیا ہوا ہے۔ یہ کلام اللہ ہے جو جواب دیتا ہے لہٰذا بات یہ نہیں ہے کہ وہ جواب نہیں دیتا البتہ اُجِیۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ اس جواب کے لیے ایک شرط ہے کہ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ (2:186)۔ وہ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے اس (جواب) کی پوری پوری اطاعت کریں۔

نوعِ انسانی کو پہلے خدا کے خط کا جواب دینا ہوگا

عزیزانِ من! جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں' پہلے تم اس کا تو جواب دو اور پھر مجھ سے اس کا جواب مانگو۔ سیدھی سی بات ہے کہ میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا' اس کا جواب ذرا دیجیے اور اس کے بعد اس جواب کی روشنی میں میں تمہیں جواب دوں گا جو تم مانگتے ہو۔ یعنی میں نے تم سے جو پوچھا' ذرا اس کا بھی تو جواب دو۔ وہ اپنی بات تو تم گول کر گئے اور اس پر زور دے رہے ہو کہ صاحب! جواب نہیں دے رہا۔ میں جواب دیتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ (2:186)۔ پہلے میری بات کا جواب دو' پھر دیکھو جواب ملتا ہے یا نہیں ملتا۔

عزیزانِ من! دعا کے معنی یہ کر لیجیے کہ جو کچھ تم سوال کرتے ہو یا پوچھنا چاہتے ہو تو تم اس کے متعلق قرآن سے پوچھو۔ اس کے مکمل ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہاں سے جواب ملتا ہے۔ کہا کہ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ یہ تو باتیں ہی تجھ سے کرتا ہے اور اس کی طرف سے جواب بھی ملتا ہے۔ ہم نے اسی لیے تو خدا کو معاذ اللہ کوئی دوسری قسم کا خدا بنا رکھا ہے کہ ڈرتے ہیں کہ اس کی طرف سے جواب ملا اور ڈانٹ پڑی۔ وہ جو فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ کہتا ہے یعنی اگر اس نے یہ پوچھ لیا کہ میں نے تم کو جو کچھ کرنے کے لیے کہا تھا تو کیا وہ تم نے کیا تھا؟ ڈاکٹر کے پاس جا کے وہ کہتے ہو کہ صاحب! وہ بخار تو اترا نہیں۔ وہ پوچھتا یہ ہے کہ وہ دوائی بھی اس کے مطابق کھائی تھی جیسے میں نے تمہیں کہا تھا۔ اب اس پہ جو تم چپ رہے تو وہ کہے گا کہ پہلے اس کا تو جواب دو' پھر میں اس کا بھی جواب دیدونگا کہ تمہارا بخار کیوں نہیں اترا۔ پہلے اس کا جواب دو کہ کیا اس کے مطابق دوائی کھائی تھی؟

دراصل انسان کو جواب مانگنے والا خدا منظور نہیں

عزیزانِ من! اصل یہ ہے کہ ہم اس خدا سے بات نہیں کرنا چاہتے جو پہلے پلٹ کے پوچھے کہ جیسے میں نے تم سے کہا تھا تو کیا تم نے اس طرح دوائی کھائی تھی کیونکہ اس کا ہمارے پاس جواب نہیں ہے لہٰذا ہم ایسا جواب طلبی والا خدا چاہتے ہی نہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ ہم جو جی میں آئے کرتے جائیں، وہ پوچھے ہی نہیں بلکہ ہم جو مانگتے جائیں وہ دیتا چلا جائے۔ جی، ہم ایسا خدا چاہتے ہیں اور انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ **وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا** (20:89)۔ وہ نہ توان کے لیے نفع کی قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی نقصان کی۔ وہ تو کسی قسم کا اختیار ہی نہیں رکھتا، مٹی کا مادھو بن کے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ تو اتنا بھی نہیں دیکھ رہا کہ وہ تو اپنے اوپر سے مکھی بھی نہیں اڑا سکتا۔

5 سالہ بچی کے ایک استفسار پر اس کے ٹیچر کا ردِ عمل

عزیزانِ من! پھر کبھی کبھی اپنی ہی بات درمیان میں آ جاتی ہے۔ اسے ذاتی بات نہ کہیے۔ قرآن ہی کی تفسیر میں ہے۔ میں کبھی کبھی اپنی ایک بچی کا ذکر کیا کرتا ہوں۔ وہ بچپن سے ہی بڑی ذہین تھی۔ وہ میری سلمیٰ بیٹی ہے۔ میں کہیں، کبھی کبھی، آپ کو اس کی تقریروں کے ٹکڑے بھی دیا کرتا ہوں۔ اِسے بہرحال گھر کی تعلیم کے ماحول کا ہی اثر سمجھیے۔ کراچی میں نرسری یا جسے پریپریٹری (Preparatory) کہتے ہیں، کلاس تھی۔ میرا خیال ہے، چار پانچ سال کی وہ بچی تھی۔ اتنی ہی چھوٹی بچیوں کو وہاں بھیجتے ہیں۔ وہاں اس زمانے میں عیسائیوں کے ہی اسکول ہوتے تھے۔ ابھی تقسیم کے بعد ہم وہاں نئے نئے ہی آئے تھے۔ تو وہ کیتھولک کا اسکول تھا۔ وہاں جا کے داخل کرا دیا۔ تین چار دن کے بعد اس کی ہیڈ مسٹرس نے مجھے بلا بھیجا اور کہا کہ اپنی بچی کو کسی اور اسکول میں داخل کرا دیجیے اور خاموشی سے لے جائیے، یہاں بات بڑھنے نہ پائے۔ یا اللہ! چار پانچ برس کی اتنی سی بچی، اس نے کیا قیامت برپا کر دی کہ اسے یہاں رکھیے ہی نہیں۔ میں نے کہا: ہوا کیا؟ اس اسکول کے صحن میں، وہاں جائیے تو اب بھی آپ دیکھیں گے کہ سنگِ مرمر کا یسوع مسیح کا ایک بڑا خوبصورت مجسمہ رکھا ہے۔ صبح کے وقت وہ وہاں پریڈ کراتے تھے۔ باپ جو آسمان پہ ہے، تیری مرضی پوری ہو، تو خداوند خدا ہے یسوع مسیح ہے۔ یہ سارا کچھ وہ وہاں کراتے تھے۔ وہ بچوں سے بھی کرا رہے تھے۔ یہ بچی بھی اس طرح سن رہی تھی، اس کی طرف دیکھ رہی تھی تو جب یہ ختم ہو گیا تو یہ بچی اس پریڈ کرانے والی سے پوچھتی ہے: آنٹی یہ آپ کا خدا ہے، اس نے کہا: ہاں، یسوع مسیح خدا ہے۔ کہنے لگی: آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے سر پر کوا (Crow) بیٹھا ہوا ہے، بیٹ کر رہا ہے، وہ کوے کو بھی نہیں اڑا سکتا تو یہ خدا کیسا ہے اور اپنی پیٹھ بھی نہیں دھو سکتا۔ اس پر اس نے مناسب یہی سمجھا کہ مجھے کہے کہ اس بچی کو اسکول سے لے جائیے۔ ہاں، وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا۔ **وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا** (20:89)۔ اور نہ ہی ان کے لیے کسی نفع یا نقصان کی قدرت رکھتا ہے۔ تو انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ یہ بت جو سارا دن جون کی تپش میں تپ جاتا ہے، یوں کہیے کہ کھڑے کھڑے اس کی ٹیں بول جاتی ہے، یہ ہاتھ جو نیچے ہے اُسے اٹھا کے یوں بھی نہیں رکھ سکتا، وہ کیا مرادیں بر لائے گا۔

ایک نورانی شکل کی کہانی

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ میں نے حضرت صاحب کا واقعہ سنایا تھا۔ وہ بہت بڑے حضرت صاحب تھے۔ ہمارا ایک دوست ہوتا تھا۔ اِن کی تنقید بڑے مزے کی اور بڑی شگفتہ ہوتی تھی۔ انہیں ایک دوست لے گئے کہ آیئے صاحب! بڑے حضرت صاحب کو مل آیئے۔ حضرت صاحب' جو بت تھے' وہ اسی طرح سے زندہ جیتے جاگتے سج بن کے بیٹھتے ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بہت بڑا بننے کا سب سے بڑا راز ہی یہ ہے کہ بولیے نہیں' صرف اشارہ کیجیے: ''آپے معنی سمجھ لین گے۔ کوئی کچھ سمجھے' کوئی کچھ سمجھے۔ کوئی تے سچا نکلے گا ای ناں اوہدے اچ۔ بیٹھے ہیں: لب بند' آنکھ بند' گوش بند نہیں''[1]۔ بڑا کاریگر ہوتا ہے۔ وہ وہاں پہ گئے اور دیکھا۔ واپس آ کر انہوں نے کہا کہ کیوں صاحب! انہیں شاہ جی کہتے ہیں۔ دیکھ آئے آپ حضرت صاحب کو؟ کہنے لگے: جی دیکھ آئے۔ پھر کہنے لگے: سبحان اللہ' بڑی نورانی شکل تھی' بہت اچھی بات تھی' یہاں اللہ کی بڑی برکتیں ہیں۔ کہنے لگے: ہاں ہیں تو سہی لیکن مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا ظلم کیا کہ ان کا گدھے جیسا بھی رتبہ نہیں ہے۔ اوہ! تو نے کیا کہہ دیا؟ کہنے لگے: جی' یہ گدھا آپ کے سامنے کھڑا ہے' اس کے کہیں مکھی بیٹھتی ہے تو اس کو اللہ نے ایک دم دی ہے۔ وہ اسے کچھ یوں کرتا ہے تو اِدھر سے مکھی اڑ جاتی ہے اُدھر بیٹھتی ہے۔ یوں کرتا ہے تو اُدھر سے اڑ جاتی ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ حضرت صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے ایک آدمی ایک دم لیے ہوئے' جسے پنکھا کہتے ہیں' کھڑا تھا۔ اواوناں دیاں مکھیاں جھلدا اسی پیا۔ کھوتے نوں تے اللہ تعالیٰ نے آپ دیدتی اے۔ پر ایتھے تے ایک دوسرا مکھیاں جھلدا اسی پیا' کہ حضرت صاحب جیہڑے نے اپنی مکھی آپ نئیں اڑا سکدے' اوناں دے رتبیاں داتسی مینوں کی پوچھدے پئے'[2] کیا بات تھی اس آدمی کی! انہوں نے دیکھا کہ وہ گرنتھ صاحب کے اوپر یہ کچھ کرتے ہیں' تو ٹھیک ہے گرنتھ صاحب جو اپنی مکھی نئیں اڑا سکدا' ایناں نے حضرت صاحب دے اتے لا دتہ۔[3] ہوتا ہے یہ! **وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا** (20:89)۔ یہ کسی نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتے۔ ''ضراً اور نفعاً'' تو خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ کیا کریں گے اور قرآن ہے جو یہ کچھ بتا رہا ہے۔ تو ہے کوئی جو اس سے نصیحت لے۔

---

1. خود ہی معنی سمجھ لیں گے۔ کوئی کچھ سمجھے اور کوئی کچھ۔ ان میں سے کوئی معنی تو سچے نکل ہی آئیں گے۔ بُت بنیں بیٹھے ہیں: خاموش' ساکت وصامت۔ مگر کان بند نہیں ہیں۔
2. وہ ان کی مکھیاں اڑا رہا تھا۔ گدھے کو تو اللہ تعالیٰ نے یہ دے دیا کہ وہ اپنی مکھیاں خود اڑا تا رہے۔ مگر یہاں تو یہ بھی نہیں۔ یہاں تو ایک دوسرا آدمی یہ کام کر رہا تھا۔ حضرت صاحب خود بھی اپنی مکھیاں آپ نہیں اڑا سکتے۔ ان کے رتبوں کا مجھ سے کیا پوچھتے ہیں!
3. نہیں اڑا سکتے تو انہوں نے یہی کچھ حضرت صاحب کے لیے کر دیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق تورات کا بیان

عزیزانِ من! اب قرآن کا اعجاز دیکھیے۔ بقول ان بنی اسرائیل کے حضرت ہارون علیہ السلام نبی ہیں۔ اِن کی تورات میں جو قصہ لکھا ہے اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرتِ ہارون علیہ السلام نے یہ بچھڑا بنا کے پرستش کرائی تھی۔ قرآنِ کریم میں آیا تو اُس نے بات تو ان کے نبی کی ہے۔ بظاہر میں حضرت ہارون علیہ السلام کو ان کا نبی کہتا ہوں' نبی تو صرف ان کا ہی نہیں ہوتا' وہ تو ہمارا بھی نبی ہے' وہ تو خدا کا نبی ہے اور ہم اسی طرح ان کی نبوت پہ ایمان لاتے ہیں جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پہ ایمان لاتے ہیں۔ **لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ** (2:136)۔ ہم ان تمام انبیاء کو ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھتے ہیں اور نبی ہونے کی جہت سے ان میں سے کسی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ اس کے برعکس یہودی اپنے نبیوں کے متعلق اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھتے ہیں' قرآن ان کی تصحیح کرتا ہے' غلط کی تردید کرتا ہے۔ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ حضرتِ ہارون علیہ السلام نے یہ سارا کچھ بنا کے دیا تھا۔ قرآن ان کے لیے یہ کہتا ہے کہ **وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ** (20:90)۔ ہارون علیہ السلام نے انہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لوگو! یہ شخص تمہیں سخت گمراہی میں ڈال رہا ہے۔ (یہ بچھڑا تمہارا رب نہیں ہے۔) تمہارا رب خدائے رحمان ہے۔ لہٰذا تم (اس گمراہ کرنے والے کی بات مت مانو) میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو اور جو کچھ میں کہتا ہوں اس کی اطاعت کرو۔ اس طرح' عزیزانِ من! ہارون علیہ السلام ان سے کہتا ہی رہا کہ یہ تو ایک بت بنایا ہوا ہے' یہ خدا نہیں ہوسکتا۔ خدا تو خدائے رحمٰن ہے' یہ فتنہ ہے' یہ سازش ہے' اس میں نہ پڑو' جو میں کہتا ہوں وہ مانو۔ میری اس تعلیم کے پیچھے پیچھے چلو۔ **قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى** (20:91)۔ لیکن انہوں نے اُسے صاف جواب دے دیا تھا کہ ہم اس کی پرستش سے باز نہیں آئیں گے۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئے گا (تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کہتا ہے)۔ ٹھیک ہے' موسیٰ علیہ السلام کو آنے دو' فیصلہ کرلے گا۔

قوم کے اس عمل پر حضرت ہارون علیہ السلام کی خاموشی کیوں؟

عزیزانِ من! یہاں یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس کے بعد حضرتِ ہارون علیہ السلام خاموش کیوں ہوگئے۔ خاموش ہی نہیں ہوگئے بلکہ انہیں اس پر چلنے دیا' آخر انہیں بچھڑے کی پرستش سے روکا کیوں نہیں؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ عزیزانِ من! اس کا جواب سنیے اور اس کے بعد سوچیے کہ ہم کس مقام پہ کھڑے ہیں۔ **قَالَ يٰهٰرُوْنُ** (20:92)۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام سے پوچھا۔ یہ واقعہ ان کی Absence میں' عدم موجودگی میں' ہوا تھا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ اے ہارون علیہ السلام آپ تو یہاں موجود تھے: **مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ** (20:92-93)۔ جب تُو نے دیکھا تھا کہ قوم یوں گمراہ ہو رہی ہے تو تو نے انہیں (سختی سے) روکا کیوں نہیں؟ تو نے وہی کچھ کیوں نہ کیا جو ایسے وقت میں' میں کیا کرتا ہوں؟ وہ کون سا امر تھا جو تجھے ایسا کرنے سے مانع ہوا؟ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام سے ڈانٹ کر' جھنجھوڑ' کر کہا کہ آپ کو کیا ہوگیا تھا' یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے رہے' آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں؟

اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ (20:93)۔کیا تو نے بھی دیدہ و دانستہ مجھ سے سرکشی برتی؟ آپ سے میں کہہ کے گیا تھا کہ یہ فتنہ ہے' اسے روکنا ہے' کہ یہ کچھ نہیں کرنے دینا۔ اس سامری کو بھی میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا' قوم ابھی ناپختہ ذہن ہے۔ انہوں نے تو یہ کچھ کیا مگر آپ نے انہیں کیوں نہیں روکا؟ قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ (20:94)۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے میرے بھائی! اے میری ماں کے بیٹے! اے میری ماں جائے! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور مجھے ہدفِ ملامت نہ بنا۔

عزیزانِ من! وہ جو کہا کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُمِ موسیٰ علیہ السلام (28:4,10) اس طرح کہا ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم (2:25,3:45) کہا ہے' کیوں؟ سامی النسل قوم کے ہاں کا رواج ذہن میں لائیے۔

سامی النسل قوم کے ہاں کا رواج

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے باپ کا نام ہی نہیں لیا' صرف یَبْنَؤُمَّ (20:94) کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامی النسل [1] قوم کے ہاں یہ رواج تھا کہ باپ اور ماں میں سے جس کی شہرت زیادہ ہوتی تھی' اولاد اپنے آپ کو بھی اس کی طرف منسوب کیا کرتی تھی اور قوم بھی اسی کی طرف منسوب کیا کرتی تھی۔ یہ ایک بھائی دوسرے بھائی سے یہ کہہ رہا ہے۔ یہاں بھائی بھی نہیں کہا۔ یہ بھی نہیں کہا کہ اے میرے باپ کے بیٹے! بلکہ کہا ہے کہ اے میرے امی جائے! او میری امڑی داجایا! [2] یہ اس لیے کہ سامی النسل قوم کے ہاں یہی رواج تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں آپس میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے

ہاں تو عزیزانِ من! حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے! مجھے اس طرح نہیں ڈانٹو۔ آپ سُن تو لیجیے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں روکنے میں زبردستی کیوں نہ کی' کیوں نہ روکا؟ عزیزانِ من! ایک ایک لفظ سُن لیجیے۔ کہنے والا نبی ہے' سننے والا نبی ہے' دونوں نبی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے انہیں بُت پرستی سے روکنے کا یہ کام کیوں نہ کیا' وہ جواب سُن کے

---

[1] قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی آبادی کا یہ اولین سرچشمہ جھیل کیسپیں کے اطراف و جوانب میں واقع تھا۔ اس قیاس کے تحت علم الاقوام والسنہ کے محققین نے اقوام عالم کو مختلف مماثلت و مشابہت کی بنا پر تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) آریائی (ایرین) مثلاً ہندی اقوام' ایرانی اور فرنگستانی (۲) تورانی (منگولین) مثلاً ترکستانی' چینی (۳) سامی (سیمٹک) مثلاً عرب' آرامی' عبرانی' سریانی' کلدانی وغیرہ
بعض علمائے انساب' اقوام عالم کی تقسیم اختلاف رنگ کی بنیاد پر کرتے ہیں یعنی سفید فام (مثلاً امم سامیہ اور فرنگی)' سیاہ فام یا سرخ فام (باشندگان افریقہ) اور زرد فام (جاپانی اور چینی وغیرہ)۔ ان کے برعکس' تورات کا بیان ہے کہ طوفان نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسل انسانی حضرت نوح کے تین بیٹوں یافث (Japheth)' حام (Ham)' اور سام (Shem) سے آگے بڑھی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ ان تینوں نسلوں میں سے تورات کو صرف سامی نسل (Semitic Race) سے تعلق ہے۔

[2] اے وہ جسے میری ہی پیاری' شیریں' شفقت بھری ماں نے جنم دیا!

مطمئن ہوجاتا ہے کہ ٹھیک کیا۔ کہا کہ اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ (20:94)۔ مجھے ڈر تھا کہ تُو آ کر یہ نہ کہے کہ تُو نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا' بنی اسرائیل میں فرقے بنا دیئے اور میری بات کا کچھ پاس لحاظ نہ کیا۔

نبی نے جہالت پر مبنی شرک کو تو قبول کر لیا مگر فرقہ نہیں پیدا ہونے دیا

عزیزانِ من! حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میں ڈرا کہ تم آ کر کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا۔ اس لیے میں چپ رہا کیونکہ قوم کے اندر تفرقہ پیدا کر دینا اتنا بڑا جرم عظیم ہے' کچھ وقت کے لیے شرک کو گوارا کر لیا' اس بت پرستی والے شرک کو گوارا کر لیا' مگر قوم کے اندر تفرقہ نہیں پیدا ہونے دیا۔ یہ شرک ان کی جہالت پہ مبنی تھا۔ جذبات سے الگ ہٹا کر ذرا سی بات بھی انہیں سمجھا دی جاتی کہ تم نے دیکھا نہیں کہ یہ معبود آگے سے جواب نہیں دیتا' بات بھی نہیں کرتا' اپنے ہی نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتا' یہ شرک جہالت کی بنا پہ ہے' سمجھا دینے کے بعد توحید پہ آ سکتے ہیں۔ اس لیے میں نے قوم کی اس عارضی جہالت کو گوارا کر لیا لیکن اُسے تفرقہ سے بچا لیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔

تفرقہ تو دین کو ختم کر دیتا ہے

عزیزانِ من! اگر قوم کے اندر تفرقہ پڑ جائے تو اس سے جو فساد برپا ہوتا ہے اُس سے تو دین ہی ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ دین ہی ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن نے تفرقے کو شرک کہا ہے۔ سورۃ روم کی وہ آیات (30:31-32) جو میں ہمیشہ پڑھا کرتا ہوں' انہیں دیکھیے: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31)۔ دیکھنا' مشرک نہ ہو جانا۔ دیکھیں' مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ خدائے واحد پہ ایمان لانے کے بعد مشرک نہ ہو جانا۔ ارے ہم مشرک کیسے ہو جائیں گے؟ کیا بُت پوجنے لگ جائیں گے؟ کہا کہ وہ بُت پوجنے والا شرک تو کوئی ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ تو موسیٰ علیہ السلام آئے اور ان کے سامنے انہوں نے چار دلائل دیئے' ان کے دیوتا کو لیا' ان کے بُت کو لیا' اس کو جلایا' پیسا' راکھ کیا' پانی میں بہا دیا۔ اور بتا دیا کہ یہ بُت کتنا بے اختیار ہے' لہٰذا یہ تو شرک ختم ہو گیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (30:31)۔ مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ کہا کہ کیسے مشرکین میں سے نہ ہو جانا؟ اور پھر خود ہی بتا دیا کہ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ (30:32)۔ ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں فرقہ بندی پیدا کر لی۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کہا کہ وَكَانُوْا شِيَعًا (30:32)۔ فرقوں میں بٹ گئے۔ خود بھی ایک فرقہ بن کے بیٹھ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ پھر ٹھیک ہے صاحب! آپس میں بات چیت کر کے پتہ چل جائے گا کہ یہ غلط ہے' وہ صحیح فرقہ ہے۔ یہ گمراہ ہیں' وہ دوسرا گمراہ نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب فرقے پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر یہ بات نہیں رہا کرتی کہ دیکھا جائے کہ کسے صداقت کی تلاش ہے اور کون ہم میں سے غلط ہے۔ وہاں تو ہر فرقہ اپنے ہی میں مگن ہوتا ہے۔

ہر فرقہ اپنے آپ میں ہی مگن رہتا ہے

عزیزانِ من! فرقہ بازی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ہر فرقہ یہ دیکھے کہ کسے صداقت کی تلاش ہے اور کون روشِ غلط پر گامزن ہے۔ کوئی فرقہ بھی اپنے آپ کو نہیں کہتا کہ میں غلطی پہ ہوں۔ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کیونکہ فرقوں کی نفسیات ہی یہ ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ** (30:32)۔ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یعنی ہر فرقہ اس میں مگن ہوتا ہے کہ ہم سچائی پر ہیں، دوسرے گمراہ ہیں۔ مگر قرآن انہیں کہتا ہے کہ **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ** (30:31)۔ دیکھنا مشرک نہ ہو جانا۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شرک یہ ہے جس میں فرقے بن جاتے ہیں۔ قوم فرقوں میں بٹ جاتی ہے اور ایک شرک وہ ہے جو صرف بُت پرستی کا ہے۔ جس پر ایک پیغمبر نے جواب دیا، دوسرے نے سنا، مطمئن ہو گئے کہ اس کا ازالہ ابھی ہو جائے گا لیکن جب دین میں فرقے پیدا کر لو تو عزیزانِ من! پھر تو چودہ سو سال میں بھی آپ ''جتنی ٹل لانی اے، لا کے رکھ لو''❶ یہ شرک نہیں مٹ سکتا۔ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو، کر کے دیکھ بھی لیا ہے، ہر شخص آپ کے ہاں دیکھ رہا ہے کہ اختلافِ امت نے تباہ کر دیا ہے، اس نے مار دیا ہے۔ برباد کر دیا، شکوہ ملک و دین تک باقی نہیں ہے۔ مگر یہ شرک قائم و دائم ہے۔

دنیا کی امامت مسلمان کے ہاتھ تو آ سکتی ہے، مگر کس طرح؟

اگر آج مسلمان، جو مراکش سے انڈونیشیا تک، ایک بحرِ متلاطم ہے، موجیں مارتا سمندر ہے، کہیں اکٹھے ہو جائیں، ان میں اتحاد پیدا ہو جائے، تو دنیا کی کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ ساری دنیا پہ غالب آ سکتے ہیں۔ آپ ان کے ہاں ہر جگہ یہ بحث سنیں گے۔ یہ سارا کچھ سننے کے بعد جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہونگے تو جس مسجد میں یہ نماز پڑھ رہے ہیں، وہاں اگر کوئی ہاتھ اونچا کر کے یوں نہ لایا تو جو ہاتھ یہاں تک نہیں کرتا اس کو مسجد سے نکال دیں گے، عزیزانِ من! اس کے بعد مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کو متحد کرنے والا کوئی واعظ جب کھڑا ہوتا ہے تو یہ اِسے بھی برداشت نہیں کرتا کہ وہ اس کی طرح ہاتھ نہیں باندھتا یا نماز نہیں پڑھتا۔❷

شرک آسانی سے مٹ جاتا ہے، لیکن فرقہ بازی سے توبہ بھلی

آج فرقے بدستور قائم ہیں۔ ان میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ان حالات میں مٹ نہیں سکتے۔ دین کے تفرقے میں جو شرک پیدا ہوتا ہے، وہ دلائل سے مٹتا ہی نہیں ہے۔ بُت پرستی کا شرک تو بڑی آسانی سے مٹ جاتا ہے۔ ہندومت کو چھوڑ کر یہاں جتنے

---

❶ جتنا بھی زور لگانا ہے لگا کر دیکھ لو۔

❷ اقبالؒ (1938-1877) کے الفاظ میں ہوا یہ کہ

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عجم کے پجاری تمام!

حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی۔ (بالِ جبریل۔ ص: 137)

ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں' وہ دلائل کی بنیاد پر ہوئے۔ اس بت پرستی کے خلاف ہمارے ہاں کے بڑوں نے کچھ دلائل دیئے ہیں' وہ ان سے قائل ہو گئے اور مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد بس یوں ہوا کہ محمود غزنوی [1] نے بُت شکنی کی تو برہمن نے بُت شکنوں کو بُت پرست بنا دیا۔

سلطان محمود غزنوی نے بُت شکنی کی' برہمن نے بُت شکنوں کو بُت پرست بنا دیا

برہمن نے سلطان محمود غزنوی سے کہا کہ کیا آپ نے ذرا ہماری بھی کرامت دیکھی ہے۔ کہا: جی' کیا؟ تو اُس نے کہا کہ صنم شکستہ ای یعنی تو نے بتوں کو توڑ دیا' اور بندہ شدی ایاز را' ایاز کا بندہ بن گیا۔ ہماری کرامت بھی تو ذرا دیکھو۔ یہاں بُت شکن بھی بُت پرست ہو جاتا ہے۔ یہ ہندوؤں سے مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے' [2] اسکی بھی یہ کیفیت ہے کہ (اسے بھی مسلمان ہوئے) کوئی دو تین پشتیں ہی ہوئی ہونگی۔ ہمارے ہاں جب بھی چھینک آئی بجائے اس کے کہ الحمدللہ' کہیں' چھیں کیا جے نندی کی۔ ارے وہ ٹھیک ہے جی' یہ رام تو اندر سے نکلتا نہیں۔ ان بُتوں کو چھوڑ کے ہم مسلمان ہوئے۔ وہ تو ایک فرقہ ایک بُت کو پوجتا تھا' ہم نے پتہ نہیں کتنے بُت تراشے' البتہ پتھر کے بُت نہیں تراشے کیونکہ یہ تو شرک ہے۔

عزیزانِ من! کسی سے کوئی پوچھے کہ جی' آپ کون ہوتے ہیں؟ کہیے کہ مسلمان ہوتا ہوں۔ تو دوسرا اس جواب سے مطمئن ہی نہیں ہوتا۔ سوال ہوا ہے کہ جی کون سا مسلمان؟ یعنی مسلمان ہونا اس کے لیے قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ یہ ہمارا روز کا تجربہ ہے۔ میرے یہ احباب جو قرآنِ کریم کو حبل اللہ ماننے والے ہیں' روز آ کے کہتے ہیں کہ جب کسی سے کہتے ہیں تو آگے سے وہ کہتا ہے کہ نہیں' صاحب! دسوناں پئی کیہڑے مسلمان او؟ [3] کونسے مسلمان؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے جو داغا جاتا ہے۔ میری یہ بچیاں کہتی ہیں کہ ہم سے اسکول میں یہ سوال پوچھا جاتا ہے۔ جب ان سے کہتے ہیں کہ نہیں سر! ہم صرف مسلمان ہیں تو سر کہتے ہیں کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو کسی فرقے سے منسلک ہونا چاہیے۔ عزیزانِ من! آپ توحید پرست نہیں رہ سکتے' آپ کو مشرک بننا پڑے گا' بتانا پڑے گا کہ آپ کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ ہر ایک مسلمان' الحمدللہ اہل السنّت والجماعت بتاتا ہے' اچھا جی! چلیے۔ سنی اے جی [4]۔ آ پھر سوال آتا ہے کہ جی' کیہڑے

---

[1] محمود غزنوی' جس کا دورِ حکومت 997ء سے 1030ء تک رہا' نے 1026 میں سولہویں بار ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ حملہ بڑی تاریخی شہرت کا حامل ہے۔ ہندوستان کے شہر کاٹھیاوار میں سومنات (Somnat) کے مقام پر ہندوؤں کا ایک بہت بڑا مندر تھا۔ اس مندر میں ایک بہت بڑا بت تھا۔ جب محمود اس بُت کو توڑنے لگا تو ہندو پروہت اس کے پاؤں پر گر پڑے اور التجا کرنے لگے کہ اس بُت کو نہ توڑیئے۔ اسے نہ توڑنے کے عوض بہت بڑی رقم کی بھی پیش کش کی۔ محمود غزنوی نے کہا کہ ہٹ جاؤ کافرو میں بُت فروش نہیں بلکہ میں بُت شکن ہوں چنانچہ اس نے ایک ضرب کاری سے اس بُت کو پاش پاش کر دیا۔

(Rauf, Abdur: History of Islam,1994,P 166

[2] پرویزؒ کا یہ اشارہ اپنی ہی طرف ہے۔

[3] بتایئے کہ آپ کون سے مسلمان ہیں؟

[4] یہ سنی ہے۔

سنی جی۔ کہ جی، حنفی سنی ہندے آں۔ باقی جنے سی، او تے الگ چلے گئے نیں۔ مسلمان حنفی۔ حنفی مسلمان ٹھیک ہے۔ کیہڑے حنفی؟ دیو بندی ہوئیا بریلوی ہوتسی؟ چلو جی ہوا گاں۔ ٹھیک ہے جی بریلوی۔ او کیہڑے جی بریلوی؟ قادری یا نقشبندی ہیگے او❶۔ او میرے اللہ! رست از یک بندتا افتاد در بندے دگر۔ وہ یہ کہتا ہے کہ شرک کے ایک بندھن کو توڑ کے آج یوں آگے چلیے ایک اور بندھن توڑیئے، ایک اور بندھن چلیے، کہاں تک چلتے ہو؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ شرک ہے۔

عزیزانِ من! یہ تو ہوا کہ خدا کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ اگر نہیں ہے تو یہ شرک ہو گیا۔ اب جو مشرک ہو گیا تو خدا کے ساتھ اُس کا تعلق ختم ہو گیا۔ سیدھی سی بات ہے۔ اب آگے آیئے، حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ بھی ایک تعلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خدا نے دین دیا۔ اپنی کتاب (قرآنِ کریم) بھی دی مگر امت کے لحاظ سے تو ہم اپنے آپ کو امتِ محمدیہ ﷺ ہی کہہ کے بنتے ہیں۔ کتاب کا اور خدا کا مدعی تو ہر مذہب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کتاب اپنی اصلی شکل میں نہ ہو۔ عیسائی بھی تو خدا کو مانتا ہے، خدا کی کتاب کو بھی مانتا ہے پھر وہ ہم میں سے کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ وہ امتِ محمدیہ ﷺ کا فرد نہیں ہوتا۔ ہم میں سے وہ اس دن ہوگا جب وہ امتِ محمدیہ ﷺ کا فرد ہوگا۔ رسالتِ محمدیہ ﷺ پہ اس لیے ایمان ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ امت نہیں بن سکتا۔ خدا نے کتاب (قرآنِ کریم) دی، ہم اس پہ ایمان لائے۔ خدا پرستی والی بات تو یوں ہوئی۔ اب آگے ہم امتِ محمدیہ ﷺ کے فرد چلے۔ آپ نے سن لیا کہ خدا نے کہہ دیا کہ اگر تم نے دین میں فرقے پیدا کر لیے تو تم مشرک ہو گئے، ہمارے ساتھ تمہارا تعلق ختم ہو گیا۔ اچھا جی! ہم امتِ محمدیہ ﷺ ہیں، محمد ﷺ کے ساتھ تو تعلق رہا۔ کہا کہ تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ **اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا** (30:31-32)۔ جنہوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لیے اور خود بھی فرقہ بن گئے۔ **لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ** (6:160)۔ اے رسول! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

جس نے امت میں فرقے پیدا کیے آپ ؐ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ جن لوگوں نے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور خود گروہ بن گئے تو سنیے جناب: کہا کہ اے رسول! **لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ** (6:160)۔ تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یا میرے اللہ! تیرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ عزیزانِ من! نہ خدا سے تعلق، نہ اس کے رسول سے واسطہ۔ تو پھر مسلمان کہاں کا؟ حالانکہ خدا نے کہا تھا: **مُسْلِمِيْنَ** (6:164) یعنی خدا نے تمہارا نام مسلمان یا مسلم رکھا ہے۔ رسول نے کہا تھا کہ **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ** (6:164)۔ میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوں۔ تو سننے والا مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ بات کہو جس میں شرک بھی آئے اور جس سے تمہارا محمد ﷺ سے بھی رشتہ ٹوٹ جائے۔ لہٰذا

---

❶ جناب آپ کون سے سنی ہیں؟ جی، ہم حنفی سنی ہیں۔ باقی جتنے بھی تھے وہ تو الگ ہو گئے۔ جناب کون سے والے حنفی سنی؟ کیا آپ دیو بندی حنفی ہیں یا بریلوی حنفی؟ چلیے جناب! اور آگے بڑھیے۔ ٹھیک ہے جی کہ بریلوی سنی ہیں۔ جناب کون سے بریلوی ہیں؟ قادری ہو یا نقشبندی ہو؟

تم فرقہ بتاؤ۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دین میں فرقہ پیدا کرنے والے مشرکین ہیں، رسول ﷺ سے کہتا ہے کہ اعلان کردو کہ لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160)۔ تمہارا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ آخر اس ناسور سے بچنے کا، محفوظ رہنے کا اور تفرقہ بازی کی اس چیز کو قیامت تک مٹانے کا طریقہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کا طریق صرف اور صرف یہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (3:102)۔ تم سب کے سب، بلا استثناء، اجتماعی طور پر اس نظام (اسلام) کے ساتھ، محکم طور پر وابستہ رہو اور امت میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کو مت آنے دو۔ اس طرح تم خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک کرلو، فرقے مٹ جائیں گے۔ فرقہ پرستی میں خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک کا کہنا سب سے بڑا جرم ہے۔ عزیزانِ من! تمہارے سامنے یہ بزرگ ❶ سنگین ترین جرم کا مجرم بیٹھا ہے میرا ایک ہی جرم ہے کہ میں کہتا ہوں کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا (3:102)۔ یاد رکھو! دین نہ انفرادی مسلک کا نام ہے نہ گروہ بندی کے طریقے کا۔ لہٰذا تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم سب کے سب خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک رکھو اور دین میں فرقے نہ پیدا کرو۔ عزیزانِ من! آپ حیران ہونگے! فتوے کے اندر یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ شخص ایک نیا مذہب لے کر پیدا ہوا ہے۔ وہ نیا مذہب یہ ہے کہ یہ کہتا ہے کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کہ دین میں خدا کی کتاب کافی ہے۔ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ نیا مذہب لے کر نکلا ہے۔ یا میرے اللہ! اور قصور یہ بتایا جاتا ہے کہ میں کہتا ہوں وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ (3:102)۔ تم سب کے سب خدا کی کتاب کے ساتھ وابستہ رہو۔ ''سب کے سب'' کے اندر تو پھر فرقہ نہیں آتا۔ یہ حسبنا کتاب اللہ کہنے کے بعد تو پھر یہ جو اتنے ستر بہتر فرقے بنا رکھے ہیں ان میں سے تو کوئی باقی نہیں رہتا۔ پھر تو صرف مسلمان کہا جا سکتا ہے جس سے وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کہنے پر ایک نیا مذہب بن جاتا ہے۔

خود کو صرف مسلمان کہیے فرقے خود بخود ختم ہو جائیں گے

عزیزانِ من! قریب تیس چالیس سال سے یہ پکار ہے، جسے میں مسلسل و متواتر دہرائے چلا جا رہا ہوں کہ بابا! قرآن کی نصِ صریح کے مطابق فرقہ بندی شرک ہے۔ امت میں فرقے بنانے سے حضور رسول اللہ ﷺ سے بھی کوئی تعلق نہیں رہتا۔ امت محمدیہؐ میں بھی وحدت نہیں رہی۔ میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں۔ اِس کی مخالفت میں یہ سارا کچھ سنتا چلا آ رہا ہوں۔ اب اس چیز کا آہستہ آہستہ اثر ہونے لگ گیا ہے کیونکہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ جب میں نے بات شروع کی تھی تو میں اکیلا تھا۔ ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے انہیں مسجدوں میں سوال کرنا شروع کر دیئے: مولوی صاحب! یہ بتائیے آپ جو کہتے ہیں کہ حنفیوں کی مسجد ہے یا ہم اہلسنت و جماعت ہیں، قرآنِ کریم نے یہ کہا ہوا ہے کہ فرقہ بندی شرک ہے تو کیا آپ کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ ان کے پاس اس کا کوئی جواب

---

❶ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔

نہیں۔ بہرحال، مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے ان کو مجبور کیا ہے۔ اب سوچیں گے تو سہی کہ کیا جواب دیں۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس موقعہ پر شیطان مدد کرتا ہے

''فرقہ بندی شرک ہے'' کا جواب آیا مگر اس جواب سے پہلے ایک بات سن لیجیے کہ جب وہ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ ایسے مقام پہ شیطان آتا ہے۔ وہ کچھ افسوں پھونکتا ہے اور کرتا یہ ہے کہ **فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ** (16:63)۔ مفاد پرست ان کے بُرے اعمال کو ان کی نگاہ میں خوش نما بنا کر دکھاتے ہیں۔ مفاد پرستیوں کا عنصر ان کے غلط اعمال کو مزین کر کے دکھا دیتا ہے۔ یہ بات بہت سے مقامات پہ آئی ہے۔ دوسرے مقام پہ یہ ہے کہ جب وہ مزین بناتا ہے تو ان کا جو ''سوئے عمل'' ہے، وہ انہیں بڑا حسین بن کے دکھائی دیتا ہے، پھر یہ عمل حسین بن کے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ٹھیک ہے شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس طرح کان میں کچھ پھونکے۔ عزیزانِ من! یہ اس مقام پہ پہنچ گئے ہیں۔ اب ہمارے ہاں کے فرقوں کے پاس کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو کسی نے ان کے کان میں افسوں پھونکا کہ یہ فرقے نہیں ہیں، یہ تو مکاتبِ فکر Schools of Thought ہیں۔

کہا گیا کہ یہ فرقے نہیں مکاتب فکر ہیں

عزیزانِ من! وہ افسوں یہ پھونکا ہے کہ یہ فرقے ہی نہیں ہیں، یہ تو مکاتبِ فکر ہیں۔ اب جو پوچھا کہ صاحب! قرآن نے تو فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے تو آپ کا یہ فرقہ کیوں؟ کہنے لگے کہ یہ فرقہ ہے ہی نہیں، یہ مکتبِ فکر ہے، یہ مکتبِ فکر کی بات ہے، فلسفہ میں یہ چیز آتی ہے کہ مثلاً ابنِ رشد کا ایک فلسفہ ہے، ابن عربی کا ایک فلسفہ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ ابن عربی کے فلسفے کو صحیح ماننے والوں نے ابن رشد کے فلسفے کو صحیح ماننے والوں سے کہا ہو کہ ہماری مسجد میں کوئی نماز نہ پڑھنے آئے۔ وہاں یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر ہمارے ہاں فرقوں میں کیفیت یہ ہے کہ مثلاً اونچی آواز سے آمین کہنے والا اس مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا، جو خفی آمین کہتے ہیں وہی اس میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔ آپس میں کیفیت یہ ہے۔ مگر آہ! یہ کہتے ہیں کہ یہ فرقہ نہیں ہے یہ تو مکتبِ فکر ہے۔ یاللعجب!

مکاتبِ فکر کا شوشہ اور امامِ کعبہ کے پیچھے باطل نمازیں

عزیزانِ من! مکاتبِ فکر کا یہ شوشہ آپ نے بھی سنا ہے، جو ابھی نکلا [1] ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مدینہ منورہ کے امام یہاں آئے تھے۔ انہوں نے یہاں نمازیں پڑھائیں۔ لاکھوں انسانوں نے ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں اور وہ اس قدر مطمئن تھے کہ صاحب! یا اتنے

---

[1] یہ 1976ء کو کہا گیا تھا۔

بڑے ثواب کا کام ہے' لوگ سینکڑوں ہزاروں میل سے چل کے نمازیں پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کے امام کے پیچھے نمازیں پڑھیں اور وہ نمازیں پڑھا کے بھی چلے گئے۔ اب کراچی سے ایک تحریک گونج رہی ہے کہ یہ جتنی نمازیں تم نے ان کے پیچھے پڑھی ہیں وہ باطل ہو گئیں کیونکہ یہ مدینہ منورہ کے امام تو نجدی وہابی ہیں۔ وہابیوں کے پیچھے اہلسنت والجماعت والوں کی نمازوں کے متعلق فتویٰ یہ ہے کہ ان کی ساری نمازیں باطل ہو گئیں۔ اب انہیں کہا گیا ہے کہ دوبارہ نمازیں پڑھو۔ اگر نہ پڑھیں' تو کہنے لگے کہ نہیں' او تے نمازیں باطل ہو گئیں [1] دوبارہ نمازیں پڑھو۔ آپس کی کیفیت یہ ہے۔ اب پوچھیے تو کہ یہ وہی افسوں ہے جو ابلیس نے پھونکا ہے کہ یہ فرقے نہیں ہیں' مکتب فکر ہیں۔ کیا بات ہے ان مکاتب فکر کی کہ ان کی پیچھے پڑھی ہوئی نمازیں باطل ہیں' دوبارہ پڑھو۔ یہ ہیں مکاتبِ فکر اور اگر اس سے آگے میں ان سے پوچھ لوں تو یہ کہیں گے کہ تمہیں اس سے کیا غرض تم تو منکرِ حدیث ہو' جی!

بنی اسرائیل کے ہاں 72 فرقے تھے اور ہمارے ہاں 73 فرقے ہونگے

عزیزانِ من! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ان فرقوں میں سے ہر ایک یہ مانتا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے اور یہ اسے صحیح حدیث [2] مانتے ہیں: صحاح میں ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں تو بہتّر فرقے ہوئے تھے اور میری امت میں تہتّر فرقے ہونگے۔ ان میں سے بہتّر جہنمی ہونگے' ایک ان میں سے ناجی ہوگا۔ یہ ہیں ناں موجود! یہ یہیں ہیں ناں بہتّر بہتّر فرقے۔ اگر آج کوئی فرقہ نہیں ہے' یہ مکاتبِ فکر ہیں تو حضور ﷺ نے جنہیں یہ فرقے کہا تھا' وہ کہاں ہیں۔ اگر یہ فرقے نہیں ہیں تو پھر قولِ رسول کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ اب اس سے آگے میری زبان تو جرأت نہیں دیتی کہ کچھ کہوں۔ دنیا کیا کہے گی اس رسول ﷺ کے اس قول کے متعلق جس کے مطابق یہ کہا ہوا ہے کہ میری امت میں تہتّر فرقے ہونگے۔ تم کہتے ہو کہ فرقہ نہیں ہے' پھر یہی کہو گے کہ صاحب! یہ کافر ہے' منکرِ حدیث ہے' ملحد ہے۔

میں کافر کس طرح بنا؟

عزیزانِ من! میں **حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ** کہہ کر یوں کافر ہوں۔ یہ اُس سوال کا جواب نہیں دیتے۔ ان سے پوچھا کہ تم نے قرآن چھوڑا۔ قرآن کی آیات کی رو سے فرقہ بندی تو شرک ہے اور قرآن نے کہا ہے کہ فرقہ پیدا کرنے والے کے ساتھ رسول کو کوئی

---

[1] وہ تو سب نمازیں باطل ہو گئیں۔

[2] فنِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح پہلے درجہ کی حدیث کو کہتے ہیں۔ یہ وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند متصل ہو یعنی روایت کرنے والوں میں درمیان سے کوئی راوی چھوٹا نہ ہو۔ یادداشت اور حافظہ کے لحاظ سے کوئی راوی کمزور نہ ہو یعنی عادل اور قوی الحافظہ ہو۔ (از ہری از ہری: قرآن اور حدیث: 2004' ص۔ 27)

تعلق نہیں۔ تم نے کہا کہ ہاں! یہ قرآن میں ہے لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ یہ تو سرے سے فرقے ہی نہیں ہیں، یہ تو مکاتبِ فکر ہیں۔ لہٰذا بات ختم ہوئی۔ بہت اچھا جی، کیا کہو گے؟ لیکن بات یوں نہیں ہے۔ اس میں ابلیس کی فسوں کاری شامل ہے۔

ابلیس کی فسوں کاری کہ فرقے نہیں، مکاتبِ فکر ہیں

آج جبکہ حضور ﷺ کو سب سچا مانتے ہو اور اپنے ہاں اس کو صحیح حدیث بھی مانتے ہو، ابھی کل تک آپ ہی ہمیں یہ چیز سناتے تھے اور پھر آپ کی جتنی کتابیں لکھی ہوئی ہیں ان میں اپنے فرقے کو سچا ثابت کرنے کے لیے دلیل یہ دیتے ہو کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ باقی بہتر جو ہیں جہنمی ہیں اور ان میں سے ایک ناجی فرقہ صرف ہمارا ہی ہے، ہزار ہزار صفوں پر ان کی یہ چیزیں تحریر ہیں۔ جب قرآن کی آیت کی موجودگی میں کوئی جواب نہیں بن پڑا تو اس کے بعد کہہ دیا کہ صاحب! مسلمانوں میں فرقہ تو کوئی ہے ہی نہیں، یہ تو مکاتبِ فکر ہیں۔ عزیزانِ من! کبھی امت کو کسی طریق سے بھی کوئی گمراہی چھوڑ کے ذرا صحیح راستے کی طرف آنے کا خیال آتا ہے تو فوراً یہ افسوں کان میں پھونک دیا جاتا ہے۔ یہی ہے وہ چیز جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ** (16:63)۔ شیطان ان کے غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھا دیتا ہے۔

صدیوں سے دھوکا دیا جا رہا ہے

عزیزانِ من! آج فرقہ بندی مزین ہوگئی ہے، اس طرح ان کے ہاں پھر مکاتبِ فکر کی اصطلاح آ گئی۔ اب ان کے ہاں آپ دیکھیں گے جہاں جہاں ان کے مضامین چھپتے ہیں وہاں مکتبِ فکر لکھا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ بہت خوش ہیں کہ **يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (2:9)۔ یہ نظامِ خداوندی اور اس کے قائم کرنے والی جماعتِ مومنین سے دورخی چالیں چلتے ہیں اور بزعمِ خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں (خدا کو اور ایمان والوں کو) دھوکا دے رہے ہیں حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ **وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ** (2:9)۔ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔ وہ انہیں کیا دھوکا دیں گے، خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ فرقے کو مکتبِ فکر کہہ کر مطمئن ہو کے بیٹھ جانا کہ ہم فرقہ پرست نہیں ہیں ہم پہ قرآن کی یہ آیت منطبق نہیں ہوتی اگر خود فریبی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

ہاں، تو عزیزانِ من! بات ہو رہی تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا تھا کہ میں نے بنی اسرائیل کو اس لیے نہیں روکا تھا کہ تو ہی آ کے کہے گا کہ تو نے قوم کے اندر تفرقہ ڈال دیا۔ **وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ** (20:94)۔ اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا اور میرا انتظار بھی نہ کیا کہ میں آ جاؤں تو پھر یہ بات سوچیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے قوم کی اس عارضی جہالت کو گوارا کر لیا، اِسے تفرقہ سے بچا لیا۔ لہٰذا اب بنی اسرائیل سے پہلی بات یہ ہوئی ہے کہ تم نے یہ کیا کیا؟ دوسری بات حضرتِ ہارون علیہ السلام سے ہوگئی کہ یہ معاملہ تو یوں صاف ہو گیا۔

حضرتِ موسیٰ علیہ السلام بھی مطمئن ہو گئے جو اتنے غضبان آئے تھے۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ اس قومِ بنی اسرائیل کو نہ روکنے میں یہ حکمت تھی کہ کہیں قوم میں فرقہ نہ پیدا ہو جائے تو اُس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اس کے بعد ہے کہ **قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ** (20:95)۔ پھر وہ سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے کہا کہ تجھ پر کیا بنی تھی کہ تو نے یہ کچھ کر دیا؟ عزیزانِ من! وقت ہو گیا۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ آیت 94 تک ہم آ گئے' 95 سے ہم آئندہ لیں گے۔

استدراک

مجھ سے کسی صاحب نے ایک بات پوچھی ہے' یہ اعتراض نہیں ہے' وہ صاحب وضاحت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آپ اکثر قرآنِ کریم کے ان دروس میں اقبالؒ (1877-1938) کے اشعار بھی ساتھ کوٹ (Quote) کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ پوچھا ہے کہ کیا یہ شخصیت پرستی تو نہیں ہے۔ تو میں نے سوچا ہے کہ آپ احباب کو بھی بتا دوں کہ شخصیت پرستی کسے کہتے ہیں؟

شخصیت پرستی کی تعریف

شخصیت پرستی کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ کسی انسان کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ وہ جو کچھ کہے' صحیح کہے اور اس کا کہا ہوا دین میں سند ہو۔ اسے شخصیت پرستی کہتے ہیں۔ اور میرے نزدیک یہ پوزیشن کہ جو کچھ اس میں ہے' وہ صحیح ہے' سچ ہے' اور وہ دین میں سند ہے۔ یہ پوزیشن صرف خدا کی کتاب کو حاصل ہے' کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اب رہا یہ کہ میں کبھی یہ چیزیں کوٹ (Quote) کرتا ہوں۔ یہ صداقتیں جو قرآن کے اندر کی ہیں' اپنی جگہ اٹل ہیں' حق ہیں' ان کو ہماری تائیدات کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن جب ہم انہیں Explain (واضح) کرتے ہیں تو جہاں جہاں بھی کوئی چیز ان کی تائید کے لیے کسی نے اپنی فکر کی بنیاد پر' اپنے مطالعہ کی بنیاد پر' اپنے تجربے اور مشاہدے کے بنیاد پر' سائنس کے انکشافات کی بنیاد پر' کہی ہوئی ہے' میں اس چیز کو پیش کرتا ہوں۔ اُسے سند نہیں قرار دیتا۔ سند (Authority) تو صرف خدا کی کتاب (قرآن کریم) ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) تو پھر بھی ایک مردِ مومن ہے' غیر مسلم نے بھی اگر کوئی بات ایسی کہی ہے جو قرآن کے کسی دعوے کی تائید کرتی ہے تو اس کی تائید میں' میں اس چیز کو پیش کرتا ہوں مگر اسے سند نہیں قرار دیتا۔ سند تو صرف خدا کی کتاب ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے بھی خدا کی کتاب کی صداقت کو مان لیا تو پھر اس لحاظ سے اس کا قول تائیداً پیش کر دیتا ہوں۔ باقی رہا اقبالؒ یا کوئی اور تو عزیزانِ من! جہاں جہاں میں نے دیکھا ہے کہ وہ میری بصیرت کے مطابق قرآن کے خلاف ہے تو میں نے اس کی دھڑلے سے مخالفت کی ہے۔

مخالفت نہیں ہے، یہ اختلاف ہے

میرا یہ دھڑلے سے مخالفت کرنا ان کی مخالفت نہیں ہے۔ یہ اختلاف ہے یعنی انہوں نے یہ بات کہی لیکن میرے نزدیک یہ چیز قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ بات یہ ہے۔ آپ احباب نے دیکھا ہوگا کہ مثنوی اسرار و رموز کی شرح طلوع اسلام میں تین چار سال تک شائع ہوتی رہی۔ یہ 1956ء سے 1959ء تک شائع ہوئی۔ اس میں آپ دیکھیے گا کہ کتنے ہی مقامات آتے ہیں، جہاں میں نے یہ چیز کہی ہے کہ یہاں اقبال سے مغالطہ ہوگیا ہے۔ یہ چیز میری بصیرت کے مطابق قرآن کی اس آیت کے خلاف جاتی ہے۔ اس لیے میں اس سے متفق نہیں ہوں۔ وہاں وہ غلطی کر گئے۔ کیا آپ اس کو شخصیت پرستی کہتے ہیں؟ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے اقبالؒ یا کسی اور کی حتیٰ کہ اگر مغرب کے مفکرین کی، غیر مسلموں کی، یہ چیزیں جو میں پیش کرتا ہوں، قرآن کی صداقتِ ابدی کی تائید میں آتی ہیں تو میں انہیں پیش کر دیتا ہوں [1] اور جو اس کے خلاف جاتی ہیں میں انہیں رد کرتا ہوں لہٰذا اسے شخصیت پرستی نہیں کہتے۔ (شکریہ)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

[1] اس سلسلے میں درج ذیل شعر ملاحظہ فرمایئے، بات واضح ہوجائے گی:

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اسی سلسلے میں یہ بھی دیکھیے

سرسید کی لوحِ تربت اور اقبال

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا، قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا، فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں
چُھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ! کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اَب نہ آئیں اُن فسانوں کو نہ چھیڑ
پاک رکھ اپنی زباں، تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

بانگِ درا۔ ص ص: 66-67

دسواں باب: سورۃ طٰہٰ (آیات 95 تا 107)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ
تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ
الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا
مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ
لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ كَذٰلِكَ
نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَاۗءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ
يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ
نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

عزیزانِ من! آج جون 1976 کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 95 سے ہو رہا ہے: (20:95)۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سلسلہ کلام یہاں تک پہنچا تھا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی عارضی سی غیر حاضری میں سامری نے ایک بُت بنایا اور قوم نے اسے پوجنا شروع کر دیا۔ وہ واپس آئے تو پہلے تو انہوں نے اس قوم سے یہ کہا کہ تمہیں کیا ہوگیا۔ پھر اپنے بھائی حضرتِ ہارون علیہ السلام سے پوچھا کہ تم ان میں موجود تھے تم نے انہیں روکا کیوں نہیں۔ اور پھر آپ کو یاد ہے کہ وہ جو ایک جواب ہے' اس کے اندر ساری قیامتیں مضمر ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا کہ میں نے اس لیے نہیں روکا کہ تم بھی آ کے مجھ سے کہو گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا تو میں نے ان کی جہالت کو تو گوارا کر لیا لیکن تفرقے تک نوبت نہیں آنے دی۔ دونوں مطمئن ہو گئے۔ اب اس کے بعد سامری باقی رہ گیا تو انہوں نے کہا کہ **قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ** (20:95)۔ کہا کہ اے سامری! تم پہ کیا بنی تھی جو تم نے یہ حرکت کی؟ اب سامری کا یہ جواب تو ایسا نظر آتا ہے کہ ہم سب کی ترجمانی کر رہا ہے۔

بنی اسرائیل کی نفسیاتی کمزوری اور سامری کی چابکدستی و پرکاری

عزیزانِ من! قرآن کریم نے سامری کے جواب کے الفاظ نقل کیے ہیں کہ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ (20:96)۔ اس نے کہا کہ (جب میں اِدھر' تمہاری قوم کی طرف آیا تو) میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا یعنی سامری نے کہا کہ میں جو اِدھر آیا تو پہلے میں نے آ کے ذرا ان کی ذہنیت و کیفیت کا اندازہ لگایا اور ان میں ایسا کچھ میں نے بھانپا جو انہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ ابھی ان کا ایمان بڑا ہی ناپختہ ہے' یہ مسلمان ہو تو گئے ہیں لیکن وہ جو زنار [1] ہے' وہ ان کے دل کی گہرائیوں میں حلول کیے ہوئے ہے۔ اس طرح میں نے وہ بات بھانپی جو ان کے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں تھی۔

غور کیجیے گا! ہم اپنے متعلق خود اس بات کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتے یا لگا سکتے کہ ہمارا ایمان کتنا ناپختہ ہے۔ مسلمان ہے الحمدللہ! کیا بات ہے صاحب! اس الحمدللہ کی' اِس منافقت کی! وہ بات واقعی ہمیں نظر نہیں آتی' کاغذ کو آنکھوں کے ساتھ لگایئے تو پھر کچھ پڑھا ہی نہیں جاتا۔ اس لیے اسے ذرا دور رکھنا پڑتا ہے۔ [2] تو اس نے کہا کہ میں نے آ کر ان کی جو کیفیت بھانپی' ان کی جو قلبی کیفیت دیکھی' تو میں نے ان کے متعلق اندازہ لگا لیا کہ ان کو بہکا دینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اور اس کے بعد میں نے یہ طریق اختیار کیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کے باہر رہتے ہوئے' ایمان نہ لاتے ہوئے' مسلمان نہ ہوتے ہوئے' مخالفت کے انداز میں' غیر کی حیثیت سے' بیگانہ بن کے' باہر سے بہکانے کی کوشش کرتا تو کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ان کے سامنے اپنے ایمان کا اظہار کروں۔ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (20:96)۔ میں نے تمہارے پیغامِ رسالت کو کماحقہٗ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور محض اپنے مقاصد کی خاطر تمہارے پیرووں میں شامل ہو گیا تھا۔ یوں سمجھو کہ میں نے یونہی اچک کر کچھ تھوڑا سا دے دیا کہ گزارا ہو جائے' ان کو پتہ چل جائے کہ میں مسلمان ہو گیا تھا۔ عزیزانِ من! ہم بھی تو جس کو کلمہ پڑھا دیتے ہیں' اس کے بعد تو پھر اس کا جلوس نکالتے ہیں کہ صاحب! الحمدللہ یہ مومن ہو گئے۔ مسلمان کرنے والا بھی اپنی اس خوشی اور فخر پر پھولا نہیں سماتا۔ قوم بھی سمجھتی ہے کہ ہم میں سے ہو گیا' وہ بھی یہی سمجھتے ہیں صاحب! بہرحال سامری نے کہا کہ میں نے ذرا سا' یونہی ان کی تعلیم سے کچھ تھوڑا سا لے لیا تا کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ عزیزانِ من! یہاں بات تو بڑی صاف سی ہے لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے' اس سے کچھ لطف تو پیدا نہیں ہوا' تو لطف پیدا کرنا تو بڑا ضروری ہے۔ یہی تو مذہبی پیشوائیت کرتی ہے۔ اسے بھی ذرا سنتے جایئے۔

---

[1] وہ دھاگا جو ہندو لوگ گلے میں رکھتے ہیں اور مجوسی وغیرہ کمر پر باندھتے ہیں۔ اس سے مراد سابقہ عقائد کی دلکشی ہے۔

[2] جسے سائنس کی زبان میں Least distance of distinct vision کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں کی تفاسیر میں اثر الرسول کا بیان

آپ کو یاد ہے کہ ان مفسرین نے تفسیر میں یہ بھی لکھا تھا کہ فرعون کا گھوڑا پانی میں نہیں اتر رہا تھا۔ دریا کے کنارے کھڑا ہو گیا تھا اور پانی میں نہیں جا رہا تھا تو خدا کی ساری تدبیر ہی فیل ہو رہی تھی۔ اس کے بعد حضرتِ جبرائیل اپنی گھوڑی پہ سوار ہو کر آئے اور انہوں نے آ کے اپنی وہ گھوڑی آگے لگائی۔ وہ پانی میں اتری پھر یہ پیچھے والے بھی پانی میں اترے اور پیچھے سے حضرت میکائیل انہیں ہانک رہے تھے۔ تو بہر حال یہ جو آگے حضرت جبرائیل گھوڑی پہ سوار تھے یہ پانی میں اترے تو ان کے پیچھے فرعون اور اس کے لشکری بھی اترے۔ یہ میں پہلے تفسیر میں بیان کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں یہ تفسیر آ رہی ہے۔ تو اسی ضمن میں ''اثر الرسول'' کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ میں نے وہ کچھ دیکھا جو یہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کہا کہ میں نے جب دیکھا کہ جبرائیل گھوڑی پہ سوار آ رہا ہے تو میں نے اس گھوڑی کی جو کلائے نعل [1] دیکھی تو وہ میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے اس گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے مٹی دیکھی اور سمجھ گیا کہ اب یہ کیا کام کر سکتی ہے؟ کہ میں اگر دھات کا ایک بُت سا بنا دوں، اور اس میں وہ مٹی ڈال دوں تو وہ بولنے لگ جائے گا۔ یہ ''اثر الرسول'' کی تفسیر ہوئی۔ یہ لفظ آیت 96 کے اندر آیا ہے اور اس سے چار ہی آیتیں پہلے، جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تمہیں کیا جلدی پڑی تھی کہ انہیں اسی طرح سے ناپختہ حالت میں چھوڑ کے یہاں چلے آئے؟ اسی سورت کی 84 ویں آیت میں، یہی کوئی چار آیتیں پہلے یہ لفظ آیا ہے: قَالَ هُمْ أُولَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِیْ (20:84)۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے) کہا کہ وہ میرے پیچھے، میرے نقشِ قدم پر ٹھیک چل رہے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی خطرے کی، خدشے کی، بات نہیں تھی۔ وہ تو میری تعلیم میں، میری پیروی کر رہے ہیں۔ یہ چار ہی آیتیں پہلے ''اثری'' کا لفظ یہاں موجود ہے۔ یہاں (20:96) میں ''اثر الرسول'' آیا ہے۔ تو وہاں اگر اس کے معنی تعلیم لیے جائیں تو جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ پھر اس میں کچھ لطف پیدا نہیں ہوتا تو اس کے لیے پھر حضرت جبرائیل گھوڑی پر سوار ہو کر آئے تھے اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر کے چلے گئے۔ تو یہ بات ہی کیا ہوئی! یہ قصہ کچھ آگے بھی تو چلنا چاہیے تھا۔ لہٰذا وہ قصہ یوں چلا کہ ان کی گھوڑی کے پاؤں کے نیچے سے میں نے تھوڑی سی مٹی لے لی۔ بس یہ بات انہیں نظر نہیں آئی، مجھے نظر آئی تھی کہ یہ سارا کرشمہ اس مٹی کا ہے جو یہ بچھڑا بولنے لگ گیا تھا۔ بہر حال یہ تو میں نے کہا ہے کہ یہ سب زیبِ داستاں ہے تا کہ قصے میں لطف پیدا ہو۔

سامری نے یہ کہا تھا کہ بات یہ تھی کہ میں نے بھانپ لیا تھا کہ ان کا ایمان ناپختہ ہے۔ یہ یہاں آپ کے ہاں کے جتنے سُوٹے باز [2] منہ سے آگ نکالنے والے، جھنڈا کھڑا کرنے والے اور ایک چبوترہ بنانے والے ہیں، وہ سب پہلے یہ بھانپ لیتے ہیں کہ ان کی

---

[1] نعل کا ہنر، فن، چال ڈھال

[2] نشہ کرنے والے

خوش عقیدگی کا عالم کیا ہے۔ اب بھی جب ''خالص'' اہلحدیث کے محلے میں کبھی کوئی ایسی عمارت بنتی ہے تو یہ مجمع باز اسے بھانپ لیتے ہیں اور مجمع لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ مجمع باز پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ مجمع کہاں جمے گا تو یہ وہاں مجمع لگا لیتے ہیں اسی طرح سامری نے بھانپ لیا کہ ہاں! یہاں بات چل جائے گی تو اس کے بعد کہا کہ پھر میں نے ان میں داخل ہونے کے لیے' انہی میں کا ہونے کے لیے' او یونہی ذرا جو رسول کی تعلیم تھی' میں نے حاصل کی اور اے موسیٰ! تمہاری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' جب وقت آیا تو بڑی آسانی سے **فَنَبَذۡتُهَا** (20:96) تمہاری تعلیم کا وہ تھوڑا سا حصہ بھی میں نے الگ کر دیا۔ **وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِيۡ نَفۡسِيۡ** (20:96)۔ یہ تھا وہ نقشہ جو میرے دل نے پیش کیا اور جو مجھے بڑا دلکش نظر آیا۔ دراصل یہ تھی وہ بات جو مجھے بڑی خوش آئند نظر آئی کہ مزا آ جائے گا' چلاؤ ذرا ان کو۔ کہا کہ اچھا! یہ تم ہو اور یہ ہے وہ جو کچھ تم نے کیا۔

وقت کی رفتار قبر پرستی کو دوام بخشتی ہے

عزیزانِ من! غنیمت تھا کہ بنی اسرائیل کے درمیان نبی موجود تھا' جلدی سے ہی بات گرفت میں آ گئی' ورنہ کیا معلوم کہ کتنے سامریوں کے بنائے ہوئے کتنے ہی بُت' ہمارے ہاں چلے آ رہے ہیں اور پھر یہ تو خوش عقیدگی کا ایک ایسا مذموم مرض ہوتا ہے کہ جتنا زیادہ وقت گزرتا چلا جائے یہ مرض اتنا ہی زیادہ جڑیں پکڑتا چلا جاتا ہے۔ پہلے یا دوسرے ہی دن اگر کوئی ایسی قبر بنے اُسے اگر اکھیڑ [1] دیجیے تو ہنگامہ نہیں ہوتا۔ یہ جو اس کے ساتھ صدیوں کی عقیدتیں وابستہ ہو جاتی ہیں تو پھر آپ اسے آسانی سے نہیں گرا سکتے۔ اس لیے انہوں نے فوراً ہی اِسے پکڑ لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سامری کو معاشرے سے منطقع ہو جانے کی اذیت ناک سزا

قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِي الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ (20:97)۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہاں سے نکل جا۔ تیرے لیے عمر بھر کی سزا یہ ہے کہ تجھ سے عام معاشرتی تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ سنیے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس زور سے کہا کہ جاؤ' دفعہ ہو جاؤ۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ اب تم اچھوت بن کر رہو گے۔ تم سے سارے معاشرتی تعلقات منقطع کر دیئے جائیں گے۔ معاشرہ ہو' عزیزانِ من! تو معاشرہ سے تعلقات کا منقطع ہونا تو بہت بڑی سزا ہے اور یقیناً بہت بڑی سزا ہے۔ ہمارا تو وہ معاشرہ ہی نہیں ہے۔ ہم تو سارے

---

[1] ختم کرنا

یتیم [1] ہیں۔ کیا بات ہے ان عربوں کی! ان کے ہاں تو معاشرے کا لفظ ''عشرۃ'' سے ہے۔ جس میں ایک یا اکائی کے ساتھ صفر (Zero) لگتا ہے اور '' یہ عشر اس وقت کا لفظ ہے جب تک وہ دو یعنی صفر اور اکائی ساتھ رہتے ہیں''۔ تو پھر اس صورت میں ایک کی قیمت دس گنا ہوتی ہے اور صفر، جس کی قیمت ہی کچھ نہیں ہوتی، وہ بھی ایک کے ساتھ دس گنا ہو جاتا ہے لیکن ان کی یہ قوت اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ ان کو الگ الگ کر دیجیے، دس سے صفر کو الگ کیجیے تو پھر ایک ایک ہی رہا اور صفر کچھ بھی نہیں یعنی عشر کی یہ کیفیت ہو گئی۔ معاشرہ تو وہاں سے ہے۔ یہ تو اس وقت تک ہے جب تک عشر کی یہ کیفیت رہے گی یعنی: ایک کے ساتھ زیرو (صفر) ہے۔ یہ معاشرہ کی بنیاد ہو گی۔ مجھ سے نہ پوچھیے۔ اپنے آپ سے پوچھیے۔ یہ سات کروڑ کا بہت بڑا معاشرہ تو چھوڑ دیجیے۔ اگر صفر کے ساتھ یہ سات کروڑ لگے ہوئے ہوں تو پھر پوچھیے نہیں کہ یہ ایٹم کیا بن جائے۔ آپ ذرا یہ سوچیے کہ ایک کے ساتھ صفر لگائیے، میں نے دو ہی (ایک اور صفر) کو ساتھ لگانے کا کہا ہے۔ سوچیے تو سہی کہ آیا کوئی اس قسم کا آپ کے ساتھ ایسا ساتھی ہے؟ قرآن نے کہا تھا کہ تم معاشرہ کی کیفیت یہ کر دیتے ہو جس میں **يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15)۔ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس میں کا ہر فرد تنہا ہوتا ہے۔ **يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** (90:15)۔ جو معاشرہ میں ہزار ہا انسانوں کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پاتا ہے۔ کسی صحرا میں، کسی جنگل میں، ایک کٹیا میں، ایک جھونپڑے میں، ایک فرد ہے۔ وہ وہاں اپنے آپ کو تنہا نہیں محسوس کرتا۔ اسے معلوم ہے کہ حالات ہی ایسے ہیں، دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کا نقشہ کھینچ رہا ہے جو **يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ** ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جس میں کروڑوں کی تعداد میں ایک دوسرے کے قریب ہونے والے (ذا مقربۃ) افراد اپنے آپ کو تنہا پاتے ہیں۔ ان میں ذی القربیٰ بھی ہونگے، یہ اقربا سے بھی ہونگے، ویسے بھی قریبی ہونگے، ایک دوسرے کے ساتھ ہونگے، لیکن اس کے باوجود ہر ایک اپنی اپنی جگہ تنہائی محسوس کرے گا۔

---

[1] اَلْيُتْمُ کے بنیادی معنی ''اکیلا اور تنہا رہ جانا'' کے ہیں۔ اصمعی نے کہا ہے کہ اَلْيَتِيْمُ اس ریتلی زمین کو کہتے ہیں جو اپنے اردگرد کی زمینوں سے الگ تھلگ ہو۔ ابن الاعرابی کہتا ہے کہ اَلْـمَيْتَم، ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو تنہا اور اکیلی ہو۔ امام راغب کے نزدیک ہر منفرد اور تنہا چیز یتیم کہلاتی ہے۔ تاج العروس، محیط المحیط اور المفردات فی غریب القرآن نے علاوہ دیگر معانی کے یہ معنی بھی دیئے ہیں۔ بن باپ کے بچے کو بھی یتیم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ حرالی نے کہا ہے کہ ضرورت کے وقت باپ کا نہ رہنا یتیم کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک بچہ جوان نہ ہو، وہ یتیم کہلاتا ہے جونہی وہ جوان ہو جائے تو اسے یتیم نہیں کہتے۔ اس کے برعکس لڑکی اس وقت تک یتیمہ کہلاتی ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، خواہ وہ بالغ ہی کیوں نہ ہو چکی ہو۔ لسان العرب میں ہے کہ یتیم اس عورت کو کہتے ہیں جس کا خاوند نہ ہو، یعنی خواہ وہ مر چکا ہو یا ویسے ہی اس کا خاوند نہ ہو۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویز: لغات القرآن، جلد چہارم، ص ص۔ 1786 -1785۔

بھرے معاشرے میں اذیت ناک سزا تنہائی کا احساس ہے

عزیزانِ من! یہاں سامری کو اس جرم کی انتہائی سزا یہ بتائی گئی کہ کوئی اس کے ساتھ معاشرتی تعلقات نہیں رکھے گا۔ یہ معاشرے کا سنگین ترین جرم تھا اور اس جرم کی سزا یہ بتائی گئی کہ آج کے بعد تو يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (90:15) ہوگا' یعنی انسانوں کی بستیوں میں رہتے ہوئے بھی تو تنہا ہوگا' اچھوت ہوگا' ہم لوگ تو بڑے اونچے مرتبے کے لوگ ہیں۔ یہ جو آپ کے ہاں کمین کہلاتے ہیں' عزیزانِ من! پتہ نہیں اب بھی یہ حالت ہے کہ نہیں۔ معاف رکھیے گا' میں عام الفاظ میں کہہ رہا ہوں' خدانکردہ انہیں نہیں کہہ رہا جنہیں ہم نے کمین بنا رکھا تھا۔ یہ دھوبی' یہ کنجڑے' حتٰی کہ یہ بھنگی' مہتر' ان کی جو برادریاں ہوتی تھیں' ان کے ہاں کا جو برادری کا کوئی مجرم ہوتا تھا تو وہ اسے عدالت میں نہیں لے جاتے تھے بلکہ اسے پنچائیت میں لے جاتے تھے۔ اگر پنچائیت والے اسے سزا دیدیں کہ تمہارا ''حقہ پانی بند''[1] ہے تو معاشرے سے قطع تعلق کردینے کی' یہ علامت ہوتی تھی' یہ چیز ہوتی تھی کہ وہ چیخ اٹھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہر قسم کا ''ڈنڈ''[2] بھرنے کو تیار ہوں' خدا کے لیے مجھے یہ سزا نہ دیجیے' حقہ پانی بند نہ کیجیے' اور یہ چیختے ہوئے تو میں نے بھی سنا ہے۔ اس لیے کہ انہیں پتہ تھا کہ اگر یہ سوسائٹی مجھ سے الگ ہوگئی یا میں اس سے الگ کردیا گیا تو دنیا میں میری کوئی قیمت نہیں رہے گی۔ اس لیے کہ وہ معاشرے کا فرد ہوتا تھا' چھوٹی سی برادری ہی کا سہی۔ وہ اس برادری کا فرد ہوتا تھا' جسے معاشرہ کہا جاتا ہے۔

اُمت کی حیثیت ایک معاشرے کی تھی

عزیزانِ من! آج ہم میں اس معاشرے کا یہ احساس ہی نہیں رہا کہ اس بھرے معاشرے میں ہر فرد کا اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنا بڑی سزا ہے اور یہ بھی احساس نہیں رہا کہ اس معاشرے میں ہر فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس لیے کہ ہم نے وہ معاشرہ دیکھا ہی نہیں۔ بڑے پیمانے پر تو معاشرہ امت بنی تھی۔ اس وقت فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ[3] (3:102) کی کیفیت تھی۔ اس وقت اس نے یہ نہیں کیا تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھے کردیئے اور وہ سب ایک جگہ بیٹھ گئے تو یہ معاشرہ بن گیا۔ نہیں' اس وقت یہ امت بنی تھی۔ اس قسم کے محض مل بیٹھنے' اتحاد رکھنے کے لیے تو اس نے خود ہی کہا تھا کہ تم یہودیوں کی یہ کیفیت دیکھو گے: ''بیٹھے ہوئے ہیں ہزاروں' لاکھوں' کروڑوں کی تعداد میں' ایک دوسرے کے ساتھ' لیکن ایک کا دل دوسرے کے ساتھ ملا ہوا نہیں ہے' قلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔'' امت کا تصور تو رہا ایک طرف' یہ تو معاشرہ نہیں بلکہ جہنم ہوتا ہے۔

---

1. معاشرتی انقطاع ہے' کسی سے بول چال' لین دین' میل ملاپ' سلام دعا نہیں ہے۔
2. جرمانہ
3. تمہارے دل ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے۔

آج ہمارے معاشرے کا ایک ایک فرد یتیم ہے

عزیزانِ من! نظر آیا کہ معاشرہ اجسام کا' Physical Bodies کا' ایک جگہ اکٹھے رہنے کا نام نہیں ہے۔ اس اعتبار سے تو اسی شہر لاہور کا معاشرہ بیس سال کے اندر دس گنا زیادہ بڑھ گیا ہے۔ جتنا معاشرہ بڑھتا چلا جاتا ہے' یتیمی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ پہلے پھر بھی محلے داری تو ہوا کرتی تھی' اب تو محلے داری بھی کوئی نہیں رہی۔ یتیم ہونے کی قیامت تو یہ ہے کہ آپ کے گھر والے چیخ رہے ہیں' چلا رہے ہیں کہ گھر میں کوئی حملہ آور آ گیا ہے' شاید مستورات ہی ہیں' کوئی اور نہیں ہے' دن دیہاڑے آیا ہے۔ چیخ رہے ہیں' یہ بھی نہیں ہے کہ ساتھ والے اٹھ کے پوچھ تو لیں کہ کیا ہوا؟ سڑک پہ چلتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں راستہ طے کرنے والوں کے درمیان دو غنڈے آ کے ایک شخص کو پکڑتے ہیں' سڑک پہ لٹا لیتے ہیں' چھریوں سے اس کا ایک عضو الگ کر رہے ہیں' وہ چیخ رہا ہے مگر یہ ہزاروں کی تعداد میں راستہ چلنے والے گزر رہے ہیں' وہ دیکھ رہے ہیں' کوئی آگے جا کے پوچھتا تک نہیں۔ یہ یتیمی کی انتہا ہے اور پھر آبادی جتنی زیادہ مہذب ہوتی چلی جاتی ہے' یتیمی اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ مہذب آبادی کی شرط یہ ہے کہ صاحب! آپ کے ساتھ کون رہتے ہیں' کہا کہ اُسے کبھی پوچھنے کا یا ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ کب سے رہ رہے ہیں؟ ویسے تو پندرہ بیس سال سے رہ رہے ہیں' ہمسائے کا نام پتہ معلوم نہیں ہے کہ کون ہیں؟ ہم سایہ تو ان کا مشترک سایہ ہے اور سایہ تو آرام کی چیز کو کہتے ہیں۔ ہاں' عزیزانِ من! کبھی ہوتا تھا' اب تو سایہ بھی الگ الگ ہوتا ہے اور اب تو شاید ایک فرد کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس کے سر کے اوپر ہمیشہ بارہ بجے کا سورج ہوتا ہے' الگ سایہ ہوتا ہی نہیں۔

برادری سے الگ رکھنے کی ایک دلخراش کیفیت

عزیزانِ من! آج یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو جو سزا دی تو یہ سزا کیوں دی تھی؟ یعنی ہم کہیں گے کہ یہ سزا کیوں دی' بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ٹھیک ہے الگ رہو۔ جی' نہیں! اب کہا کہ اس کے بعد یہ یاد رکھو! اگر کوئی بھولے بھٹکے سے' نہ جانتے ہوئے کہ تمہاری کیا کیفیت ہے اور تم کو یہ سزا ملی ہوئی ہے' تمہارے قریب آنا چاہے تو اس سے کہہ دینا کہ نہیں' مجھے برادری نے چھوڑ دیا ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی کہلوانا ہے۔ اس لیے کہا کہ جاؤ: وَاِنَّ لَکَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَہٗ (20:97)۔ اور اس کے بعد (آخرت میں عذاب کا) ایک وعدہ ہے جو کبھی ٹلنے والا نہیں۔ بس تیرے لیے یہ ایک فیصلہ ہے جس سے تو کبھی بچ نہیں سکے گا۔ یہ سزا ایسی ہے کہ اپنے ذہن میں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی بات نہیں صاحب! یہاں سے نکل جاؤں گا' اِدھر چلا جاؤں گا' ان میں جا ملوں گا' جیسے آج ہو رہا ہے کہ کوئی پارٹی والوں کے ساتھ خیانت کرتا ہے تو دوسری پارٹیاں پہلے سے انتظار کر رہی ہوتی ہیں' بلکہ ہار لے کر کھڑی ہوتی ہیں۔ ہر غدار اور منافق کے گلے میں ہار پڑتا ہے۔ ہوا کیا اگر اِدھر سے الگ ہو گیا!

سامری سے کہا کہ اسے سمجھ رکھنا کہ یہاں ابھی معاشرے کی یہ کیفیت ہے: اس میں تمہاری یہ مجال نہیں ہو سکے گی کہ اس کے خلاف کچھ کر سکو۔ نظر آتا ہے کہ جہالت کی بنا پہ بُت پرستی تو کر لی تھی لیکن تربیت نبوی نے ان میں یہ کیفیت پیدا کر دی تھی کہ اگر وہاں سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ ''یہ اچھوت ہے' اسے الگ کر دیا ہے تو کوئی دوسرا اس سے ملنے کی جرأت نہیں کر سکتا' وہ ہاتھ بھی بڑھائے تو یہ ہاتھ نہیں بڑھاتا''۔ وہ جو صدرِ اول کے اندر ایک امت بنی تھی' وہ تو لفظ ہی امت ایسا تھا جس نے بتا دیا تھا کہ یہ کیا بنے تھے۔ امت کا تو مادہ ہی ''ام'' ہے یعنی یہ لفظ ہی یہاں سے نکلا ہے۔ یہ جناں دی ماں سانجھی ہووے۔ ❶ اس قوم کی عجیب بات تھی' عزیزانِ من! اوگل نئیں پیدا ہوندی پراواں وچ' جیہڑی گل ماں سانجھی ہون نال ہوندی اے۔ ❷ ام سے امت بنائی۔ اس امت میں تو علیحدگی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا' تاریخ اس کی ایک مثال بھی پیش کرتی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ صدرِ اول میں تین آدمیوں سے ایک جرم سرزد ہوا تھا۔ لشکر جہاد میں جا رہے تھے۔ (قریب ۸۰ آدمی اس غزوہ ❸ میں نہیں گئے تھے۔ انہیں متخلفین' یعنی پیچھے رہ جانے والے' کہتے ہیں۔ انہوں نے معذرت کی اور حضور ﷺ نے اسے قبول فرما لیا۔ لیکن تین صحابہ ایسے تھے جن کے لیے وحی کے حکم کا انتظار کرنا پڑا۔ ان میں ایک کعب بن مالکؓ تھے اور باقی دو بلالؓ بن امیہ اور مرارہ بن ربیع تھے)۔ آپ اندازہ لگایئے کہ امت کے اندر اتنا سا اختلاف یا الگ رہنا اتنا سنگین جرم تھا کہ قرآنِ کریم نے اسے قیامت تک کے لیے اپنے اوراق میں محفوظ کر لیا (9:118)۔ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی باہمی شہادتوں کو ضروری نہیں سمجھا' ان سے لغزش ہوئی تھی۔ یہ تین تھے۔ یہ پیچھے رہ گئے تھے۔ جہاد (غزوہ تبوک) میں ساتھ نہیں جا سکے تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ غزوہ سے واپس آئے' معاشرہ تو یہی تھا' جس کے متعلق انہیں بھی یہ کہنا پڑا کہ خدا نے کہا ہے کہ ان کے متعلق ہم فیصلہ دیں گے کہ کیا کرنا چاہیے یعنی یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ خدا کے نیچے آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اگر یہ خدا کی عدالت سپریم کورٹ تھی تو حضور کی عدالت ہائی کورٹ تھی۔ یہ بھی کوئی چھوٹی کورٹ نہیں تھی۔ خود رسول اللہ ﷺ کی کورٹ تھی۔ حضور ﷺ نے کہا کہ جماعت سے الگ رہنا جرم ہے' یہ پہلا جرم تھا' بہت سنگین جرم تھا۔ اس لیے خدا نے کہا ہے کہ اس کا فیصلہ ہم دیں گے۔ کہا کہ اس فیصلے تک ان سے قطع تعلق کر لو۔ اور پھر قرآن کے الفاظ میں قطع تعلق کے معنی اس انتہا تک پہنچے کہ بھائی بہن ماں باپ جن کے ہاں بھی یہ جاتے تھے ان کے لیے کواڑ اندر سے بند ہوتا تھا۔ (حضرت کعب بن مالکؓ' جو ان تینوں میں سے ایک تھے' فرماتے ہیں کہ) بیوی نے بھی یہ کہہ دیا کہ مجھ پہ بھی تو ایک مومنہ ہونے کی حیثیت سے وہ حکم اسی طرح سے لاگو ہوتا ہے' استثنیٰ نہیں ہے' یا تو رسول اللہ سے اجازت لے آیئے ورنہ میرا بھی اس وقت تک انقطاع ہے۔ (حضور ﷺ کی طرف

---

❶ یہ وہ ہیں جن کی ماں ایک ہی ہو۔

❷ وہ بات ہی بھائیوں میں پیدا نہیں ہوتی جو ایک ہی ''ماں جایوں'' میں ہوتی ہے۔

❸ وہ جنگیں' جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود شرکت فرمائی' انہیں اصطلاح میں غزوات کہتے ہیں۔

سے حکم تھا کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ رہو۔ میں نے بیوی سے پوچھا کہ کیا طلاق کا حکم ہے؟ کہا نہیں۔ صرف علیحدہ رہنے کا۔ یہ سن کر میں نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ پچاس دن اسی کرب والم میں گزر گئے)۔ ان کی اس حالت کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ** (9:118)۔ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے۔

سزا یافتہ شخص کو پناہ دینے والے کے خط کا حشر

عزیزانِ من! معاشرہ سے الگ رہنے کی کیفیت کے جوان کے بیانات روایت میں آئے ہیں' وہ سنے نہیں جا سکتے؛ وہ بری طرح سے چیخ رہے تھے۔ (زندگی اور اس کی تمام جاذبیتیں ان کے لیے وبالِ جان بن گئی تھیں)۔ اور پھر یہ وہ لوگ تھے جن کے ایمان کی یہ کیفیت تھی (کہ بقول کعب بن مالکؓ ''لوگوں نے مجھ سے کہا کہ جس طرح اور لوگوں نے حیلے بنا کر معذرت قبول کروالی ہے' تم بھی ایسا ہی کرو! لیکن میری روح اس تصور سے کانپتی تھی کہ جھوٹ اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے! میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ حضور نے فرمایا: تم اپنے گھر میں ٹھہرو! اور حکمِ خداوندی کا انتظار کرو!) نظر آتا ہے کہ وہ کوئی بڑی اچھی پوزیشن پہ تھے کیونکہ غسانیوں ❶ میں سے ایک سردار (ملک غسان) نے انہیں پیغام بھیجا تھا۔ یہ مخالفین میں سے تھے۔ (غسانیوں کا عیسائی خاندان رومی حکومت کے زیرِ اثر' شام پر حکمران تھا۔ اب تک مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوتوں کو دیکھ کر رومی حکومت کو خیال پیدا ہوا کہ اس قوت کو یہیں دبا دینا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے رومی سلطنت نے اس خاندان کو متعین کیا تھا۔) ملک غسّان نے پیغام بھیجا تھا کہ ہم نے سنا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہاری قوم اس قدر ذلت آمیز سلوک کر رہی ہے' تمہیں اس قسم کے سلوک برداشت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا یہاں ہمارے پاس چلے آؤ' یہاں کی سرداری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ پیغام قاصد (شامی سوداگر) لے کر آیا تھا' کعب بن مالکؓ نے اس سے کہا کہ اگر ہمارے ہاں یہ روایت نہ ہوتی کہ قاصد کو کچھ نہیں کہا جاتا تو تمہارا سر یہیں قلم کر دیا جاتا۔ اس روایت کے صدقے تمہیں تو میں کچھ نہیں کہتا۔ تندور جل رہا تھا' وہ خط لیا اور اس تندور میں ڈال دیا اور کہا کہ اسے جا کر یہ کہنا کہ اس نے تمہارے خط کا یہ حشر کیا ہے۔ اور مزید کہا کہ اگر وہ ہوتا تو اسے بھی اس خط کے ساتھ تندور میں ڈال دیتا۔ (پھر کہا کہ اپنے آقا سے جا کر کہنا کہ تمہاری عنایات والتفات سے میرے آقا کی بے التفاتی لاکھ درجہ خوشتر ہے۔) ایمان کی یہ کیفیت تھی لیکن صدمہ یہ تھا کہ مجھے اپنوں نے بھی الگ کر دیا۔ عزیزانِ من! ان کے یہ بیانات پڑھنے کے ہیں۔ اس کے پچاس دن اس طرح گزرے تھے اور نوبت یہاں تک آ چکی تھی کہ انہیں اپنی زندگی تک کا بھروسہ بھی نہیں رہا تھا' وہ ختم ہو رہے تھے تو پھر خدا ہی کی طرف سے یہ فیصلہ آیا کہ ہاں! ہم نے ان کی

---

❶ مسلمانوں کی سرحدوں پر جو قبائل بسا کرتے تھے انہیں غسانی کہتے تھے۔

معذرت سن لی ہے۔ (بقول کعب بن مالک رضی اللہ عنہ انہوں نے کہا کہ پچاسویں دن میں اسی غم میں اپنی چھت پر بیٹھا تھا کہ میں نے آواز سنی کہ کوئی شخص جبل سلع سے بلند آواز میں پکار رہا تھا کہ کعب مبارک ہو! میں سجدہ میں گر گیا کہ اللہ نے میری توبہ قبول کر لی۔ اس کے بعد لوگ بشارت لے کر یکے بعد دیگرے میری طرف آنے لگے۔)❶ مجھے شرم نے مار دیا' معذرت خدا کی عدالت میں پیش ہوئی تھی۔ وہاں سے اس کی قبولیت کی سند آئی کہ اس کے بعد پھر انہیں امت کے ساتھ علیک سلیک کی اجازت دی اور پھر پوچھیں نہیں کہ انہوں نے کیا جشن منایا ہے۔ قرآن نے اس واقعہ کو اپنے اندر رکھ لیا ہے۔

عزیزانِ من! بالکل اسی طرح ادھر سامری کی اس سزا کو بھی قرآن نے اپنے اندر ریکارڈ کر دیا کہ معاشرے سے الگ کر دینا کتنی عظیم سزا ہوتی ہے یعنی ادھر ایک واقعہ جو ہمارے ہاں صدرِ اول میں ایسا پیش آیا ہے اسے بھی قرآنِ کریم نے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے اور وہ اس لیے محفوظ کیا کہ امت کو یہ معلوم جائے' ہر فرد کو یہ معلوم ہو جائے کہ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ملت سے جدا ہونے کی سزا اپنی ہستی کے وجود کو ختم کرنے کے مترادف ہے

عزیزانِ من! بیرونِ دریا اتنی بڑی موج کو ریت چوس کے لے جاتی ہے۔ اور سورج اسے بیرونِ دریا سے بھاپ بنا کر اڑا دیتا ہے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ امت ہو' وہ معاشرہ ہو' وہ برادری ہو۔ اس کا ساتھ دینا اسی لیے ضروری ہے۔ یہ جو فرد کا ربطِ امت کا پیغام تھا' اس کا پیغام دینے والا اقبالؒ (1877-1938) یہ سب کچھ سنتا تھا کہ ہاں! یہ گلشنِ امت بڑا ہی خزاں دیدہ ہے۔ اس کے اندر کچھ پنکھڑیاں رہ گئی ہیں' یہ چیز ہر طرف سے آتی تھی جیسے آج بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب! اس امت کے اندر رکھا ہی کیا ہے اس کے باوجود عزیزانِ من! اس کی وہ نظم (پیوستہ رہ شجر سے' امید بہار رکھ) پڑھیے' بڑی خوبصورت نظم ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے کہ

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ   پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ ❷

---

❶ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے غزوۂ تبوک رجب ۹ ھ مطابق نومبر 635ع۔ [پرویزؒ: معراج انسانیت' 1949' ص ص۔ 593-580۔ اور پرویزؒ: مطالب الفرقان جلد ششم' 1985' ص ص۔ 252-251]

❷
ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ   ممکن نہیں ہری ہو' سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے   کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور   خالی ہے جیبِ گل' زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور   رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو   نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ   پیوستہ رہ شجر سے' امیدِ بہار رکھ

کلیات اقبال 1982ء' بانگ درا' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ص۔ 248۔

شجر سے ٹوٹی ہوئی شاخ کبھی ہری نہیں ہوسکتی

عزیزانِ من! اسے یاد رکھیے کہ جو شاخ خزاں میں شجر سے ٹوٹ جائے' اس کا ہرا ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا' اس لیے ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ' اور پیوستہ رہ شجر سے' امید بہار رکھ۔ عزیزانِ من! جس قسم کی یہ ساری امت ہے' اسی قسم کے ہم ہیں۔ ہم ان سے الگ نہیں ہیں۔

یہ بہت بڑا فریب ہے جو یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ ہم نے اس امت میں سے صالحین کو الگ کر لیا[1]۔ یا للعجب! اور یہ کہنے والا ہمیشہ پہلے اپنا وجود الگ کھڑا کرتا ہے' یعنی وہ پہلے اپنے آپ کو یہ کہتا ہے کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ دس برس تک یہ شخص[1] وہاں کہتا رہا کہ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ پانچ' سات' دس کروڑ مسلمان' مسلمان کی حیثیت سے باقی رہتے ہیں یا ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے ہیں' میرے نزدیک اس سے کچھ فرق نہیں' ایک مسلمان کے نزدیک کچھ فرق نہیں۔ حالانکہ رسول ﷺ نے تو کہا تھا کہ **اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ** (6:164)۔ میں ان میں کا پہلا مسلمان ہوں' یعنی سب سے پہلے میں نے خود اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ عزیزانِ من! اس کا یہ کہنا کہ میرے نزدیک کچھ فرق نہیں پڑتا کہ یہ دس کروڑ مسلمان' مسلمان کی حیثیت سے باقی رہتا ہے یا ہندوؤں میں جذب ہو جاتا ہے' میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں! یا للعجب!! اس کا کونسا مقام ہے؟ کیا رسالت کا مقام ہے؟ کیا مامور من اللہ ہونے کا مقام ہے؟ کہ یہ کہتا ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں اور یہ بھی کہ یہ رہیں یا نہ رہیں' میرے نزدیک کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ بھی کہ میرے نزدیک مسلمان ہونے کی حیثیت سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مسلمانوں کی اپنی مملکت قائم ہوتی ہے یا نہیں' میرے نزدیک مسلمان ہونے کی حیثیت سے' یہ باقی سارے دس کروڑ کوئی مسلمان نہیں ہے' میں ہی مسلمان ہوں۔

عام انسانوں میں صرف ذات نبی کو ہی انفرادیت کا حق حاصل ہے

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ صرف ایک خدا کا رسول کہہ سکتا تھا کہ وہ اُن میں سے نہیں ہوتا تھا' جن میں سے وہ پیدا ہوتا تھا۔ جن میں اس نے اپنی زندگی بسر کی ہوئی ہوتی تھی۔ کسی دوسرے کو اس کا کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ یہ کہے کہ وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ تو جیسی قوم ہے' اس کا ہر فرد ویسا ہی ہے' وہ اسی میں سے ہے۔ اس طرح سے یوں الگ ہو جانے والی بات ایک نیا دین لانے والا تو کر سکتا ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ میں ایک دوسرا نیا دین لے کر آیا ہوں۔ اسے یوں الگ کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صورت نہیں ہے تو پھر جیسی حالت باقیوں کی ہے ویسی ہماری ہے۔

عزیزانِ من! ہم کوئی مامور من اللہ تو نہیں ہیں کہ ہم یہ کہیں اور پھر قیامت یہ کہ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ آ و تجدیدِ ایمان کرو' نئے سرے سے ایمان لاؤ!! یا للعجب! ارے بھئی! کس کے ہاتھ پہ ایمان لاؤ؟ کہا کہ ہمارے ہاتھ پہ ایمان لاؤ۔ پوچھا گیا کہ آپ

---

[1] یہ اشارہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1978 - 1903) کی طرف ہے۔

نے تجدید ایمان کیسے کی ہوئی ہے؟ کہنے لگے کہ رسول کی طرح ہمیں تو ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ ہمارے ہاتھ پہ تجدید ایمان کرو۔ عزیزانِ من! یہ تجدید ایمان کرائی گئی۔ مودودیؒ [1] کے ہاں یہ روئیداد بڑے فخر سے شائع کرائی گئی۔ یہ ان کے ہاں اگست 1941ء کے اجتماع میں موجود ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا' عزیزانِ من! کہ جس قسم کی بھی اچھی بُری امت ہے ہم سارے وہی ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ نہیں ہو' تو ان سے الگ ہو کے جاؤ: ہندو ہو جاؤ' عیسائی ہو جاؤ' یہودی ہو جاؤ' پھر تو کہو کہ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ جب تک مسلمان کہلاتے ہو' یہ تو آپ نہیں کہہ سکتے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں یا یہ مجھ میں سے نہیں ہیں۔ تو صاحب! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ کچھ بھی اس لیے برداشت ہو رہا ہے کہ معاشرہ نہیں ہے۔ اگر معاشرہ قائم ہوتا' اگر یہاں امت موجود ہوتی' تو وہ تو صرف تین ہی تھے جو یہ کہنے والے ذرا پیچھے رہ گئے تھے کہ ہم تم میں سے نہیں ہیں۔ امت ہونی چاہیے' اس کے بعد تو فیصلہ یہی ہے کہ ٹھیک ہے جو فیصلہ ان کے متعلق کیا گیا کہ اگر تم اس امت میں سے نہیں ہو تو کچھ اور امت بنو۔ جاؤ' ہمیں پھر تم سے واسطہ نہیں ہے' لیکن اگر تم یہی کہتے ہو کہ تم مسلمان ہو' ہم مسلمان ہیں' تو پھر تو مسلمان بن کے رہنا ہوگا۔ اور اگر کہتے ہو کہ ہم ان سے الگ ہیں تو پھر الگ ہو کے رہنا ہوگا۔ پھر یہ بات بڑی سیدھی سی' منطقی سی' ہے۔

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کہیں امت ہو' قوم ہو' ملت ہو' معاشرہ ہو' تو اس میں سے کسی کو الگ کر دینا یا کسی کا الگ ہو جانا' تو گویا قیامت کا برپا ہو جانا ہے۔ یہ سزا تھی جو اس سامری کو دی گئی اور بہت بڑی سزا تھی۔ اور پھر یہ سزا اسی سامری تک ہی نہیں رہی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کافی عرصے تک فلسطین کے ایک چھوٹے سے گوشے میں' ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا' اُسے سامری کہتے تھے۔ وہ اچھوتوں کا قبیلہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور ان کے آگے جو نسل بڑھی ہے تو اس باقی قوم نے انہیں اس طرح سے اچھوت قرار دیا کہ وہ مستقلاً اچھوت ہی ہو گئے۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا' عزیزانِ من! کہ اگر معاشرہ قائم ہو' اس میں سے کسی کو الگ کر دینا' اچھوت قرار دینا' حقہ پانی چھڈ دینا' [2] اس کے لیے سخت ترین سزا ہے اور جب معاشرہ ہی نہ ہو تو پھر تو ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ساتھ رہنے میں کیا فرق ہے اور الگ ہو جانے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ حالت آج کی نہیں ہے بلکہ صدیوں سے یہی کیفیت چلی آتی ہے۔

آج کا مسلمان افراد کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے' اُمت کی نہیں

عزیزانِ من! آج کسی آدمی کو' توبہ توبہ' کسی دوسرے سے معاملہ نہ پڑے' ورنہ نانی چھٹو یاد آ جاتی ہے۔ [3] ہم کہتے ہیں کہ بہشت وہ

---

1. سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903 - 1978)
2. معاشرتی انقطاع کر دینا۔ معاشرتی بائیکاٹ کر دینا۔
3. سخت مشکل پڑنا

مقام ہے جہاں کوئی پریشانی' کوئی آزار' کوئی تکلیف' کوئی مصیبت' نہیں ہوگی۔ ارے! دیکھو تو سہی' اس کی ایک ہی شکل ہے کہ کسی کا کسی دوسرے کے ساتھ معاملہ نہ پڑے' معاملہ پڑا تو یہ بہشت جہنم بنا۔ آج سکھ میں وہ رہ سکتا ہے جس کا کسی اپنے جیسے دوسرے انسان کے ساتھ واسطہ نہ پڑے' معاملہ نہ پڑے۔ جب معاملہ پڑتا ہے' یہ بہشت جہنم بن جاتا ہے۔ عزیزانِ من! آج ہماری یہی حالت ہے۔ یہ صورت اس لیے پیدا ہوگئی ہے کہ وہ امت نہیں رہی۔ ہم افراد کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ہم فرد ہیں' ہم قوم نہیں ہیں۔ یہ ایک قوم' دو قوموں' چار قوموں' کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہاں قوم کا وجود ہی نہیں ہے' ہر فرد تنہا رہ رہا ہے۔ یتیم ہے۔

امریکہ کے اپنے اہلِ دانش کی چیخ و پکار

یہاں میں امریکہ کے دو مصنفین (Authors) کی کتاب کا حوالہ دیتا ہوں۔ اور اس کتاب کا عنوان بتا رہا ہے کہ معاشرے کی کیفیت کیا ہے حالانکہ ہم یوں سمجھتے ہیں کہ نہیں' وہ ان لوگوں کا معاشرہ ہے' وہ قوم ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرے کے متعلق کتاب لکھی۔ اس کا عنوان ہے: The Lonely Crowd (ہجومِ یتیم) یہ وہی چیز ہے جسے قرآن نے یَتِیۡـمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ (90:15) کہا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ جس میں ہزار انسانوں کے قریب رہتے ہوئے بھی ہر فرد اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار پائے۔ یہ کتاب اسی آیت کا ترجمہ ہے: The Lonely Crowd۔ ہجوم ہے' مگر ہے Lonely (تنہا) یتیم۔ یہ ہوتا ہے کسی کو برادری سے چھڈ [1] دینا اور پھر اگر ساری برادری ہی یَتِیۡـمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ (90:15)۔ اتنے ''قریب'' ہونے کے باوجود تنہا ہے تو اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جب ان لوگوں کی حالت تباہی پہ پہنچ جاتی ہے' مصیبتیں آتی ہیں' تو اس وقت پھر یہ بجائے اس کے کہ یہ دیکھیں کہ ہم نے کیا جرائم کیے تھے' جن کی وجہ سے ایسا ہوا ہے' وہ کہتے ہیں کہ یہاں بیٹھے بٹھائے' خواہ مخواہ ہی' خدا نے ہمیں ذلیل کر دیا۔ خدا نے ذلیل کر دیا؟ بس خدا کی طرف یہ بات پہنچائی اور معاملہ صاف! اپنے متعلق کچھ بھی نہیں! کیسا تعجب انگیز ہے یہ جواز!

اس ذلت و رسوائی کا بنیادی سبب؟

قرآن نے یہاں ان سے کہا ہوا ہے کہ کَلَّا (89:17)۔ یہ بات نہیں ہے۔ تمہیں پتہ ہے کہ یہ اس قدر ذلت کی' رسوائی کی' زندگی تم پہ کیوں آئی' یہ عذاب کیوں آیا جس سے تم چیخ اٹھے ہو۔ یہ خدا نے یونہی نہیں کر دیا۔ کَلَّا (89:17)۔ ہرگز یونہی نہیں کیا۔ تمہارے جرائم تھے۔ خدا کسی کو یونہی ذلیل و خوار نہیں کرتا۔ اس ذلت و رسوائی کی وجہ یہ ہے لَّا تُـکۡـرِمُوۡنَ الۡيَتِيۡمَ (89:17)۔ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت و توقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ اس طرح جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کیا کرتے تھے۔ کسی بھی وجہ سے جو کوئی تنہا رہ گیا ہے' یہ نہیں کہا کہ تم اس کی حفاظت نہیں کیا کرتے تھے' کہا

---

[1] علاحدہ کر دینا' معاشرتی بائیکاٹ کر دینا

یہ کہ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (89:17)۔ وہ روٹی کپڑے سے بھی رہ جاتا تھا' وہ سامانِ زیست سے بھی محروم رہ جاتا تھا۔ تمہارے نزدیک وہی قابلِ عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو' جس کا جتھہ طاقتور ہو۔ یہ تھا تمہارے نزدیک ان کی عزت کا معیار! اس طرح تمہارے نزدیک پہلا معیار یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ اس کا جتھہ کتنا بڑا ہے' پارٹی کتنی بڑی ہے' یہ ہماری طرف کتنے آدمی ساتھ لے کے آئے گا۔ یہ تھا معیارِ تکریم۔ معیارِ تکریم یہ نہیں تھا کہ اگر فرض کرو ایک فرد کسی طرح سے تنہا رہ گیا ہے تم اس کی بھی عزت کرو' اس لیے کہ اس کے باوجود وہ انسان تو ہے' کیوں کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70)۔ ہم نے ہر فردِ انسانیہ کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہ تمہارے ہاں کی جتھے بازیاں' پارٹی بازیاں' گروہ سازیاں' تو بعد کی چیزیں ہیں ہے جو معاشرے کے اندر تم نے پیدا کی ہیں' جب کہ ہم نے تو ہر انسانی بچے کو واجب التکریم پیدا کیا اور ایک تم ہو کہ اس انسانی بچہ کو جو کسی طرح سے بھی معاشرہ میں الگ رہ جاتا تھا' جیسا وہ پیدا ہوا ہے' تم اسے واجب التکریم ہی نہیں سمجھتے تھے۔ یہ تمہارا اپنا ایک معیار تھا' خدا نے نہیں بنایا تھا۔

خودساختہ خدائی تصورات اور اختیارات کو ماننے کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو کہا کہ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا (20:97) اور دیکھ! تیرے گھڑے [1] ہوئے ''خدا'' کا اب کیا حشر ہوتا ہے۔ اب دیکھ! یہ جسے تم خدا بنائے بیٹھے ہو' یہ مٹی کا معبد ہے' جس کی پرستش پر تو اس طرح جم کر بیٹھا ہے۔ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا (20:97)۔ ہم اسے رگڑ کر ریت بنا دیں گے اور پھر اسے جلا کر سمندر میں بہا دیں گے تاکہ یہ لوگ دیکھ لیں کہ یہ بُت کس قدر بے بس تھا۔ پھر سن رکھو کہ اس قوم کو محض یہ بتانے کے لیے کہ جسے تم خدا سمجھ رہے تھے یہ کتنا بے بس' بے اختیار' بلا ارادہ' بلا کسی قوت کے' کتنا بڑا مجبورِ محض ہے۔ کہا کہ دیکھو! ہم اُسے ریتی سے رگڑ کے' اس کو ذرہ ذرہ کر کے اور آگ میں تپا کے' اس کی راکھ بناتے ہیں اور پھر اس راکھ کو ہم یوں بہا دیتے ہیں کہ اسے کسی خشکی' پانی' آگ یا ہوا میں کہیں پناہ نہ ملے گی اور اسے ان کی آنکھوں کے سامنے یہ بتانے کے لیے یہ کر دیا کہ یہ جو اپنے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا' تمہارے لیے کسی نفع یا نقصان کا موجب کیسے بن سکتا ہے! یہاں لَنَنْسِفَنَّهٗ (20:97) کا لفظ آیا ہے۔ میں دو ہی آیتیں آگے چل کر بتاؤں گا کہ خاص طور پہ یہ لفظ کیوں آیا ہے۔ دراصل کسی چٹان کو ذرہ ذرہ کر کے ہوا میں جو اڑا دیا جائے تو یہ لفظ اس کے لیے آتا ہے۔ چٹان ہو لیکن پہلے تو اس کا ذرا ذرا کیا جائے' ریت بنائی جائے' اور اس کے بعد ہوا میں اڑا دیا جائے' اس کی یہ کیفیت کر دی جائے۔ ابھی میں عرض کروں گا کہ خاص طور پہ یہ لفظ یہاں کیوں آیا ہے۔

---

[1] خودساختہ

کائنات کے اندر کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں

عزیزانِ من! یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یاد رکھو! اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىۡ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ (20:98)۔ تمہارا الٰہ صرف وہ خدا ہے جس کے سوا کائنات میں کسی کا اختیار و اقتدار نہیں یعنی تمہارا الٰہ وہ ہے کہ جس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ یہی نہیں کہ اسے بہت بڑے اختیارات و اقتدارات حاصل ہیں، اقتدارِ مطلق حاصل ہی اسے ہے، کوئی اور صاحبِ اقتدار ہے ہی نہیں۔ عزیزانِ من! ہم یہاں آج تک طے نہ کر پائے کہ نظریہ پاکستان کیا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی چلے جا رہے ہیں، نہ ان کو پتہ ہے، نہ مخالفین کو علم ہے۔ بہرحال نظریہ پاکستان تو ہے ہی اتنا سا، عزیزانِ من! کہ لا الہ الا اللہ: صاحبِ اقتدار خدا کے سوا کوئی نہیں۔ یہ ہے وہ ذات کہ وَسِعَ كُلَّ شَىۡءٍ عِلۡمًا (20:98)۔ اسی کا علم ہر شے کو محیط ہے، ساری کائنات پر اس کا علم چھایا ہوا ہے، ہر ایک کے راز سے واقف ہے۔ حالات سے واقف ہے، کوئی شے اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہے۔

خلافت کے لیے انسانی ذات بشریت کی حد تک خدائی صفات کی مظہر ہونی چاہیے

عزیزانِ من! یاد رہے کہ جو کوئی بھی ذاتِ مطلق کے نام پر حکومت قائم کرے، یعنی خدا کے اقتدار کو دنیا میں نافذ کرے جسے آپ خلافت یا خلیفہ کہتے ہیں، تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ خدا کی جو صفات قرآن میں آئی ہیں، وہ علی حدِ بشریت اس کی ذات کے اندر ان صفات کا انعکاس Reflection موجود بھی ہو اور عملی طور پر ظاہر بھی ہوں، پھر اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خدا کے نام پر، خدا کے احکام کو نافذ کرے۔ ان نافذ کرنے والوں کی کیفیت یہ ہونی چاہیے کہ پہلے وہ چیز اپنے اوپر نافذ کریں، پھر دوسرے پہ نافذ کریں کیونکہ اپنے پہ نافذ کرنے سے خدا کی صفات کی ایک جھلک یا عکس اس کے اندر آ جاتا ہے۔ یہاں سب سے بڑی یہ چیز کہی ہے کہ اس کا علم اتنا وسیع ہونا چاہیے کہ وہ اس سے باخبر ہو کہ معاشرے میں، مملکت میں، امت میں، قوم میں، کس فرد پہ کیا بیت رہی ہے۔ اسے اس کا اچھی طرح سے علم ہو۔ یہ بات تھی جو حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ [1] کہتے تھے کہ خلافت کے معنی تو اس شام کی بڑھیا نے مجھے سمجھائے۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ جب ایک فاتح کی حیثیت سے وہ واپس آ رہے تھے کہ رات ایک جگہ پڑاؤ کیا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ رات کی تنہائیوں میں، خاموشی میں، اکیلے ہی نکل جاتے تھے۔ تنہائی میں جا کے یہ معلوم کیا کرتے تھے کہ کوئی کس حال میں رہ رہا ہے۔ دُور صحرا میں، ایک جھونپڑی کے اندر ایک بڑھیا تھی۔ آپ نے اس سے جا کے یہ پوچھا کہ مائی! کیا حال ہے؟ عزیزانِ من! یہ مائی کا لفظ میں اپنے انداز میں کہہ رہا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اس بڑھیا نے کہا کہ اے پوچھنے والے! تمہیں اس پوچھنے سے کیا غرض! جسے یہ حال معلوم کرنا چاہیے، وہی نہیں معلوم کرتا، اسے ہی معلوم نہیں ہے تو تمہیں کیا پتہ؟ کہنے لگے: مائی! یہ تم کس کی بات کر رہی ہو؟ کہنے لگی کہ وہ جو اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین کہہ

---

[1] حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کا دورِ خلافت 13ھ تا 24ھ بمطابق 634ء تا 645ء ہے۔

کے بیٹھا ہوا ہے' امیر المؤمنین کہلوا رہا ہے' خدا کا 'نائب' بنا ہوا ہے' اس کے احکام کو نافذ کر رہا ہے' اتنی بڑی مملکت' اتنا بڑا معاشرہ' اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ کہا: مائی! تم نے اسے کچھ بتایا ہے کہ تمہارا حال کیا ہے جو پھر اس نے تمہاری خبر گیری نہیں کی۔ یہ ہے جی' جو انہوں نے کہا تھا' جو مجھے اس بڑھیا نے بتایا ہے کہ خلافت کیا ہے؟ کہا: خدا کے نام پر جو خلیفہ بنتا ہے' اس کے لیے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ محتاج و مفلس خود اپنا حال جا کے اس کو بتائے۔ اس کا اپنا فریضہ یہ ہے کہ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کس پہ کیا گزر رہی ہے۔ جیسے خدا کو معلوم ہے کہ بندوں پہ کیا گزر رہی ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے پاس اس شام کے ویرانے کی بڑھیا کا جواب نہیں تھا۔ کہا کہ رات کا باقی حصہ آ کے روتا رہا۔ اے الہ العالمین! یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے جسے میں اپنے سر پر لے بیٹھا' مجھے تو اس کا پتہ ہی نہیں تھا' عزیزانِ من! یہ ہے دنیا میں نائبِ حق ہونا یعنی دنیا کے اندر خدا کے احکام کو نافذ کرنے والا ہونا' اور آپ ساری عمر یہ کہتے رہے کہ جسے خلافت کہتے ہیں' اسے تو عمر رضی اللہ عنہ کو اس بڑھیا نے سمجھایا۔ یہی مشہور مقولہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر دریائے دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری بھی عمر رضی اللہ عنہ کے اوپر ہوگی' اور ایک ایک بات کا جا کے جواب دینا پڑے گا۔ پھر آپ نے یونہی ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ کاش! میں جیتا جاگتا انسان ہونے کی بجائے یہ تنکا ہوتا' تو حساب سے تو چھوٹ جاتا۔ یہ ہے اس بارِ گراں کو اٹھانے کی ذمہ داریاں' عزیزانِ من! بہر حال یہ ہے وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا (20:98)۔ اسی کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ کوئی شے اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔ عزیزانِ من! قصہ داستانِ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام جس کا آغاز ہوا تھا وہ یہاں ختم ہو گیا۔ اس پارے میں یا اس سورۃ میں آگے چل کے اور تفاصیل آئیں گی۔

قرآنِ حکیم میں جا بجا بیان کردہ تاریخی واقعات کا اصل مقصد

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ یہ دادی اماں کی کہانیاں نہیں ہیں' جو وہ رات کو بچوں کو سلانے کے لیے بیان کیا کرتی ہے۔ یہ کہانیاں تو سوتوں کو جگانے کے لیے ہیں۔ کہا کہ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ (20:99)۔ اے رسول! ہم اس طرح گزری ہوئی سرگزشتوں میں سے بعض باتیں تجھ سے بیان کر دیتے ہیں۔ یوں ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ پہلی قوموں پہ کیا گزری تھی' ان کے ہاں کے جو اتنے اتنے بڑے بنے بیٹھے تھے' جن کے جھنڈے گڑھے ہوئے تھے' جو فرعون بنے بیٹھے تھے' ہم بتا دیتے ہیں کہ ان پہ کیا بیتی تھی اور یہ بھی کہ رسولوں کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔ كَذٰلِكَ (20:99)۔ یوں یہ سب کچھ تمہیں ہم سناتے ہیں' اے رسول! ان تاریخی توشتوں کے علاوہ: وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا (20:99)۔ ہم نے تجھے ایک ایسا ضابطۂ قوانین دیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال کن اصولوں کے مطابق ہوتا ہے اور اس طرح صرف یہ کہانیاں ہی نہیں بتائیں بلکہ اس کے ساتھ ہم نے تمہیں ایک ضابطہ ہدایت بھی دیا' جس کے متعلق کہا کہ اُسے ہر وقت سامنے رکھو۔ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا (20:100)۔ جو کوئی بھی اس ضابطہ قوانین سے روگردانی کرے گا' وہ ظہورِ نتائج کے وقت' اپنی غلط روش کے نتائج کا بوجھ

خود اٹھائے گا' کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ اس لیے یاد رکھو! یہ وہ ضابطہ قانون ہے کہ جس نے بھی اس سے اعراض برتا' یہاں تو یہی کہا ہے کہ مکافاتِ عمل کے وقت تم دیکھو گے کہ کتنا بڑا بوجھ وہ اپنی کمر کے اوپر لادے چلا آ رہا ہے کہ چلا نہیں جائے گا' یہاں تو اتنی سی بات کہی۔ اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر آیت 124 میں کہا کہ **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124)۔ جو کوئی میرے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت (Economy)' روزی (Livelihood) تنگ ہو جائے گی اور اسے ظہورِ نتائج (قیامت) کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ زندگی کی روشن راہیں اس کے سامنے تاریک ہوں گی۔ عزیزانِ من! یہاں پر وہی لفظ ''ذکر'' آیا ہے۔ وہاں (20:100) میں تھا کہ جو ہمارے اس ضابطے سے اعراض برتے گا' جو سامنے رکھنے کے لیے دیا گیا ہے' تو ظہورِ نتائج کے دن اپنی غلط روش کے نتائج کا بوجھ خود اٹھائے گا' کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا۔

تباہی اور بربادی کا پہلا نشان پسماندگی اور غربت ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ وہاں تم دیکھو گے کہ وہاں (20:100) میں قیامت کا لفظ ہے۔ ہمارے ذہن میں قیامت چونکہ صرف مرنے کے بعد آتی ہے' اس لیے وہ برحق ہے۔ وہاں یہ کیفیت ہو گی۔ لیکن قرآن اپنے قانونِ مکافاتِ عمل سے ان نتائج کو وہیں نہیں اٹھا رکھتا۔ یہاں اس دنیا میں بھی ان اعمال کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔ قرآن سے اعراض کے متعلق اسی سورۃ کی آیت نمبر 124 میں کہا ہے کہ **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ** (20:124)۔ جو اس سے اعراض برتے گی' تو اس قوم کی پہلی چیز یہ ہو گی کہ **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124)۔ اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ یہ ہمارے ہاں جو معاش کا مسئلہ' اقتصادی مسئلہ' اکنامکس کا مسئلہ ہے' اس کے متعلق ہے کہ جی! اس کو مذہب سے الگ رکھنا چاہیے۔ یہ تو Purely (خالصتاً) اکنامک کا مسئلہ ہے' معیشت کا مسئلہ ہے۔ یہ ٹھیک بات ہے کہ اس کا مذہب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذہب نے اپنے آپ کو خود ہی الگ کر رکھا ہے۔ اس لیے کہ یہ جو مذہب کے علمبردار ہیں' ان کے لیے روزی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ تو دوسرے ان کے لیے کما کر لاتے ہیں۔ او تے گل ٹھیک ہیگی'[1] مگر جسے آپ ''دین'' کہتے ہیں' وہ تو روزی کا مسئلہ ہے۔ اس کی تو بنیاد اس پہ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس نے اعراض برتا' جو قوم اس سے اعراض برتے گی' اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ اچھا جی' یہ تو پھر معیشت کا مسئلہ ہے۔ جس نے ان قوانین سے اعراض برتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی روزی تنگ ہو گئی۔ ٹھیک ہے' کہا جا سکتا ہے کہ یہاں اس کا نتیجہ بھگت لیا' معاملہ ختم ہوا۔ کہنے لگے: نہیں' ختم نہیں ہوا' آگے بھی چلے گا اور وہ اس طرح کہ **وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124)۔ اور جس کی یہاں روزی تنگ ہو گی قیامت کے دن بھی وہ قوم اندھی اٹھائی جائے گی:

---

[1] وہ بات تو صحیح ہے۔

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے!

اقبالؒ ❶

قرآنی نظام سے دُوری کا نتیجہ امروز وفردا کی تاریکی اور زبوں حالی ہے

عزیزانِ من! جس کا امروز تاریک ہے' اس کا آنے والا کل بھی تاریک ہے۔ قرآن نے آخرت کی سرخروئیوں اور سرفرازیوں کا بڑا محسوس معیار دے دیا ہے کہ جو قوم یہاں درخشندہ وتابناک نہیں ہے' وہ وہاں مستقبل میں بھی تابناک اور روشن نہیں ہے۔ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهِ وَسَآءَ لَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ حِمۡلًا (20:101)۔ وہ اُس دن اُسی حالت میں رہے گی' اُس کا یہ بوجھ کس قدر بُرا ثابت ہوگا۔ یوں کہیے کہ کتنا بڑا بوجھ ہوگا جسے وہ اٹھا کے لائیں گے! بات تو بوجھ ہی کی ہے۔ وہ جو اس نے سمجھانے کے لیے کہا ہے کہ جو نتائج ہونگے وہ ثَقُلَتۡ مَوَازِیۡنُهٗ (101:6) اور خَفَّتۡ مَوَازِیۡنُهٗ (101:8) پلڑے میں ڈالے جائیں گے۔ وہ جس کا تخریبی یعنی بُرائیوں کا پلڑا جھکا ہوا ہوگا فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ (101:9) اس کے لیے تباہی ہے' وہ ذلت کی پستیوں میں گر جائے گا اور وہ جس کا حسنات کا' حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرنے کا' پلڑا جھکا ہوا ہوگا فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ (101:7) اُس کی زندگی' اُس کی حسین آرزوؤں' کے مطابق خوش آئند ہوگی۔ قرآن نے یہاں ترازو کی مثال دی ہے۔ اعمال کے نتائج کو وزن کہہ کے پکارا ہے' ورنہ یہ بات نہیں ہے کہ باہر کوئی ترازو کھڑا ہے اور نہ ہی یہ کوئی بوجھ لینے والی بات ہے۔ وہ تو اپنی ذات لے کے جانے والی چیز ہے کہ اسکا انداز کیا ہے۔ یہ تعمیری خوشگواریوں والی بات ہے۔ ٹھیک ہے اگر تعمیری خوش گواریاں اپنی ذات (Personality) میں نشوونما پا چکی ہیں تو وہ جنت ہے اور اگر یہ ذاتِ انسانی تخریبی ہے تو پھر اس کے لیے جہنم ہے۔ اُسے قرآن نے کہا ہے کہ وَسَآءَ لَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ حِمۡلًا (20:101)۔ اس دن' اس کا یہ بوجھ کس قدر برا ثابت ہوگا۔

اب یہاں ''یوم'' بتایا ہے یعنی جس دن۔ عزیزانِ من! اب یہاں میں ذرا سا تمہیداً کچھ عرض کرونگا۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یَوۡمَ یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ وَنَحۡشُرُ الۡمُجۡرِمِیۡنَ یَوۡمَئِذٍ زُرۡقًا (20:102)۔ اعمال کے نتائج کا ظہور' اس دنیا میں سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان مخالفین کے ساتھ یہی ہوگا' جب جنگ کا بگل ❷ بجے گا اور اِن مجرمین کو اُن کے اعمال کا بدلہ اس طرح دیا جائے گا کہ مارے دہشت کے ان کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی (20:124)۔ یہاں یہ چیزیں آئی ہیں کہ صور پھونکا جائے گا' حشر برپا ہوگا' قیامت آئے گی' اعمال کے بدلے نتائج سامنے آئیں گے۔ ہمارے سامنے اخروی زندگی کا یہی نقشہ ہے۔ میں یہاں یہ عرض کردوں کہ ان تمام

---

❶ اقبالؒ: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' لاہور' 1996' ص۔ 163۔

❷ یہ اور اس کے بعد کا بیان' مرنے کے بعد کی زندگی سے بھی متعلق ہوسکتا ہے۔ (پرویز: مفہوم القرآن۔ ص۔ 720۔ فٹ نوٹ)

چیزوں پہ ہمارا ایمان ہے۔ اخروی زندگی پر ایمان کے بغیر تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہے کہ ہمارا خدا پہ ایمان یا رسول پہ ایمان یا کتاب پر ایمان ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہوتی لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ وہیں جا کے یہ نتائج مرتب ہونگے' یہاں نتائج مرتب نہیں ہونگے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ غلط معاشرہ' غلط کار قوم کے غلط نظام کے نتائج یہاں بھی سامنے آتے ہیں اور وہاں بھی۔ نبی اکرم ﷺ خدا کی طرف سے ایک نظام لے کر آئے اور آپ ﷺ کے مقابلے میں' سب سے پہلے یہ بڑے بڑے قریش' ان کے رئیس' اِن کی یہ بڑی بڑی سرداریاں' جتھے' نکل آئے تھے' اب آخری مقام وہ آ گیا جہاں ان کے ساتھ ٹکراؤ ہونا ہے اور یہ بظاہر کمزور سی قوم ہے۔ تعداد کے اعتبار سے ابھی مدینے میں کوئی تین سو کے قریب ہی تھے۔ یہ بھی آج کی اصطلاح میں نئے نئے پناہ گزیں (Refugees) تھے۔ درحقیقت وہ نئے نئے آنے والے پناہ گزیں نہیں تھے۔ پوچھو نہیں وہاں والے کیا بن گئے! مکے سے آئے ہوئے یہ بے سروسامان پناہ گزیں تھے۔ تعداد بھی یہ اتنے تھوڑے سے تھے۔ اور وہ جو اس زمانے میں سردارانِ قریش تھے' ان کا جتھہ عظیم تھا۔ وہ مکہ سے اُٹھ کر یورش کرنے کے لیے مدینہ اس خیال سے آ گئے کہ وہاں انہیں ختم کر دیں گے۔

انبیائے کرام کے مدِ مقابل: فرعون' ہامان اور قارون

عزیزانِ من! بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ لازماً یہاں مدینہ میں رہنے والوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ یہ اتنے اتنے بڑے رئیس' جو مقابل میں آ رہے ہیں' تاریخ میں ان کے نام دیکھیے' ان میں کا ایک ایک رئیس پہاڑ نظر آئے گا' ان کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے' کیا ہوگا؟ قرآنِ کریم نے یہ داستان بیان کی ہے کہ ایک طرف فرعون ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے اور فرعون سے فرعونیت تو ضرب المثل ہوگئی ہے۔ یہ تو ایک طرف رہا' اس کے ساتھ جو ہامان یعنی پروہت ہے قرآن اس کے جنود گنا رہا ہے۔ یہ بھی اتنے ہیں کہ ان کے بھی جھنڈے گڑے ہوئے ہیں اور پھر ان کے مقابلے میں قارون جیسا سرمایہ دار ہے۔ یہ بنی اسرائیل کی سی محدود قوم ہے' جو وہاں سے نکل کے' بھاگ کے' صحرائے سینا میں آئی ہوئی ہے' کچھ پاس نہیں' کھانے تک کے لیے کچھ نہیں ہے۔ انہیں وہاں صحرا کے بٹیر اور وہاں کی گوند کھانے کو مل رہی ہے' چشمے کا پانی پینے کو مل رہا ہے' حفاظت کے لیے صرف یہ کہا ہے کہ تمہارے پیچھے پہاڑ کھڑا تھا' اس کے دامن میں تم زندگی بسر کرتے تھے' بے سروسامانی کی یہ کیفیت تھی۔ لیکن قرآن نے کہا کہ اس کے باوجود تم نے دیکھا کہ وہ فرعون' وہ اس کے جھنڈے' وہ اس کے ستون' وہ اس کے جنوذ' کیا ہوئے؟ سب غتربود [1] کر دیئے گئے۔ اس لیے یہاں کہا کہ گھبرانا نہیں' یہ تمہارے مدمقابل' اتنے اتنے بڑے سردار' اتنے اتنے بڑے گاڑے ہوئے ان کے یہ جھنڈے' ان سے مقابلہ ہوگا۔ کہا کہ کوئی بات نہیں' ان کا بوریہ بستر لپیٹ دیا جائے گا۔

---

[1] برباد

اب میں یہاں یہ عرض کرونگا کہ یہ جو قرآن کی اس قسم کی آیات ہیں' عربی زبان کی رو سے' ان کے متعلق آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ چیزیں قیامت ہی کے لیے ہیں۔ اگر عربی زبان میں ان الفاظ کو دیکھا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عرب اپنی زبان میں ان الفاظ کو ان کے مجازی معنوں میں استعمال کرتے تھے اور پھر جو واقعات وہاں سامنے آرہے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جن پر یہ تمام تفاصیل منطبق ہوتی ہیں۔ چھوٹی بڑی قریباً بیاسی [1] لڑائیاں تو نبی اکرم ﷺ کی نو سال کی عہد نبوی کی زندگی میں لڑنا پڑیں' غزوات تو یہ تھے' جو بڑی لڑائیاں تھیں۔ باقی چھوٹی لڑائیاں تھیں۔ اور اتنی اتنی بڑی لڑائیاں: بدر کی' احد کی' حنین کی' اور مکہ کی یہ لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ ان کا تو قرآنِ کریم نے بھی ذکر کیا ہے۔ [2]

قرآن اپنے الفاظ کے مجازی معنی کی بھی سند عطا کرتا ہے

عزیزانِ من! میں نے گزارش کیا ہے کہ میں اس پہ اعتراض نہیں کیا کرتا کہ آج آپ ضرور وہی مجازی معنی لیجیے جو میں ان لڑائیوں کے متعلق' قیامت کے متعلق' آیاتِ قرآنی سے لونگا۔ اگر آپ اپنی دانست میں ان کے لغوی معانی کو ٹھیک سمجھتے ہیں' وہی معنی لیجیے' مگر میں بہر حال یہ معنی لیتا ہوں۔ عربی زبان اس کی سند دیتی ہے' قرآن اس کی تائید کرتا ہے

بات ہو رہی تھی کہ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ [3] وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (20:102)۔ (اعمال کے نتائج کا ظہور

---

[1] مورخین کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی رو سے عہد نبوی میں 82 مرتبہ جنگی مقاصد کے لیے نقل و حرکت کرنے کی ضرورت پڑی۔ ان میں سے 19 میں خود نبی اکرم ﷺ نے شرکت فرمائی۔ انہیں اصطلاح میں غزواۃ کہتے ہیں اور بقایا میں حضور ﷺ تشریف نہیں لے گئے۔ انہیں سرایا کہتے ہیں۔ ان تمام غزوات و سرایا میں کل 259 مسلمان شہید ہوئے اور 759 مخالفین (کل 1018)۔ اس تعداد کو 82 پر پھیلا یئے تو اوسط تقریباً 12.5 نکلتا ہے۔ یہ ہیں قطراتِ خون' نچوڑ ''وحشت و بربریت'' کی اس خونچکان داستان کا جو مخالفین اسلام' اسلامی شمشیر کی طرف منسوب کر کے دنیا کو اس دین سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ نو سال کے عرصہ میں تمام لڑائیوں میں مقتولین کی تعداد 1018 کو دیکھیے اور دوسری طرف دورِ تمدن و تہذیب اور عصرِ حاضر کے علم و عقل کے مناقشات و تنازعات کے نتائج کو سامنے رکھیے۔ صاف نظر آجائے گا کہ وحشت و بربریت کا دور کون سا ہے؟...... پھر اس 1018 کی تعداد میں آپ کو غیر مصافی آبادی کا ایک فرد بھی دکھائی نہ دے گا۔ غیر مصافی آبادی تو ایک طرف غزوہ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء) میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو لوگ قریش کی طرف سے مجبوراً میدان جنگ میں لائے گئے ہیں' انہیں بھی قتل نہ کیا جائے نیز ان میں سے کسی معصوم بچے یا بیگناہ عورت کا سر بھی آپ کو دکھائی نہ دے گا۔ (پرویزؒ: معراج انسانیت' 1949' ص ص۔ 594-593)

[2] (۱) جنگ بدر (17 رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء)؛ (۲) جنگ احد (14 شوال 3ھ مطابق 29 مارچ 625ء)؛ (۳) جنگ احزاب (ذیقعدہ 6ھ)؛ (۴) جنگ حدیبیہ (ذیقعدہ 6ھ)؛ (۵) غزوۂ خیبر (7ھ)؛ (۶) فتح مکہ (رمضان 8ھ مطابق جنوری 630ء)؛ (۷) جنگ حنین (شوال 8ھ)؛ (۸) غزوۂ تبوک (رجب 9ھ مطابق نومبر 635ء)

[3] تاج العروس' المفردات فی غریب القرآن اور محیط المحیط جیسی شہرہ آفاق لغات نے لکھا ہے کہ صور اس نرسنگھے کو کہتے ہیں جو لڑائی کے وقت بجایا جاتا ہے اور جس سے مراد اعلانِ جنگ ہوتا ہے۔ ان معانی کے اعتبار سے جب نفخ فی الصور (69:134 نیز 20:102) کا تعلق اس دنیا کے حوادث سے ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب نظامِ خداوندی کے انقلاب کے لیے باطل کی قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے گا۔

اس دنیا میں بھی سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ان مخالفین کے ساتھ یہی ہوگا) جب جنگ کا بگل [1] بجے گا اور ان کا بدلہ اس طرح دیا جائے گا کہ مارے دہشت کے ان کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی (20:124)۔ اس لیے یہاں کہا کہ ڈرتے کیوں ہو؟ جنگ کے بگل بجیں گے: یُنۡفَخُ فِی الصُّوۡرِ وَنَحۡشُرُ (20:102)۔ جتھے اکٹھے ہونگے۔ حشر کہتے ہی اکٹھے ہونے کو ہیں اور عربی زبان میں تو جنگ کے میدان ہی کو محشر کہا کرتے تھے' جہاں لشکر اکٹھے ہو جائیں' لشکر کا معنی ہی ''جمع'' ہے۔

اذیت ناکی اور صدمے کے باعث ان کی آنکھیں نیلی ہو جائیگی

عزیزانِ من! یہاں کہا گیا ہے کہ جب جنگ کا بگل بجے گا اور یہ مجرم اپنے اعمال کے بدلے کے لیے اکٹھے ہونگے۔ ان کے ہاں انتہائی پریشانی' تشویش' صدمے کے عالم [2] کی کیفیت کیا ہوگی؟ کہتے ہیں کہ اس میں آنکھیں نیلی ہو جاتی ہیں۔ یہاں (20:102) میں کہا کہ گھبراؤ نہیں' انہیں میدانِ جنگ میں آنے دو' اِن لڑائیوں کے بگل بجنے دو۔ یہ مجرمین آئیں گے۔ اُس وقت انہیں پریشانی کے عالم میں دیکھو گے اور پھر یہاں لفظ زُرۡقًا (20:102) آیا ہے۔ یہ صرف آنکھوں کی نیلاہٹ کو ہی نہیں کہتے۔ ایک تو یہ پیدائشی' طبعی بات ہوتی ہے کہ آنکھیں نیلی ہوتی ہیں اور دوسری یہ بات کہ ان آنکھوں میں کسی پریشانی یا بیماری یا کمزوری کی وجہ سے وہ نیلاہٹ ہوتی ہے' اس کے بعد آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ اس کے لیے بھی یہ لفظ (زُرقاً) بولتے تھے۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ قرآن کے مطابق وہ قوم' جو اس کے ''ذکر'' (20:102) سے اعراض (اَعۡرَضَ (20:102) برتے گی' اندھی ہو جائے گی۔ اس لیے کہا کہ انہیں آنے دو' تم دیکھو گے کہ کس طرح ان کی بینائیاں اچک کر لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہوگی: یہ گرفتار ہونگے' ان قیدیوں کی یہ حالت ہوگی تو اُس وقت یَتَخَافَتُوۡنَ بَیۡنَهُمۡ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا عَشۡرًا (20:103)۔ وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے ہوں گے۔ وہاں اونچی اونچی باتیں نہیں کریں گے اور ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں گے کہ ہماری عیش و عشرت کی زندگی' جس کے متعلق ہم سمجھتے تھے کہ ہمیشہ ایسی رہے گی' کس قدر ناپائیدار اور مختصر نکلی۔ بس یونہی ہفتہ عشرہ کے برابر۔ حیاتِ جاوداں کے مقابلے میں مفادِ عاجلہ کی مدت ایسی ہی ہوتی ہے (75:20-21;76:28)۔

پریشانی کے عالم میں گزرے ہوئے وقتوں کی یاد

عزیزانِ من! پھر اتنے اتنے بڑے ہامان اور اتنے اتنے بڑے سرداران کی یہ کیفیت ہو جائے گی کہ قیدیوں کی حیثیت سے'

---

[1] یہ اور اس کے بعد کا بیان مرنے کے بعد کی زندگی سے بھی متعلق ہو سکتا ہے۔

[2] تاج العروس اور محیط المحیط نے ان معانی کی تائید کی ہے۔ محیط المحیط میں لکھا ہے کہ عوام حشر کے لفظ کو ہجوم اور ایک دوسرے کے لیے تنگی پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔

سرگوشیوں کے عالم میں' ایک دوسرے سے باتیں کہیں گے کہ بھئی! وہ ہماری عیش سامانیوں کی زندگی' وہ جس کے متعلق ہم سمجھتے تھے کہ کبھی اس کا خاتمہ ہی نہیں ہوگا' انہیں زوال ہی نہیں آئے گا' وہ تو آنکھ جھپکنے کے عرصے کے اندر چلی گئی۔ ارے! وہ کتنی عزت رہی! نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ (20:104)۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ اس دہشت اور ہراسانی کے عالم میں کس کس قسم کی باتیں کریں گے۔ کہا کہ وہ ایسی باتیں آہستہ آہستہ کرتے تھے' تم نے بھی نہیں سنی ہونگی لیکن ہم نے سن لی تھیں۔ وہ کیا باتیں تھیں جو وہ آپس میں کرتے تھے' وہ یہ کہتے تھے؟ کہ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا (20:104)۔ ان میں وہ' جو زیادہ بڑے سوجھ بوجھ والے تھے' انہوں نے کہا کہ ان کی عیش و عشرت کی زندگی ہفتہ عشرہ بھی کہاں! دس دن بھی کاہے کے! یہ تو یوں گزر گئے بس ایک ہی دن سمجھ لیجیے: یہ زندگی آئی بھی اور چلی بھی گئی! حیاتِ جاوداں کے مقابلہ میں اُس کی مدت ایک دن سے بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ زندگی کس قدر شعلۂ مستعجل ثابت ہوئی! ٹھیک ہے کہ سکھ کے دن تو یونہی بدل جاتے ہیں' دکھ کے دن نہیں گزرتے۔ سننا چاہتے ہو کہ شاعروں کے نزدیک یہ کیا کیفیت ہوتی ہے تو سنیے:

کس قیامت سے شبِ ہجر مری گزرے ہے
کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں

یہ بیمار کی رات' یہ شبِ ہجر' بڑی لمبی ہوتی ہے لیکن وہ جو عیش و عشرت کے لمحے ہیں وہ تو یوں گزر جاتے ہیں۔ یہاں بات یہ کہی ہے۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے بعد بڑے بڑے رؤسا اس طرح سے قید میں آئیں گے کہ انہیں اپنی گزری ہوئی عیش و عشرت کی زندگی' لمحات کی زندگی نظر آئے گی کہ آئی اور یوں چلی گئی۔

قرآنِ حکیم کے الفاظ کے مجازی معنی کی اہمیت اور کیفیت

اِس حیرت انگیز انقلاب کی باتیں سن کر' یہ لوگ تم سے تعجب کے ساتھ پوچھتے ہیں کہ وَیَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا (20:105)۔ یہ بڑے بڑے اکابرین' جو پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں' (کیا یہ بھی ختم ہو جائیں گے؟) اِن سے کہہ دو کہ میرا نشو و نما دینے والا انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر' پر کاہ کی مانند اڑا دے گا (18:47;56:5;77:10;78:20;81:3)۔ اس آیت میں لفظ نَسْفًا آیا ہے۔ اس کے معانی ہوتے ہیں: ''جڑ سے اکھیڑ دینا'' اور الْمِنْسَفَةُ وہ اوزار ہے جس سے عمارت کو اکھاڑا جاتا ہے۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ (20:105)۔ اے رسول! تم سے یہ ''جبال'' کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ اب میں نے کہا ہے کہ یہاں پھر ''جبال'' کے لغوی معنی لے لیجیے' جن میں کہا ہے کہ قیامت کے قریب پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے' دھنکی ہوئی روئی کی طرح' اڑتے پھریں گے' سورج اور چاند ٹکرا جائیں گے' ان کی روشنی گم ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے یہ جو آپ کی خارجی کائنات ہے' یہ عدم سے خود بخود وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ وجود میں لائی گئی تھی۔ ابدیت تو صرف خدا کے لیے ہے' اس کے علاوہ کوئی شے

بھی ابداً نہیں رہ سکتی، جسے ہمیشگی کہتے ہیں اس کا سوال ہی نہیں ہے، اسے تو ایک دن ختم ہونا ہے، یہ ہمارا ایمان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جو ہمارا ٹکڑا ہے، یا یہ جو کُرّے ہیں، ان کے انجام کے متعلق بھی قرآن نے یہ کچھ بتایا ہو۔ لیکن عزیزانِ من! اس بات کا ہم لوگوں پہ کوئی اثر نہیں پڑتا پہلے تو ہم لوگ ہیں جن کے سامنے وہ واقعات نہیں ہوئے تو ہم پہ ان واقعات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یعنی اگر ہم ان واقعات سے پہلے یہاں سے مر گئے تو ہماری بلا سے، اس کے بعد یہ ٹکراتے رہیں، بھڑتے رہیں، رہیں یا نہ رہیں ہمیں کیا! یہ تو ہمارے بعد آنے والا واقعہ ہے، ہم پہ اس کا اثر نہیں ہوگا۔ اگر کیفیت یہ ہوگئی کہ رات کو اچھے بھلے سوئے ہیں، ایک ٹکراؤ ہوا، سب ختم ہوگئے اور بس! جس اعتبار سے میں نے عرض کیا ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات جو یہاں اس زمانے میں ہونے والے تھے، یہ کچھ ان کے متعلق کہا ہے۔ اور ان عربوں کے ہاں مجازی معنی موجود ہیں۔ یہاں قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ تم سے ''جبال'' کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ''جبال'' کیا ہیں؟

یہ بڑی بڑی چٹانیں ریت کی شکل اختیار کر جائیں گی

عربی زبان میں، یہ جو بڑے بڑے سردار ہوتے تھے، پہاڑوں کی طرح محکم گڑے ہوئے کھڑے ہیں، سینہ تان کر چوٹیاں یوں بلند ہیں، مثال کے طور بھی، اور تشبیہ کے طور پہ بھی۔ یہ بڑی چیز ہوتی تھی۔ وہ اپنے اِن سرداروں کے متعلق یہ کہتے تھے کہ وہ جبال [1] ہیں۔ یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ یہ تم سے پوچھتے ہیں کہ یہ جو پہاڑوں کی مانند اس طرح سے کھڑے ہیں...... یہ ابوجہل، یہ ابوسفیان، اور یہ ابولہب...... یہ ان کے متعلق آپ سے پوچھتے ہیں، آپ ان کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ **فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا** (20:105)۔ ان سے کہہ دو کہ تیرا رب، تیرا نشوونما دینے والا، انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دے گا، یہ انہیں پرِ کاہ [2] کی مانند اڑا دے گا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ فرعون کا جو اتنا بڑا ''بت'' تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ کیا حشر کیا تھا؟ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہی کچھ ان ''پہاڑوں'' کے ساتھ ہوگا۔ یہ چٹانوں کی صورت نظر آ رہے ہیں، ریت کے ذرے میں بدل جائیں گے یہ ہوا میں اڑا دیئے جائیں گے۔ **فَيَذَرُهَا** ان کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔ وہاں بھی تھا کہ **فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا** (20:106)۔ ان کا نام ونشان مٹ جائے گا، یہ صاف اور ہموار ہوجائیں گے۔ اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ چٹیل بنجر زمین جس پہ کچھ اگ ہی نہ سکے یعنی بلندیاں پستیوں میں بدلیں گی اور پستیاں اس قسم کی ہوں گی کہ ان میں روئیدگی تک کی صلاحیت باقی نہ رہے۔ اور یہ جو کھڑے ہوئے پہاڑ نظر آتے ہیں، ان کے متعلق کہا کہ یہ ہوگا ان کا انجام۔ قرآنِ کریم میں ایک ہی مقام پہ یہ بات نہیں کہی، متعدد آیات میں جبال کے متعلق اسی قسم کے الفاظ آئے

---

1. تاج العروس میں اَلْجَبَلُ کے معانی پہاڑ، قوم کا سردار یا عالم لکھے ہیں اور اس کی جمع جِبَالٌ ہے اور اَرْضٌ سے مراد قوم کا نچلا طبقہ ہے۔ تاج العروس کے مولف، محبّ الدین، ابن الفیض، السید محمد مرتضیٰ الحسینی الواسطی الزبیدی الحنفی (وفات 1205ھ مطابق 1791ء)، نے اَلْجِبِلُّ وَالْجِبِلَّةُ کے معنی ''انسانوں کی بڑی جماعت'' کیے ہیں۔ واضح رہے کہ جبل کے لغوی معنی پہاڑ کے ہیں اور اس کے مجازی معنی سرداران قوم کے ہیں۔
2. کٹی ہوئی سوکھی گھاس کا تنکا۔

ہیں۔ اور دو چار آیتیں تو ایسی ہیں جنہیں میں ضرور پیش کرنا چاہتا ہوں اور یہ خاص طور پہ عزیزانِ من! اس دور میں تو سننے کی باتیں ہیں۔ یہ بڑے بڑے جو بظاہر پہاڑ آپ کو نظر آتے ہیں' کیا آپ ان کا انجام نہیں دیکھتے کہ ان کی آخر کیفیت کیا ہوتی ہے۔ کہا کہ **وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ** (18:47)۔ جب بڑے بڑے دولت منداور صاحبِ اقتدار لوگوں کو ان کے مقامات سے ہلا دیا جائے گا۔ اسے یوں سمجھو کہ جس دن ''پہاڑوں'' سے کہا جائے گا: چلو چلتے بنو۔ یہ وہ دولت منداور صاحبِ اقتدار لوگ ہیں جو پہاڑوں کی طرح گڑے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان سے کہا جائے گا: چلتے بنو۔ کیوں چلتے بنو؟ یہ کس طرح سے ہوگا؟ عزیزانِ من! اس کے لیے تو وقت چاہیے' اس کے لیے کئی درس لوں گا۔ کہا کہ یہ کس طرح سے ہوگا؟ یہ کیوں چلتے بنیں گے؟ اس کے لیے قرآن ایک انقلاب لاتا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً**(18:47)۔ اور جن کمزور اور ناتواں لوگوں (الارض) کو انہوں نے اِس وقت پاؤں تلے روندر کھا ہے' وہ ابھر کر اوپر آجائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ جنہیں آج تم نے اپنے پاؤں سے پامال کر رکھا ہے' وہ ابھر کے کھڑے ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جنہیں استبدادِ زمانہ نے دبائے رکھا ہے تو دیکھے گا کہ وہ ابھر کر اوپر آجائیں گے۔ یہاں لفظ **بَارِزَةً** آیا ہے۔ یہ عجیب لفظ ہے۔ ''بارز'' ہوتا ہے وہ ''توانائیاں' وہ قیامتیں' جو کسی کے اندر چھپی ہوئی نہ ہوں بلکہ نمودار ہو کے باہر آجائیں''۔ یہ بارز ہونا کہیں خارج سے (From Without) نہیں آیا کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ عرب جنہیں تم پاؤں کے نیچے پامال کرتے ہو' یہ جسے تم نچلا طبقہ کہہ کے پکارتے ہو' تم نہیں سمجھتے کہ ان کے سینے میں کتنی بڑی توانائیاں پوشیدہ ہیں۔ اس وقت وہ خفی (پوشیدہ) ہیں اور جس دن یہ بارز یعنی نمود میں آ گئیں تو کیفیت یہ ہوگی کہ پھر **وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ** (18:47)۔ بڑے بڑے دولت منداور صاحبِ اقتدار لوگوں کو ان کے مقامات سے ہلا دیا جائے گا۔ اُن ''پہاڑوں'' سے کہا جائے گا کہ چلتے بنو۔ کہیں ان کے متعلق کہا تھا کہ ذرہ ذرہ کر دیئے جاؤ گے۔ دوسرے مقام پہ بات بڑی دلچسپ آئی ہے۔ کہا کہ سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح سے ہوگا؟ سورۃ الواقعہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ واقعہ کیسے ہوگا؟ **اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا** (56:4)۔ اُس وقت نیچے کے طبقے کے لوگ (عوام' جنہیں مستبد قوتوں نے اپنے پاؤں تلے روندر کھا ہے) آکر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یعنی یہ جو سارے اس طرح سے' خوابِ خرگوش کی طرح سوئے ہیں یا سلا دیئے گئے ہیں' انہیں یوں جھٹکا دے کر بیدار کیا جائے گا کہ اٹھو اور اٹھنے کے بعد **وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا** (56:5)۔ اوپر کے طبقہ کے بڑے بڑے لوگ' بڑے بڑے سردارانِ قوم' جابر و متکبر لوگ' ریزہ ریزہ ہو جائیں گے' اپنے مقام سے ہانک کر ہٹا دیئے جائیں گے' منتشر اور پریشان ہو جائیں گے' یا خود ہی رینگ کر الگ ہو جائیں گے۔

یہ بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح کھڑے سردار ریت کی مانند سرکنا شروع ہو جائیں گے

عزیزانِ من! دیکھا آپ نے! اس آیت میں **وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ** (77:10) وہی **نَسْفًا** (20:105) ہے۔ اسی آیت کے معنی ہیں: اور پہاڑوں جیسی محکم جماعتیں پرکاہ کی طرح اڑ جائیں گی۔ یوں سمجھو گویا انہیں چھلنی میں چھان اور چھاج میں پھٹک

دیا جائے گا۔ جو باقی رہنے کے قابل ہوگی وہ باقی رہ جائے گی۔ دوسری سب ضائع ہو جائے گی۔ یہاں وہی لفظ نسفت ہے جو اسی نسفا سے آیا ہے، یہ آخری پارے ہیں۔ ان میں یہ انفرادی چیزیں بڑی ہی وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ یہاں بھی وہ ''سیرۃ'' ہے: وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (78:20)۔ اور پہاڑوں جیسے محکم سردارانِ قوم کے پاؤں اکھڑ جائیں گے اور وہ بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے۔ اس طرح جانے کے بعد یہ نہیں ہے کہ کہیں اور جگہ جا کے کھڑے ہو جاؤ گے۔ یہ تو ان کا اپنی جگہ سے سرکنا ہے۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ ان کا ہوا کیا؟ ان کا تو کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ یہ چیز سراب بن گئی۔ سراب کا یہ لفظ سب سے بڑے فریب اور دھوکے کے لیے آتا ہے۔ ریت کا یہ سراب یوں تو نظر آتا ہے کہ وہاں حیات کا پانی ہے، اس میں پانی کی نمود نظر آتی ہے، آثار نظر آتے ہیں مگر قریب جایئے تو نظر آتا ہے کہ زندگی کا پانی موجود نہیں ہے۔ اور یہ جو چیز کہی گئی ہے، وہ آگے چل کے آئے گی تو میں عرض کرونگا کہ قرآن نے یہ کہا ہے: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6)۔ اس زمانے میں عالمگیر انسانیت، خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہو گی۔ یہ وہ دن ہوگا جب عام جمہور خدا کی ربوبیتِ عالمین کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی، اس دن یہ انقلاب برپا ہوگا۔ یہ ہے يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6)۔

یہ دَور باطل نظام کی جگہ ربوبیت عالمینی کا دَور ہوگا

عزیزانِ من! الناس کی حد تک مقصد ربوبیتِ عالمینی کا قیام ہوگا اور یہ چیز ایک باطل کی جگہ دوسرے باطل کو لانے کے لیے نہیں ہو گی۔ جب یہ ہوگا تو اس وقت یہ کرۂ ارض، یہ زمین، تیرے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ یہاں رب کہا ہے، یہاں ربوبیت ہی کا ذکر ہے۔ یہاں لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) کہا ہے کہ اٹھنے کے لیے مقصد یہ ہوگا۔ یہ فساد کے مٹانے کے لیے، فساد برپا کرنا نہیں ہوگا۔ ربوبیت عالمینی مقصد ہوگا۔ اس کے لیے يَقُوْمُ النَّاسُ (83:6) ہے یعنی الناس کھڑے ہونگے، زمین اپنے نشو ونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ کہا کہ یہ کیفیت ہوگی تاکہ سب انسانوں کی ربوبیت ہوتی چلی جائے اور کسی فرد کا کسی دوسرے فرد پہ کوئی کنٹرول نہیں ہوگا، وہاں کوئی کسی کا ''جبال'' نہیں رہے گا، کسی کا کسی دوسرے کے اوپر کوئی اختیار و اقتدار نہیں ہوگا۔ اسے کہتے ہیں آزادی۔ اور واقعی جب ربوبیت کا نور سب کو ڈھانپ لے تو انسانیت کسی دوسرے کی محتاج نہیں ہو سکے گی ورنہ آج تو روٹی کی غلامی نے انسان کو اپاہج بنا رکھا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کسی فرد کا کسی دوسرے فرد پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں رہتا، عزیزانِ من! یہ یہاں آیا تھا کہ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا o فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا o لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (20:105-107)۔ (اس حیرت انگیز انقلاب کی باتیں سن کر یہ لوگ تم سے تعجب کے ساتھ) پوچھتے ہیں کہ یہ بڑے بڑے اکابرین، جو پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں، (کیا یہ بھی ختم ہو جائیں گے؟) ان سے کہہ دو کہ میرا نشو ونما دینے والا انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پرِ کاہ کی مانند اڑا دے گا۔ اور یہ ایسے صاف اور ہموار ہو جائیں گے کہ تو دیکھے گا کہ نہ ان میں کوئی ٹیڑھ پن باقی رہا ہے، نہ اونچ نیچ (7:86)۔ ان سب کے بل نکل جائیں گے اور

عیاری و پُرکاری سے پیدا کردہ ناہمواریاں صاف ہو جائیں گے۔ اس طرح عزیزانِ من! قرآن' کہتا ہے کہ آج ان ''پہاڑوں'' اور ''پہاڑوں میں گری ہوئی وادیوں'' میں تم عجیب وغریب قسم کے سیاسی پیچ وخم دیکھو گے' عجیب عجیب قسم کے نشیب وفراز دیکھو گے۔ یہ **عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا** (20:107) ہیں۔ یہ پیچ وخم اور نشیب وفراز ہیں۔ یہ پہاڑ اور یہ وادیاں ہیں۔ قرآن کیا باتیں کرتا ہے!

عزیزانِ من! میں نے جو عرض کیا تھا کہ میں جبال کے مجازی معنی لیتا ہوں۔ یہ اس طرح کے پہاڑ ہیں۔ یہ سچ مچ کے پہاڑ نہیں ہیں۔ میں یہ سچ مچ کے پہاڑ کیوں نہیں کہہ رہا؟ عزیزانِ من! یہ ایسے ہی نہیں ہے' خود ہی یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ اپنی طرف سے یہ بات کہنا تو بہت بڑا شرک ہے۔ قرآن کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کے سوچنے کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ کہا کہ **لَا تَـرٰی فِیْهَـا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا** (20:107)۔ یہاں عوجاً کا لفظ ہے۔ اس عوجًا میں ع کے نیچے زیر ہے اور و کے اوپر زبر ہے' ج کے اوپر دو زبریں ہیں۔ اسی عربی زبان میں لفظ عَوَجًا ہے جہاں عَ پہ زبر' وَ پہ زبر' ج پہ زبر یعنی صرف پہلا حرف جو ع ہے جب اس کے اوپر زبر آئے گی تو اس کے معنی ہوں گے: وہ الجھنیں' وہ چیزیں' جسے محسوس طور پر دیکھا جائے۔ اور جب ع پر زیر ہوگی تو اس کے معنی ہوگا: وہ پیچیدگیاں جسے صرف سمجھا جا سکے اور وہ دکھائی نہ دیں۔ یہاں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ قرآن تو کسی فہم' شعور' ادراک کی بات کر رہا ہے' طبعی آنکھوں سے دیکھنے کی بات نہیں کر رہا۔ اس لیے جب اس نے جبال کہا ہے تو وہ تو اس کا جتنا بھی ہے وہ طبعی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اور قرآن تو عِوجاً کہہ رہا ہے کہ ان آنکھوں سے نہیں' ادراک کی آنکھوں سے' بصیرت کی آنکھوں سے' فہم وشعور کی آنکھوں سے' جو تمہیں پیچیدگیاں نظر آئیں گی اور یہ اونچ نیچ نظر آئے گی' یہ وہ ہے۔ لہٰذا یہاں بات دراصل یہ بیان کی گئی ہے۔ اس لیے' عزیزانِ من! میں نے گزارش کیا ہے کہ یہاں یہ جو جبال وغیرہ کے معنی لیے جائیں گے تو وہ بھی اس طرح سے لیے جائیں گے اور اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ **یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ** (20:108)۔ اس وقت سب لوگ اس کے پیچھے چلیں گے جو آج اس انقلاب کی دعوت دے رہا ہے اور جس کی دعوت میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں (18:1)۔ عزیزانِ من! یوں کہا کہ دعوت دینے والا اس کتاب کے احکام کی اتباع کرے گا جس میں عقل وفہم وشعور کی رو سے بھی تم کسی قسم کی کوئی پیچیدگی نہیں پاؤ گے۔ اس کے آگے اس کتاب قرآن کا ذکر ہے' اُسے ہم آئندہ لیں گے۔

آج ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 107 تک آ گئے۔ آیت 108 سے آئندہ لیں گے

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۭ

❀......❀......❀

گیارھواں باب: سورۃ طٰهٰ (آیات 108 تا 114)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یَوۡمَئِذٍ یَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا ﴿۱۰۸﴾
یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوۡلًا ﴿۱۰۹﴾ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ مَا
خَلۡفَهُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِهٖ عِلۡمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ عَنَتِ الۡوُجُوۡهُ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ ؕ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿۱۱۱﴾
وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلۡمًا وَّ لَا هَضۡمًا ﴿۱۱۲﴾ وَ كَذٰلِكَ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡاٰنًا
عَرَبِیًّا وَّ صَرَّفۡنَا فِیۡهِ مِنَ الۡوَعِیۡدِ لَعَلَّهُمۡ یَتَّقُوۡنَ اَوۡ یُحۡدِثُ لَهُمۡ ذِكۡرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَی اللّٰهُ الۡمَلِكُ
الۡحَقُّ ۚ وَ لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡكَ وَحۡیُهٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿۱۱۴﴾

عزیزانِ من! آج جون 1976 کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 108 سے ہو رہا ہے: (20:108)۔ تجدیدِ یادداشت کے لیے عرض کر دوں کہ سورۃ طٰہٰ میں فرعون اور صاحبِ ضربِ کلیم حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے درمیان کشمکش بڑی ہی تفصیل سے آئی ہوئی ہے۔ اگرچہ دیگر مقامات پر بھی جستہ جستہ اس کے واقعات آئے ہیں لیکن اس سورۃ میں بڑی تفصیل سے آئی تھی اور یہ آپ نے دیکھ لیا کہ کئی مہینوں تک یہ داستان درس کی صورت میں ہمارے سامنے متواتر آتی رہی ہے۔

قرآن میں تاریخی واقعات کو بیان کرنے کا ایک عظیم مقصد ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے' تاہم وہ جو ہسٹری (تاریخ) بھی بیان کرتا ہے' اس کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ اس سے اقوامِ سابقہ کا یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس قوم نے اپنے ہاں غلط نظامِ زندگی اختیار اور نافذ کیا' اس کا انجام بڑی ہی تباہی اور بربادی کی شکل میں ہوا' خواہ انہیں کتنے ہی مادی اسباب اور قوتیں کیوں نہ حاصل ہوئی ہوں۔ اس طرح قرآن نے ثابت یہ کیا ہے کہ جو نظام بھی باطل کی بنیادوں پر استوار ہوگا' انجام کار تباہ ہو کر رہے گا اور اس کے مقابلے میں حق کی آواز کو بلند کرنے والا داعی یا انقلاب مقابلتاً کم ساز و سامان کے ساتھ بھی کامیاب نظر آئے گا۔ دراصل حق کے اندر اپنی ایک قوت ہوتی ہے جو فوارے کی طرح اپنے زورِ دروں سے ابھرتی ہے اور غالب آ جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اپنے اس دعویٰ کی تائید و تصدیق کے لیے یہ داستانیں بیان کی ہیں اور ان میں سب سے زیادہ

ظلم واستبداد کا مجسمہ فرعون ہے۔ یہ ضرب المثل بن چکا ہے۔

ہجرت کے بعد قریش کا مدینہ پہنچ کر حملہ آور ہونے کی وجہ جواز

دنیا میں ایک طرف فرعونیت' قہرمانیت اور ظلم واستبداد ہے تو دوسری طرف بے سروسامانی کا عالم۔ ان دونوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ جہاں تک اس قسم کے واقعات کا تعلق ہے تاریخ یہ بتاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی دور کے اور بنی اسرائیل کی قوم کے واقعات ملتے جلتے سے تھے۔ بنی اسرائیل کی یہ بڑی بے سروسامان ضعیف وناتواں سی ایک جماعت تھی۔ جس طرح انہوں نے ہجرت کی' مصر سے نکلے' سینا میں آئے' اسی طرح رسول خدا ﷺ کو بھی بڑی ہی بے سروسامانی کی حالت میں مکہ سے مدینہ جانا پڑا اور کیفیت یہ کہ جس طرح فرعون نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تھا' اسی طرح قریش نے بھی ان کا تعاقب کیا حالانکہ اگر بات یہی ہوتی کہ قریش کو وہاں مکے میں ان کے رہنے سے کوئی خطرہ تھا تو یہ وہاں سے چھوڑ کے مدینے چلے آئے تھے اور اس زمانے کے مواصلات کے پیشِ نظر یہ بڑا لمبا فاصلہ تھا۔ اِن مدینے والوں نے مکہ والوں سے آ کر کرنا کیا تھا لیکن انہیں پتہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک خطہ زمین میں بھی متشکل ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج ایسے دلکش اور جاذبِ نگاہ ہونگے کہ ساری قومیں افواجاً' جیسے قرآن کہتا ہے گروہ در گروہ' ان کے اندر شامل ہو جائیں گی اور انہیں پتہ تھا کہ اگر یہ ہو گیا تو اس کے بعد ہماری سیادت'[1] قیادت' اور یہ سارا نظامِ سرمایہ داری' برہمنیت اور مذہبی پیشوائیت باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا اصل میں ساری چیز ہی یہ تھی' ورنہ قریش کا تو اپنا کوئی مذہب ہی نہیں تھا۔ یہود ونصاریٰ کی بات تو پھر بھی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ وہ ایک خاص مذہب کے پیرو تھے۔ ان کے خلاف تو بات ہو سکتی تھی لیکن ان قریش کے ہاں تو یہ بھی صورت نہیں تھی۔

بات کو سمجھانے کے لیے قرآن کریم کا تشبیہی انداز پیش نظر رکھیے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے بیان کا اپنا ایک انداز ہے۔ وہ جو داستان تھی' کشمکش تھی' انقلاب تھا' وہ اس نے آخری فقرے میں اس طرح واضح کیا ہے کہ گویا وہ اس دہشت اور ہراسانی کے عالم میں' تعجب سے پوچھتے ہیں کہ **یَسْـئَـلُـوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ** (20:105)۔ یہ بڑے بڑے اکابرین' جو پہاڑ کی طرح کھڑے ہیں' کیا یہ بھی ختم ہو جائیں گے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ لفظی ترجمے تو ان چیزوں کے یہ ہیں کہ ''تجھ سے پہاڑوں کی بابت پوچھتے ہیں۔'' لیکن ذرا غور کرنے سے بات سمجھ میں آ سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی داستان بیان ہو رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ اے رسول! تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو یہ جو یہاں ایک سوال کیا ہے' اس میں ربط کیا ہے؟ اور پھر یہ عرب کیا پوچھتے ہیں؟ انہوں نے ان سے پہاڑوں کے متعلق کیا پوچھنا تھا؟ یہاں کہا یہ ہے کہ

---

[1] سرداری' سلطنت' حکومت

تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ میں نے گزارش کیا تھا کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس زمانے میں دیکھا جائے کہ وہ لوگ ان الفاظ سے اور کیا معنی لیتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ایک چیز کے لفظی معنی ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ قوم ان الفاظ کو اور معنوں میں بھی استعمال کرتی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ قوم اُن الفاظ کو اور کن معنوں میں استعمال کرتی ہے، وہ معانی بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ ان عربوں کے ہاں جبال بڑے بڑے سرداروں کو کہتے تھے جو چٹانوں کی طرح جمے ہوئے ہوں، جن کے جھنڈے گڑے ہوئے ہوں۔ قرآن نے فرعون کو بھی تو ذِی الْاَوْتَادِ (89:10) کہا تھا یعنی وہ جس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے اور ان کی یہ چیز تھی کہ ہمیں یہاں سے کون اکھیڑ سکتا ہے۔ اِس اعتبار سے وہ اس قسم کے صاحبِ اقتدار لوگوں کو، سرداروں کو، اکابرین کو، جن کا اقتدار اور سرداریاں پہاڑوں کی طرح، بڑی ہی محکم ہوں، جبال کہتے تھے۔ ہم بھی اپنے ہاں یہ بولتے ہیں کہ آپ چٹان کی طرح سخت ہیں، اس کے معنی ہیں: پہاڑ کی طرح محکم اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی، ہے۔ اقبالؒ (1877-1938) کہتا ہے کہ تو اپنی ذات کے اندر مستحکم ہو کے، پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جا۔ اس کے یہ معنی تھے کہ وہ فوری طور پہ تجھ سے پوچھتے ہیں۔ ان سے بات تو یہ کہہ رہے ہیں۔ یعنی رسولِ خدا کو ماننے والوں کی یہ بے سروسامان سی جماعت اور اُدھر وہ قریش جو واقعی پہاڑوں کی طرح محکم تھے اور جن کے کھونٹے گڑے ہوئے تھے۔ ذرا، تاریخ تو اٹھا کے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی کیفیت کیا تھی؟ وہ تمام جسے یہ جزیرہ نما عرب کہتے ہیں پر چھائے ہوئے تھے۔ گو کہ ان کی کوئی حکومت نہیں تھی لیکن باقی حکومتیں ان کے ساتھ حکومت کی سطح پہ روابط رکھ رہی تھیں۔ ان کی یہ کیفیت تھی۔

پہاڑوں اور چٹانوں کی طرح مستحکم ان سرداریوں کا نتیجہ ریت کے ذروں کی طرح ہوگا

عزیزانِ من! کہا کہ تمہاری جماعت کے یہ بے سروسامان سے، غریب سے، ناتواں سے، لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ جو اتنے اتنے بڑے، پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے، چٹانوں کی طرح مستحکم ہیں، جن کی سرداریاں، قیادتیں، اور مفادات کے کھونٹے گڑے ہوئے ہیں، ان کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں؟ آخر ان کا انجام کیا ہوگا؟ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّىْ نَسْفًا o فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا o لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا (20:105-107)۔ ان سے کہہ دو کہ میرا نشو و نما دینے والا انہیں جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پر کاہ کی مانند اڑا دے گا۔ اور یہ ایسے صاف اور ہموار ہو جائیں گے کہ تو دیکھے گا کہ اِن میں کوئی ٹیڑھ پن باقی نہیں رہا: نہ اونچ، نہ نیچ۔ ان سب کے بل نکل جائیں گے اور عیاری و پرکاری سے پیدا کردہ ناہمواریاں صاف ہو جائیں گی۔ تم کہتے ہو کہ ان کا کیا ہوگا؟ انہیں دیکھو تو سہی، خدا کا وہی قانون جو وہاں بنی اسرائیل کے خروجِ مصر میں کارفرما تھا، اس کے ہاتھوں تم دیکھو گے کہ یہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، ذروں میں بدل جائیں گے، ریت کی طرح ان کی کیفیت ہو جائے گی، ایک ہوا کا جھونکا آئے گا، انہیں یہاں سے وہاں، اور وہاں سے یہاں اڑائے اڑائے پھرے گا۔ یوں نظر

آئے گا جیسے **قاعًا**[1] **صفصفًا**[2] (20:106) صاف چٹیل میدان ہے جس کی تمام اونچ نیچ ختم ہو چکی ہے۔ جو تمہیں پہلے پہاڑ نظر آتے ہیں اب ان میں یہ چیز ہوگئی کہ وہ ہموار ہو جائیں گے اور ہموار بھی ایسے کہ جیسے چٹیل اور بنجر زمین جس میں کچھ بھی نہیں اگے گا۔ کہا کہ دیکھو تو سہی ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی۔

عربی الفاظ کے مادوں پر غور کرنا بڑا ہی ضروری ہے

اس عوجًا اور امتًا' میں باطل کے نظام کی اور باطل کے اقتدار کی دو چیزیں بتائی ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ عربی زبان کے ان الفاظ کے مادوں پہ غور کرنا چاہیے۔ یہ جو عِـوَجًـا ہے اس کا مادہ ''ع و ج'' ہے۔ اس مادہ میں اگر ع زبر کے ساتھ ہو یعنی عَوَ جًا[3] ہو تو اس کے معنی اُن ٹیڑھ پن یا پیچیدگیوں کے ہوتے ہیں جو محسوس طور پر سامنے آ جائیں۔ فزیکل (طبعی) چیزوں کے اندر جو ٹیڑھ پن ہوتا ہے اُسے ''عَوَجًا'' کہتے ہیں اور اگر یہی لفظ زیر کے ساتھ ہے یعنی یہ 'عِوَجًا''[4] ہے تو یہ وہ ٹیڑھ پن اور پیچیدگیاں ہیں جو غیر محسوس قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ جسے میکیاوَلی[5] سیاست کہتے ہیں' اس کا سارا راز ہی اس پیچ وخم پہ ہوتا ہے' جسے آپ Crookedness (کج روی) کہتے ہیں'

---

[1] اَلْـقَـاعُ۔ ہموار نشیبی زمین جو وسیع ہو اور اس میں نشیب وفراز نہ ہو' نہ اس میں کنکریاں ہوں نہ پتھر' اور نہ ہی اس میں درخت پیدا ہوتے ہوں۔ صاف چٹیل میدان جس میں ٹیلے اور پہاڑ نہ ہوں۔

[2] صَـفْـصَـفًا۔ مادہ ص ف ف۔ صف بنانا' صف بندی کرنا۔ الصّف وہ لوگ جو لائن لگا کر کھڑے ہوں۔ الصفصف سپاٹ اور ہموار زمین جس کا گھاس وغیرہ سب صاف کر دیا گیا ہو۔ قَاعًا صَفْصَفًا (20:106)۔ صاف' چٹیل' ہموار میدان جس کی تمام اونچ نیچ ختم ہو چکی ہو۔

[3] امام راغب نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''عَوَجٌ'' اس ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں جو آنکھ سے دیکھا جا سکے

[4] امام راغب نے اپنے قرآنی الفاظ کے معروف لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''عِـوَجٌ'' اس ٹیڑھے پن اور ناہمواری کو کہتے ہیں جو عقل وبصیرت سے دیکھی جا سکے۔ جیسے معاشرہ کی ناہمواریاں اور نظامِ زندگی کا ٹیڑھا پن۔

[5] اس کا ملخص یہ ہے کہ چونکہ انسانی زندگی طبعی زندگی ہے اس لیے اس کا حل بھی صرف معاشی مسئلہ ہے۔ نوعِ انسانی کی ساری تاریخ اس معاشی مسئلہ کے حل کی تلاش کی تگ وتاز کی داستان ہے۔ جس طریق سے اس مسئلہ کا حل مل جائے' وہی طریق قابل قبول ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا کی مختلف اقوام اس نظریہ کو حقیقت تسلیم کر لیں تو ہر قوم کے سامنے مقصدِ زندگی یہ رہ جائے گا کہ وہ کس طرح معاشی فارغ البالی حاصل کر سکتی ہے۔ اس سے اُسے کچھ واسطہ نہیں ہوگا کہ یہ فارغ البالی کن طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کا اثر دیگر نوعِ انسانی پر کیا پڑتا ہے۔ ہنری فورڈ (Henry Ford: 1863-1947) کے الفاظ میں ''جو کچھ معاشی طور پر صحیح ہے وہ اخلاقی طور پر بھی صحیح ہے۔'' اس تصورِ حیات کے مطابق ان قوموں میں جس قسم کا سیاسی نظام قائم ہوگا' وہ بالکل واضح ہے۔ وہ سیاسی نظام جس میں ہر قوم اپنی معاشی مرفہ الحالی کی فکر میں ہوگی اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طریق کار کو جائز اور مناسب خیال کرے گی۔ یہ ہے وہ نظام سیاست جس کی داغ بیل میکیاوَلی (Machiavelli: 1469- 1527) نے رکھی اور جو اس وقت سے آج تک تمام مغربی اقوام کی سیاست کا عروۃ الوثقٰی ہے۔ اس سیاست میں قوت اور فریب (Force and Fraud) وہ دو عمود ہیں جن پر اس سیاست کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی رو سے مقصدِ پیش نظر کا حصول' تمام سیاسی تگ وتاز کا منتہیٰ ہوتا ہے' خواہ اس کے لیے کوئی طریق اختیار کر لیا جائے اس لیے کہ طرق وذرائع کے جائز وناجائز کا معیار ان کے نزدیک فقط یہ ہے کہ ان سے مقصد حاصل ہو گیا ہے یا نہیں۔ جن ذرائع سے مقصد حاصل ہو گیا وہ جائز' جن سے مقصد حاصل نہ ہوا وہ ناجائز۔ اس سیاست کی مزید وضاحت اس کتاب کے چوتھے باب میں ''فرعون کی ایک خطرناک چال اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دور نگہی'' کے عنوان کے فٹ نوٹ پر ملاحظہ فرمائیے۔

جسے آپ سادگی اور پرکاری کہتے ہیں' یہ سیاست کے وہ پیچ وخم ہیں جن میں یہ سب کو الجھائے رکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ معاشرے کے اندر نشیب وفراز کی وہ ناہمواریاں ہوتا ہے جو انہوں نے پیدا کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور باطل کے اقتدار کی دوسری چیز معاشرتی اونچ نیچ ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ایک طرف تو یہ شعوری' ادراکی' غیر محسوس ناہمواریاں ختم ہو جائیں گی تو دوسری طبقاتی اونچ نیچ (اَمۡتًا) بھی باقی نہیں رہے گی۔

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ نہ تو ان کی سیاست کے پیچ وخم رہیں گے اور نہ طبقاتی ناہمواریاں' جو انہوں نے پیدا کر رکھی ہیں' باقی رہیں گی۔ یہ خود بھی جو پہاڑ اور چٹانوں کی طرح محکم کھڑے ہیں' میدانوں کی طرح' بنجر زمین کی طرح' ہو جائیں گے۔ دوسرا میں نے آپ کو قرآنِ کریم کی کئی آیات سنائیں تھیں' جن میں بتایا گیا تھا کہ ان سے کہا جائے گا: چلیے' روانہ ہو جائیے' یہاں سے کھسکیے۔ ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ سراب بن کے نظر آئیں گے یعنی كَسَرَابٍۭ بِقِيعَةٍ (24:39)۔ چٹیل میدان میں سراب کے طرح۔ تو یہاں یہ کہا ہے کہ ان کی اپنی کیفیت تو یہ ہوگی اور اس کے بعد جو معاشرہ ہے' اس کی صورت یہ ہوگی کہ اس میں نہ تو کوئی سیاست کا پیچ وخم رہے گا اور نہ ہی معاشرے کے اندر کوئی اونچ نیچ رہے گی۔ عزیزانِ من! عِوَجًا اور اَمۡتًا کے ان دو لفظوں میں دونوں معاشروں کا تقابل کس حسین اور واضح انداز میں کیا! باطل کے نظام میں ''عِوَجًا'' اور ''اَمۡتًا'' کی دونوں کیفیتیں ہوتی ہیں۔ حق وصداقت پر مبنی نظام میں یہ چیزیں باقی نہیں رہتیں' اس معاشرے میں صاف ستھرا صراطِ مستقیم ساری دنیا کے سامنے ہوتا ہے۔ سب اس پہ چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی سیاسی پیچ وخم نہیں ہوتا' کوئی نشیب وفراز نہیں ہوتا اور کوئی اونچ نیچ نہیں ہوتا۔

قرآنی الفاظ کے لغوی اور مجازی معنیٰ متعین کرنے کے لیے خود قرآنی راہنمائی موجود ہوتی ہے

عزیزانِ من! اب یہاں لفظ عوج آیا ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا کہ یہاں ہم اس کے لغوی معنی Literal Meaning نہیں لیتے بلکہ یہاں ان کے مجازی معنی لیتے ہیں۔ اس کے لیے بھی تو کوئی دلیل ہونی چاہیے' از خود ہی تو نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے کہا تھا کہ دلیل خود قرآن Provide (مہیا) کر دیتا ہے۔ ایک تو اس کا یہ ''عَوَجا'' کہنے کے بجائے ''عِوَجا'' کہنا یہ بتا رہا ہے کہ یہ کوئی ادراک کی' فہم کی' بات بیان کی جا رہی ہے جس میں محسوس نشیب وفراز یا پیچ وخم نہیں ہے۔ اور اگلی بات میں ایک دوسری چیز واضح کر دی کہ یہ کب ہوگا؟ اب دیکھیے' یہاں جبال کا لفظ آیا ہوا ہے۔ ''جبال'' کے معنی اگر آپ وہی محسوس پہاڑ لیں تو اس پہاڑ کے معنی سے اگلی بات جچتی نہیں ہے۔ یہاں اگلی ہی آیت میں کہا ہے کہ يَوۡمَئِذٍ يَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِيَ (20:108)۔ جس دن یہ اس داعی کا پھر اتباع کریں گے تو سیدھی سی بات ہے کہ پہاڑ تو کسی داعی کا اتباع نہیں کرتے ہیں۔ یہاں اس نے فوراً اس چیز کا اشارہ دے دیا کہ وہاں اس کے لغوی معنی پہاڑ نہیں لیے جائیں گے۔ قرآن تو اتباع کہتا ہے۔ آپ سوچیے کہ پہاڑ کیا اتباع کرتے ہیں؟ یہاں کہا ہے کہ یہ اس دن ہوگا جب یہ اس داعی کا اتباع

کریں گے اور اب پھر دیکھیے کہ داعی کی خصوصیت کیا ہے؟ لَا عِوَجَ لَهٗ (20:108)۔ اس کی دعوت میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں ہے، جس کی دعوت میں، جس کے نظام میں، جس کی اپنی زندگی کے اندر، کوئی پیچ وخم نہیں ملے گا۔ اب یہ نظر آیا کہ یہ باطل کے نظام کے پیچ وخم، اس کے ہاتھوں ختم ہوتے ہیں، جس کی اپنی زندگی میں کوئی پیچ وخم نہیں ہوتا۔ ایک ہی لفظ میں اس داعی کی یہاں کتنی بڑی خصوصیت بتا دی گئی ہے۔

عزیزانِ من! یہ قرآن کے اعجاز ہیں۔ ان سے ایسے ہی نہ گزر جایا کیجیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی میں یہ پیچ وخم کیوں نہیں رہے؟ حضور ﷺ بھی تو اسی معاشرے کے ہی ایک فرد تھے جی! ابھی دو ہی سورتیں پہلے، سورۃ الکہف، 18ویں سورۃ کی ابتدا اس سے ہوتی ہے کہ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ (18:1)۔ کائنات کا ہر حسین نقشہ اور تعمیری پروگرام اس ذاتِ خداوندی کی حمد وستائش کا زندہ پیکر ہے جس نے (اسی مقصد کی تکمیل کے لیے) اپنے بندے پر یہ ضابطہ قوانین نازل کیا ہے۔ وہ ضابطۂ قوانین جس میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ اس طرح کھول کر بتا دیا کہ مستحقِ حمد وستائش وہ ذات ہے جس نے اپنے عبد پر، اپنے محکوم بندے پر، ایک کتاب نازل کی۔ اس کتاب کی خصوصیت کیا تھی؟ اس خصوصیت کے لیے کہا کہ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا (18:1)۔ جس میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ قَیِّمًا (18:2) سیدھا، استادہ ہے۔ تمہارے سامنے جو چیز ہے وہ سیدھی، واضح اور متوازن نظر آئے۔ اگر اس میں کہیں ذرا سی بھی کجی ہو تو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ یہ الکتٰب (18:1) ہے، اور وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا (18:1) اس میں کوئی فکری، ادراکی، شعوری اور ذہنی پیچ وخم نہیں ہے۔

دنیا بھر میں آج کی سیاست گری کی مہرہ بازیوں کا علاج

عزیزانِ من! قرآن سیاست کو ایک اور پٹڑی پہ ڈال دیتا ہے۔ ساری دنیا کی سیاست کا مدار پیچ وخم پہ ہوتا ہے۔ قرآن پہلی چیز تو یہ کہتا ہے کہ اس سے ان کے سارے پیچ وخم نکل جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہوگا کیسے؟ اس مقصد کے حصول کے لیے انہیں قرآنِ کریم کا اتباع کرنا ہوگا۔ اتباع کے معنی ہیں: پیچھے پیچھے چلنا۔ اگر آگے چلنے والا ہی ٹیڑھا میڑھا چلے گا تو پیچھے چلنے والے بھی اسی طرح سے، انہی رخوں پہ چلیں گے۔ Followers (متبعین) نے تو Follow (پیروی) کرنا ہوتا ہے۔ یہ جو اوپر کے لوگوں (Highups) کی زندگی ہے، جو ان کی سیاست ہے، جو ان کا سارا کاروبار ہے، جو ان کی بساطِ سیاست ہے، یہ کہیے کہ جو ان کی مُہرہ بازیاں ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ سارا ہی معاشرہ اس کے اندر رنگا جاتا ہے۔ اس لیے عوام کو Followers (پیروکار) کہتے ہیں یا قرآن نے اسی لیے یہاں یَتَّبِعُوۡنَ کہا ہے یعنی جو اس داعی کے پیچھے چلیں گے۔ اس داعی کے لیے کہا کہ لَا عِوَجَ لَهٗ (20:108) جس کی دعوت میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں، جس میں خود بھی کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ اسی وجہ سے اوپر کہا کہ عِوَجًا وَّلَاۤ اَمۡتًا (20:107) معاشرے سے کج روی، ٹیڑھا پن اور اونچ نیچ نکل جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو آگے Lead (رہنمائی) کرنے والا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ لَا عِوَجَ لَهٗ

(20:108)۔ اس کی اپنی زندگی میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ اس کی چال ڈھال میں کوئی سقم نہیں ہے۔ وہ سیدھا سادہ متوازن ہے۔ کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ اس کتاب کا اتباع کرتا ہے جس میں کوئی پیچ وخم نہیں۔ بات پھر وہیں آ گئی ہے کہ وہ خود پہلے اس کتاب کا اتباع کرتا ہے، جس میں پیچ وخم نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی اپنی زندگی میں، اس کی اپنی سیاست میں، اس کے نظام میں، کوئی پیچ وخم نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر پیچ وخم والا جو ہے، اس کے تمام پیچ وخم، اس جنتری [1] میں سے نکل کے بالکل سیدھے ہو جائیں گے۔ قرآن کے عشق کی جنتری ایک ایسی ہی جنتری ہے۔ آپ تو جنتری کا مفہوم سمجھتے ہیں لیکن ہماری اگلی نسل تو بیچاری سمجھتی ہی نہیں ہوگی۔ اوناں نوں تے جنتری دے معنی وی نہیں اوندے ہون گے ہن۔ [2] وہ سنار کے پاس ایک پلیٹ سی ہوتی ہے، جس میں بہت سے چھید ہوتے ہیں۔ وہ سیدھا کرنے کے لیے جو تار کھینچتا ہے تو وہ تار اس کے اندر رکھتا ہے اور پھر اس میں سے کھینچتا ہے تو اس میں کے وہ سارے بل نکل جاتے ہیں۔ سیدھی تار آ جاتی ہے، یہ ہے قرآن کا وہ اتباع جس سے زندگی کی کج روی، ٹیڑھ پن اور طبقاتی اونچ نیچ سب نکل جاتی ہیں اور اسی قرآن کا اتباع یہ داعی کرتا ہے تو اس کی زندگی میں کوئی پیچ وخم نہیں رہتا۔ جس کی اپنی زندگی میں پیچ وخم نہیں، جو بھی اس کا اتباع کرے گا، اس کی زندگی میں پیچ وخم نہیں ہوگا۔ اور جب تمام معاشرہ ہی اس کا اتباع کرے گا تو معاشرے میں پیچ وخم نہیں رہے گا۔ اسی لیے کہا کہ **لَا عِوَجَ لَهٗ** (20:108) اس کی دعوت میں کسی قسم کا پیچ وخم نہیں۔ اس طرح کہا کہ آج جو تم یہ دیکھ رہے ہو کہ اس قدر شور مچا رہے ہیں، یہ دُہائی دے رہے ہیں، اتنا بڑا پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ اس نقار خانے میں اس طوطی کی آواز واقعی سنائی نہیں دیتی، ٹھیک ہے اس سے گھبراؤ نہیں کیونکہ اس کی اپنی دعوت میں کسی قسم کا کوئی پیچ وخم نہیں، کوئی فکری، ذہنی، شعوری اور ادراکی، غیر محسوس سی بھی کوئی کج روی، نہیں ہے۔

معاشرے کی تباہی کے لیے ابلیس کے دو خطرناک حربے

عزیزانِ من! قرآن نے ابلیس کے متعلق دو چیزوں کا بتایا تھا۔ ایک تو ابلیس نے یہ کہا تھا کہ تم دیکھو گے کہ میں ابن آدم کو کیسے تگنی کا ناچ نچاتا ہوں۔ اور اس سے پوچھا گیا تھا کہ تم کیا کچھ کرو گے؟ اس نے اور چیزیں کہی تھیں، ان میں ایک یہ بھی کہا تھا کہ میں پروپیگنڈہ کے ذریعے ایسا کرونگا، اتنا Broadcast (نشر واشاعت) کرونگا، اس قدر پروپیگنڈہ کرونگا، اس قدر شور مچاؤنگا کہ حق کی آواز ان کے کانوں میں پڑنے ہی نہیں دونگا۔ بعینہٖ یہی کچھ ان قریش نے کہا۔ قریش نے بھی یہ کہا تھا کہ جو شخص قرآن کی بات پیش کرتا ہے تم وہاں **وَالْغَوْا فِیْهِ** (41:26) شور مچاؤ، کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ عزیزانِ من! یہ جو ایک پیڑ پر چڑیوں کی چیں چیں ہوتی ہے، اگر کہیں کسی

---

1. جنتری۔ تقویم، وہ کتاب جس میں (عرف عام میں) نجومی ستاروں کی گردش کا سالانہ حال تاریخ وار درج کرتے ہیں۔ نیز لوہے کی ایک سلاخ دار پلیٹ جس میں سونے یا چاندی کے تار ڈال کر انہیں لمبا کرتے ہیں۔
2. انہیں تو اب جنتری کے معنی بھی نہیں آتے ہوں گے۔

وقت چڑیوں کے جھرمٹ کو دیکھنے کا اتفاق ہو' مثلاً صبح کے وقت' تو آپ دیکھیں گے کہ وہ بیک وقت بولنا شروع کر دیں گی جسے ہم کائیں کائیں کہتے ہیں۔ آپ کائیں کائیں کہہ لیجیے۔ یہ ''الغو'' کا زیادہ اچھا ترجمہ ہوگا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ان قریش نے بھی یہی تکنیک استعمال کی تھی۔ یہ کہتے تھے کہ **لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ** (41:26)۔ دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سن لینا بلکہ جہاں دیکھو کہ کوئی شخص قرآن کی بات پیش کرتا' ہے وہاں شور مچادو' کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ کائیں کائیں کرو' حق کی آواز ان کے کان میں پڑنے نہ دو۔ اس دور میں یہ تکنیک ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آوازیں بھی یہ کچھ کرتی ہیں۔ پریس کی یہ خاموش آواز تو اس شور مچانے والی آواز سے بھی زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ کسی آواز کو دبانے کی یہ تکنیک ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ تکنیک اختیار کر رکھی ہے اور اس پیغام کو قبول کرنے والے یہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس تو اتنے وسائل' اتنا سامان نہیں ہے۔ اُن سے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے۔ اس داعی کو اٹھنے دیجیے اور اس کے بعد جب یہ معاشرہ قائم ہوگا تو یہ جتنی بھی بڑی بڑی آوازیں سنائی دیتی ہیں' عزیزانِ من! سنیے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ **وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا** (20:108)۔ اور مخالفت کی تمام آوازیں' خدائے رحمان (کے نظام) کے سامنے خاموش ہو جائیں گی' اور سوائے قدموں کی خاموش آہٹ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ خدا کی رحمانیت کے پروگرام کے سامنے یہ ساری آوازیں چھپ جائیں گی' پست ہو جائیں گی۔ عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ پہ غور کرتے جایئے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ کسی کو خاموش کرانے کے' چپ کرانے کے' دو طریقے ہیں۔ فرعون بھی چپ کراتا تھا۔ اس نے بھی ان ساحروں سے کہا تھا کہ تم میری اجازت کے بغیر' میری آواز کے بغیر' کچھ نہیں کر سکتے' تم میری آواز پر اپنی آواز نکالتے ہو۔ ایک چپ کرانا گلا گھونٹنا بھی ہوتا ہے۔ وہ استبداد کی خاطر دوسرے کو چپ کرانا ہوتا ہے۔ یہ چپ کرایا جا رہا ہے۔ **خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ** (20:108)۔ مخالفت کی تمام آوازیں' خدائے رحمان (کے نظام) کے سامنے خاموش ہو جائیں گی۔ بچہ سو رہا ہے بھئی! ذرا اونچا نہ بولنا۔ بچے کے سونے میں رحمانیت کارفرما ہوتی ہے۔ بچہ بائیس گھنٹے سوتا ہے اور اس کی ساری پرورش اس نیند پہ منحصر ہوتی ہے۔ اس میں مائیں کتنی احتیاط برتتی ہیں: اونچی آواز سے نہ بولنا' ''آہستہ! کاکا ستا ہویا اے۔''[1] سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے یہ شور نہ مچاؤ؟ کہا اس لیے کہ **لِلرَّحْمٰنِ** (20:108) رحمانیت کارفرما ہے' سامان نشوونما کارفرما ہے' شور مت مچاؤ۔ کہا: یہ سارا غوغا' شور اور ہنگامہ' جتنا بھی ہے' یہ سارا پست ہو جائے گا تاکہ خدا کا جو نظامِ رحمت ہے کہیں اس میں خلل اندازی نہ ہونے پائے۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ آج جو اس طرح سے کھڑکھڑاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں اس کے بعد جب یہ **فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا** (20:108) چلیں گے تو ایسے دبے پاؤں ہوں گے کہ آواز بھی نہ نکلے گی۔ ہلکی سی آواز کے سوا کچھ نہیں سنائی دے گا۔ کیا نقشہ ہے!

---

[1] شور نہ مچانا' آہستہ بولنا' بچہ سویا ہوا ہے۔

پہاڑوں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ اس وقت ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ آواز پست ہوگی، چلنے تک میں تعظیم واحترام کے طور پر اتنی احتیاط برتیں گے کہ پاؤں کی بھی آہٹ نہ آنے پائے۔ کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی۔ اس وقت سارا باطل کا نظام چلتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ اس میں ایک شخص کھڑا ہوتا ہے، اس کی مکاری، چالبازی، سادگی و پرکاری اور نشیب و فراز کی تدبیریں عروج پر ہوتی ہیں اور پھر اس کے ساتھ اس کی مدد کے لیے اسی طرح کے دوسرے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی تنہا کچھ نہیں کر سکتا، ساتھ کھڑے ہونے والے، اس کے زورِ بازو پہ سب کچھ کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس دور کے اندر اس دور کی خصوصیات سنتے جائیے۔ یہاں کہا کہ پھر خدائے رحمان (کے نظام) کے خلاف اٹھنے والی تمام آوازیں خاموش ہو جائیں گی۔ اس وقت تو سوائے ہلکی سی آواز کے کچھ نہیں سنے گا۔ یہاں تک کہ سوائے قدموں کی خاموش آہٹ کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔

شفاعت کا قرآنی مفہوم سفارش نہیں بلکہ گواہی ہے

عزیزانِ من! اِس حیرت انگیز انقلاب میں کیا ہوگا؟ قرآن نے کہا کہ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ (20:109)۔ اس وقت کسی کی رفاقت و معیت کسی کے کام نہیں آئے گی۔ یہاں شفاعت کا لفظ آیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے شفاعت کا مفہوم کئی درسوں میں واضح کیا تھا۔ تجدید یادداشت کے لیے کہوں گا کہ اس کے معنی سفارش کے نہیں ہوتے۔ سفارش کے معنی اُس مقام پہ ہونگے جب یہ غیر مسلم، کفار، مشرک، اپنے عقیدے کے مطابق، اس لفظ کو استعمال کریں گے کیونکہ ان کا تصور یہ ہے کہ ان کے معبودانِ باطل، ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا، ان کے یہ بزرگ، یہ اسلاف، ان کے انبیاء، خدا سے ان کی سفارش کریں گے اور پھر سفارش سے چھڑا لائیں گے۔ ان کے اس عقیدے کی تردید میں وہاں وہ لفظ آئے گا۔ ان کے استعمال میں، جیسا کہ وہ آتا ہے، تو وہاں یہ آئے گا کہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہماری سفارش کریں گے اور ہمیں چھڑا لائیں گے۔ شفاعت کا یہی لفظ ہے جسے قرآن نے اِدھر بھی استعمال کیا ہے۔ ہماری بنیادی غلطی یہ ہے کہ ہم ہر جگہ ایک لفظ کا ایک ہی معنی لے لیتے ہیں۔ اِدھر بھی یہی چیز ہے۔ اگر شفاعت کے معنی اِدھر بھی سفارش کیے گئے تو اب ہمارے ہاں پھر ٹھیک ہے انہوں نے، اپنے نبیوں کو سفارش کے لیے لیا اور دوسری طرف انہوں نے اپنے نبیوں کو اور بزرگوں کو سفارش کے لیے لیا تو پھر تردید کا ہے کی کہ دوسروں کے انبیاء کی سفارش تو قبول نہیں کی جائے گی، جھڑک دیئے جائیں گے مگر یہ جو ہمارے محبوب کی امت ہے ان کے سفارشی جب آئیں گے تو انہیں تو ہم کرسی پہ ساتھ بٹھائیں گے، اللہ اکبر! کیا اسی کا نام عدل ہے؟ کیا یہی عدالتِ خداوندی ہے؟ جبکہ یہی کچھ تو باطل کے ہر نظام میں ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کے جتنے بھی ملزم ہیں، ان ملزموں کے ساتھ تو ان کے سفارشی دائیں بائیں بیٹھتے ہیں، لیکن دوسروں کے لیے جو اپوزیشن کی پارٹی ہوتی ہے یا مخالفین جو ہوتے ہیں، سفارشیں بند ہو جاتی ہیں۔ باطل کے نظام میں تو یہ ہوتا ہے۔ اگر آپ بھی یہی سفارش تصور کر لیں کہ ان کے ہاں والے جو ہیں ان کی سفارش تو نہیں، ہمارے جو ہونگے جی! ان

کی سفارش قبول ہوگی (معاذ اللہ) تو آپ شفاعت کے قرآنی مفہوم سے بہت دُور نکل جائیں گے۔ آپ شفاعت کے بنیادی معنی لیجیے' پھر دیکھیے کہ قرآن سفارش کے لفظ کو کن معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ قرآن نے یہ لفظ اُن معنوں میں استعمال کیا ہے جسے آج آپ Defence Witness کہتے ہیں یعنی صفائی کا گواہ۔ شفاعت کے معنی شہادت کے ہیں اور اس لیے وہ اس کو شَفَعَ کہتے ہیں۔ شَفَعَ کے معنی ہوتے ہیں ساتھ کھڑے ہونا' ایک کے ساتھ دو ہو جانا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مکافاتِ عمل کا تصور اور خدا کی عدالت میں پیشی کی حیثیت

قرآنِ کریم کا مکافاتِ عمل کا تصور یہ ہے کہ ہر فرد اپنی ذات کا اعمال نامہ لے کر وہاں موجود ہوگا۔ گواہی کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں ہے لیکن قرآنِ کریم جب وہاں کے معاملات کو مثالوں کے ذریعے' تمثیلی انداز سے' سمجھاتا ہے تو وہ عدالت کا نقشہ قائم کرتا ہے: جج بھی بیٹھا ہے' وہ بھی ہے۔ وہاں ملزم کو ہتھکڑی لگائے ہوئے' ایک آگے سے کھینچ رہا ہوگا' ایک پیچھے سے ہانک رہا ہوگا۔ وہاں جا کے کٹہرے میں کھڑا ہو جائے گا۔ اس کے بعد آگے یہ چیز ہے کہ یہ پوچھا جائے گا' گواہ طلب کیے جائیں گے' اس کی شہادت والا ہوگا۔ جو اس ملزم کی شہادت دینے والا ہے' اسے Defence Witness' صفائی کا گواہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ یہ نہیں ہے کہ ہر ایک شخص وہاں اپنے طور پہ آ کے کھڑا ہو جائے گا کہ جی میں بھی ہوں' ہاں جی! عدالت میں تو کوئی دوسرا ہے اور اس کے لیے یہ ہے کہ جس کو ہم سمن بھیجیں گے' جسے ہم بلائیں گے' وہ آئے گا اور پھر وہ آ کے بات بھی قاعدے قانون کے مطابق کرے گا۔ اس کے معنی شہادت اور رفاقت کے ہوتے ہیں۔ یہ کہا کہ **يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا** (20:109)۔ اس وقت کسی کی رفاقت و معیت کسی کے کام نہیں آئے گی' ہاں مگر اس کی جو خدائے رحمان کے قانون کے مطابق پسندیدہ بات کرے۔ اس سے واضح ہے کہ یہاں یہی نہیں کہ یہ کھڑا ہوگا اور اس کے ساتھ پارٹی کے لوگ' وہ اِدھر اُدھر کے بھی کھڑے ہو جائیں گے۔ کہا کہ بالکل نہیں۔ رفاقت اسی کی ہوگی کہ جو قانونِ خداوندی کے مطابق' کسی کی کوئی رفاقت یا معیت چاہے گا اور پھر بات بھی وہی کرے گا۔ رَضِيَ کے معنی ہیں جو اس کے ساتھ منطبق ہو جائے۔ بات بھی وہ کرے گا جو اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اس معاشرے میں یہ نہیں ہوگا کہ مجرم اور ملزموں کی سفارشیں کرنے والے غنڈے آ جائیں گے۔ اس میں یہ بالکل نہیں ہوگا۔ کہا کہ ان سے یہ باتیں کہو تو یہ ہنس دیں۔ کیا بات ہے! کہ ہمارے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم سارے چٹیل میدان ہو جائیں گے' ہم میں کوئی پیچ و خم نہیں رہے گا' ہماری سیاست ختم ہو جائے گی' ہمارا جتھہ ختم ہو جائے گا' ہمارے ساتھ وہی اٹھ کے کھڑا ہو سکے گا جسے اس کی یہ اجازت دیں گے۔ بات یہ ہے۔ یہ ہوگا کیسے؟ کہا: **يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا** (20:110)۔ یہ سب کچھ اسی طرح واقع ہو کر رہے گا۔ اس لیے کہ خدا کا قانونِ مکافات جانتا ہے کہ یہ لوگ کیا کچھ کر چکے ہیں' اس کے عواقب (جو ان کے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور جو اپنے وقت پر نمودار ہو جائیں گے) کیا ہیں۔ یہ بات (اِس وقت) اِن کے حیطۂ ادراک میں بھی نہیں آ سکتی (کہ یہ کیسے ہوگا)۔ ٹھیک ہے' یہ اپنے حساب کتاب سے یہ فیصلے کر رہے ہیں کہ ہمارے جھنڈے کتنے دُور تک گئے ہوئے ہیں' کتنے گڑے ہوئے ہیں' انہیں کوئی اکھیڑ نہیں سکتا' یہ

اس طرح سے اپنے اپنے جھنڈے لگا رہے ہیں۔ اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ پیدا کیا کرتا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری چال کامیاب ہوگئی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ جو غلط فریب کارانہ چالیں ہوتی ہیں' ان کا انجام کیا ہوتا ہے' پیچھے کیا چیز آ رہی ہے' آگے کیا بھیجا ہے۔ عمل ہمیشہ پہلے سرزد ہوتا ہے' نتیجہ اس کے پیچھے آ رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے آخرت کو عاقبت کہتے ہیں۔ عقبہ کے معنی ہوتا ہے: کسی کے پیچھے پیچھے چلے آنا' جیویں کھوجی یا کھوجیا کھرا نپدا اے۔ ❶ یہ وہ ہوتا ہے۔ انہیں کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت اس نے یہ چور اپنے ذہن میں رکھ چھوڑا ہے کہ میں نے یہ بھی خانہ بند کر دیا' یہ بھی احتیاط برت لی' یہ بھی کچھ کر لیا۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ ''ساڈے کھوجی پیراں دی کھوج توں پتہ لے لیندے ہیگے۔'' ❷ اور اب تو یہ طبعی کھوجی' یہ جو انہوں نے کتوں کا نیا سسٹم نکالا ہے' وہ تو سونگھ کے پتہ لے لیتے ہیں۔ یہ باتیں یوں سمجھانے کی ہیں جیسے یہ عام سطح پہ سمجھایا جاتا ہے' ورنہ قرآن نے تو یہ بتایا ہے کہ ہر شخص کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ آج وہ لپٹا ہوا ہے' اس وقت یہ کھول دیا جائے گا۔ بس اتنا ہی فرق ہے اور کھولنے کے بعد اس سے کہا جائے گا کہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ (17:14) لو! اپنا اعمالنامہ خود پڑھ لو۔ یہ نہیں ہے کہ کسی اور سے کہا جائے گا کہ اس کا اعمال نامہ پڑھ دو۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ نہیں صاحب! پڑھنے میں یہ بھی کچھ چار سو بیس کر گیا۔ وہ کہنے لگا کہ کسی اور سے کہا ہی نہیں جائے گا۔ کہا جائے گا کہ خود پڑھ لے۔ پڑھ لیا۔ پڑھنے کے بعد پھر اگر کوئی اور حساب لگا کے بتا دے کہ جی! اتنا جمع ہوا ہے' اتنا اس کا مائنس (منفی) ہوا' اتنا بیلنس (باقی) نکلا۔ پھر یہ کہے کہ نہیں صاحب! غلطی ہوگئی۔ کہا کہ آج اپنا حساب بھی آپ ہی کر لے۔ وہ تو یہ اعمال نامہ ہے۔ کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو عزیزانِ من! ایک ترازو سینے کے اندر لٹکا ہوا ہے۔ ہر آن' ہر ایکشن' ہر عمل ہی نہیں بلکہ دل میں گزرنے والا خیال بھی اپنا نتیجہ وہاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ تو اصل تو یہ ہے مکافاتِ عمل۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان تو بڑا ہی حکمت والا ہوتا ہے

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ تو عام سطح پہ بھی بات سمجھاتا ہے' اور پھر آئن سٹائن (Albert Einstein: 1879- 1955) اور برگسان (Henry Bergson: 1859- 1941)۔ کو بھی انسانی ذات کے تاثرات اور اس کے نقوش کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ جو عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آ سکتے' لیکن اس نے تو عرب کے بدو کو بھی قرآن سمجھانا ہے تو اس نے کہا کہ یہ عدالت اس قسم کی ہوگی۔ آج بھی' عزیزانِ من! اگر کسی سے کہہ دیجیے کہ ایسا نظام ہوگا جس میں عدالت اس قسم کی ہوگی تو وہ کہے گا کہ یا اللہ! کل کا آنا کسی طرح سے آج ہی آ جائے۔ یہ اس طرح سے بات سمجھاتا ہے۔ ٹھیک ہے علم و اعتراض کی بنا پر آج یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ قرآن نے دوسری جگہ کہا ہے کہ آنے والی تباہی تو ان راستوں سے آیا کرتی ہے جو مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ (39:25) ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں آ سکتے۔ یہ تباہی علم و شعور کی رو سے آج ان کی سمجھ میں نہیں آتی اور ہر باطل کے نظام والے بدھو تو ہوتے نہیں' وہ اتنا انتظام کر لیتے

---

❶ جس طرح کھوجی یا کھوجیا پاؤں کے نشانات کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جاتا ہے۔

❷ ہمارے کھوجی پاؤں کے نشانات سے معلوم کر لیتے ہیں۔

ہیں کہ اس بساط کے مہروں کے اوپر کوئی ان کو شکست نہ دے لیکن قرآن کہتا ہے کہ آنے والی تباہی تو ان راستوں سے آتی ہے جو ان کے عقل و شعور میں بھی نہیں ہوا کرتی۔ وہ انہیں Unforeseen Circumstanses (اَن دیکھے حالات) کہہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو وہ Unforeseen (اَن دیکھے) ہوتے ہیں۔ خدا کے نزدیک تو وہ اعمال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ یہ اسے اس وقت نہیں بھانپ سکتے' وہ جانتا ہے کہ کیا ہوگا' کیسے ہوگا۔ یہ بات ہو رہی تھی۔ پوچھ رہے تھے کہ یہ جو بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہیں' ان کا انجام کیا ہوگا؟ یہ کس طرح سے ہوگا؟ کہا کہ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ (20:111)۔ خدائے حی و قیوم کے (اس زندگی بخش) نظام میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے گی۔ پھر دل کے جھکاؤ کے ساتھ اس نظام کی اطاعت کریں گے۔

عمل سے محروم قوموں کی حالت خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی

عزیزانِ من! ہمارے ذہنوں میں تو یہ چیز اس طرح سے نہیں آتی۔ جب یہ صورتِ حال ہوتی ہے تو ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ بس جب یہ چیز آئے گی تو پھر یہ سارے بیٹھے رہیں گے' خدا کے فرشتے آئیں گے اور یہ سب کچھ کریں گے۔ پھر ان کیے گئے واقعات کو یوں بیان کیا جاتا ہے جیسے کہ انہوں نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انہیں یوں فنا کیا' یہ تباہ کیا۔ شکست ہونے لگی تو ان کی روایت کے مطابق آپ نے مٹھی بھر کنکریاں لیں' ماریں اور سارے اندھے ہو گئے۔ ابابیلیں آئیں'[1] وہ پاؤں میں

---

[1] یہ اشارہ ہے اس واقعہ فیل کی طرف۔ واقعہ یہ تھا کہ یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے (جو شاہ حبش کا گورنر تھا) 570ء میں جو حضور کا سن ولادت ہے' ارادہ کیا کہ مکہ کو فتح اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تا کہ عربوں کی مرکزیت فنا اور قریش کی سیادت تباہ ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے بجائے اس کے کہ برملا اعلان جنگ کرتا اپنے ساتھ ہاتھیوں کی ایک عظیم الشان فوج لے کر خفیہ خفیہ بڑھنا شروع کیا۔ اس یورش کے لیے حج کا موسم تجویز کیا' جب عربوں میں لڑائیوں کا سلسلہ منقطع (یا ملتوی) ہو جاتا ہے اور پھر ایامِ تشریق کہ جن میں تمام عرب ہتھیار الگ رکھ کر رسومِ حج کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں اس نے مانوس راستہ کو چھوڑ کر پہاڑیوں کے پیچھے پیچھے چور راستہ اختیار کیا تا کہ کسی کو اس حرکت و یورش کا علم ہی نہ ہونے پائے تا آنکہ وہ مکہ پر حملہ آور ہو جائے۔ یہ تھے اس کے مکائد (خفیہ تدابیر)۔ عرب اس کی آمد سے بے خبر تھے لیکن اللہ تو بے خبر نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسا سبب پیدا کر دیا جس سے یہ تمام راز طشت از بام ہو گیا۔ گدھ اور چیلیں ہمیشہ لاشوں (Dead Bodies) اور مرداروں (Dead) کی تلاش میں رہتی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں جب کبھی لشکر ادھر اُدھر جنبش کرتے تو وہ اپنی فطری ذہانت سے بھانپ لیتیں کہ کہیں ان کی ضیافت کا سامان ہونے والا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ساتھ ہو لیتیں۔ ابرہہ نے زمین پر تو تمام حفاظتی تدابیر اختیار کر لیں کہ اس کا راز آشکارا نہ ہونے پائے لیکن آسمان پر تو اسے کچھ اختیار حاصل نہیں تھا۔ عربوں نے دیکھا کہ گدھوں کے جھنڈ کے جھنڈ منڈلاتے چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے ان ''خبر رساں ایجنسیوں'' سے فوراً بھانپ لیا کہ ان کے سائے میں کوئی لشکر بڑھے آ رہا ہے۔ حج کے موقعہ پر اجتماعِ عفیر موجود تھا۔ سب ارد گرد کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ اب صورت یہ ہو گئی کہ نیچے وادیوں میں ابرہہ کا لشکر ہے اور اوپر پہاڑیوں پر عربوں کا ہجوم' نہ جائے ماندن' نہ پائے رفتن۔ ازمنہ گزشتہ کے فنونِ حربیہ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ سنگ باری اس زمانے کے کیسے مؤثر حربات میں سے تھی۔ ہزار ہزار من کی چٹانیں اوپر سے لڑھکا دی جاتیں جو اپنے ہی زور دروں (Momentum) سے اس شدت سے نیچے آتیں کہ جو ان کی زد میں آ جاتا اس کا بھرکس نکل جاتا۔ آنِ واحد میں ہاتھی اور ان کا لشکر بھس بن کر رہ گیا۔ (پرویز: معراج انسانیت' 1949' ص ص۔ 267-366)

کنکریاں لیے ہوئے تھیں۔ وہ کنکریاں مارتی تھیں جو لگ کر ہاتھیوں کے پیٹ سے نکل جاتی تھیں۔ ٹھیک ہے جو قوم خود عمل سے محروم ہو جائے‘ وہ اپنے آپ کو اسی طرح سے فریب دیتی ہے کہ آپ کے یہ سارے کام خدا کیا کرتا ہے۔ اور بس! تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔

میدانِ بدر میں تلواریں چلانے کا مقصد اور خدا کے ہاں مجاہدین کی عظمت

عزیزانِ من! وہ قوم اتنا بھی نہیں دیکھتی کہ خدا نے بدر کے میدان میں کہا تھا کہ یہ تم سمجھتے ہو کہ خدا کیا کرتا ہے۔ وہ یہ کرتا ہے کہ جب انسانی ہاتھ خدا کے احکامات سے ہم آہنگ ہو کر کوئی کام کرتا ہے تو خدا کہتا ہے کہ یہ کام تم نہیں ہم کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی مثال بدر کا میدان ہے‘ جہاں کہا کہ یہ جو تمہارے ہاتھوں سے تلواریں چل رہی ہیں‘ خدا اس طرح سے تلواریں چلایا کرتا ہے۔ جی! یہ خدا کیوں چلاتا ہے؟ اس کے مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے جو تلواریوں چلے گی اسے خدا چلائے گا۔ باطل کے لیے جو بازو اٹھے گا اسے ابلیس چلائے گا‘ ورنہ خدا اور ابلیس‘ اہرمن و یزداں‘ تو کسی میدان میں یوں آمنے سامنے نہیں آتے۔ یہ تو مجوسی تصور ہے۔ یہ تو یوں ہے کہ عمل سے فارغ ہوا مسلماں‘ بنا کے تقدیر کا بہانہ۔ وہ تو یہی چیز کہیں گے کہ صاحب! یہ سارا کچھ ہو جائے گا۔ اُن کے کہنے کے مطابق تو سفید عماموں اور ہری پگڑیوں والے بابے [1] آئے اور انہوں نے یہ سب کچھ کر دیا اور اسکے بعد جب ہم نے کہا کہ میاں یہ کچھ کرو تو کہنے لگے کہ بھئی! یہ چیز تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پہ موقوف ہے: جب وہ چاہتا ہے تو ابابیلوں سے بھی وہ ابرہہ کے لشکر کو مروا دیتا ہے۔ [2] یہ ہمارے اور آپ کے تو بس کی بات نہیں ہے۔ اب وہ پھر کہیں گے کہ ان کے لیے وہیں ابابیلیں کہیں سے آئیں گی تو وہ یہ سب کچھ کر دیں گی۔ اتنے عرصہ سے تو وہ ابرہہ‘ جو ان پر مسلط ہے‘ اپنا کام کر جائے گا۔ پھر وہی بات آ گئی۔ یہ تو ان کا دوسرا قبلہ ہے۔ ان کے نزدیک تو کعبہ دوسرا قبلہ ہے اور جسے یہ قبلہ اول کہتے ہیں‘ اس پہ تو ”ابرہہ“ اتنے عرصے سے مسلط [3] ہیں۔ اب تک کوئی ابابیل نہیں آئی۔ عزیزانِ من! یہ ”اس کو“ قبلہ اول کہتے ہیں۔ یہ کچھ کم اہم بات نہیں ہے۔

عربوں کے ہاں لفظ 'وجہ' اور لفظ 'عنت' کا مفہوم

عزیزانِ من! یہاں بات کچھ اور آ رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ پہلے کہا تھا کہ **وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ** (20:111)۔ خدائے حی و قیوم کے (اس زندگی بخش) نظام میں‘ تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے گی۔ وہ اس نظام کے استحکام کے لیے بطیبِ خاطر اٹھ کھڑے ہوں گے اور قوانینِ خداوندی کی دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اطاعت کریں گے۔ یہاں

---

[1] یہ اشارہ 1965 کی پاک و ہند جنگ میں ان کی پھیلائی ہوئی باتوں کی طرف ہے۔

[2] یہ واقعہ فیل کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل پچھلے صفحہ کے فٹ نوٹ میں دی گئی ہے۔

[3] یہ بیت المقدس اور یہودی اسرائیلی ریاست کے قیام کی طرف اشارہ ہے۔

الفاظ آئے ہیں: **عَنَتِ الْوُجُوْهُ** ۔کیا الفاظ ہیں یہ! ''وجہ'' کے لغوی معنی چہرے کے ہوتے ہیں' رُخ کے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں چہرے کے لیے لفظ رُخ استعمال ہوتا ہے لیکن عربوں کے ہاں یہ 'وجہ' یا ''وجوہ'' کا لفظ شخصیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ پوری Personality (شخصیت) کے لیے ہوتا ہے' انسانوں کی تمام مضمر صلاحیتوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ذرا اس کی وجہ تو بیان کیجیے' یہ بنیادی چیز ہے کہ بظاہر جو ہوا ہے وہ بات تو ہماری سمجھ میں آ گئی' اس کے اندر ایک مضمر چیز ہے کہ یہ ایسا کیوں ہوا ہے' وہاں کے لیے یہ لفظ آیا ہوا ہے۔تو انسان کی جو ''مضمر صلاحیتیں'' ہوتی ہیں' ان کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔اس آیت میں اس سے پہلے ایک اور لفظ ہے۔ وہ ہے: عـنـت۔عربی زبان کا اعجاز اور قرآن کا انتخاب دیکھیے کہ اس لفظ کے دو مادے ہو سکتے ہیں: ''ع ن ت'' بھی اور ''ع ن و'' بھی۔اور یہاں یہ دونوں ہی اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ عجیب و غریب چیز ہے' عزیزانِ من! 'عنت' کے معنی ہوتے ہیں: مضمر چیزوں کا محسوس ہو جانا' Potentialities (صلاحیتوں) کا Actualize (نشوونما) ہو جانا۔مضمر اور بارز تو ہمارے ہاں بھی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔اس کا مطلب ہے: چھپی ہوئی صلاحیتوں کا ابھر کر باہر نکل آنا۔ یہاں کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہوگی کہ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھر کر باہر آ جائیں گی۔اب سوال یہ ہے کہ یہ کون ہیں' جن کی یہ صلاحیتیں ابھر کر باہر آ رہی ہیں؟ کہا کہ یہ وہ ہیں جن کے ہاتھوں سے یہ کچھ ہونا ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ نہ تو کسی ابابیل سے ہوگا' نہ کنکریوں سے ہوگا۔ یہ انسانوں سے ہوگا۔انسان بھی یہ نہیں ہیں کہ جس قسم کے جی چاہے آپ نے فوج میں بھرتی کر لیے اور وہ اٹھ کے چلے جائیں گے۔ بالکل نہیں' عزیزانِ من! اصل چیز تو یہ ہے کہ انقلاب پیدا کرنے کا جتھہ اکٹھا کر لینے سے فساد پیدا ہوتا ہے' انقلاب پیدا نہیں پیدا ہوتا۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں انسانی عقل و بصیرت کے نفسیاتی تغیر کا نام ہی انقلاب ہے

قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ** (13:11)۔خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ یہاں اس آیت کو اِنَّ **اللّٰـهَ** سے شروع کیا ہے۔ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا۔کہا: تم تو ایک طرف رہے' انسان تو ایک طرف رہے' خدا بھی کسی قوم کی ماہیت و کیفیت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنی نفسیاتی کیفیت خود نہیں بدل لیتی۔اس پہ زور دے کر کہا کہ پھر خدا بھی اسے نہیں بدلتا۔ یہ ذرا دیکھیے تو سہی کہ وہ کیا کہہ گیا ہے: جی لا لو جتاں زور مرضی۔ [1] یعنی یہ بات اتنی اہم ہے کہ آخر تم یہاں تک پہنچو گے کہ جو کچھ تم کر سکتے ہو' کر گزرو۔لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ یہ چیز تو خدا بھی نہیں کرتا جب تک کہ قوم اپنی نفسیاتی کیفیت خود نہ بدل لے' بغیر نفسیاتی تغیر (Psychological Change) پیدا کیے انقلاب نہیں آئے گا۔ انقلاب تو قلب کے بدلنے سے آتا ہے۔

---

[1] جی حضور! جتنی طاقت لگا سکتے ہو' لگا لو۔

صاحبِ علم ہونا کسے کہا جائے گا؟

عزیزانِ من! یہ لفظ بتا رہا ہے کہ وہ کیفیت یہ تھی جس کے تحت رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت تیار کی اور پھر اس جماعت کو **وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ** (2:129)۔کتاب (ضابطۂ حیات) کی تعلیم دی۔ یہ بھی بتایا کہ ان قوانینِ ضابطہ حیات کی غرض و غایت کیا ہے' ان پر عمل کرنے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے اور صرف نظری طور (Theoretically) پر ہی یہ تعلیم نہ دی بلکہ عملاً ایسا نظام متشکل کر دیا جس میں لوگوں کی صلاحیتوں کی برومندی اور اُن کی ذات کی نشو ونما ہوتی گئی۔عزیزانِ من! اس میں کیا فراست ہے؟ تعلیم تو علم کا نام ہے۔کا ہے کا علم؟ کہا کہ قانون کا علم' کتاب کا علم۔ یہ اٹھارہ علوم جو ہمارے ہاں مدرسوں میں پڑھائے جاتے ہیں' جس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ ہم علم حاصل کر رہے ہیں' یہاں کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ **وَ الْحِکْمَۃَ** کا' دانش کا' حکمت کا' Wisdom (دانائی) کا' Reason (عقل و فکر) کا علم بھی تعلیم کے ساتھ ہو۔اس کے لیے قرآن نے قانون' قانون کی رائے' اس کی غرض' علت' سبب' نتائج' دینے کے متعلق ایک لفظ حکمت کا استعمال کیا۔اس نے یہ کہہ دیا کہ اگر اس طرح ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرو گے تو اپنی جماعت کی یہ کیفیت ہوگی۔ جہاں تک ان کے ذہن کا تعلق ہے' ان کے علم کا تعلق ہے تو اقبالؒ (1877-1938) نے **الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ** کا ''دین اور دانش'' بڑا صحیح ترجمہ کیا ہے یہ بڑا خوبصورت ترجمہ ہے' یعنی کتاب و حکمت کا ترجمہ دین و دانش۔اور جب اس نے کہا تھا کہ ''متاعِ دین و دانش لٹ گئی' اللہ والوں کی'' [1] تو اس نے کہا یہ تھا کہ ان کے ہاتھوں سے قرآن بھی گیا' عقل و بصیرت بھی گئی اور پھر یہ کہا کہ یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی۔متاعِ دین و دانش ہی تو **یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ** ہے۔یہ تو صرف تعلیم ہوئی لیکن اس نے کہا ہے کہ خالی تعلیم سے بات نہیں بنتی۔اس کے لیے **یُزَکِّیْھِمْ** بھی ضروری ہے یعنی جوان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو ونما کرے گا' وہ صاحب علم ہوگا۔ یہ ہے وہ چیز' یہ ہے وہ جماعت' جو تیار ہوگی۔تو کہا کہ کوئی بات نہیں' ہزار کے مقابلے میں تین سو ہی سہی۔ان ہزار کو پتہ نہیں ہے کہ یہاں وہ ''جمہوریت'' ہے جس میں انسانوں کو ''تولا'' کرتے ہیں' ''گنا'' نہیں کرتے۔ یہ یہاں کی الٹی جمہوریت ہے جہاں بندوں کو گنا کرتے ہیں' تولا نہیں کرتے! [2]

اصل بات تو انسانی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ہے

عزیزانِ من! ابھی میں تولنے کی بات کے متعلق بھی عرض کرونگا۔ یہاں آیا ہے کہ **عَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ** (20:111)۔اس

---

1. متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی — (اقبالؒ: بال جبریل' ص۔36)
2. جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں — بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے! — (اقبالؒ: ضربِ کلیم' ص۔171)

آیت میں لفظ ’’عنت‘‘ آیا ہے۔لفظ عنت‘ کے متعلق میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اس کے معنی ’’مضمر صلاحیتوں کا بارز ہو جانا‘ کھڑے ہو جانا‘ سامنے آ جانا‘‘ ہوتا ہے اور اس کے دوسرے معنی کے لیے یہاں لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ آیا ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ صلاحیتیں تو نمود میں آ سکتی ہیں‘ ان کی نشو ونما بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اقبالؒ (1877-1938) نے تو نپولین (Napoleon 1769-1821) اور مسولینی (Benito Mussolini 1883-1945) تک کی خودی کو بھی سراہا ہے۔ٹھیک ہے یہ صلاحیتیں ان میں بھی بیدار ہو سکتی ہیں۔اگلی بات تو یہ ہے کہ وہ نشو ونما یافتہ صلاحیتیں کس طرح سے استعمال کی جائیں گی؟ اصل چیز تو یہ ہے۔تلوار تو ڈاکو کے ہاتھ میں بھی ہوتی ہے‘ چوکیدار کے ہاتھ میں بھی ہوتی ہے۔وہ جو جرم کا تعین ہوتا ہے‘ وہ تو اس تلوار کے استعمال پر ہوتا ہے‘ تلوار پہ تو نہیں ہوتا۔صلاحیتیں بارز ہو سکتی ہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ ان نشو ونما یافتہ صلاحیتوں کا مقصد کیا ہے؟ اسی ’’عنت‘‘ کے مادے کے معنی ’’اطاعت‘‘ کے ہوتے ہیں۔یہ مضمر صلاحیتیں ابھریں گی‘ کھڑی ہونگی‘ بارز ہونگی اور یہ پھر اس کے ساتھ ہی یہ ہے کہ یہ جھکیں گی۔اب یہاں اس کے لیے کہا ہے کہ یہ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ کے لیے ہے۔یعنی یہ بارز ہونا خدائے حی و قیوم کے زندگی بخش نظام کے لیے ہے۔اس آیت میں یہ کیا دو لفظ آ گئے! ’’حی‘‘ بھی اور ’’قیوم‘‘ بھی۔جو خود بھی زندہ ہے‘ انسانیت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔جو خود بھی قائم ہے‘ انسانیت کا قیام بھی چاہتا ہے۔خدا تعالیٰ کے اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے یہ مضمر صلاحیتیں بارز ہونگی اور پھر اس پروگرام کے سامنے جھکیں گی۔لہٰذا اس طریق کے متعلق یہ کہا ہے یعنی اصل بات تو قوت اور صلاحیتوں کے استعمال کی ہے۔عزیزانِ من! میں عمر کے اس حصے میں کیا کہوں‘ بس یہ کہ اے کاش! یہ قرآن کہیں ہمارے نصاب (Curriculum) میں آ جاتا!

میری زندگی کی آخری خواہش کہ کاش یہ قرآن کہیں نصاب کا حصہ بن جاتا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کو اپنے ہاں نصاب (Curriculum) میں شامل کرنے کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔صدر اول میں اسی سے تو یہ سارا انقلاب برپا ہوا تھا۔آپ اپنی تاریخ میں‘ جو پہلا اتنا بڑا درخشندہ دَور پیش کرتے ہیں‘ وہ اس قرآنی فکر سے ہی برپا ہوا تھا۔پروگرام یہ تھا عَنَتِ الۡوُجُوۡهُ لِلۡحَیِّ الۡقَیُّوۡمِ (20:111)۔خدائے حی و قیوم کے (اِس زندگی بخش) نظام میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے گی۔وہ صلاحیتیں اس نظام کی اطاعت میں جھکیں گی۔ہمارے اس صدر اول میں تو یہ کچھ برپا ہو گیا۔ان صلاحیتوں کے مالک‘ اس پروگرام کی تکمیل کے لیے آ گئے‘ اس مقصد کے حصول کے لیے سرفروشانہ آ گئے‘ شمشیر بدست آ گئے‘ کفن بدوش آ گئے۔ادھر تو یہ کیفیت ہوئی تھی۔اس کے بعد اس کا نتیجہ پوچھا گیا تھا کہ ان ’’پہاڑوں‘‘ کا یعنی ان اکابرین کا کیا ہوگا؟ کہا کہ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ حَمَلَ ظُلۡمًا (20:111)۔جو ظلم و زیادتی کرے گا‘ وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ان کے لیے قرآن کیا لفظ لایا ہے! یہ لفظ ہے ظلم۔یعنی وہ ظلم کو جگہ جگہ اٹھائے اٹھائے پھرنے والے ہوں گے یعنی جو اسے بکھیرنے والے ہوں گے وہ اسے جگہ جگہ اٹھائے پھریں گے۔

عزیزانِ من! ظلم کے معنی تو آپ کو یاد ہی ہو گئے ہونگے۔ یہ لفظ کئی دفعہ آیا ہے۔ ہمارے ہاں قرآنی فہم وفراست کی رو سے تو یہ چیزیں ایک خاص تصور رکھتی ہیں اور ان سے ہٹ کے اِدھر اُدھر کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اب تو یہ اصطلاحیں بھی اپنے معنی کھو گئی ہیں۔ ظلم کے معنی ہی کچھ نہیں رہے۔ مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں ❶ والی بات ہے۔ معنی ہی اینہاں چیزاں دے نئیں باقی رئے ہیگے ❷۔ ظلم کے معنی ہوتے ہیں: جس چیز کو جہاں ہونا چاہیے اس کا وہاں نہ ہونا بلکہ کسی اور جگہ ہونا۔ کیا بات ہے عرب کی اس زبان کی! اور کیا بات ہے اس قرآن کی! عزیزانِ من! اب اس نقطے کو پھیلاتے چلے جایئے بات سمجھ میں آتی جائے گی: جسے جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو۔ ایہو رونا روندے ہونا روز ❸۔ جسے جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو اور جسے وہاں نہیں ہونا چاہیے وہ وہاں ہو۔ آگے جو کچھ ہوتا ہے وہ تو جو کچھ یہ کرتے ہیں، یہ اس کے نتائج ہوتے ہیں۔ اصل چیز تو یہ ہوتی ہے کہ "جسے جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو" یہ ہے ظلم۔

لفظ خاب کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اب اس آیت میں دوسرا لفظ ہے خاب۔ میں نے آپ کو پہلے بھی "خاب" کے معنی بتائے تھے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ تو ہوا ہے کہ "ناکام ہو گیا، نامراد ہو گیا۔" اس سے بات تو نہیں بنتی۔ قرآن ہے، عزیزانِ من! جبھی تو میں کہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ شاید آپ کو یاد آجائے کہ یہ لفظ قرآنِ کریم میں انسانی ذات کی نشوونما کے سلسلے میں آیا تھا کہ **قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا** (91:9-10)۔ انفس وآفاق میں کارفرمایہ تمام پروگرام اس حقیقت پر شاہد ہے کہ) جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی، وہ کامیاب وکامران رہا۔ اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی، اسے زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ لیکن جس نے اسے مفاد پرستیوں کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کا شعلۂ حیات افسردہ ہو گیا۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ خوابیدہ رہ گئیں۔ وہ اس چقماق کی طرح ہو گیا جس میں آتش افروزی ❹ کی صلاحیت تو ہو لیکن اس کی چنگاری کی نمود نہ ہو سکے اور اس طرح وہ پتھر کا پتھر رہ جائے۔ میں خاب کے لفظ کو یہاں تک ہی رکھتا ہوں۔

یہاں "پہاڑ" کی بات کی ہے یا مثال کے طور پر "بڑی بڑی چٹانیں" کی بات کی ہے۔ ٹھیک ہے، بڑے کو تو چھوڑیئے۔ ان کے ہاں چٹان کا پتھر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ابھی ماچس وغیرہ تو ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ اس پتھر کے اندر سے آگ نکلتی تھی۔ اصل میں تو رگڑ

---

❶ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں (غالب: دیوانِ غالب، ص۔109)

❷ ان چیزوں کے وہ معانی ہی باقی نہیں رہے۔

❸ ہر روز یہی رونا روتے ہو، یہی راگ الاپتے ہو۔

❹ آگ کا بھڑکنا

(Friction) سے چنگاری نکلتی تھی لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس پتھر کے اندر یہ آگ پنہاں ہے اور اس میں سے یوں رگڑنے سے' اس کے اندر سے' ایک شرر یا چنگاری باہر نکلتی ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ ان پہاڑوں سے' ان چٹانوں سے' ان پتھروں سے' یہ شرر فشانیاں ہوتی ہیں' شعلے نکلتے ہیں۔ تو تصور یہ دے رکھا ہے کہ ان پتھروں کے اندر آگ کے یہ بڑے بڑے ذخیرے موجود ہیں' آتش فشاں ہیں۔ تو کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس قسم کے پتھر' اس قسم کی چٹانیں' جن کے اندر آگ بھری ہوئی ہے' سے کیا ہوگا؟ اس سوال کے جواب کے لیے ان کے ہاں یہ لفظ ''خاب'' تھا۔ معلوم نہیں کہ کثرت استعمال سے یا کسی اور وجہ سے وہ پتھر تو پتھر ہی رہ جاندا سی۔ ❶ یعنی اس پتھر میں سے وہ شعلہ نہیں نکلتا تھا۔ پتھر کی شکل تو وہی رہتی تھی مگر اس کی شر رانگیزی اور شعلہ فشانی ختم ہو جاتی تھی۔ وہ جو ایسا پتھر تھا' اس کے لیے یہ عرب ''خاب'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ یہاں کہا کہ یہ جو پہاڑ نظر آتے ہیں' بڑے بڑے چٹان نظر آتے ہیں ان کے اندر بڑی آگ بھری تھی۔ ٹھیک ہے' ان کی شکلیں یہی رہیں گی مگر وہ شرر فشانیوں کی کیفیتیں ختم ہو جائیں گی۔ یہ سابقہ دور کے اقتدار والے' یہ اکابرین' اسی طرح کے پتھر ہوں گے۔ ان کا تو یوں سمجھو کہ اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی۔ ❷ اب یہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ سارے وہ چقماق ہوتے ہیں' مگر خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا (20:111) اب ان میں یہ بات نہیں رہے گی' ان کا شعلۂ حیات افسردہ ہو گیا' وہ اس چقماق کی طرح ہو گئے جن میں آتش افروزی ❸ کی صلاحیت تو ہے مگر اس کی چنگاری کی نمود نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے ظلم و زیادتی کی' ناکام و نامراد رہے۔ اور اس کے مقابلے میں قرآن تو لا الہ الا اللہ' لا الہ الا اللہ لاتا جاتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ اضداد سے بات سمجھاتا ہے۔ اس لیے اس گروہ کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ (20:112)۔ اور جو شخص' خدا کے ضابطۂ قوانین کی صداقت کو تسلیم کر کے صلاحیت بخش کام کرے گا' جو کوئی بھی صلاحیت بخش کام کرے گا جس سے اس کی بھی اور عالمِ انسانیت کی بھی صلاحیتیں ابھریں گی' اسے عملِ صالحہ کہتے ہیں' وہ صالحین ہوتے ہیں تو پہلی شرط یہ ہے کہ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ان قوانین کی صداقت پہ اس کو یقین ہو اور پھر اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں' تو پھر اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ لیجیے صاحب! بڑے بڑے لمبے وعظ' بڑی بڑی لمبی کتابیں' بڑی بڑی ضخیم جلدیں' موجود ہیں جن میں درج ہے کہ صاحب! ایمان و اعمال کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہاں صرف چار الفاظ میں فرمایا کہ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (20:112)۔ اُسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا اور نہ کسی حق تلفی کرنے والے کی سلب و نہب کا۔ ان کو کسی قسم کا خدشہ' خطرہ' ڈر نہیں رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ کن چیزوں سے خدشہ و ڈر نہیں رہے گا؟ کہا کہ ظلم اور حزن سے نہیں ہوگا۔ وہاں ظلم نہیں ہوگا اور کوئی کسی کی چیز ہضم نہیں کر پائے گا' یعنی یہ بات نہیں ہوگی کہ جسے جہاں ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ رہے' قطعًا

---

❶ وہ پتھر کا پتھر ہی رہ جاتا ہے۔

❷ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

❸ آگ کا بھڑکنا

نہیں۔ اس چیز کا ترجمہ ہی Exploitation (سلب ونہب) ہوتا ہے۔ آپ اس کا اور کیا ترجمہ کریں گے؟ یہی کہ ہضم کر گیا۔ ہم بھی تو یہ لفظ روز کہتے ہیں۔ اس معاشرے میں اس قسم کا یہ خطرہ نہیں رہے گا۔

جنتی معاشرے کی بنیادی خصوصیات

عزیزانِ من! اگر کسی معاشرے سے یہ خطرہ مٹ جائے کہ نہ ظلم ہو اور نہ Exploitation (لوٹ کھسوٹ) ہو تو سبحان اللہ صاحب! اس سے بڑی جنت اور کیا ہوسکتی ہے کیونکہ یہاں کہا ہے کہ **لَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا** (20:112)۔ اسے نہ کسی ظالم کے ظلم کا خوف ہوگا اور نہ کسی حق تلفی کرنے والے کی سلب ونہب کا۔ سیاست کے اندر ظلم ہوتا ہے' اس کی وجہ سے یہ چیز ہے۔ ''ہضم'' کا لفظ معیشت کے متعلق ہے۔ Politics & Economics (سیاسیات اور معاشیات) دونوں کے اندر یہ چیزیں آ رہی ہیں کہ سیاست میں ظلم نہیں ہوگا' معیشت میں ''ہضم''[1] نہیں ہوگا یعنی Exploitation (استحصال) نہیں ہوگی۔ ایک اور بات تو اس کے ساتھ بلکہ اسی سانس میں کہنی چاہیے لیکن وہ میں آگے چل کے کہوں گا۔ یہاں کہا ہے کہ یہ نہیں ہوگا کیونکہ **عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ** (20:111) جب اس قسم کی صلاحیت والی جماعت' قوم' پارٹی' انسانیت ساز مقصد کے بروئے کار لانے کے لیے کھڑی ہو جائے گی تو وہاں یہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ نظام زندگی بخش ہے۔ ''حَيّ'' بڑی چیز ہے۔ یعنی یہ زندگی بخش پروگرام ہے جس کے لیے اس قسم کی صلاحیت والی قوم کھڑی ہو جائے' تو اس سے قرآنی معاشرہ تشکیل پائے گا جس میں نہ ظلم ہوگا' نہ کوئی کسی کا مال ہضم کر سکے گا۔

عزیزانِ من! آیئے تھوڑی سی تفصیل سے سمجھیں۔ اس معاشرے کی دو ہی چیزیں ہیں: ظلم نہیں ہوگا' ہضم نہیں ہوگا۔ پہلا یہ ہے کہ ظلم نہیں ہوگا۔ سورۃ الانفطار اور سورۃ الفاتحہ روز دہراتے ہیں: **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** (1:3)۔ ''مالک دن جزا کا'' اس کا ترجمہ ہوگیا۔ ''قیامت کے دن کا مالک'' بھی اس کا ترجمہ کر دیا گیا۔ یعنی اسے دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہاں اِس دنیا میں تو اس کا اقتدار وملکیت وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ وہاں روزِ قیامت ''بیٹھا انتظار کردا پیا اے کہ اچھا کوئی گل نئیں۔ کرلو جو تہاڈا جی کرے۔ کدی تے آئیں گا ناں ساڈی گلی اچ۔''[2] جی! یعنی اس کے اقتدار کا دائرہ وہاں روزِ قیامت ہے' یہاں نہیں ہے۔

عزیزانِ من! کیا پوچھتے ہیں' الدین کے لفظ کا! یہ ایک جامع لفظ ہے۔ **مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ** کا مفہوم یہ ہے کہ دین کا دَور ہے جس میں اقتدار اسی کا ہوگا۔ مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا نظام قائم ہو جائے گا جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔ ان راستہ روکنے والی مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے گا اور اس دَور میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے

---

[1] غضب ونہب' استبدا' ناجائز انتفاع (فائدہ اٹھانا' منافع) یا استحصال (Exploitation)

[2] انتظار کر رہا ہے کہ اچھا کوئی بات نہیں' کرلو جو کچھ تمہیں کرنا ہے' کبھی تو ہماری گلی میں آؤ گے جہاں ہمارا زور چلتا ہے

مطابق ہوں گے۔ یہ ہوگا **ملک یوم الدین**۔

دین کہتے کسے ہیں؟ آخر یہ ہوتا کیا ہے؟

اب سوال یہ ہوا کہ دین ہے کیا؟ قرآن کے الفاظ میں: **وَمَآ اَدۡرٰکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ** (82:17)۔ یقیناً خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ یوم الدین کیا ہے۔ یہ قرآن ہے۔ پہلی ہی سورۃ الفاتحہ میں الدین کی بات ہوئی' پھر سارے قرآن میں الدین الدین آیا۔ یہ سورۃ الانفطار 82ویں سورۃ ہے کہ جس میں کہا ہے کہ **مَآ اَدۡرٰکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ** (17-82)۔ کیا سمجھیں یوم الدین کیا ہوتا ہے؟ تو یہ کون بتائے گا کہ یوم الدین کیا ہوگا؟ **مَآ اَدۡرٰکَ مَا یَوۡمُ الدِّیۡنِ** (18-82) پھر سوچو' سمجھو کہ تمہیں کون بتائے گا؟ کہا کہ ہم بتائیں گے۔ ہمارے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ یوم الدین کیا ہے۔ ترجموں سے بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ عزیزانِ من! سنیے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ جس دَور کے اندر الدین نافذ العمل ہوگا تو نظام الدین قائم ہوجائے گا۔ یہ لفظ سنتے سنتے کان پک گئے۔ سوال یہ ہے حکومتِ الٰہیہ کیا ہوگی؟ دین کی اقامت کیا ہوگی؟ دینی نظام کیا ہوگا؟ قرآن میں ہے کہ کہا کہ اس سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے کہ **مَآ اَدۡرٰکَ** (18-82) تمہیں کون بتائے گا؟ ہم بتائیں گے۔ ہم سے پوچھو کہ یہ کیا ہوگا۔ سنیے عزیزانِ من! **یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا** (19-82)۔ یہ وہ دور ہوگا جس پر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس طرح یہ وہ دَور ہوگا جس میں کسی شخص کا کوئی اقتدار اور اختیار کسی دوسرے شخص پر نہیں ہوگا۔ معاف رکھیے گا مجھے کچھ یوں یاد پڑتا ہے کہ اس دفعہ بھی میں نے یہ آیت ساتھ پیش کی تھی کہ **یَوۡمَ لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا** (19-82)۔ اس دَور میں کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا' کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ اسی لیے محمد اقبالؒ (1877-1938) نے شعر کی زبان میں کہا تھا کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست ❶

---

❶ ''حکیم مریخ'' نے کہا کہ ہمارے ہاں کوئی شخص اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اس لیے کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور جب کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا تو نہ کوئی کسی کا غلام ہوتا ہے' نہ کوئی غلاموں کا آقا۔ حتیٰ کہ نہ یہاں کوئی حاکم ہے اور نہ محکوم۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرما دیئے ہیں' سب اسی کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی انسان کسی انسان پر حکومت نہیں کرتا۔ یہی قرآنی تعلیم کا مقصود و منتہا اور یہی اسلامی دستور و آئین کا ماحصل ولب لباب ہے۔ یہ ہے نقشہ اس معاشرے کا جس کے لیے حضرت علامہ اقبالؒ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ایک قطعہ زمین مل جائے۔ ان کے ذہن میں نقشہ یہ تھا کہ اس قطعہ زمین میں مسلمان قرآنی آئین کے مطابق معاشرہ قائم کریں اور اس معاشرے کی کیفیت یہ ہو جسے انہوں نے مرغدین کے معاشرے کے نام سے تعبیر کر کے جاوید نامہ میں پیش کر دیا۔

وہ جو اقبالؒ [1] نے ''جاوید نامہ'' میں اپنی سیر افلاک کی داستان بیان کی ہے اس میں انہوں نے عالمِ بالا کا تصور اپنے ذہن میں کھینچا تھا کہ وہ نقشہ کیسے ہوگا؟ اس میں مرغدین کہتا ہے کہ گلستانِ دین کا چمن کیسا ہوگا؟ کہا کہ اس میں نہ سائل و محروم ہوگا' نہ غلام و آقا ہوگا' نہ حاکم و محکوم ہوگا۔ خدا نے جو غیر متبدل قوانین عطا فرمائے ہیں' سب انہی کے تابع ہوں گے۔ یعنی:

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

یعنی اس کیفیت میں تو سیدھی سی بات ہے کہ جب حاکم نہیں ہوگا تو محکوم نہیں ہوگا؛ محکوم نہیں ہوگا تو حاکم بھی نہیں ہوگا۔ یہ تصور ہے کہ **يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا** (82-19)۔ کسی کا کسی انسان پر کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ تو کہا کہ کیا پھر وہ جو کمیونزم کا تصور ہے کہ اسٹیٹ باقی نہیں رہے گی؟ تو کیا وہاں پھر ہر سو انتشار و افتراق (Anarchy) ہوگا؟ کیا کوئی کسی شخص پر کوئی اختیار نہیں رکھے گا؟ کیا سارے ہی بے لگام ہو جان گے جس طرح اج کل ساڈے نوجوان منڈے پھردے نیں؟ [2] کیا یہی صورت پیدا ہوگی؟ کیا یہ ہے نقشہ الدین کا؟

یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! اتنی سی بات تو یہ کہی کہ یہ جو باطل کے نظام میں انسان کا اختیار و غلبہ دوسرے انسان پہ ہوتا ہے یہ تو چیز تکریمِ انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ اس لیے کہ قرآن تو کسی نبی کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا فیصلہ یہ ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (3-78)۔ کسی انسان کو اس کا حق

---

[1] حضرت علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت (1930) میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''جاوید نامہ'' کی ترتیب و تدوین میں مصروف تھے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی سیر افلاک کی داستان بیان کی ہے۔ وہ اس سیر میں' فلک مریخ میں ''شہر مرغدین'' میں پہنچتے ہیں۔ جس طرح یہ شہر اور وادیاں تصوراتی ہیں' اسی طرح ان کے نام بھی حضرت علامہ کے خود ہی تراشیدہ ہیں۔ مرغ دین کا نام اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اس سرسبز و شاداب بستی کا نام ہے جس کا نظام' دین کی بنیادوں پر استوار ہے۔ بالفاظ دیگر' حضرت علامہ نے اس میں یہ بتایا ہے کہ اگر دنیا کے کسی خطہ میں دین کے اصولوں پر معاشرہ قائم ہو جائے تو وہاں کی زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ چنانچہ حضرت علامہؒ نے پاکستان کی تجویز ہی اس لیے کی تھی کہ یہاں کے رہنے والے مسلمان اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے مطابق بسر کر سکیں۔ اس لیے جو کچھ انہوں نے ''مرغدین'' کے متعلق کہا ہے' اس سے ان کا تصور اس پاکستان کا معاشرتی نقشہ تھا جو اس زمانے میں ان کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔ چنانچہ اس داستان کا عنوان ہی انہوں نے ''گردش در شہر مرغدین'' تجویز کیا تھا۔

[2] جس طرح آج کل ہمارا نوجوان طبقہ گھومتا پھرتا ہے۔

حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطۂ قوانین' حکومت اور نبوت عطا کر دے [1] اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس طرح قرآن اس بات کو کھول کر بتا دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا...... خواہ خدا اس کو ضابطۂ قوانین عطا کر دے حکومت اس کو مل جائے' نبوت بھی کیوں نہ مل جائے...... کہ وہ کسی شخص سے یہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔

حکومتِ الٰہیہ میں صرف قانون کی حکمرانی ہوگی

'جی'! یہ ہے: يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا (19-82)۔ وہ دَور جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار ہوگا۔ وہاں تو وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19)۔ اختیارات تمام کے تمام قوانینِ خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی' کسی اور کی نہیں ہوگی۔ ہر معاملے کا فیصلہ خدا کے قانون کے مطابق ہوگا' یعنی یہ وہ دَور ہوگا جس میں نہ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا' نہ محتاج۔ اور نہ ہی کوئی کسی مجرم کو اس کے جرم کی پاداش سے چھڑا سکے گا۔ یہ ہوگا یوم الدین' جی! قرآن Anarchy (انتشار) میں بات نہیں چھوڑتا' ساری بات میں قانون کو باقی رکھنا ہے' عزیزانِ من! یہ سارا نقشہ جو چلا آ رہا ہے' اس کی یہ ساری کشمکش جو چلی آئی ہے' وہ صرف اس لیے ہے کہ قانون سازی کا حق کسے ہوگا؟ یہ افلاطون (Plato:c. 428- 347 B.C) سے لے کر یا آپ اس سے بھی پہلے کہہ لیجیے آج تک سیاست میں سارا مسئلہ یہ ہے کہ قانون سازی کا حق کسے ہوگا؟ شکلیں بدلتی چلی جا رہی ہیں' بات In Principle' اصولی طور پر' وہی ہے کہ قانون سازی کا حق انسانوں کو ہی دیا جاتا ہے۔ اس کی شکلیں بدل دیجیے' آخر الامر جمہوریت پہ آ جائے۔ یہاں بھی تو قانون سازی کا حق انسانوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ انسان یہاں سے آگے نہیں گیا۔ قرآن نے آ کے یہ کہا کہ اس سے محکومیت اور حاکمیت کا تصور جاتا ہی نہیں ہے: ایک فرد کا حق ہو یا افراد کی ایک جماعت کو حق ہو' Majority (اکثریت) کو حق ہو' Minority (اقلیت) محکوم ہو جائے گی۔ بادشاہ کو حق حاصل ہو' رعایا محکوم ہو جائے گی۔ تو کہا کہ الدین میں اس کا سوال ہی نہیں۔ قانون سازی کے حق کے لیے انسانوں سے اونچی کوئی ذات ہونی چاہیے اور انسان کے اوپر تو اس کائنات میں خدا ہی ہے' کوئی دوسرا ہے ہی نہیں۔ اس لیے حکومت الٰہیہ میں صرف قوانینِ خداوندی کی حکمرانی ہوگی۔

---

[1] خدا کی طرف سے عطا شدہ ضابطۂ قوانین (کتاب) میں رسول اور اس کے متبعین دونوں شامل ہوتے ہیں کیونکہ وہ کتاب' رسول کی وساطت سے دوسرے انسانوں کو بھی ملتی ہے۔ اس طرح حکومت بھی۔ لیکن نبوت میں نبی کے علاوہ کوئی اور شریک نہیں ہوتا۔ اس لیے کتاب' حکومت' اور نبوت کہنے سے نبی اور غیر از نبی سب آ گئے۔ دیکھیے :90 ;6:90 25:16۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 138)۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک سیاست اور معیشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے

عزیزانِ من! قانون سازی کا حق خدا کو حاصل ہے۔ وہ اس کے اصول دیتا ہے' حدود دیتا ہے۔ ان حدود کے اندر آپ باہمی مشاورت سے اس کے نافذ کرنے کے طریقے تجویز کر سکتے ہیں۔ اصول' قوانین اور قوانین کے حدود آپ متعین نہیں کر سکتے۔ کہا کہ جب یہ چیز نافذ العمل ہوگی تو اسے یوم الدین کہا جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **لَا تَمۡلِکُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَیۡـًٔا ؕ وَ الۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (82:19)۔ ہر شخص' ہر انسان' اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار واقتدار ہوگا۔ تمام کے تمام اختیارات قوانینِ خداوندی کے لیے مختص ہوں گے۔ حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی' کسی اور کی نہیں۔ یعنی نہ کوئی انسان کسی دوسرے کا محکوم ہوگا' نہ محتاج۔ اور نہ ہی کوئی کسی مجرم کو اس کے جرائم کی پاداش سے چھڑا سکے گا۔ یہ ہوگا **یَوۡمِ الدِّیۡنِ** (1:3)۔

عزیزانِ من! سیاست کے تو یہ پہلو ہو گئے۔ اب زیرِ گفتگو چلی آنے والی آیت (20:12) کے اگلے ٹکڑے میں ایک لفظ **هَضۡمًا** ❶ (20:12) ہے۔ کہا کہ اس نظام میں' اس یوم الدین میں' **هَضۡمًا** کی کیفیت بھی نہیں رہے گی۔ ایک ہی صفحہ آگے الٹیے۔ اتفاق سے اس (20:124) میں سیاست اور معیشت کی دو صورتوں کو اکٹھا ہی رکھا ہے اور ہونا ہی ایسا چاہیے۔ ان کا تو چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ جو معیشت کے مفادات ہیں اگر ان کو درمیان سے نکال دیجیے تو سیاست کے لیے کوئی شخص کھڑا ہی نہ ہو۔ پھر تو آپ کے لیے' آپ کی ممبری کے لیے لوگ کہیں گے کہ آپ کی مت ماری ہوئی ہے ❷' عزیزانِ من! سورۃ المطففین کو غور سے سنیے کہ قرآن یہاں کیا بات کر گیا ہے۔ سارا مسئلہ ہی اقتصادیات کا ہے' معیشت کا ہے کہ انسانوں کو ان کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیدیا جائے' حق دیدیا جائے۔ یہ ہے سارا مسئلہ۔ اسی کے حل کے لیے دیانتدارانہ کہیے تو ٹھیک ہے کہ علمائے معاشیات میں کچھ بددیانتی سے Exploitation' انتفاع ❸ یا استحصال ❹ یا سلب ونہب ❺ ہوتی چلی گئی۔

---

❶ هَضَمَ فُلَانًا کے معنی ہیں: اس نے فلاں آدمی کو دبا یا اور اس کا حق غصب کر لیا۔ هَضۡمًا کے مفہوم میں ناجائز انتفاع یا استحصال (Exploitation) کا تصور موجود ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، ص: 1762)۔

❷ آپ کے تو ہوش وحواس ہی ٹھکانے نہیں ہیں۔

❸ فائدہ اٹھانا' منافع' فائدہ۔

❹ حاصل کرنا۔

❺ چھینا جھپٹی۔

مزدور کی مزدوری کون متعین کرتا ہے اور کس طرح کرتا ہے؟

مزدور کی مزدوری متعین کرنے کے اس سلسلہ میں جو کچھ دیانتداری سے بھی ہوا ہے' وہ بھی مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا۔ Wages (اجرت) تک کا تعین صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہے' میں سنایا کرتا ہوں کہ آخر میں بات آ کے Wages (اجرتوں) تک پہنچی ہے اور آجر بڑا مطمئن ہے کہ ٹھیک ہے جی! جو مزدوری طے ہوگئی اور جب مزدور کو وہ مزدوری دے دی جائے تو وہ عدل ہو گیا۔ اس آجر کو تو اس کا حق دے دیا کہ اس نے مزدوری طے کر دی۔ یہ کس نے طے کی؟ کیا کبھی آپ نے اس پر بھی غور وخوض کیا؟ جی! صبح کے وقت اٹھ کے دس بیس مزدور' روٹی کی تلاش میں' مارکیٹ کے چوراہے پر آ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر جنہیں ضرورت ہوتی ہے' انہیں کام پہ لگانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ وہ دیکھ لیتے ہیں کہ اگر کوئی دس بیس اکٹھے بیٹھے ہوں تو ٹھیک ہے۔ کہتے ہیں کہ بھئی! کی دیہاڑی میاں؟ بھئی' توں دس اوئے' کنّی دیہاڑی ❶۔ یہ اجرت طے نہیں کر رہا ہوتا' یہ انہیں خرید رہا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! شکل بدلتی ہے۔ وہ جو نخّاس ❷ میں غلام نیلام ہوتا تھا اور یہ آج آپ کی مارکیٹ میں جو مزدوروں کے ساتھ آپ جا کر کرتے ہیں' ذرا بتائیں کہ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس میں کون راضی ہوتا ہے؟ گل فیر پنجابی محاورے اچ ای آوندی اے۔ ❸ مشکل یہ ہے کہ وہ میری مادری زبان ہے۔ میں نے اپنی والدہ سے یہ چیزیں سنی ہوئی ہیں۔ انہیں بڑے محاورے یاد تھے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت دے۔ محاورہ پنجابی میں ہے: پاہ کن وگاڑیا؟ رات دیاں پوکھیانیں۔ ❹ عزیزانِ من! اس کا کیا ترجمہ ہوگا اور کیا مفہوم ہوگا؟ اس نے آپ کی Economics (معاشیات) کا سارا مسئلہ حل کر دیا۔ بھلا بتاؤ تو سہی کہ ان مزدوروں میں کون اس کے ساتھ اٹھ کے چلا آئے گا؟ کتنے میں جائے گا؟ اتنے میں ہی جتنے یہ دے گا جسے پتہ ہے کہ گھر میں بچوں کے لیے آٹا نہیں ہے۔ پاہ کن وگاڑیا؟ رات دیاں پوکھیاں نیں۔ ❹ Wages (اجرت' مزدوری) مارکیٹ میں یوں طے ہوتی ہیں۔ معاملہ انفرادی ہو' خواہ آپ کے ہاں کارخانے کے اندر مزدوروں کا ہو' خواہ روس کی کمیونزم کے اندر ہو' Wages' اجرتیں' طے ہوتی ہیں اور طے ہوتی ہیں ان کے ہاتھوں جو کام کرانے والا ہے' خواہ وہ فرد ہو' اور خواہ وہ بورڈ کی شکل میں ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اجرتیں' یہ Wages' کیسے طے ہوتی ہیں؟

---

❶ میاں! کتنی اجرت فی یوم ہے؟ ارے بتاؤ' تمہاری اجرت کیا ہے؟

❷ منڈی' چوپایوں کا بازار' جہاں نیلام ہوتا ہے۔ یہاں اشارہ مصر کے اس بازار کی طرف ہے جہاں غلام نیلام ہوتے تھے۔

❸ بات پھر بھی پنجابی محاورے میں آتی ہے۔

❹ نرخ' اجرت' بھاؤ' کس نے بگاڑا؟ اف جورات کے بھوکے تھے' انہوں نے بھاؤ (اجرت) ہی بگاڑ کر رکھ دیا۔

خرابی کی اصل وجہ کسی غلام کا آقا کو زیادہ کما کے دینا ہے

عزیزانِ من! حکمائے یونان میں سے ہی غالباً ایک شخص نے کہا تھا کہ انسانیت کی تاریخ میں وہ دن بڑا ہی سیاہ تھا' جس دن کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر دیا' جو اس سے زیادہ تھا جتنا اس غلام پہ خرچ آتا تھا۔ بس یہ ہے سارا مسئلہ! یعنی اگر مزدور یا غلام اتنا کما کر دے جتنا اس پہ خرچ آجاتا ہے تو کوئی بھی اس کو کام پہ نہ لگائے' اسے غلام ہی کوئی نہ بنائے۔ اوتے چٹی پے جانی ہوئی۔ ❶ یہ اقتصادیات کا بڑا بنیادی مسئلہ ہے کہ مزدور اتنا کما کر دے' جو اس سے زیادہ ہو جتنا کہ اس آجر کو دینا ہوتا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری کی بنیادی اینٹ کا مرکزی کردار

آیئے' ذرا آگے چلیں۔ مزدور کے ساتھ Wages' اجرتیں طے ہوتی ہیں۔ فیکٹری اور مل کا مالک یہ دیکھ لیتا ہے کہ اس میں کمانے کی اتنی صلاحیت ہے۔ تو کہتا ہے کہ ہاں بھئی! ٹھیک ہے' دس روپے دیں گے' آٹھ گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ ٹھیک ہے؟' ٹھیک ہوگئی یہ بات؟ یہ کام ہوگا' آٹھ گھنٹے کرنا ہوگا' دس روپے تجھے دیئے جائیں گے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ معاملہ بڑا ہی حق وانصاف کے مطابق ہو رہا ہے: وقت متعین ہے' پیسے متعین ہیں' کام متعین ہے۔ اب اور کیا چاہیئے۔ اور یہ مزدور رضامندی سے اٹھ کے چلا جاتا ہے۔ وہ آجر دیکھ لیتا ہے کہ اس نے چار گھنٹے میں دس روپے کے مقابل اتنا کام کر دیا۔ یہ جو باقی چار گھنٹے وہ کام کر رہا ہے' اس چار گھنٹے کی محنت کا اس کو معاوضہ کچھ نہیں مل رہا۔ یہی تو چار گھنٹے کی اس کی محنت ہے۔ اس پہ تو نظامِ سرمایہ داری قائم ہے۔ اگر یہ اس کو آٹھ گھنٹے کی محنت میں دیدے جتنا اس نے کمایا ہے' کما کر دیا ہے' تو کہدو کہ اس سے تو کارخانہ ہی بند ہو جائے گا۔ یہ چار گھنٹے ہیں۔ یہ [جسے آپ انصاف کہہ رہے ہیں] یہ تو Wages' معاوضے' اجرت کی رو سے انصاف ہے۔ یہ انصاف تو وہ پہلے چار گھنٹے میں ہوتا ہے۔ یہ جو اگلے چار گھنٹے ہیں' ان میں وہ محنت کرتا ہے۔ اس کا معاوضہ اسے نہیں ملتا۔ اس میں اگر وہ آٹھ کی بجائے سات گھنٹے کام کرے تو اس کا ٹینٹوا دبا کے' یہ اتنے پیسے اس میں سے کاٹ لیتا ہے۔ یعنی اس کے چار گھنٹے کی محنت میں سے وہ آجر ایک گھنٹے کی محنت کاٹ لیتا ہے۔ کم کام کیا' پہلے چلا گیا تھا تو کم دیتا ہے۔ یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ صاحب! چار گھنٹے تو میں نے اتنا کام کر کے دیدیا۔ بعض کام ایسا ہوتا ہے کہ جس میں گنا جا سکتا ہے' ماپا جا سکتا ہے کہ میں نے کتنا کر کے دیدیا۔ وہ کہتا ہے کہ باقی چار گھنٹے کا تو آپ نے مجھے کچھ دیا ہی نہیں۔ وہ کہے کہ تم سے تو یہ بات طے ہو چکی ہے۔ "طے ہوئی بات"۔ سمجھ لیا نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد۔ تفصیل میں جاؤں تو اس کے اندر کئی دن' کئی مہینے لگ جائیں۔ وہ لم ❷ یہی ہے کہ پاہ وگاڑدے نیں، رات دے پوکھے۔ ❸ یہ جو پوکھارات دا ہونا ہے ❹ قرآن کا معاشی نظام سب سے پہلی یہ چیز مٹاتا ہے۔ انسان کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہو جائے۔

---

❶ اس سے تو نقصان ہو جانا ہوتا ہے۔

❷ حکمت' Rationale' Why of it

❸ رات کو بھوکے سونے والے بھاؤ بگاڑ دیتے ہیں۔

❹ یہ جو رات کا بھوکا ہونا ہے۔

مطففین کون ہوتے ہیں؟

اب اگلی چیز یہ آ گئی کہ صاحب! ہم یہ سارا معاملہ انصاف کی روسے، حق کی روسے طے کرتے ہیں اور ٹھیک ٹھیک پیسے دیدیتے ہیں۔ سنیے! یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ کیسے طے ہوتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ وَیۡلٌ (83:1)۔ تباہی ہے، بربادی ہے۔ یہ اس سورۃ کا پہلا ہی لفظ ہے، جس میں کہا ہے کہ اس نظام کا انجام ایک تباہی اور بربادی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس نظام کے لیے تباہی و بربادی ہے؟ کہا کہ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ (83:1) تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے ہے۔ یہاں طفیف کا لفظ ہے۔ اس کا ''ط ف ف'' مادہ ہے۔ مجھے معنی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے تو خود ہی آگے بتایا کہ اَلَّذِیۡنَ (83:1) وہ لوگ ہیں، تو ہم یہیں سے سمجھ لیں کہ مطففین سرمایہ کار ہیں، سرمایہ داری نظام کے علمبردار ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون ہوتے ہیں؟ عزیزانِ من! سنیے کہ وہ کون ہوتے ہیں۔ یہ چودہ سو سال پہلے کی بات ہورہی ہے۔ آپ اس دور کے علم الاقتصادیات کی کسی کتاب کو دیکھ لیجیے، اس میں آپ کو یہ چیز ملے گی کہ اَلَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ (83:2)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دوسروں سے اپنے واجبات پورے پورے لیے جائیں۔ یہ ایسا معاہدہ کرتے ہیں کہ جب انہیں لینا ہوتا ہے تو وہ ٹھیک اپنے ماپ تول کے مطابق لیتے ہیں۔ اس معاہدے میں وہ آٹھ گھنٹے جان مار کے محنت کرتا ہے تو جب اِسے ان سے لینا ہوتا ہے تو یہ ترازو میں ڈنڈی ماردیتے ہی۔ اس کے لیے ان کا انداز یہ ہوتا ہے کہ یہ وَاِذَا کَالُوۡھُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ (83:3)۔ جب ان کے واجبات کا وقت آئے تو ترازو میں ڈنڈی ماردی۔ محنت کرنے والوں کو کم از کم دیا جائے اور خود زیادہ سے زیادہ کمایا جائے۔ لیکن جب یہ بات مقرر کرتے ہیں کہ اس کو کتنا دینا چاہیے، تو اس میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ لیتے ہیں تو یَسۡتَوۡفُوۡنَ (83:2) پورے پورے واجبات لیتے ہیں اور ماپ تول کر لیتے ہیں: آٹھ گھنٹے یہ کام اس طرح کرنا ہوگا، ایک منٹ کی فرصت نہیں، پانی پینے تک کی فرصت نہیں، مہلت نہیں۔ اور جب اس کو دینا ہوتا ہے تو پہلے سے یہ سوچ لیتے ہیں کہ یُخۡسِرُوۡنَ (83:3) اسے اتنا نہ دیا جائے جتنا یہ کرے۔ اس میں تو ایک رمز اور بھی آرہی ہے اور وہ ہے ماپ اور تول کی ہے۔

عزیزانِ من! قرآن عجیب الفاظ میں کہتا ہے کہ اِذَا کَالُوۡھُمۡ (82:3)۔ یہ چیزوں ہی کی نہیں بلکہ خود انسانوں کی قیمت متعین کرتے ہیں۔ یعنی یہ اس کی چیزوں کو نہیں بلکہ یہ اس شخص کو ماپتے ہیں تو اَوۡ وَّزَنُوۡھُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ (83:3)۔ اسی ماپ کے اندر ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ یہ ''کَالُوۡھُمۡ'' ہے۔ یعنی دیکھ لیتے ہیں کہ اس کی ضرورت کتنی ہے۔ رات دا بھوکھا ہیگا ناں۔ [1] دیکھ لیتے ہیں کہ اس کی کام کرنے کی صلاحیت کتنی ہے۔ کَالُوۡھُمۡ (83:3) یہ اس انسان کو ماپتے ہیں۔ وَّزَنُوۡھُمۡ (83:3) اس انسان کا وزن کرتے ہیں۔ اسے ماپتے ہیں، تولتے ہیں کہ اے ہے کِنّے دا، [2] تو پھر کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ یُخۡسِرُوۡنَ (83:3) ڈنڈی مارتے ہیں۔ یُخۡسِرُوۡنَ

---

[1] ساری رات کا بھوکا ہے۔

[2] یہ کس قدر و قیمت کا ہے۔

ڈنڈی مارنے کو کہتے ہیں۔ بس کہا کہ یہ نظامِ طفیف ہے۔ یہ وَیۡلٌ (83:1) ہے' تباہ ہو کے رہے گا' آخر الامر نہیں چلے گا۔ وہاں (120:105) میں بات آئی تھی کہ یہ ''پہاڑ'' جو اتنے اتنے بڑے ہیں' قوت وثروت کے مالک نہیں رہیں گے' بلکہ وہ نظام آئے گا جس میں ظلم اور حزن نہیں رہے گا۔ یہاں کہا کہ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ o لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (83:4-5)۔ کیا یہ لوگ اس زعمِ باطل میں مبتلا اور اس خیالِ خام میں مدہوش ہیں کہ یہ نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسا ہی رہے گا' اس کو کوئی بدل نہیں سکے گا؟ ان کا یہ فریبِ نفس ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ جن لوگوں کو انہوں نے یوں اقتصادی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے' وہ انہیں راستے سے ہٹا کر آزادی حاصل کر لیں گے۔ اور اس طرح وہ انقلابِ عظیم واقع ہوگا۔ عزیزانِ من! ''بعث'' کے معنی ہوتا ہے: کسی کام میں' پروگرام میں' جو رکاوٹیں آ رہی ہوں' انہیں راستے سے ہٹا دینا' ان رکاوٹوں کو ہٹا دینا۔ کہا کہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم نے اتنی رکاوٹیں پیدا کر دی ہوئی ہیں' انہیں کوئی ہٹا ہی نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! وہ ملک میں ان لوگوں کی Majority (اکثریت) کو دھندے کے لیے رکھ لیتے ہیں جنہیں ہر وقت روٹی کا ہی دھندا رہے' کسی اور کام کی طرف سوچنے کی فرصت ہی نہ رہے۔ پورا ای ناں پڑے اوناں دا۔ ❶ ٹھیک ہے کہ اجرت ودھا دیو تھوڑی تنخواہ ودھا دیؤ تے ایدروں قیمتاں ودھا دیو۔ ❷ یہ ہوتی ہیں اس کے راستے میں رکاوٹیں۔

کسی نظامِ کہنہ کے مرض کا بہترین علاج انسانیت کے اجتماعی طور پر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے میں مضمر ہے

یہاں کہا ہے کہ یہ سرمایہ دار اطمینان کر لیتے ہیں کہ کوئی بات نہیں' ان رکاوٹوں کو کوئی نہیں ہٹا سکتا' جب کہ قرآن نے اپنے ہاں یہ کہہ رکھا ہے کہ یہ رکاوٹیں ہٹیں گی' یہ راستے سے دُور ہونگی۔ کہا سوال یہ تھا کہ جی! یہ رکاوٹیں کب دُور ہونگی؟ جواب دیا کہ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (83:5)۔ جس دور میں یہ عظیم انقلاب واقع ہوگا' اس وقت یہ رکاوٹیں دُور ہونگی۔ یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ (83:5) جس دن عالمگیر انسانیت خدا کا نظامِ ربوبیت قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی' یہ رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ ایسے ہی ذہن میں سوال ابھرا کہ کاہے کے لیے عالمگیر انسانیت اٹھ کھڑی ہوگی؟ کیا فساد کرنے کے لیے؟ کیا کرسیاں اور شیشے توڑنے کے لیے؟ کیا آگ لگانے کے لیے؟ کہا کہ بالکل نہیں۔ یہ اس کام کے لیے نہیں اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہ نظامِ ربوبیت کے اٹھ کھڑی ہوگی۔ یعنی یہ النَّاسُ' یہ عوام' اٹھ کھڑے ہونگے تاکہ نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے۔

لفظ الحجارۃ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! اس سے پیشتر جس طرح جبال کا لفظ ''پہاڑ'' بمعنی اکابرین کے لیے آیا تھا یعنی وہ اکابرین جو پہاڑ کی طرح محکم

---

❶ ان کا خرچ ہی پورا نہ ہو۔

❷ اجرت بڑھاؤ' تھوڑی تنخواہ بڑھاؤ تو ادھر سے قیمتیں بھی بڑھا دو۔

ہیں' اُسی طرح قرآن کریم میں اَلْحِجَارَۃُ (2:24) کا لفظ مجازی معنوں میں آیا ہے۔ اَلنَّارُ الَّتِیْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (2:24)۔ اس نار میں تمہارے عوام اور خواص' متبعین (Followers) اور چالاک لیڈر جا گریں گے۔ یہاں جو اَلْحِجَارَۃُ ہے وہ بڑے بڑے لیڈروں کے لیے ہے۔ عربی زبان میں یہ لوگ ان ''چالاک لیڈروں ❶ کو'' اَلْحِجَارَۃُ کہتے ہیں۔ وہ جو قرآن میں جہنم کے متعلق آیا ہوا ہے کہ جہنم کا ایندھن وہ ''اَلنَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ ہونگے تو وہاں بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اَلنَّاسُ تو انسان ہوگئے اور اَلْحِجَارَۃُ لغوی معنی کے لحاظ سے پتھر ہوگئے۔ تو پھر پتھر جہنم کا ایندھن کیسے ہونگے؟ اُوتے بلدی ہوئی اگ اتے پتھر سٹ دیوتے بجھا دیندا ہیگا اے۔ ❷ اور پھر یہ پتھر جہنم کا ایندھن کیوں؟ ان پتھروں نے کیا جرم کیا ہے کہ انہیں جہنم میں ڈال دیا جائے؟

عزیزانِ من! یہ دراصل کوئی اور بات ہے۔ یہ جہنم کا ایندھن ہونگے جسے قرآن اَلْحِجَارَۃُ کہتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن جبال کہتا ہے: یہ اَلْحِجَارَۃُ بڑے بڑے لیڈر ہیں اور جسے اَلنَّاسُ کہتے تھے' یہ عوام اور متبعین (Followers) ہوتے ہیں۔ یہاں قرآن نے کہا کہ جس دن یہ الناس اٹھ کھڑے ہونگے فساد کے لیے نہیں بلکہ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (83:6) عالمگیر ربوبیت انسانیہ کی خاطر' اس دن یہ تباہ ہو جائیں گے۔ اور یہی ہے جو کہا تھا کہ وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ (83:6)۔ خدائے حی و قیوم کے (اس زندگی بخش) نظام میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود ہو جائے گی۔ وہ اس نظام کے استحکام کے لیے بطیبِ خاطر اٹھ کھڑے ہوں گے اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ کریں گے۔ یہ جو انسانوں کی مضمر صلاحیتیں ہیں' ابھریں گی۔ پھر یہ انسانیت ساز پروگرام کے لیے جھکیں گی اور اس دن یہ جتنے بڑے بڑے ''پتھر'' چالاک و ہوشیار اکابرین ہیں' ''حجارہ'' (چالاک لیڈر) ہیں' وہ بجھے ہوئے آگ کے کھنگر بن کے رہ جائیں گے اور ان کے برعکس جو بھی عملِ صالحہ کرے گا' ان باتوں پہ یقین کرے گا' اسے نہ پھر ظلم کا خدشہ ہوگا' نہ Exploitation' یا استحصال کا یا سلب و نہب کا اندیشہ ہوگا۔

قرآنِ کریم نے ہر بات کو واضح سے واضح تر انداز میں پیش کیا ہے

عزیزانِ من! سنیے! قرآن میں فرعون اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی کشمکش کی بات ہو رہی ہے۔ اور اسی طرح اِدھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت مومنین کے درمیان اس ٹکراؤ کی بات ہو رہی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ کَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (20:113) یہ

---

❶ تاج العروس اور محیط المحیط میں لکھا ہے کہ حَجَرٌ ایسے آدمی کو بھی کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو۔ امام راغب اصفہانی (متوفی قریب 502ھ) نے اپنی قرآنی الفاظ کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہوں جیسے پتھر۔ جن میں سمجھنے سوچنے اور اثر پذیری کی صلاحیت باقی نہ رہی ہو۔ جن کی صلاحیتوں کی نشوونما رک گئی ہو اور الناس کے معنی ہوں گے عام لوگ جو بڑے بڑے لیڈروں کے پیچھے چلتے ہیں اور حجارۃ کے معنی ہوں گے وہ چالاک اور ہوشیار لوگ جو لیڈر بن کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں۔

❷ اگر جلتی آگ پر پتھر پھینک دیں تو وہ آگ ہی بجھا دیتا ہے۔

ہے وہ عظیم مقصد جس کے لیے ہم نے اس قرآن کو اس قدر واضح انداز میں نازل کیا ہے۔ یعنی یہ قرآن ہم نے اس مقصد کے لیے نازل کیا ہے، جو عربیًا ہے یعنی بڑا ہی واضح ہے۔ قرآن میں کوئی گُپت وِدیا ❶ نہیں ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس کے اندر بیان نہیں ہوئی۔ خود "لفظ" عربی کے معنی ہی ہوتے ہیں: واضح، لاریب، جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور "عربی" کو بھی قرآن "مبین" کہتا ہے۔ ایک تو عربی کے لفظی معنی "واضح ہونا" ہوتے ہیں، اور پھر "مبین" ہے یعنی نہایت واضح ہے اور دوسرا یہ کہ وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ (20:113) اور اس میں مختلف انداز سے زندگی کی غلط روش کے نتائج وعواقب کو بیان کر دیا ہے تا کہ لوگ اس روش سے بچ سکیں۔ یوں سمجھو کہ ہم نے سمجھانے کے لیے لوٹا لوٹا کے، پھیر پھیر کے، یہ باتیں کہی ہیں۔ اس میں دو چیزیں ہونگی۔ ایک تو "وعید" ہے۔ وعید تو باطل نظام کے جرائم ہیں، ان کے تباہ کن نتائج وانجام ہے، ان کی بربادیاں ہیں۔ یہ ہے "وعید" جس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ رسول آکر مخاطبین کو (Warn) یعنی آگاہ کرتا ہے کہ یہ جو تمہارا غلط نظام ہے، یہ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ (83:1) ہے۔ یعنی اس میں بتایا ہے کہ تاجرانہ ذہنیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ مطففین کی وجہ سے یہ وعید ہے اور یہ وعید اس نظام کے لیے تباہی ہے اور اگلی چیز ہے کہ پھر اس سے بچیں تا کہ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (20:113)۔ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں بیدار رہوں۔ سوال یہ ہے کہ انہیں کیا ملے گا؟ کہا کہ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا (20:113)۔ انہیں سربلندی اور سرفرازی عطا ہو جائے گی۔

لفظ ذکر اور یحدث کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہاں پھر "ذکر" کی وہی بات ہو جاتی ہے کہ ان کی بڑی باتیں ہونگی اور یہ "ذکر" رات کو سونے نہیں دیتا۔ خدا کرے کسے ایسے محلے اچ تسی نہ ہوؤ جتھے ذکر دی مسجد ہووے، تے لاؤڈ سپیکر ہون چار چار لگے ہوئے، جی! سارے معاشرے کے لاؤڈ سپیکر جو ہیں ان پہ دفعہ 144 ہے لیکن ایتھے دو ہور لگ جاندے ہیگے۔ ❷ یہاں قرآن نے کہا کہ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا (20:113)۔ انہیں سربلندی اور سرفرازی عطا ہو جائے۔ صاحب! یہ "حدث" عجیب لفظ ہے اس کا مادہ "ح د ث" ہے۔ اس کے دو معنی نکلیں گے۔ ایک تو سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کا برومند ہو جانا، اور دوسرا شرف اور رفعت اور بلندی مل جانا۔ ذکر کے معنی شرف ہیں، مجد ❸ ہیں۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ قرآن ہم نے کسی اپنے مقصد کے لیے نہیں نازل کیا۔ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (43:44)۔ یہ قرآن جس کے متعین کردہ راستے پر تو چل رہا ہے، تیرے اور تیری قوم (متبعین) کے لیے بڑے شرف اور عظمت کا موجب ہے۔ اس قرآن میں جو کچھ بھی دیا گیا ہے، اس سے

---

❶ پوشیدہ علم، چھپا ہوا فن

❷ خدا کرے کہ آپ کسی ایسے محلّہ میں نہ رہتے ہوں جہاں ذکر کی مسجد ہو، اور چار چار لاؤڈ اسپیکر لگے ہوں۔ جی! جو معاشرے کے لاؤڈ اسپیکر ہیں، ان پہ تو دفعہ 144 لیکن یہاں دو دو مزید لگائے جا رہے ہیں۔

❸ شرف، عظمت، فوقیت، عزت

مقصد تیری اور تیری قوم کی بڑائیاں اور سرفرازیاں ہیں' اس سے مقصد سرفرازیاں' رفعتیں' بلندیاں' اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیتوں کا برومند ہوجانا ہے۔

قرآنِ حکیم کو نازل کرنے کا بنیادی مقصد و مدعا انسان کو اس کے مقام سے آگاہ کرنا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ سربلندی اور سرفرازی عطا کرنے کے لیے ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے۔ باقی رہا یہ کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ تمہارے مدمقابل اتنے اتنے بڑے اکابرین ہیں' تو ہوا کریں۔ ہم نے اس قرآن کو اس قدر واضح انداز میں نازل کیا ہے اور اس میں مختلف انداز سے زندگی کی غلط روش کے نتائج وعواقب کو بیان کر دیا ہے تاکہ لوگ اس روش سے بچ سکیں۔ اس میں جو تاریخی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں' ان سے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے مقابلے میں کون ہے؟ **فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ** (20:114)۔ اس طرح یہ لوگ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیں کہ قوانین خداوندی کے ساتھ وابستہ رہنے سے کس طرح غلبہ وقوت اور سربلندی و سرفرازی حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ یہ جس خدا کے قوانین ہیں وہ شاہنشاہِ حقیقی ہے۔ بڑی عظمتوں کا مالک ہے۔ اس طرح یہ برتری اس کے لیے ہے جسے اللہ کہتے ہیں' جو الملک الحق ہے' ویسے الملک تو ملوکیت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ لفظ بادشاہ کے لیے بھی ہے اور صاحبِ اقتدار کے لیے بھی یہی ملک کا لفظ ہے۔ لیکن یہاں قرآن نے ایک لفظ سے فرعون میں اور محمد رسول اللہؐ میں واضح فرق کر دیا۔ یعنی ملک الحق وہ اقتدار ہے جو حق پر مبنی ہو۔ خدا کا اقتدار حق پر مبنی ہے۔ اسے ہم قادرِ مطلق کہتے ہیں' اسے اقتدارِ اعلیٰ کا حامل کہتے ہیں۔ وہ اپنے متعلق بھی یہ کہتا ہے کہ یہ سن لو: ایک اقتدار فرعون کا بھی ہوتا ہے؛ ہمارے اقتدار کے متعلق یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ کچھ دھاندلی کے لیے اقتدار ہے۔ یہ تو **اَلْمَلِكُ الْحَقُّ** (20:114) ہے' حق پر مبنی ہے حالانکہ یہ جو **فَتَعٰلَى اللّٰهُ** (20:114) ہے' یہ تو خدا کے لیے ہے۔ لیکن نہیں' اس نے مومنوں کے لیے کہا ہے کہ **اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ** (3:38)۔ تمہیں یہ غلبہ واقتدار حاصل ہو جائے گا لیکن شرط یہ ہے کہ **اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** (3:138) تمہیں قوانینِ خداوندی کی صداقت پر پورا یقین ہو اور تم قوانینِ خداوندی کی اس روش پر قائم رہو۔ صرف نمازیں پڑھنے اور بغیر سوچے سمجھے تلاوت کرنے سے یہ غلبہ واقتدار حاصل نہیں ہوگا۔ اگر واقعی تم اس قرآن کے لیے مومن بن جاؤ گے تو پھر یہی علو مرتبت' یہ غلبہ' یہ تسلط' تمہیں حاصل ہو جائے گا حالانکہ یہ یہاں خدا کے لیے بتایا گیا ہے۔ ''خدا کے لیے ہے'' کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں کہ جو قوانین اس نے بنائے ہیں ان کے مطابق چلنے سے یہ کیفیت حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ **اَلْمَلِكُ الْحَقُّ** (20:114) میں الحق قرآن کے لیے آیا ہے۔ یعنی اپنے اقتدار کو اس کے مطابق استعمال کرنے سے یہ غلبہ واقتدار حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اقتدار کو حکومتِ خداوندی' حکومتِ الٰہیہ کہیں گے۔ قرآن کے دیئے ہوئے اصول وقوانین کے مطابق جو اقتدار استعمال کیا جائے' وہ مبنی علی الحق ہوگا اور اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ ظلم رہے گا' نہ حزن اور تمہیں شرف اور سرفرازیاں حاصل ہونگی۔

حکومتِ الٰہیہ کی تکمیل، نبی اکرمؐ کی خواہش اور قرآنِ حکیم کی رہنمائی

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے حکومتِ خداوندی کی تشکیل و تکمیل کے لیے ایک پروگرام بھی دیا ہے۔ درس کا وقت تو پانچ ہی منٹ باقی بچا ہے لیکن چونکہ اس آیت کے ساتھ اس کا متصل حصہ جزولاینفک ہے لہٰذا مجھے بتانا ہی چاہیئے، بات بڑے کام کی ہے اور دُور کی کہی ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ صاحب! حکومتِ خداوندی کی تشکیل و تعمیل کا یہ پروگرام کب ہوگا؟ آپؐ کی مکہ کی زندگی کے تیرہ برس موانعات و مشکلات میں بسر ہوئے۔ آپ کو یاد ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ آپؐ آخر الزمان نبی ﷺ ہیں جن کے بعد کسی اور نبیؐ نے آنا ہی نہیں ہے۔ آپ کی تو قیامت تک نبوت پھیلی ہوئی ہے۔ نبوت کا تیئس سال کا سارا عرصہ ہے۔ اس میں تیرہ سال مکہ کی زندگی میں گزر گئے۔ یہ نبوت کی کل زندگی کا قریباً 60% ہے۔ اب اس کے بعد مدینہ کی زندگی آئی۔ اس میں وہ جنگیں شروع ہوئیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ساری عمر اپنے مقصد کے حصول میں جانکاہ مشقتیں اٹھاتے گزر گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ کسی وقت حضور ﷺ کے قلبِ مطہر میں حسین و معصوم سی آرزو اُبھری۔ قرآن میں سورۃ الرعد کی آیت (13:40) اس کی غماز ہے۔ یہ خود نبی اکرم ﷺ کے دل میں بیدار ہونے والی ایک مقدس آرزو تھی کہ بارالٰہی! کیا میں اپنے مقصد کو اپنی آنکھوں کے سامنے حاصل ہوتے دیکھ سکوں گا یا میری زندگی اسی تگ و تاز میں گزر جائے گی؟ یا اللہ! میری ساری زندگی اسی کشمکش میں ہی گزر جائے گی، کیا میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گا کہ وہ معاشرہ میرے سامنے متشکل ہو کے آجائے؟ اس آرزو میں جی چاہتا ہے کہ وہ معاشرہ میرے سامنے اسی طبعی حیات میں متشکل ہو کر سامنے آجائے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی مقدس آرزو ہے۔ ہر ایک کا یہی جی چاہتا ہے۔ یہ زمیندار حق و صداقت پر کام کر رہا ہے۔ اس نے اس کے قانون کے مطابق فصل بوئی ہوئی ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ میرے سامنے یہ فصل پکے اور دانے گھر آئیں۔ عزیزانِ من! یہ آنا چاہیے۔ اس وقت تک تو یہ سب کچھ غیر محسوس ہے۔ ضمیر کائنات میں پہلو بدل رہا ہے۔ دل میں اس طرح کی آرزو کا پیدا ہونا لازمی امر ہے کہ "کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں"۔ [1] یہ حقیقت بصورتِ آرزو دل میں ابھری۔ میں کہا کرتا ہوں، عزیزانِ من! ہمارا، آپ کا، سب کا، جی یہ چاہتا تھا۔ یہ رسول ﷺ، یہ کہنے والا، عمر کے آخری حصے میں ہے، خدا سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تو اتنا لمبا عرصہ گزارا، مجھے بھی کچھ دکھا دے۔ لیکن قرآن اس مقام پہ ایک غیر متبدل قانون سامنے لاتا ہے کہ انسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر خدا اپنے قوانین کو بدلا نہیں کرتا۔

ذاتِ خداوندی کے غیر متبدل قانون انسانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر بدلا نہیں کرتے

عزیزانِ من! خدا کہتے ہی اسے ہیں جو جذبات سے بلند ہوتا ہے۔ جذبات کی بات، میرے، آپ کے، دل میں آئی ہے۔ اللہ نے کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اور پھر اس کے ہاں سے جواب آیا کہ **فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَ عَلَیۡنَا الۡحِسَابُ** (13:40)۔

---

[1] کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں، مری جبینِ نیاز میں   (اقبالؒ: بانگ درا، ص-294)

تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ دیکھیں کہ ہمارے قانون کے مطابق نتائج کب ظہور میں آتے ہیں۔ اسے پھر سمجھ لو کہ تیرے ذمہ صرف یہ بات ہے کہ اس کو پھیلاتے چلے جاؤ' یہ ہم نے دیکھنا ہے کہ ہمارے قانون کے مطابق فصل کے پکنے کا کب وقت آتا ہے؛ تمہاری اس آرزو کی خاطر ہم کبھی اپنا قانون نہیں بدل سکتے ❶ کہ گندم نے چھ مہینے کے بعد اگر پکنا ہے تو تمہارے بچوں کی بھوک کی خاطر' اسے تین مہینے کے بعد پکنے میں بدل دیں' ہمارا قانون نہیں بدلا کرتا۔ **عَلَيْكَ الْبَلَاغُ** (13:40) تیرا کام تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ تم اس غم میں کیوں گھلے جا رہا ہے؟ یوں لگتا ہے کہ **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ** (26:3)۔ (اے پیغمبر!) شاید تم اس رنج و غم میں اپنی جان ہی کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں میں سے کیوں

---

❶ اس سلسلے میں پرویزؒ کا ایک واقعہ خود انہی کے الفاظ میں سنیے: ''اکثر لوگوں کو اس پر تعجب ہوا ہے کہ میری اور قائداعظمؒ کی پوزیشن میں اس قدر بعد کے باوجود وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے مجھے ان سے اس قدر قُرب حاصل تھا۔ میرے اس زمانے کے قریبی احباب تو اس راز سے واقف تھے لیکن میں نے خود اس کا ذکر بہت کم کیا ہے۔ میرے اس قُرب کی وجہ تھی: ان کا قرآنی ذوق۔ مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں پہلے سے وقت لیے بغیر' ان کی فرصت کے اوقات میں حاضرِ خدمت ہو جایا کروں۔ میں جب حاضر ہوتا' پیش پا آمدہ معاملہ کے بعد' قرآن کریم کے کسی نہ کسی اہم مقام پر بات شروع ہو جاتی۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ ذرا سے نکتے سے پوری کی پوری بات فوراً سمجھ لیتے تھے۔ یہ غالباً مارچ 1947 کا ذکر ہے کہ ایک نشست میں' میں نے قرآن مجید کے کسی مقام کی تشریح کرتے ہوئے [سورہ الرعد کی اسی آیت (13:40) کا یہی مفہوم کہہ گیا کہ] یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اس کا نتیجہ کب سامنے آتا ہے؟ میں رواروی میں یہ کچھ کہہ تو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (ان کی آنکھوں میں آنسو بہت کم لوگوں نے دیکھے ہوں گے) یہ دیکھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آپ پر یہ کیفیت کیوں طاری ہو گئی؟ فرمایا کہ میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی عظیم ہستیؐ کے لیے ذرا سی رعایت روا نہیں رکھی اور یہ صاف کہہ دیا کہ ہمارے قانون کے مطابق واقع ہوگا۔ خواہ تمہاری زندگی میں ہو' خواہ اس کے بعد۔ تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ وہ ہماری خاطر اپنے قانون میں کیوں رعایت برتنے لگا۔ اس لیے معلوم نہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے پاکستان بنتے دیکھ سکیں گے یا نہیں؟ اس پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے نادانستہ کیا غلطی ہو گئی۔ میرے مضراب نے ان کے کس تارِ رگ جاں کو چھیڑ دیا؟ میں نے اس احساس کی شدت کو کم کرنے کے لیے کہا کہ نہیں! حضورؐ کے مقصد کا حصول حضورؐ کی حیات طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔ فرمایا کہ یہ الگ بات ہے کہ خدا نے اپنے قانون میں تو کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ یہ کہہ کر وہ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ اس وقت تو مجھے اس کا علم و احساس نہیں تھا لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس گہری سوچ میں ان کے پیش نظر (شاید) اپنے پارسی معالج کے سیف میں محفوظ رکھا ہوا' وہ ایکس رے (X-Ray) ہوگا جس کا تذکرہ اب ماؤنٹ بیٹن نے کیا ہے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ عزیزم! جو کچھ میں نے کہا ہے اس سے کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ قانونِ خداوندی کے لیے لچک نہ ہونے کے ساتھ ہمیں اپنے سامنے اسوۂ رسول اللہؐ رکھنا چاہیے۔ حضورؐ نے اس جواب کے ملنے کے بعد اپنی تگ و تاز میں کسی قسم کی کمی نہیں کر دی تھی۔ ہمیں بھی اپنی جدوجہد بدستور جاری رکھنی چاہیے اور نتیجہ کا انتظار خدا کے قانون کے مطابق کرنا چاہیے۔ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقین محکم ہے۔ اعلانِ پاکستان کے بعد جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے اس عدیم النظیر کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرنے کے بعد مندرجہ بالا واقعہ کی یاد دلائی تو ہنس کر فرمایا کہ نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ نے بات بنا دی ورنہ خدا کا جواب تو بڑا روکھا پھیکا سا تھا۔'' (طلوع اسلام بابت فروری 1983' ص۔ 15-14)۔

نہیں ہو جاتے! اور چاہتے ہو کہ اس نظام کی تشکیل اپنی اسی عمر میں دیکھ لو۔ دیکھو یا نہ دیکھو' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ تیری عمر کا کیا حساب ہے' سوال تو اس معاشرے اور اس دنیا کا ہے جو یہ تیرے بعد بھی قائم رہیں گے۔ اسی لیے **اِنَّکَ عَلَیْکَ الْبَلَاغُ** (13:40) تیرا کام یہ ہے کہ تو اسی ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچاتا جائے۔ عزیزانِ من! میں اس درسِ قرآن میں پانچ سات منٹ زائد لوں گا کیونکہ بات سے بات نکل رہی ہے۔ اور میں اس کی یہیں وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

لفظ تبلیغ کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں تو یہ بلاغ تبلیغ ہی ہے یعنی تبلیغ ہی کرتے جانا ہے۔ ابلاغ کے معنی ''ذرائع ابلاغ'' ہیں اور اس کے معنی ''پہنچا دینا'' ہے۔ پہنچا دینے کو ابلاغ کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ تو عرب تھے اور یہ قرآن تو انہی کی زبان عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ ان کے ہاں تبلیغ کے تو معنی ہی کچھ اور ہیں۔ عرب کے بادیہ نشین صحراؤں میں پھرتے تھے۔ پانی پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا اور اتفاق دیکھیے کہ صحرائے عرب میں پانی کی کمی تھی۔ اس کی اشد ضرورت کے پیش نظر صحرا میں کہیں کہیں کوئی کنویں ہوتے تھے۔ جب نہریں نہیں بنائی گئی تھیں تو گرمیوں کے کنویں ہمارے ہاں بھی تھے۔ ساہیوال ❶ اور لائلپور ❷ کے اندر کنویں اب بھی ہیں۔ گرمی کے زمانے میں ان کنوؤں کا پانی بڑا نیچے چلا جاتا ہے۔ عرب کے صحرائی کنوؤں پر ڈول اور رسی رکھی رہتی تھی یہ وہی رسی ہے ''لج جنوں کیندے ❸ نیں''۔ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ گرمی میں پانی کتنا نیچے چلا جائے گا کیونکہ گرم مقامات کے کنوؤں کا پانی ہمیشہ ایک سطح پر نہیں رہتا۔ ممکن ہے کہ گرمیوں کے موسم میں کوئی مسافر پیاس سے تڑپتا' پھڑکتا ہوا آئے' اسے کنواں بھی مل جائے' ''لج ڈول وی اوتھے ہووے۔'' ❹ وہ اس رسی اور ڈول کو کنویں میں لٹکائے اور وہ پانی تک نہ پہنچے۔ یہ عرب کرتے یہ تھے کہ اس مقصد کے لیے ہمیشہ اپنے ساتھ رسی کا ایک ٹکڑا رکھ لیتے تھے۔ وہاں جا کے دیکھتے تھے کہ اگر وہ ڈول کے ساتھ رکھی ہوئی رسی کنویں کے پانی تک نہیں پہنچتی تو یہ اپنے ساتھ رکھا ہوا رسی کا ٹکڑا اس کے ساتھ باندھ دیتے تھے تاکہ وہ ڈول پانی تک پہنچ جائے۔ یہ جو اُس رسی کی کمی کو پورا کرنے والا ٹکڑا ہوتا تھا' تاکہ وہ ڈول خود پانی تک پہنچ جائے' یہ عرب اسے تبلیغ یا ''**اَلتَّبْلِغَةُ**'' ❺ کہتے تھے اور اس ڈول کے ساتھ رکھی ہوئی رسی کو ''**الرِّشاءُ**'' کہتے تھے۔

عزیزانِ من! یہاں سے تبلیغ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر ایک انسان اپنی ذاتی استعداد کی کمی کی وجہ سے کسی مفہوم تک

---

❶ یہ صوبہ پنجاب کا ضلع ہے۔ اس کا پرانا نام منٹگمری تھا۔

❷ صوبہ پنجاب کا گنجان آباد ضلع جس کا موجودہ نام فیصل آباد ہے۔

❸ جسے لَج کہتے ہیں

❹ وہاں رسی اور ڈول بھی پڑا ہو۔

❺ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد اول' 1960' ص۔ 347۔

نہیں پہنچ سکتا تو اس کی اس کمی کو اس طرح پورا کر دیا جائے کہ وہ اصل مقصد تک پہنچ جائے لیکن اگر وہ اپنی رسی (یعنی الرشاء) کو استعمال ہی نہ کرنا چاہتا ہو تو خالی تبلغتہ یا تبلغ اسے پانی تک نہیں پہنچا سکتی۔ تبلیغ اسی کو فائدہ دے سکتی ہے جو اپنی عقل کو بھی کام میں لائے۔ اس طرح کسی دوسرے میں صلاحیت کی یا علم کی جو کمی ہے، جس کی وجہ سے وہ حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا تو اس کی اتنی کمی کو پورا کرنے کے لیے اپنے علم کی رسی اس کے ساتھ باندھ دو تا کہ وہ اپنی تشنگی بجھا سکے۔ حقیقت تک تو اس نے خود ہی پہنچنا ہوتا ہے۔ بس اس میں کسی قسم کی کمی رہ جاتی ہے۔ یہ جو شخص، جسے آپ مبلغ کہتے ہیں، وہ ہے، جو اس کی اتنی رسی جو کم رہ گئی ہے، پانی تک نہیں پہنچ سکتی، وہ اتنی سی رسی اس کے ساتھ باندھ دے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں پیاس کی تڑپ بھی ہو۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **اِنَّکَ عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ** (13:40)۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس ضابطۂ ہدایت کو لوگوں تک پہنچائے جا، یعنی تیرے ذمہ یہ ہے کہ ''جتنی جتنی کمیاں ان کے اندر ہیں، جناں دیاں تھوڑیاں رسیاں پانی تک نیں پہنچ سکدیاں، تو وہ باندھتا چلا جا۔ ❶ اس کے بعد یہ ہمارا کام ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ نتیجہ کب نکلتا ہے۔ اس لیے کہا کہ **وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ** (20:114)۔ قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلے میں اے رسول! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی معاملہ کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایت نہ مل جائیں، اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ انتظار کرنا چاہیے۔

کسی معاشرے میں انقلاب لانے کے لیے انقلابی کو ایک ایک قدم آگے بڑھنا ہوگا

عزیزانِ من! قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اسے ہم نے تنزیل یعنی بتدریج نازل کیا ہے۔ اسے ہم نے تئیس سال کے عرصے پہ پھیلایا ہوا ہے۔ انقلابی پروگرام تو ہوتا ہی ایسا ہے۔ عزیزانِ من! خدا اس انقلابی پروگرام کی ایک ایک کڑی دیئے چلا جا رہا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح یہ پروگرام ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے لیکن جو اس پروگرام کو لے کر اٹھے ہوئے ہیں، ان کی تو وہ کیفیت ہے جو غالب (1797-1869) کی ہے:

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ❷

اس پروگرام کو لے کر اٹھنے والوں کی بیتابی تمنا یہ کہتی ہے کہ یا اللہ! ''چھیتی نال ہو جائے ❸ ''۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب صورت یہ ہے کہ ''عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب۔'' عزیزانِ من! یہ بیتابی تمنا تھی، جس کے لیے حضورؐ نے کہا تھا کہ یا اللہ!

---

❶ ان میں جو جو کمی رہ گئی ہے، ان کی جتنی جتنی رسیاں پانی تک نہیں پہنچ سکتیں تو وہ باندھتا چلا جا۔

❷ عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب   دل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک

❸ جلد از جلد یہ پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔

میں بھی اپنی اس طبعی عمر میں اس انقلابی پروگرام کی تشکیل کو دیکھوں گا؟ دوسری چیز یہ ہے کہ یہ پروگرام تدریج❶ چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک قدم لے کر پختگی تک' پایۂ تکمیل تک' پہنچتا ہے۔ وہ بھی یوں کہ ٹھیک ہو گیا ایک قدم' پھر اگلا قدم' پھر اگلا قدم۔ اس میں بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے' وہ جو بیتابی تمنا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ وہ جو کل کو ہونا ہے یہ آج ہی ہو جائے۔ اس پروگرام کی ترتیب یہ چاہتی ہے کہ نہیں' عجلت سے کام نہیں چلے گا' یہ تو بتدریج' قدم بہ قدم ہوگا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ''آج تم بوو۔ کل گوڈی دیو۔ پرسوں پانی دیؤ تے چوتھے دن آ کے بوٹا پٹ کے لے جاؤ' تے گھر جا کے پسوالاں گے۔ پسوا کی لو گے؟''❷ مگر عزیزانِ من! یہ قرآن ہے اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔

قرآنی پروگرام کی تکمیل کا راز

عزیزانِ من! قرآنی پروگرام کی تکمیل کے سلسلے میں مکمل ہدایات تک انتظار کرنا ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ** (20:114)۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی مرحلے کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایت نہ مل جائے' اس میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے' اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے' اس لیے خدا تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ سے کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر یہ چیز ہے کہ یہ پروگرام جلد روبہ عمل ہو۔ ان پروگرام کو لے کر اٹھنے والوں کو اِس کے روبۂ عمل ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس میں ذرہ برابر بھی دیر ہو۔ وہ کہتے تھے کہ ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔''❸ تو کہا کہ یہ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ تم جیو یا نہ جیو' تم تو مرنے والے ہو' طبعی عمر گزار کر تم تو یہاں سے آگے چلے جاؤ گے' بات ہی کونسی ہے! کہا کہ اس قرآن کے پروگرام میں جلدی نہیں کرنا۔ عزیزانِ من! سوچیے تو سہی' کتنی کتنی اچھی اسکیمیں' اچھی اچھی آرزوؤں کے ساتھ لے کر اٹھے ہوئے لوگ' محض اس لیے فیل ہو گئے' اور وہ اسکیمیں بھی فیل ہو گئیں کیونکہ انہوں نے اس میں جلدی کی۔ یہ پروگرام وحی کی رو سے مکمل ہدایات چاہتا ہے اور اس پروگرام کا تقاضا: آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک۔❸ تو اس پروگرام میں یہ چیز ہے کہ جو بھی قدم اٹھانا' پختگی کے ساتھ اٹھانا' ایک ایک کر کے قدم آگے اٹھانا' جلدی نہیں کرنا۔ اس لیے کہا کہ **لَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُهٗ** (20:114)۔ جب تک قرآن کی طرف سے تمہارے سامنے پروگرام کی ساری کڑیاں نہ آ جائیں' اس وقت تک اس معاملے میں جلدی نہ کرنا' فساد ہو جائے گا'

---

❶ آہستہ آہستہ ہونا' درجہ بدرجہ ہونا' درجہ' سلسلہ

❷ آج تم پودا لگاؤ کل اسے گوڈی دو۔ پرسوں اسے پانی دو۔ پھر چوتھے دن اس پودے کو اکھاڑ کر لے جاؤ کہ ''گھر جا کر پسوا لیں گے۔'' کیا پسوا لو گے؟ (خاک' ابھی تو اس میں دانہ تک نہیں آیا۔)

❸ آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک (غالب: دیوانِ غالب' ص۔ 82)

انقلاب نہیں آئے گا۔ اور اس کے لیے' عزیزانِ من! سنیے کیا بات آئی ہے! ہمارے ہاں کے' یہ جتنے اپنے آپ کو علماء کہلانے والے ہیں' ان سے بات کر کے دیکھیے' ان کے رویے سے نخوت و تکبر ٹپکتا ہے۔ قَالُوۡا قُلُوۡبُنَا غُلۡفٌ (2:88) کہتے ہیں کہ ہمارے دل خود علوم و معارف کے بھرے ہوئے برتن (اور مخزن) ہیں' اس لیے ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں ہے' ہم تمہارے علوم سے بے نیاز ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی سن لیجیے۔ ''پتہ اے' سانوں سارا پتہ ہیگا'' [1]۔ ہمارے ہاں یہ چیز کسی نے کہی ہے اور بہت عام ہے کہ جو کچھ ہمارے ہاں کے اسلاف کہہ گئے ہیں' ان سے زیادہ کوئی اور کہہ ہی نہیں سکتا۔ ٹھیک ہے: ''پاویں اپنے جغرافیہ اچ تین ای براعظم ہون۔ اوہدوں دو [2] باقی نئیں سی دریافت ہوئے۔'' [3] یہ اسلاف سننے کو تیار نہیں۔ یا للعجب!

کسی بلند ترین مقصد کی کامیابی کا راز نخلِ تمنا کے ساتھ ساتھ طالب علمانہ ذہنیت میں مضمر ہے

عزیزانِ من! جو قرآن کا طالب علم ہے اس کا تو یہ انداز ہی نہیں ہوتا' یہ ذہنیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ یہ کہے کہ اس کا دل علوم و معارف کا بھرا ہوا برتن اور مخزن ہے۔ وہ تو عمر کے آخری حصے تک طالب علم ہی رہتا ہے۔ سلیوان [4] اپنی کم مائیگی و بے بساطی کا برملا اظہار کرتا ہے اور یہ کہنے میں کوئی باک [5] محسوس نہیں کرتا کہ آج زندگی کی ابتداء کے بارے میں ایک دہقان بھی وہیں کھڑا ہے' جہاں نیوٹن (Sir Isaac Newton: 1642-1727) [6] کھڑا ہے۔ سلیوان ایک بہت بڑا Scientist' (سائنسدان) ہے۔ Limitations of Science اس کی کتاب کا نام ہے۔ اس کتاب کا آخری فقرہ یہ ہے کہ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں' میں اور میرے ہم عصر جو کچھ کہہ چکے ہیں' اس کے باوجود میں یہ کہونگا کہ ''سائنس کی دنیا میں ہمیں حرفِ آخر' آخری انسان پہ چھوڑ دینا چاہیے۔''

عزیزانِ من! طالب علمانہ ذہنیت یہ ہے اور حقیقت میں یہی چیز' کشادِ نگاہ بھی پیدا کرتی ہے' وسعتِ قلب بھی پیدا کرتی ہے' راستے

---

[1] ہمیں یہ سب معلوم ہے اور اچھی طرح معلوم ہے۔

[2] خواہ ان کے (ہاں پڑھائے جانے والے ان کے) اپنے جغرافیہ میں ابھی تک تین ہی براعظم ہوں۔ اس وقت تک باقی کے دو براعظم دریافت نہیں ہوئے تھے۔ (اب جب دریافت ہو گئے تو انہوں نے انہیں اپنے نصاب (Curriculum) میں آج تک شامل نہیں کیا ہے۔)

[3] یہ جون 1976ء کی بات ہے۔ آج اِن دریافت شدہ براعظموں کی تعداد 7 ہے۔ اِن کے نام اور آبادی کے لحاظ سے ان کا نمبر اس کتاب کے آٹھویں باب میں ''لیکن ہم ابھی تک بدستور وہیں کھڑے ہیں'' کے عنوان کے تحت دیئے گئے فٹ نوٹ میں درج ہے۔ انہیں وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

[4] Prof. W.N. Sullivan

[5] خوف' ڈر' اندیشہ

[6] Principia Mathematica (1687) اس کی بڑی اہم کتاب ہے۔ ایک سیب کو زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کر اس نے زمین کی کشش ثقل پر بڑا اہم کام کیا ہے۔

بھی روشن کرتی ہے۔

عزیزانِ من! کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہستی ﷺ کون ہے جس سے یہ کہا جا رہا ہے؟ یہ وہ ہستیٔ مبارک ہے جو ہمارے ایمان کے مطابق عالمِ الناس ہے، جو علم انسانی کے بلند ترین افق پر ہے۔ اس سے یہ کہا جا رہا ہے کہ **لَا تَعۡجَلۡ** (20:114)۔ جلدی نہ کر، اپنی سوچ طالب علمانہ رکھ، دعا کرتا رہا کر، تمنا اور آرزو کیا کر کہ **رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا** (20:114)۔ اے میرے نشو و نما دینے والے! میرے علم میں اضافہ ہو جائے۔ اس طرح **لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ** (75:16)۔ اے رسول! تم کسی معاملہ کے متعلق عملی قدم اٹھانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ اس وقت تک انتظار کرو، جب تک اس معاملہ کے متعلق پورا پورا پروگرام بذریعہ وحی نہ دے دیا جائے۔ اس لیے دعا کرو کہ **رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا** (20:114)۔ اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ ہو جائے (تو پھر قدم اٹھایا جائے)۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 114 تک ہی آ سکے۔ 115 ویں آیت سے آئندہ شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ؕ

❀......❀......❀

بارھواں باب: سورۃ طٰہٰ (آیت 115: تمہید قصۂ آدم اور دو بنیادی انقلابات)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبۡلُ فَنَسِيَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهُۥ عَزۡمٗا ﴿١١٥﴾

عزیزانِ من! آج جون 1976 کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 115 سے ہو رہا ہے: (20:115)۔

قصۂ آدم کی حقیقت اور اہمیت

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیت میں خود نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا کہ اے رسول! قرآن کے مطابق اپنا پروگرام مرتب کرو اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب قرآن میں ایک ہدایت مکمل طور پر آجائے تو پھر اس پر گامزن ہو جاؤ۔ اب اس کے بعد اگلی آیت میں قصۂ آدم شروع ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر ذہنوں میں ہے اور ہمیں محراب و منبر سے بتایا جاتا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ قرآن میں تو ربط ہی نہیں ہے: کبھی بنی اسرائیل کا قصہ آ گیا' درمیان میں ہی کہیں صاحبِ قرآن کی بات آ گئی اور پھر آدم کا قصہ چلا آیا' تو بس یہ ایسے ہی ہے۔ بہر حال ان لوگوں کا تصورِ قرآن ایسا ہی ہے حالانکہ قرآنِ حکیم میں تو بڑا گہرا ربط ہے۔ اس لیے سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ قصۂ آدم جو بار بار قرآنِ کریم میں آتا ہے اس کی لِم کیا ہے؟ یہ بات کیا ہے؟ اس کی غایت کیا ہے؟ اور جب یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو پھر یہ معلوم ہو جائے گا کہ نزولِ قرآن اور قصۂ آدم میں ربط کونسا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ سب سے پہلے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ قصۂ آدم کی لِم کیا ہے؟ کائنات میں دو عظیم انقلابات آئے ہیں۔ کائنات کی تخلیق ہوئی تو اشیائے کائنات کو مجبور پیدا کیا گیا۔ ان کے لیے جو قوانین خالقِ کائنات نے مقرر کیے تھے وہ ان قوانین کی اطاعت اور اتباع پر مجبور تھیں۔ انہیں اس کا اختیار و ارادہ ہی نہیں تھا کہ ان کی خلاف ورزی کریں۔ اس کے لیے مشیت کا پروگرام یہ تھا کہ جس قانون کے تابع کسی شے یا نوع نے چلنا ہے وہ اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا تھا' انہیں خارج سے کہیں بھی راہنمائی نہیں ملتی تھی' پیدائش ہی سے اس نوع کے ہر فرد کے اندر وہ قانون رکھ دیا تھا۔ مثلاً بکری کے اندر یہ قانون ہے کہ اس

نے گھاس چرنی ہے' اس پہ گزارا کرنا ہے۔ شیر کے اندر یہ قانون ہے کہ وہ گوشت خور ہے۔ نحل (شہد کی مکھی) کی طرف' جیسے قرآن نے کہا ہے' ہم نے وحی کر دی' اور وحی کسی پیغمبر کے ذریعے نہیں آئی ہے' وہ اس کے اندر داخل ہے۔ تو اس طرح کائنات کی ہر شے اس قانون کے تابع چلنے پہ مجبور ہے جو خود اس کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کے بیشتر مقامات میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ اشیائے کائنات مجبور پیدا کی گئیں اور وہ ان قوانین کے تابع چلتی رہتی ہیں۔ انہیں اس سے مجالِ انکار نہیں' سرتابی کا یارا نہیں' ان قوانین سے وہ معصیت نہیں کر سکتیں۔ مثلاً ایک دو آیتیں سورۃ النحل کی لیجیے۔ ایک آیت ہے کہ **اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمۡ دٰخِرُوۡنَ** (16:48) کیا انہوں نے کبھی اس پر بھی غور نہیں کیا کہ مختلف چیزوں کے سائے کس طرح دائیں بائیں ڈھلتے رہتے ہیں؟ (اور اس سے انسان کس یقین کے ساتھ وقت کا اندازہ کر لیتا ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے؟ اس طرح کہ چاند' سورج' اور روشنی کے دیگر سرچشمے اور وہ اشیاء جو ان کی روشنی کے سامنے آتی ہیں' سب) قوانین کے سامنے جھکی رہتی ہیں اور ان میں کوئی سرکشی نہیں برتتی۔ سب قانون کے تابع چلنے پر مجبور ہے: **سُجَّدًا لِّلّٰهِ** (16:48) وہ خدا کے حضور ہر وقت سجدہ ریز ہیں۔ **دٰخِرُوۡنَ** (16:48) ان کو مجالِ سرتابی نہیں ہے۔ اس کے سامنے ہر چیز جھکی ہوئی ہے اور عزیزانِ من! اس کی پیدہ کردہ ایک ایک چیز پہ غور کر کے سمجھنے سے' قرآن کا اعجاز سمجھ میں آتا ہے۔

بات کو سمجھانے کا قرآنی انداز

میں نے عرض کیا ہے کہ خدا کی پیدا کردہ ایک ایک چیز پہ کھڑے ہو کر' رُک رُک غور کیجیے تو پھر قرآن کا اعجاز سمجھ میں آتا ہے۔ یہاں اس نے سمجھانا یہ تھا کہ یہ اشیاء مجبورِ محض ہیں اور مجبور اس انداز میں ہیں کہ اگر کوئی باہر کے مؤثرات بھی اُن پر اثر انداز ہوں تو بھی یہ اپنے اندر ودیعت کر کے رکھے گئے خالق کائنات کے اِن قوانین کے تابع چلتی ہیں' اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اب سوچیے کہ قرآن نے بات تو یہ سمجھانی ہے اور وہ بھی آج سے چودہ سو سال پہلے صحرا کے رہنے والے ایک بدو کو۔ صحرا کی اس دنیا کی آبادیوں کے اندر بھی جہاں مکہ جیسے ام القرٰی میں جو دار الخلافہ تھا' جو اس تمام علاقے کا مرکز تھا' جس کے سلسلہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں بھی نزولِ قرآن کے وقت صرف سترہ آدمی Literate' پڑھے لکھے تھے یعنی تعلیم یافتہ ہونا تو بہت بڑی چیز ہے' یہ محض پڑھے لکھے تھے۔ بات انہیں سمجھانی تھی۔

اسے پھر ذہن میں رکھیے کہ مکہ جیسے ام القرٰی' جسے دار السلطنت' کیپٹل سٹی' کی حیثیت حاصل تھی' دار الخلافہ تو کچھ شے نہیں ہوتی' یہ تو ان تمام اطراف و جوانب کا' قبائل کا' شعوب کا' مرکز تھا۔ اس میں صرف پڑھے لکھے اتنے سے آدمی تھے۔ گویا اس زمانے میں جب کہ ان کی علمی سطح اتنی کم تھی قرآن نازل ہوتا ہے۔ انہیں یہ سمجھانا ہے کہ یہ اشیاء مجبورِ محض ہیں' یہ خارجی کائنات از خود کوئی اختیار و ارادہ نہیں رکھتی۔

اور قرآن تو قیامت تک کے لیئے ہر دَور میں ہر انسان کے لیے راہنمائی ہے۔ اس نے یہی بات نیوٹن (Sir Isaac Newton: 1642-1727) کو بھی سمجھانی ہے اور عرب کے ایک بدو کو بھی کہ خارجی کائنات از خود کوئی اختیار و ارادہ نہیں رکھتی۔

چیزوں کے سایہ کی مثال

عزیزانِ من! اس نے ایک مثال سے بات کہی ہے۔ غور کیجئے انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ کہا کہ تم دیکھتے نہیں ہو' یہ چیزیں ہیں اور یہ ان کا سایہ ہے۔ دیکھیں یہاں تک بھی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے کہ سایہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے۔ یہ جو مجبور چیزیں ہیں انہیں تو آپ چھوڑ دیجیے۔ آپ انسان کو لیجیے۔ انسان تو صاحبِ اختیار و ارادہ چلا جارہا ہے۔ یہ اپنے ارادہ سے اٹھتا ہے' ارادہ سے چلتا ہے' ارادہ سے اپنا رخ موڑتا ہے' راستے میں اِدھر اُدھر دائیں بائیں ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنے اختیار و ارادہ سے کرتا ہے لیکن اس پہ اس کا اختیار نہیں کہ اپنے سایہ کی سمت بدل لے۔ یعنی کہا یہ ہے کہ دیکھتے نہیں ہو کہ یہ تمام خارجی اشیاء کس طرح تمام ہمارے قانون کے تابع چلتی ہیں۔ ذرا سایہ پہ غور تو کرو۔ کیا بات ہے! یہ ہے عزیزانِ من! قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان! بات بدو کی سمجھ میں بھی آئی اور یہ وہ بات ہے جس کی تصدیق و تائید نیوٹن جیسے سائنسدان نے بھی کی ہے۔ یہ ابدی حقیقت بھی ہے۔ اس مثال میں کسی دور کے اندر بھی کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے مگر اس کے سایہ کی بھی مجبوری کا یہ عالم ہے کہ اس کے سائے پہ خارج سے ودیعت کر کے رکھے گئے خالق کائنات کے قوانین سے وہ شے مؤثر ہو رہی ہے' سایہ اس کے تابع چلتا ہے' اس صاحبِ اختیار و ارادہ کے تابع نہیں چل رہا۔ یہ مڑتا ہے' جدھر جی چاہے رکتا ہے' جہاں جی چاہے چلتا ہے' جی چلنے کو نہ چاہے نہ چلے۔ سب ٹھیک ہے کہ اس میں وہ صاحب ارادہ و اختیار ہے لیکن جب دھوپ میں چلتا ہے تو اس میں اس کو اختیار نہیں ہے کہ اپنے سایہ کو اپنے اختیار و ارادہ کے تابع رکھے۔ یہ کتنا ہی Talented (اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک) کیوں نہ ہو مگر اس پر اس کا اختیار نہیں ہے کہ اپنے سایہ کی سمت کو بدل لے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ بات اس نے یہ سمجھانی تھی۔ مثال اس نے اتنی سی دی ہے۔ ''غور کرو'' اُس نے کہا۔ اب یہاں جب وہ یہ کہتا ہے کہ ان اشیاء پر غور کرو کہ یہ کس طرح قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے لیے بڑی سے بڑی مثالیں دی جاسکتی تھیں مگر چھوٹی سے چھوٹی مثال دے کر بات سمجھا دی۔

عزیزانِ من! آپ دیکھیے' اس مثال میں کتنی ابدی حقیقت ہے کہ تم دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح صاحبِ اختیار و ارادہ شے یا انسان کی بھی یہ کیفیت ہے۔ سایہ کو دیکھو تو سہی کہ یہ کس طرح اس مؤثر کے تابع چلتا ہے' جو خارج سے خالق کائنات کے قوانین کی صورت میں اس پر اثر انداز ہے؛ اپنی مرضی سے یہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (16:49)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب اس کے قوانین کے سامنے سجدہ

ریز ہے۔ خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا کائناتی قوتیں۔ ان میں سے کسی کو مجالِ سرتابی نہیں، وہ اِن قوانین کی اطاعت سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتیں۔ یعنی یہ بات بڑی واضح کر کے کہہ دی کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو شے بھی ہے: ملائکہ یعنی فطرت کی بے جان قوت اور یہ دآبہ یعنی جاندار انسان سے پہلے حیوانات تک لِلّٰہِ یَسْجُدُ........... وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (16:49)۔ اِن میں اس کی استطاعت ہی نہیں، کہ یہ اس سے سرتابی کر سکیں، استکبار کر سکیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (16:50)۔ وہ جو غالب خدا ہے، اس کے قوانین کی خلاف ورزی سے، سارے کانپتے ہیں۔ انہیں ان سے سرکشی کی مجال نہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50)۔ اور جس راستے پہ انہیں لگایا گیا ہے، وہ سر جھکائے اس پہ چلتی رہتی ہیں۔ وہ خدا کے حکم کی سرتابی نہیں کرتیں۔ بات یہ ہے کہ جس چیز کا امر کیا گیا ہے، یہ اس پر چلتی رہتی ہیں۔ کیا بات ہے یہاں ''يُؤْمَرُوْنَ'' کی! امر تو وہ شے ہے جو مشیتِ خداوندی کے تابع کسی شے کے اندر رکھی ہوئی چیز ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی قانون یا امر یا حکم ان کے اندر رکھ دیا گیا ہے وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50) یہ اس کے مطابق کیے چلے جاتے ہیں، کام کرتے چلے جاتے ہیں: عزیزانِ من! ایک ایک لفظ پہ رکنا پڑتا ہے۔

فعل اور عمل کا قرآنی مفہوم

یہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں بھی انسانوں کے متعلق کہا ہے، وہاں انہیں ایمان لانے کا اور اس پر عمل کرنے کا کہا ہے، اعمال کا کہا ہے۔ عربی زبان میں، جو فعل کا لفظ ہے، اس کے معنی بھی ''کام کرنے'' کے ہیں۔ اور عمل کے معنی بھی ''کام کرنے'' کے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ان دونوں کا ترجمہ ایک ہی ہوتا ہے، اعمال و افعال ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عربی میں تو مرادف ہوتے ہی نہیں۔ وہ تو جنہیں ہم مرادفات کہتے ہیں، ان کے اندر بھی ایک ایسا باریک Shade (امتیازی نشان) ہوتا ہے جو زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔

دیکھیے، عزیزانِ من! قرآن کا اعجاز ہے کہ انسانوں کے متعلق جہاں بھی آیا ہے، وہاں ''عمل'' کا لفظ آیا ہے۔ عربوں کے ہاں ''عمل'' اور ''فعل'' میں فرق ہے۔ عمل کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بالارادہ ہو، Intentional ہو، حتیٰ کہ جو کام عادتاً کیے جائیں وہ انہیں بھی عمل نہیں کہتے تھے۔ اس کام کا بالارادہ ہونا ضروری ہے اور اس کی دوسری شرط یہ ہے کہ التزاماً ہو، مسلسل ہو۔ جو کام بھی ہنگامی طور پر کیا جائے، خواہ بالارادہ ہی کیوں نہ ہو وہ اس کو بھی ''عمل'' نہیں کہتے تھے۔ جی! قرآن یوں سمجھ میں آتا ہے۔ سارے قرآن کے اندر ''اعملوا اعملوا'' کہا گیا ہے۔ یہ سارا کچھ جو آپ مذہب کی دنیا میں یا عادات کے تابع یا تقلیداً کیے جاتے ہیں، زبان کے اعتبار سے اسے عمل کہا ہی نہیں جا سکتا۔ قرآن کریم نے ہر جگہ اعملوا اعملوا کہا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50)۔ یہاں يَعْمَلُوْنَ نہیں کہا کیونکہ یہ تو کچھ بھی بالارادہ کرتے ہی نہیں ہیں: وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (16:50)۔ بس جس راستے پر انہیں لگایا گیا ہے، سر

جھکائے اس پر چلتے رہتے ہیں' سرتابی نہیں کرتے۔ انہیں تو بس اس راستے پر سر جھکائے چلنا ہی ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ تو ضمنی بات تھی کہ کائنات کی یہ چیزیں مجبورِ محض ہیں۔ یہ اسی طرح سے سلسلہ چلا آ رہا تھا۔

کائنات میں دو عظیم انقلاب

جیسا کہ میں نے اس درس کے ابتدا ہی میں کہا ہے کہ کائنات میں دو عظیم انقلاب آئے۔ ایک انقلابِ عظیم یہ آیا کہ انہی اشیائے کائنات کے اندر ایک ایسی مخلوق پیدا کی' جو ان سب میں بالکل الگ ہے۔ یہ صاحبِ اختیار وارادہ ہے۔ یہ ایک بہت بڑا انقلاب ہے۔ یہ پہلا انقلاب ہے۔ تخلیقِ کائنات میں ایک صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق کا پیدا کر لینا پہلا انقلاب ہے۔ اختیار وارادہ تو صرف خدا کی خصوصیت ہے۔ یہ اختیار وارادہ کی ایک صفتِ خداوندی اس مخلوق کو دی گئی ہے۔ یہ اس کائنات کے اندر پہلا انقلاب ہے۔ یہ ایک ایسی صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق کا پیدا کر دینا' پہلی مخلوق سے بالکل Departure (الگ) ہے' Deviation (انحراف) ہے۔

خدا کی جو پہلی روش چلی آ رہی تھی' وہ یہ تھی کہ ہر شے مجبور پیدا کی گئی ہے۔ صاحبِ ارادہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اس کے بعد ایک مخلوق پیدا کی جا رہی ہے جو صاحبِ ارادہ ہے۔ اب قرآن نے اگلی بات یہ کہی کہ اس صاحبِ ارادہ مخلوق کو یہاں چھوڑ دیا جائے۔ جہاں تک اس مجبور مخلوق کے مقابل اس صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق کا تعلق ہے' یہ اپنی مرضی کے مطابق اس مجبور مخلوق سے کام لے۔ وہ مجبور اشیائے کائنات' وہ مجبور مخلوق' اس کے سامنے جھکیں گی لیکن ایک ایسا مجمع' جہاں اِس صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق کو محفلِ کرۂ ارض یعنی وطنِ زمین پر' ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو سیدھی سی بات ہے کہ پھر جو اس کا حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ قرآنِ کریم نے' جہاں عام طور پہ صرف انسان کہا ہے' اس سے مراد ہے وہ انسان' وہ مخلوق' جو صاحبِ اختیار وارادہ تو ہو لیکن کسی خارج یا خدا کے قانون کے تابع نہ چلے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق' اپنا اختیار وارادہ استعمال کرے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک بڑا ہی اہم اور پیچیدہ سوال ہے۔

حملِ امانت کے سلسلہ میں مروجہ تراجم کی حالتِ زار

عزیزانِ من! وہ آیت تو آپ کے ذہن میں ہوگی جسے حملِ امانت کہتے ہیں۔ جو احباب مسلسل درس میں آتے رہتے ہیں انہیں تو معلوم ہے کہ یہ آیت اس سے پہلے بھی کئی بار سامنے آئی ہے اور یہ چیز بتائی ہے کہ ایک لفظ کے غلط ترجمے سے قرآن کی پوری تعلیم کس قدر الٹ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہی آیت ہے۔ درسِ قرآن کی اس بزم میں تو بہت سے نئے نئے احباب آتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جب یہ آیتیں آئیں تو میں دوبارہ اِن کا مفہوم عرض کر دوں اور جن احباب کو اس کا مفہوم معلوم ہے ان کے لیے تجدیدِ یادداشت ہو جائے گی۔ یہ آیت ہے: اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَیۡنَ اَنۡ یَّحۡمِلۡنَہَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡہَا وَ حَمَلَہَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوۡمًا جَہُوۡلًا (33:72)۔ یہ آیہ حملِ امانت کہلاتی ہے اور امانت کی آیت بڑی مشہور آیت ہے۔ اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے اپنی امانت کا بوجھ آسمان کے سامنے پیش کیا' زمین کے سامنے پیش کیا' پہاڑوں

کے سامنے پیش کیا' تو ہر ایک نے اس سے کہا کہ نہ بابا! میری توبہ' ہم تو اسے نہیں اٹھا سکتے' بالکل نہیں اٹھا سکتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اِس امانت کو ان سب کے سامنے لیے لیے پھر رہے ہیں کہ میاں! یہ بوجھ ہے' ذرا تھوڑا سا میرا ہاتھ بٹا دینا۔ انہوں نے کہا کہ نہ بابا! بھئی! تو ہی لے لے۔ نہ بابا! سوچیے تو سہی کہ کیا صورت ہے کہ وہ اللہ میاں اس کو ان چیزوں کے سامنے (فَـــاَبَیْـــنَ) لیے پھر رہے ہیں اور وہ ہیں کہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں صاحب' بالکل نہیں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اب واپس لیے جانا بھی تو اچھا نہیں لگتا۔ وہاں فرشتے دیکھ رہے ہونگے' بڑی مشکل ہوگئی۔ تو وہاں کوئی انسان چلا جا رہا تھا۔ جب اس نے اس بیچارے کی حالت دیکھی...... یاد رہے میں یہ بات اس ترجمہ کے تابع کہہ رہا ہوں' خود نہیں کہہ رہا...... ہاں تو جب اس نے دیکھا کہ صورت یہ ہوگئی ہے۔ بڑے میاں جی کو رحم آیا' کچھ ترس سا آیا' کچھ یہ بھی ہوا کہ بڑی بے عزتی ہوگئی ہے (نعوذ باللہ)۔ اس نے کہا کہ اچھا جی! لائیے صاحب! میں اٹھا لیتا ہوں۔ اس نے اٹھا لیا۔ آگے تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ خدا کہتا کہ صاحب! تمہارا بڑا شکریہ' تم نے بڑا احسان کیا۔ لیکن جب انسان نے یہ بوجھ اٹھا لیا تو پیچھے سے یہ کہا گیا کہ **اِنَّـــهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلاً** (33:72)۔ اوہ بڑا ہی بیوقوف تھا۔ عزیزانِ من! وہ جو ہرکولیس (Hercules) ❶ کا یونان کی اصنامیات ❷ میں ذکر آتا ہے' اس نے اسی طرح سے کیا تھا یعنی وہ کرۂ ارض کو اپنے سر کے اوپر لے کر کھڑا ہو گیا تھا ❸۔ اسے رکھانے والا تو چلا گیا اور یہ لے کے کھڑا ہے اور یہ وہی اس کا بوجھ تھا جو وہ اب تک لے کے پھر رہا ہے' اسی لیے کہتے ہیں کہ **اِنَّـــهٗ كَـــانَ ظَـلُـوۡمًـــا جَهُـوۡلاً** (33:72)۔ یہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے' جاہل ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ بہت ہی شریف انسان تھا' بڑا ہی ہمدرد انسان تھا' اس نے ہمارے حال پہ بہت کرم کیا' ہم اس کے بڑے شکرگزار ہیں' کہا کہ یہ جاہل ہے۔ اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! ہزار برس سے آپ کے ہاں یہی تفسیر بیان کی جا رہی ہے' یہی ترجمہ کیے چلے جا رہے ہیں اور پھر بڑے فخر سے شاعر یہی کچھ کہتے چلے جا رہے ہیں

---

❶ ہرکولیس یونانی دیومالا کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا باپ زیس (Zeus) ہے' ماں اکمین (Alcmene) ہے۔ دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور آدمی ہے۔ اس نے بارہ مشکل ترین کام کیے۔ اس لیے اسے Twelve Labour of Hercules کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان میں کا ایک کام زمین کو سر پر اٹھانا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف نالج' 1955' ص۔ 2557)

❷ اہل یونان بہت سے دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھتے تھے۔ تقریباً ہر شہر کے دیوی دیوتا ہوتے تھے۔ یونانی دیوتا قدرت کی طاقت کی نمائندگی کرتے تھے۔ یونانی اس بات پہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے دیوتا انسانی شکل کے ہیں اور اِن کے احساسات وجذبات بھی انسانوں جیسے ہیں۔ لوگ ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کو قربانیاں بھی پیش کرتے تھے۔ یونان کے لوگ عام طور پر کسی اہم کام کے کرنے سے قبل اپنے دیوتاؤں سے مشورے لیتے تھے۔ یہ مشورے Oracles کہلاتے تھے۔ ان کے خاص دیوتا یہ تھے: زیس (Zeus) اور اپولو (Apollo)' خاص دیوتاں یہ تھیں: ایفروڈائٹ (Aphrodite)' ایتھینا (Athena) وغیرہ۔ (ہاشمی' انوار: تہذیب کی کہانی' ص۔ 121)

❸ انسائیکلو پیڈیا آف نالج نے یہ الفاظ دیئے ہیں:

To find and obtain the golden apples from the garden of the Hesperides, Hercules had the giant Atlas get the apples and in the meantime took over Atlas' job of holding the world on his shoulders. (The Illustrated Encyclopedia of Knowldge, 1955, P. 2557)

مذہب میں انسان مجبورِ محض ہوتا ہے

بہر حال' عزیزانِ من! یہ تو انسان کو بھی مجبورِ محض مانتے ہیں۔ یہاں کہا کہ حَمَلَهَا الْإِنسَانُ (33:72)۔ انسان نے یہ امانت اٹھائی۔ اس لیے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (33:72)۔ یہ جاہل نکلا اور وہ آسمان زمین پہاڑ بڑے سمجھدار نکلے۔ اوہ کہیے! ارے احسان کرنے والا ظالم بھی نکلا اور اتنا ہمدرد ظالم جاہل نکلا! جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! خدا نکردہ۔ یہ بات نہیں ہے۔ حیرت ہے یہ بات تو بھیڑ چال ہوئی۔ اگلی بھیڑ چلی جارہی ہے' پچھلی بھیڑ اس کے پیچھے پیچھے چلی جارہی ہے۔ کسی پچھلی بھیڑ سے پوچھو کہ تم کیوں چلی جارہی ہو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بس وہ آگے جو جارہی ہے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے کہ آگے والی سے پوچھ لے کہ کہاں اور کیوں جارہی ہے؟ اسے بھی کچھ پتہ نہیں ہے' بس اس نے منہ اٹھایا اور چلی جارہی ہے۔

عزیزانِ من! خود ان عربوں کی زبان میں' ان کی لغت میں' حمل امانت ہے۔ میری لغت میں دیکھیں' وہاں میں نے اس سلسلہ میں سندیں' انہی کی کتابوں کی دی ہیں۔ عربی زبان میں ''حملِ امانت''❶ کے معنی ہوتے ہیں: ''امانت میں خیانت کرنا'' ان معانی سے یہ بات کتنی واضح ہوگئی۔ اس طرح اس آیت (33:72) کا مفہوم یہ ہوا کہ تم اشیائے کائنات پر غور کرو۔ یہ بڑے بڑے اجرامِ سماوی' خود کرۂ ارض اور اس پر جمے ہوئے اپنے بڑے بڑے پہاڑ (وغیرہ) ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ذمہ جو فرائض عائد کیے گئے ہیں' یہ سب ان کی بجا آوری میں ہمہ تن مصروف ہیں' کوئی ان میں ذرا سی خیانت نہیں کرتا' وہ اس کے تصور تک سے ڈرتے ہیں لیکن انسان کی حالت یہ ہے کہ جو فرائض اس کے ذمے عائد کیے جاتے ہیں' یہ ان کی بجا آوری میں خیانت کرتا ہے حالانکہ ایسا کرنے میں کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا' خود اس کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے' جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر زیادتی کرتا ہے۔ (اگر یہ بھی اشیائے کائنات کی طرح' لیکن بطیّبِ خاطر' وحی کے مقرر کردہ راستے پر چلتا جائے تو اسے کسی قسم کا نقصان نہ ہو۔) یہ ذمہ داریوں کا بوجھ تھا۔ امانت' فرائض' ذمہ داریاں' کائنات کی خارجی اشیاء کے سامنے پیش ہوئیں تو ان میں سے کسی نے اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ اور جب وہی ذمہ داریاں' وہی فرائض' اس انسان کے سامنے پیش کیے تو اس کمبخت کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں خیانت کرتا ہے۔ کتنا ظالم ہے! کیا بات ہے صاحب! یہ ہے اختیار و ارادہ دینے کا وہ پہلا انقلاب' جس کے تحت یہ ایک مخلوق پیدا ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اب بات یہ ہوئی کہ اسے اپنے اختیار و ارادہ پہ چھوڑ دیا جائے۔ تو کہا ہے کہ ٹھیک ہے' اگر یہ اپنی مرضی کے تابع چلے گا تو بھئی! ظالم ہے' جاہل ہے' یہ فرائض و ذمہ داریوں کے اندر خیانت کرے گا' کس کا کیا بگاڑ لے گا' اپنی اس

---

❶ تاج العروس (جو قاموس کی شرح ہے' لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے' آخری مفصل اور مستند عربی لغت ہے) اور محیط المحیط (جو پطرس بستانی کی مرتب کردہ ہے) میں حَمَلَ الْاَمَانَةَ کے معنی دیئے ہیں: امانت میں خیانت کرنا۔

جہالت کی بناپر اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑا مار رہا ہے اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سمجھتا یہ ہے کہ دوسروں پہ مار رہا ہوں۔ لفظ ظلم کی کیفیت و ماہیت یہ ہے کہ ''جس شے کو جہاں ہونا چاہیے' وہ شے وہاں نہ ہو۔'' اقبالؒ نے دولفظوں میں کیا بات کہہ دی ہے: گفت یزداں کہ چنین است دگر ہیچ مگو۔ خدا نے کہا کہ یہ شے ایسی ہے کہ ایسے ہی رہے گی' گفت آدم کہ چنیں است: آدم نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ گفت آدم کہ چنیں ہست و چناں می بائست' کہ یہ ایسی ہے لیکن ایسی نہیں رہے گی' ویسے رہے گی جیسی ہم چاہیں گے۔ قدرت نے اس شخص اقبالؒ کو بھی بات کہنے کے عجیب انداز دیئے تھے۔ صرف ایک لفظ ہے ''می بائست'' اسے ظلم کہتے ہیں جو ''چنیں است'' ہونا ہے اس کو چناں می بائست ہونا چاہیے۔ ❶ اسے ظلم کہتے ہیں اور ہے بر بنائے جہالت۔ ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ہے کسی دوسرے پہ ظلم نہیں ہو رہا' اپنی ذات پہ کر رہا ہے۔ کائنات کے اندر یہ پہلا انقلاب آیا۔ ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق کو اگر اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

کرۂ ارض پر بنی آدم کے پہلے دو بیٹوں کے قتل کا قصہ

عزیزانِ من! وہ جو بظاہر آدم کے دو بیٹوں کا ذکر ہے' پہلا قتل تو سیدھی سی بات ہے کہ یہی ہے۔ اگر دو صاحبِ اختیار و ارادہ انسانوں کو چھوڑ دیا جائے اور وہ خارج کی کسی قوت کے ماتحت بھی نہ ہوں تو یہی ہوگا۔ اور دوسری چیز یہ ہے کہ اگر ان کو کسی قسم کی کوئی ہدایت بھی ملی ہوئی نہ ہو' پھر انہیں آزاد بھی چھوڑ دیا جائے تو پھر دنیا میں سب سے پہلے آدم کے دو بیٹوں کے قتل کی مثال قرآن نے دی۔ تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ آدم کوئی ایک فرد نہیں ہے۔ یہ آدمی ہے یعنی اسی کو عربی میں آدم کہہ کے پکارا گیا ہے۔ ہمارے ہاں جسے آدمی کہتے ہیں' یہ وہی آدمی ہے۔ اس کا دوسرا لفظ آدمی رکھ لو تو ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ آدمی کے بیٹے تو سیدھی سی بات ہے کہ کسی ایک فرد کے بیٹے نہیں ہیں۔ آدمی کی اولاد ہیں۔ یہ سارے ابنِ آدم بن گئے' بنی آدم ہوگئے' آدم آدمی ہوگیا۔ یہ آدمی کی بات ہو رہی ہے' کسی آدم کی بات نہیں ہے۔ یہ آدم نہیں ہے اور نہ ہی یہ علیہ السلام ہے۔ ہم نے تو انہیں سب سے پہلا نبی بنایا ہوا ہے۔ ان لوگوں کی سوچ ملاحظہ فرماؤ۔ قرآن تو آدم ❷ کا تعارف یہ کہہ کر کرا رہا ہے کہ ہم نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر وَعَصٰٓى (20:121) اور اس نے معصیت کی'

---

❶ کلیاتِ اقبال فارسی' قبورِ عجم' غزل نمبر 69' شیخ غلام علی اینڈ سنز' لاہور' ص۔ 527

❷ تاج العروس میں لکھا ہے کہ اُدْمَۃٌ کے معنی (۱) ''قرابت' موافقت' مل جل کر رہنے کی صلاحیت یا خو' میل جول' کے ہیں۔ (۲) اَدْمَۃٌ اور اُدْمَۃٌ کے معنی ہیں ''مخلوط ہونا' موافق ہونا' ایک دوسرے میں میل محبت ہونا۔'' (۳) اَدَمَ اللّٰهُ بَيْنَهُمْ يَأْدِمُ کے معنی ہیں ''خدا نے ان کے درمیان موافقت سازی اور ہم آہنگی پیدا کر دی۔ (۴) اَلْاِدَامُ ہر موافق چیز کو کہتے ہیں جو مل جل کر رہ سکے۔ (۵) اِدَامٌ کسی خاندان کا ایسا مثالی فرد جس سے اُس کے قبیلہ کو پہچانا جائے۔ (۶) اَدَمِیٌّ جس کی نسبت اٰدم کی طرف ہو۔ انسان۔ اُدْمَۃٌ کا لفظ خود انسان کی تمدنی زندگی (Social Life) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لہٰذا ''آدمیت'' انسانی زندگی کی اُس حالت کا نام ہے جس میں اس نے مل جل کر رہنا شروع کیا۔

ہماری خلاف ورزی کی' سرکشی کی۔ تو کیا نبی کی بھی یہ کیفیت ہوسکتی ہے؟ نہیں' نبی کی یہ کیفیت نہیں ہوسکتی۔ یعنی قرآن ایک نبی کا تعارف یہ کہہ کر نہیں کرا رہا لیکن ہمارے ہاں قصہ حضرتِ آدم علیہ السلام کا چلا جا رہا ہے۔ ہمارا ابھی کوئی حال نہیں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ تقلید سوچنے کی قوتیں ماؤف کر دیتی ہے۔ میں دُور نہیں جاتا' یہیں اگلی ہی دو آیتوں کے بعد یہ آیا ہے کہ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ (20:121)۔ آدم نے اپنے نشو ونما دینے والے کی سرکشی اختیار کی۔ سرکشی کرنا تو نبی کی شان نہیں ہوگی۔ یہ کسی شخص کا قصہ ہی نہیں ہے۔ میں نے ابھی اس آیت میں حملِ امانت کی بات کی ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ کائنات کی ہر شے یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (16:50) ہے۔ ان کے مطابق یہ "یَفْعَلُوْنَ" ہے' یہ کرتا چلا جائے ہے۔ مگر یہاں یہ بات ہے کہ یہ "یفعلون" سے نہیں ہوگا۔ یہ انسانی دنیا میں "یَعْمَلُوْنَ" سے ہوگا' بالارادہ عمل ہوگا۔ تخلیق اشیائے کائنات کے بعد بالارادہ عمل کرنے کا یہ پہلا انقلاب آیا۔

انسانی فطرت کی کہانی قرآن کی زبانی

عزیزانِ من! اب یہ پہلا انقلاب آیا کہ انسانوں کو اس طرح اختیار وارادہ دے کر پیدا کیا گیا۔ اس کے اندر اشیائے خارج کی طرح از خود قوانین نہیں رکھے گئے۔ اگر اس کے اندر یہ قوانین رکھ دیئے جاتے تو پھر تو یہ وہی ہوتا جیسا باقی اشیائے کائنات ہیں۔ وہ ان کی اطاعت پہ مجبور ہوتا۔ یہ جو کسی کے اندر قانون رکھا جاتا ہے' اسے اس شے کی فطرت (Nature) کہتے ہیں۔ اب پھر اگلی آیتیں لیجیے۔ ہمارے ہاں وہی ہے جو ہزار برس سے ان آیات کے معنوں میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ ان میں مشہور آیت یہ ہے کہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (30:30)۔ آپ کے ہاں انسانی فطرت تو ایسا مسلمہ ہے کہ ہر شخص اسے دیکھتا آیا ہے اور اس لفظ کو استعمال کرتا چلا آ رہا ہے کہ Human Nature (انسانی فطرت) ہے۔ انسانی فطرت کا یہی تصور چلا آ رہا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے اور یہ اس پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ صاحبِ اختیار وارادہ کی فطرت ہو ہی نہیں سکتی۔ کہتے ہیں کہ فطرت بدل نہیں سکتی۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو یہ تو جمع بین النقیضین ہوا کہ ایک وہ "صاحبِ اختیار وارادہ" ہوا پھر وہ "صاحبِ فطرت" ہوا۔ پانی کی فطرت ہے کہ نشیب کی طرف بہے گا؛ آگ کی فطرت ہے کہ حرارت دے گی؛ سورج کی فطرت ہے کہ وہ چمکے گا۔ یہ فطرت تو اشیاء کی ہوتی ہے۔ فطرت کہتے ہیں: اس قانون کو' اس ہدایت کو' اس راہنمائی کو' جو کسی شے کے اندر رکھ دی جائے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔ وہ اس کی فطرت ہوتی ہے۔ صاحبِ اختیار وارادہ کی فطرت ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر انسان کی کوئی فطرت ہوتی تو اس میں اختلاف ہی نہ ہوتا۔ پہلے دن کی بکری' اور آج کی بکری' اور ہر دَور کی بکری' اور اگر کروڑوں بکریاں اکٹھی کر دی جائیں تو بھی ان میں اختلاف ہی نہیں ہوتا' سب اسی طرح سے گھاس چرتی رہتی ہیں' اسی طرح سے جیتی ہیں' ویسے ہی مرتی ہیں' آپس میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہوتا۔ یہاں ان میں باپ بیٹا نہیں ملتا۔ انسان کی کونسی فطرت ہے؛ یہی فطرت ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ دو بیٹے تھے اور ان میں ذرا سا اختلاف ہوا اور پھر ایک کا خنجر تھا اور دوسرے کا گلا؟ کیا یہی فطرت ہے؟ کیا کبھی کسی بکری نے کسی دوسری بکری کا گلا کاٹا ہے؟ یہ ہے فطرت۔ اور پھر آج آپ اس

فطرت والے انسانوں کو تو دیکھ رہے ہیں' جس نے آج اس دنیا کو خاک وخون کا ایک جہنم زار بنا رکھا ہے مگر اس کے باوجود یہ تصور انسانی ذہنوں میں روبہ عمل ہے کہ انسان کی فطرت ہے' یہ صاحبِ فطرت ہے' انسانی فطرت' Human Nature ہے' اور قیامت تو ذرا آگے جا کے آتی ہے جہاں یہ ساکنانِ کرۂ ارض آپس میں بُری طرح سے دست وگریباں نظر آتے ہیں۔ ابھی ابھی تو میں فطرت کے اوپر ہی آ رہا ہوں کہ انسان کی فطرت ہے اور یہ کہ آپ کے ہاں انسانی فطرت کا یہ پہلا مغالطہ چلا آ رہا ہے۔

کیا خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے؟

عزیزانِ من! ان لوگوں پہ تو ہمیں افسوس نہیں ہے کہ جن کے ہاں قندیل آسمانی کی کوئی راہنمائی نہیں تھی۔ یہ قرآن کی حامل قوم بھی فطرتِ انسانی کا درس دیئے چلی آ رہی ہے۔ آپ نے اس کی جو بھی فطرت ہے وہ تو دیکھ لی ہے اور پھر قرآن نے انسان کے متعلق پہلی چیز تو یہ کہی کہ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا (33:72)۔ یہ ظالم ہے' جاہل ہے۔ اِس کی فطرت ملاحظہ فرماؤ۔ یہ جتنی بھی ساری چیزیں ہیں' اُن میں یہ خودغرض ہے' لالچی ہے' مفسد ہے' گلا کاٹتا ہے' خونخوار ہے۔ قرآن میں یہ سارا کچھ بتایا گیا ہے۔ کیا انسان کی یہ فطرت بتائی ہے اور ان کے ہاں ملاحظہ فرماؤ کہ یہ کہتے ہیں کہ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیۡهَا (30:30)۔ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پہ پیدا کیا ہے۔ یااللہ! اور یہ خدا کی فطرت کا مظاہرہ ہو رہا ہے کہ یہ ظالم ہے' جاہل ہے' عجولاً ہے' متکبر [1] ہے' سرکش ہے' لالچی ہے' خودغرض ہے' گلے کاٹتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی فطرت ہے اور اس نے انسان کو فطرت اللہ پہ پیدا کیا ہے۔ یااللہ! ایہدے نالوں تے بکری بنا دیندا' تے چنگا سی [2]۔ یہ فطرت اللہ پہ ہے؟ یہ خدا کی فطرت ہے جس کا آئینہ بردار یہ انسان ہے؟ یہ کچھ کسی نے نہیں سوچا' کوئی نہیں سوچتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک سوچنے والا تو کافر ہوتا ہے۔ عیسائی پیشوائیت کے خلاف یہ کوئی نہیں سوچتا کہ ہم فطرتِ انسانی کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! یہی چیز تو سب سے بڑی غلطی تھی' بنیادی مغالطہ تھا۔ اور پھر وہ فطرت کو فطرت اللہ کہتے ہیں' کیا کریں؟ انہوں نے تو مناظرے میں میدان جیتنا تھا۔ ان کے بائبل (تورات) میں لکھا ہوا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پہ پیدا کیا ہے۔ اچھا جی! اس میں انہوں نے ذرا سا اپنے لیے پردہ رکھ لیا کہ خدا تو کسی کے سامنے آتا نہیں ہے لہٰذا جب کہا کہ اس نے اپنی صورت پہ پیدا کیا تو کم از کم اگر تائید نہیں ہو سکتی تو تردید بھی تو نہیں ہو سکتی کہ کہا جائے کہ نہیں صاحب! اس کی صورت ایسی تو نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا تم وہاں سے دیکھ آئے ہو' "کہ جی دیکھا تے نئیں' تے فیر مندا کیوں نئیں ہیگا توں" [3]۔ یعنی اس تصور کی یہاں تک تو گنجائش تھی' اب آگے یہ کیا

---

[1] آج کے اس دَور میں اس نکتے کی وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے:
Fullright, J. William: The Arrogance of Power, Vintage Book A Division of Random House, New York, 1966.

[2] یااللہ! اس سے تو بہتر تھا کہ انسان کو بکری بنا دیتا۔ (یہ بہت بہتر ہوتا)۔

[3] جی! دیکھا تو نہیں ہے۔ پھر تم کیوں نہیں مانتے؟

کرتے؟ یہ مناظرین ان سے آگے بڑھ گئے کہ جی نہیں' صورت نہیں بلکہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ (30:30)۔اس نے اپنی فطرت پہ انسان کو پیدا کیا۔عزیزانِ من! خود قرآن نے انسان کی یہ چیز بتائی ہے کہ اگر انسان وحی کی راہنمائی کے تابع نہ چلے تو اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (33:72)۔یہ ظالم ہے' جاہل ہے۔یہ بڑا جلد باز ہے' بڑا لالچی ہے' خود غرض ہے' فتوراً ہے' اس کا پیٹ نہیں بھرتا' اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے۔عزیزانِ من! اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو جو کچھ وہ کرتا ہے وہ سارا کچھ قرآن نے بتایا ہے تو کیا یہ فطرت اللہ ہے جس پہ یہ چل رہا ہے؟ کیا یہ اس کی فطرت ہے؟ فطرت تو بدلا ہی نہیں کرتی۔کیا یہ ہوئی انسان کی فطرت؟ قرآن نے کہا کہ پھر ہم نے انبیاء کو بھیجنا شروع کیا۔کاہے کے لیے بھیجنا شروع کیا؟ کہ ان کی فطرت بدل دیں۔تو کیا فطرت بدلا بھی کرتی ہے؟ معاذ اللہ معاذ اللہ! اسی لیے آپ کے ہاں کے دہریئے کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے یہ کر کے بھی دیکھ لیا' مگر انسان کی فطرت نہیں بدلی۔[1] پھر یہ دہریئے پوچھتے ہیں کہ کیا فطرتِ انسان بدل گئی؟ خدا نے انبیاء کا سلسلہ فطرت بدلنے کو بھیج دیا تو کیا اس سے فطرت بدل گئی؟

جو چیز بھی فطرت رکھتی ہو اس کی طرف کوئی نبی نہیں آتا

عزیزانِ من! جن چیزوں کی فطرت ہے' ان کی طرف تو کسی نبی کو بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔بکریوں کی طرف تو کوئی نبی یہ کہنے کے لیے نہیں آیا کہ بھئی! گوشت نہ کھایا کرو' حرام ہے' گھاس کھایا کرو' تم چرا کرو' یہ تمہارے لیے حلال ہے۔وہ تو یہ کچھ کہنے کے لیے نہیں آیا۔کوئی نبی شہد کی مکھی کی طرف نہیں آیا۔جس کی فطرت میں خارج سے کوئی شے ہوتی ہے اُسے اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ہدایت تو اس کے اندر ہوتی ہے۔پہلا انقلابِ عظیم یہ پیدا کیا کہ ایک صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق پیدا کی اور اس کے بعد اسے اختیار و ارادہ دے کر چھوڑ دیا۔اب اس کے اندر کوئی ہدایت نہیں ہے جسے فطرت کہا جائے۔تو پھر کام کیسے چلے گا؟ کہا کہ چلے گا۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى (20:123)۔ہماری طرف سے تمہارے پاس' صحیح راستے کی طرف لے جانے والے قوانین زندگی آتے رہیں گے۔جو کوئی ان قوانین کا اتباع کرے گا تو نہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی وہ زندگی کی خوش گواریوں سے محروم رہ کر جانکاہ مشقتوں میں پڑے گا۔تو اس طرح یہ بات واضح کر دی کہ ہم اپنی طرف سے' انبیا کی وساطت سے' ان کی طرف راہنمائی بھیجا کریں گے۔ان کا اختیار و ارادہ سلب نہیں کریں گے۔یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ایک طرف انہیں اختیار و ارادہ دیا' دوسری طرف اسے سلب کر دیا۔کہا کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (2:256) دین میں زبردستی نہیں ہے۔یہ نہیں ہے کہ اس کا اختیار و ارادہ سلب کر لیں' بالکل نہیں۔

---

[1] اسی لیے شعراء نے بھی یہ گیت الاپنا شروع کر دیا کہ

"تخلیق کائنات کے دل چسپ جرم پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

انسان کے لیے راستے کے تعین کا طریق

عزیزانِ من! کہا کہ انسان کو بلا راہنمائی کے بھی نہیں چھوڑیں گے کیونکہ یہ زیادتی ہوتی ہے کہ اختیار وارادہ تو دیا جائے لیکن اس کو راستہ نہ بتایا جائے۔ یہ تو یوں ہے جیسے بچے کو پہلے پہل شہر کی طرف بھیج دیا جائے کہ بیٹا جاؤ' انارکلی [1] سے یہ چیز لے آؤ اور اسے یہ نہ بتایا جائے کہ انارکلی کی طرف راستہ کونسا جاتا ہے۔ یہ تو اس کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ اسے تو ہزار بار سمجھایا جاتا ہے' بار بار سمجھایا جاتا ہے' دکھایا جاتا ہے' ایک راہنما دیا جاتا ہے جو ساتھ چل کے بتائے۔ پہلی دفعہ وہ کہے گا کہ ابا جان! کیسے جاؤں تو وہ کہتا ہے کہ بڑے بھائی کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں بتائے گا کہ انارکلی کدھر ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى** (20:123)۔ ہماری طرف سے راہنمائی آتی ہے۔ اس کے لیے طریقہ یہ ہے کہ اب ہم اپنی طرف سے راہنمائی دیتے ہیں۔

عزیزانِ من! دیکھیے! یہ پہلی سنت جو چلی آ رہی تھی کہ رہنمائی ہر ایک کے اندر پیدائشی طور پر ہی ودیعت کر دی گئی تھی' یہ اُس سے Departure (انحراف) ہو گیا۔ پہلی سنت اللہ جو چلی آ رہی تھی' وہ یہ تھی کہ کسی مخلوق کو اپنی طرف سے' خارج سے' راہنمائی بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اب یہ ایسی صاحبِ اختیار وارادہ مخلوق ہوئی جس کے لیے ہم نے کہا کہ ہم خارج سے اس کی طرف خود راہنمائی بھیجیں گے اور پھر راہنمائی بھی بھیجی۔

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

دیکھیے! اب یہ راہنمائی خارجی کائنات کی مجبور چیزوں کو بھی دی اور یہ راہنمائی اس کو بھی دی جسے اختیار وارادہ دیا تھا۔ مگر اس کا یہ اختیار وارادہ سلب نہیں کیا۔ **قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** (18:29)۔ تم اِن لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے' یہ ضابطۂ حق وصداقت آ گیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اِس سے انکار کر دے۔ بھئی! یہ تمہارے لیے چارٹ ہے' یہ سڑکیں ہیں' اِن کے اوپر Sign Post' نشانِ راہ لگا دیئے گئے' روشنی دے دی گئی' تمہیں پڑھنا لکھنا سکھا دیا گیا۔ تمہارا جی چاہے انارکلی کی طرف جاؤ' تمہارا جی چاہے ماڈل ٹاؤن [2] کی طرف چلے جاؤ۔ یہ سیدھی بات ہے' تم نہیں کہہ سکتے کہ صاحب! ہمیں بتایا نہیں گیا تھا کہ انارکلی کس طرف ہے۔ خدا نے انسان کا اختیار وارادہ سلب نہیں کیا۔ یہ ہے' عزیزانِ من! قصۂ آدم۔ یہ ہے پہلا انقلاب۔ یہ بڑا عظیم انقلاب تھا اور یہ کائنات کے پروگرام کے اندر' تخلیق کے پروگرام کے اندر' ایک بہت بڑا Departure (انحراف) ہے۔ وہ جو خدا کا اگلا انقلاب ہے' اس کی باری تو بہت دیر میں جا کے آنی ہے لیکن چونکہ پہلے

---

[1] شہر لاہور۔ پاکستان۔ کا ایک بہت مشہور بازار۔

[2] شہر لاہور' پاکستان' کا ایک نئی طرز کا جدید رہائشی علاقہ۔

میں دو انقلابات کا کہہ چکا ہوں' اس لیے میں یہ عرض کر دوں کہ انبیاء کا' اس سلسلۂ رشد و ہدایت کو پہنچانا' اس پروگرام پر لوگوں کے سامنے خود عمل کر کے دکھا دینا اور پھر انسان کا اس کائنات میں موجود رہنا' یہ ایک ایسی چیز تھی جس کی ضرورت بھی انسان کے بالغ ہو جانے کی حد تک تھی۔

نزولِ وحی کے سلسلہ میں انسان کا عہدِ طفولیت

عزیزانِ من! جب تک بچہ نابالغ رہتا ہے' انگلی پکڑ کر چلانے والا آدمی' اس کے ساتھ رہتا ہے۔ حتیٰ کہ جب آپ بچے کو انارکلی کے بازار میں بھی لے کر جاتے ہیں تو اسے کہتے ہیں کہ بیٹا! میری انگلی پکڑ نا یا اس کی انگلی پکڑ کے چلنا۔ انگلی چھوٹ جاتی ہے تو وہ بچہ رونے لگ جاتا ہے۔ جب باپ یا ساتھی ذرا آگے چلا جاتا ہے تو وہ بیچارہ بالکل حیران و ششدر ہو جاتا ہے' چیختا چلاتا ہے کہ آپ کہاں چلے گئے' میں کدھر جاؤں۔ نوعِ انسان کو ہدایت تو خارج سے دی لیکن وہ عہدِ طفولیت میں چلا آ رہا تھا۔ بچہ تھا: قدم قدم پہ نبی' ہر قوم میں نبی' ہر قریہ میں رسول' انگلی پکڑ کے چلا رہے ہیں۔ ذرا سے ادھر ہوئے' پھر وہ اسی طرح سے بہک گیا۔ اسے پکڑ کے چلانے والا پھر ایک اور آ گیا۔ انسان چلا جا رہا ہے لیکن انسان جامد تو نہیں ہے' بھیڑ تو نہیں ہے کہ پہلے دن جو پیدا ہوئی آخر تک وہی رہے۔ یہ تو بالغ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اوپر آ رہی تھی۔ بچہ جوان ہوتا چلا جا رہا تھا۔

عزیزانِ من! وہی بچہ جسے آپ انگلی پکڑ کر لے جاتے ہیں اور جب انگلی چھوٹ جاتی ہے تو وہ رونے لگ جاتا ہے۔ جب وہ اٹھارہ بیس سال کا ہو جائے تو پھر تو انارکلی میں ذرا اس کی انگلی پکڑ کے' چل کے' دکھائیں۔ بولتا ہے: ابا جان! کیا کر رہے ہیں؟ مجھے شرم آ رہی ہے' لوگ کیا کہیں گے؟ اب اسے انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہ رہی لیکن ہر دوراہے پر سائن پوسٹ (Sign Post یعنی نشانِ راہ) کی ضرورت تو اب بھی رہے گی۔ بچہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے اگر دوراہے پر سائن پوسٹ نہیں ہے تو اس کا حشر وہ ہوتا ہے جو گلبرگ [1] میں مکان ڈھونڈنے والے کا ہوتا ہے۔ خدا کسی کو یہاں گلبرگ نہ بھیج دے کہ وہ کسی کا مکان ڈھونڈتا پھرے۔ صبح سے شام تک' خدا جھوٹ نہ بلوائے بے شمار لوگ آتے ہیں۔ اس میں چونکہ طلوعِ اسلام کا نام ایک نمایاں سی جگہ ہوتی ہے تو وہ پوچھنے کے لیے چلے آ رہے ہیں کہ صاحب! یہ بتا دیجیے؟ اگر بتائیں بھی تو کون سی چیز کیسے بتائیں۔ یہ جہاں آپ اس وقت درس سن رہے ہیں' 25-B ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ چھبیس اس کے ساتھ ہی کہیں ہوگا۔ لیکن نہیں جی' 26 تو اس کنارے پہ ہے' اور یہ 25 کہیں اس کنارے پہ ہے۔ اس کے بعد وہ پوچھ رہا ہے کہ بھئی! کسی دو کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جی نہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ جو میرے ساتھ والے ہیں' یہ B-1 ہے۔ تو یہ 25-B ہے' سامنے 31 ہے' 26 وہاں دُور ہے۔ پھر وہ پوچھنے والا B-25 میں آ جاتا ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے ٹکریں کھا کے آتا ہے۔ کہتا ہے کہ جی! پوچھو نہیں' مجھے دو گھنٹے ہو گئے۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ 25-B میں تو آ گیا: کہ جی وہ کرنل خلیل صاحب کا یہی مکان

---

[1] شہر لاہور' پاکستان' کا وہ رہائشی علاقہ جہاں پرویزؒ اپنی طبعی زندگی میں رہائش پذیر تھے یعنی B- 25' گلبرگ' لاہور۔

ہے؟ نہیں صاحب! یہ تو نہ خلیل ہے نہ کرنل ہیں۔ کہنے لگے: جی! یہ B-25 لکھا ہوا ہے' پہلے ہماری بھی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی۔ یہاں خیر سے ایک گلبرگ-I ہے' ایک گلبرگ-II ہے' ایک گلبرگ-III ہے' ایک گلبرگ-IV ہے اور ہر ایک میں B-25 ہے۔ لیجیے صاحب:

دکھلا کے اِک جھلک وہ پردے میں چُھپ گئے
اور کہہ گئے کہ یاں سے ڈُھونڈا کرے کوئی

مارو ٹکراں۔ ❶ یہ کیا ہے؟ جی! سائن پوسٹ (Sign Post۔نشانِ راہ) نہیں لگا رکھے۔ یہ سارے جو راستہ ڈھونڈے والے پھرتے ہیں' بالغ ہیں۔ عزیزانِ من! یہ سارے بڑے بڑے پڑھے لکھے ہیں لیکن B-25 نہیں مل رہا۔ کیوں؟ اس لیے کہ سائن پوسٹ نہیں ہے۔ تو جہاں یہ صورت پیدا ہوئی' وہاں پھر انگلی پکڑ کے ساتھ چلانے والا بھی باعثِ ندامت ہوگیا۔ وہ بچہ کہتا ہے: ابا جی! جانے دیجئے ہمیں شرم آتی ہے اور پھر ابا جی کو ضرورت بھی نہیں۔ ہم روز کہتے ہیں کہ بیٹا! انارکلی سے یہ لیتے آنا۔ یہاں انارکلی کے نہ ملنے کا سوال ہی نہیں ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے گلبرگ نہ بنا دیا جائے۔ جب انسانیت' یعنی بچہ طفولیت سے آگے بڑھ کے بلوغت تک پہنچ گیا' انسانیت جوان ہوگئی' وہاں یہ کہا کہ لیجیے! ہم نے Permanent (مستقل) سائن پوسٹ (نشانِ راہ) ہر دوراہے پر لگا دیا ہے اور یہ ایسا ہے کہ **لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (10:64)۔ خدا کا قانون کبھی بدلا نہیں کرتا۔ یہاں کہا کہ ان سائن پوسٹوں (نشاناتِ راہ) میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ یہاں گلبرگ کی صورت میں کہا: دیکھیے! انہوں نے بھی لگا تو دیئے تھے' وہ باہر کا ایک ٹرک آیا تھا' وہ سائن پوسٹ دیکھیے: دوہرا ہو یا پیا ہیگا۔ ❷ اِسے کیا ہوا؟ جی' یہ ادھر کا سائن پوسٹ ہے' بارش آگئی ہے' وہ سائن پوسٹ تو موجود ہے مگر اوپر سے ڈھل گیا ہے' مگر زندگی کے نشانِ راہ کے لیے اس نے کہا کہ نہیں یہ صورت نہیں ہے۔ **اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ** (15:9)۔ اِس قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے۔ ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔

ختمِ نبوت انسانیت کے بالغ ہونے کا اعلانِ عظیم: ایک دوسرا انقلاب

ہم نے یہ سائن پوسٹ (نشانِ راہ) کھڑے کیے ہیں۔ یہ قیامت تک اس کے محافظ ہیں۔ یہ نہ بجھ سکتے ہیں' نہ گر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد کہا کہ اب انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں رہی۔ تمہیں اس کی ندامت ہوگی' بچہ جوان ہوگیا ہے۔ شرفِ انسانیت کا یہ تقاضا تھا کہ وہاں نبوت ختم ہو جاتی۔ عزیزانِ من! انسانیت بالغ ہوگئی۔ یہ خدا کی طرف سے کسی کے لیے سرٹیفکیٹ ہے کہ اب تم بالغ ہو گئے ہو' تم خود راستہ چل سکتے ہو' اب تمہیں انگلی پکڑ کر چلانے والے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

❶ تلاشِ راہ میں ٹکریں مارتے پھرو۔

❷ مڑا پڑا ہے مگر ہے تو سہی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ ختمِ نبوت شرفِ انسانیت کی دلیل ہے۔عزیزانِ من! اس کے بعد یہ عقیدہ رکھنا کہ مامور من اللہ آتے رہیں گے۔ان کا کچھ بھی نام کیوں نہ رکھ لو: باپ نہ سہی' چچا ہی آئے؛ چچا نہ آئے' بڑا بھائی ہی آئے۔یعنی یہ مجدد اور امام اور یہ سب کچھ یہی ہیں۔ چلو جی! اگر نبی نہیں تو یہ سب کچھ یوں آ رہا ہے۔ان مجدد یا امام یا مہدی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔عزیزانِ من! یہ عقیدہ اُس انقلابِ عظیم کے خلاف ہے۔ یہ عقیدہ کہ اس کے بعد انگلی پکڑ کر چلانے والا پھر بھی آئیگا' شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے۔ جسے اس نے بالغ قرار دیا ہے' وہ اس کے باوجود کہتا ہے' کہ نہیں' ہم تو ابھی تک بچے ہی ہیں۔وہ لکھنؤ کے شہزادوں کی اماّئیں جو انہیں گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تھیں' وہ سال کے بھی ہو جاتے تھے تو چل ہی نہیں سکتے تھے۔عزیزانِ من! یہ جو بھی اس قسم کے سہارے والوں کا اعتقاد رکھنے والے ہیں' یہ وہ لکھنؤ کے شہزادے ہیں جو اماّؤں کی گودوں میں پلے ہیں' جنہوں نے اپنے قدموں پر چلنا ہی نہیں سیکھا' وہ اس قدر انہیں صاحبِ بالغ قرار دیتا ہے' یہ اس کے باوجود اپنے آپ کو بچہ ہی کہتے ہیں۔کہتے ہیں: جی نہیں' ہمیں تو کوئی ساتھ لے جائے گا تو چلیں گے۔ہم تو ایسے نہیں جا سکتے۔ارے! وہ تو نہیں آ رہا مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں آ رہا تو کیا ہوا' ہم کھڑے ہیں' انتظار کر رہے ہیں' کبھی تو آئے گا۔ہم چلیں گے نہیں' یہ آئے گا۔''اے سارے' ای بابے آئے ہوئے ہیگے نے۔کدی کوئی قادیان وچ' کدی کوئی ایران وچ۔آئے جارہے ہیں۔''❶ کسی بیگار کیمپ کے اندر' کسی درگاہ کے اندر' یہ چلے جارہے ہیں۔تو پھر ایسے بچے کا وہی حال ہوگا۔وہ اپنے قدموں پہ کبھی کھڑا نہیں ہو سکے گا۔آپ کسی بچے کو دوراہے پہ چھوڑ کے دیکھ لیجیے۔کھڑا رو رہا ہوگا۔کہا: انتظار کر رہا ہوں جی' کسی کے ساتھ چلنے والے کا۔او میرے بیٹے! ٹھیک ہے' میں تمہارا ساتھ دیتا ہوں۔لہٰذا وہ اس کو ٹافی بھی دیگا۔ عقیدت مندی کا آپ نے سمجھ لیا' وہ رومال بھی اس کے ناک پہ رکھے گا کہ سونگھا اسے۔ابھی تک تھوڑا بہت ہوش ہے تو وہ بھی ختم ہو جائے گا۔پھر اسے درگاہوں میں لے جائے گا' یہ عقیدہ انسانیت کی راہ میں حائل ہے۔وہ اسے بالغ ہونے ہی نہیں دیتا۔

عزیزانِ من! یہ پہلا انقلاب تھا کہ انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا۔اس سے قبل خارجی کائنات میں کوئی مخلوق بھی صاحبِ اختیار و ارادہ نہیں تھی۔ یہ کائنات کا وہ انقلابِ عظیم تھا جو اس کارگہہِ حیات میں پہلی روشِ حیات سے Departure (انحراف) کی صورت میں آیا۔

اس کے بعد دوسرا انقلاب یہ تھا کہ اتنے عرصے تک ایک ہی روش پہ انسان چلے آ رہے ہیں' اللہ تعالیٰ انبیاء بھیجتا چلا جا رہا ہے: ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا علیٰ ہذا القیاس۔وہ ہر قوم میں' ہر ملک میں' ہر زبان میں' ہر قریئے میں' یکے بعد دیگرے نبی بھیجتا رہا۔ بچے کے لیے بڑی ضرورت تھی کہ ایسا انتظام ہو جائے تاکہ وہ بالغ ہو جائے۔اگر یہ نہ ہوتا تو خدا کی طرف سے بڑی زیادتی تھی' اور سارا کچھ کرنے کے بعد اگر یہ قیامت تک اس کو ایسا ہی رکھتا تو یہ اپنے پاؤں پہ کھڑا ہی نہ ہوتا۔خدا نے کہا ہے کہ یہ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ (5:97)

---

❶ یہ سارے ہی بابے آئے ہوئے ہیں: کبھی کوئی قادیان سے آیا' کبھی کوئی ایران سے آیا۔یہ اب بھی آئے چلے جا رہے ہیں۔

ہے۔ مقصود یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔ کوئی فرد یا قوم' کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو نوعِ انسان کا بالغ ہونے کا وقت ہی نہ آتا۔ انسانیت کھڑے ہونے کے قابل ہو گئی ہے' بچہ بالغ ہو گیا۔ بالغ ہونے کے بعد بھی اگر وہ سلسلہ جاری رکھتا' یہ بچہ شرفِ انسانیت سے عاری ہو جاتا۔ وہاں آنے کے بعد یہ کہہ دیا کہ اب اس کی انگلی پکڑ کر چلانے والا کوئی نہیں آئے گا۔ یہ ہے تمہارے ہاں کا راستہ! یہ ہیں اس پہ لگے ہوئے سائن پوسٹ۔ لو' اب **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** (18:29)۔ جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اِس سے انکار کر دے۔

آج بھی دنیا کا ہر مذہب ایک آنے والے کی انتظار میں کھڑا ہے

عزیزانِ من! اب یہاں **فَمَنْ شَآءَ** (18:29) والی بات آ گئی۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ارادے سے' اپنے اختیار سے' راستہ نہیں چلیں گے بلکہ کوئی بتانے والا آئے گا تو پھر چلیں گے۔ وہ نہیں آ رہا' یہ انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ کہ اس کے باوجود دنیا کی ساری قومیں اس آنے والے کے انتظار میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوراہے پہ کھڑا ہوا ہے' انتظار کر رہا ہے: ویدک کے ہندو ''کلنکی اوتار'' کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آخری دَور یعنی 'کلجگ[1] کے بعد وہ قیامت میں آئے گا۔ بدھ مت[2] والے ایک آخری ''متیا'' کا انتظار کر رہے ہیں۔ آخر میں وہ آئے گا' یہ دوراہے پہ کھڑے ہیں صاحب! جین مت[3] والے ایک آخری اوتار کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ بھی آئے گا۔ یہ مجوسی جسے پارسی کہتے ہیں' مصرا (Mittra) یا مترا[4] کا انتظار کر رہے ہیں اور ''مصرا'' تو وہی عیسائیوں کا مسیح ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آسمان پہ گیا ہوا ہے' وہاں سے آئے گا۔

میں یہاں آپ کو ایک عجیب بات بتا دوں۔ میں عیسائیوں کے ہاں کا عقیدہ بتاتا ہوں۔ ان کے ہاں دو تین فرقے تھے۔ ایک فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ اسی شکل میں' جیسے گیا ہے' ویسے ہی آسمان سے نازل ہو گا۔ ان کا جو دوسرا فرقہ تھا' اس نے کہا کہ وہ اسی شکل میں نہیں آئے گا' اس کا ''بروز'' آئے گا۔ ان کے ہاں کا یہ لفظ ہم نے ورثہ میں لیا ہے۔ یہ کسی کے ''بروز'' کا یا اوتار کا یا حلول کا مجوسی عقیدہ ہے۔ بہر حال وہ بھی انتظار میں کھڑے ہیں کہ کب وہ آئے گا۔ یہودی ایک آنے والے ''مسیحا'' کے انتظار میں ہیں' وہ آئے گا۔ جو مسیح کو مانتے ہیں' انہوں نے اسے ماننے کے باوجود آگے بھیج دیا کہ ''نہیں صاحب! ہم انتظار میں کیوں نہ رہیں۔ آپ ابا جان کچھ دنوں کے لیے کہیں تشریف

---

1. آخری زمانہ جس کے خاتمے پر بقول ہندو علما یہ دنیا فنا ہو جائے گی۔ اسے سنسکرت میں کل یُگ بھی کہتے ہیں۔
2. بدھ مت کے بانی' مہاتما گوتم (بدھ) قریب 560 ق م میں پیدا ہوئے۔ قریب اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ کی سب تعلیم زبانی ہے۔ اپنی وفات کے وقت انہوں نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔
3. جین مت کے بانی مبانی مہاتما ویر ہیں۔ یہ مہاتما بدھ کے ہم عصر تھے۔
4. مترا کے معتقدین توسّل اور شفاعت' کفارہ اور ایک نجات دہندہ پر ایمان رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ آخری زمانہ میں پھر دنیا میں آئے گا۔

لے جائیں ورنہ یہ لوگ کہیں گے کہ صاحب! یہ جو سارے باقی ہیں وہ تو ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم کیوں نہیں؟'' تہاڈا اَون والا ای کوئی نہیں ہیگا۔ تہاڈا اگا پچھا ای کوئی نئیں ہیگا۔ فٹے منہ تہاڈا۔ او چنگا پلا جیہڑا نال ہیگا سی ناں' اونوں کیا پئی تُو ٹر جا تھوڑے دناں واسطے کتے۔ تسی ابا جی! کتے چلے جاؤ۔ کتھے چلیا جاواں میں اس عمر اچ؟ اوناں نے کیا کہ اگر زمین تے تھاں کوئی نئی لبدی' تے آسمان تے چلے جاؤ ❶ (معاذ اللہ معاذ اللہ) میں ان کے ہاں کی باتیں کر رہا ہوں۔ اُس ❷ کے ماننے والے ❸ بھی انتظار کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے' جس نے آ کے یہ کہا تھا کہ انسانیت بالغ ہو گئی' اب کسی انگلی پکڑنے والے کی ضرورت نہیں' لہٰذا اب میں جا رہا ہوں' یہ کتاب مقدس (قرآنِ کریم) محفوظ اور مکمل ہو گئی۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) اور تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (6:116) یہ محفوظ ہے' یہ میں دیئے چلا جا رہا ہوں' اور اس کے بعد اب تم کسی آنے والا کا انتظار نہ کرو۔ لہٰذا یہ کہہ کے جانے والا چلا گیا لیکن جس کو یہ تعلیم دی گئی یہ بھی انتظار میں کھڑے ہیں۔ وہ تو کسی ایک کا ہی انتظار کر رہے ہیں' اے تے ٹبر دا انتظار کر دے پئے ہیگے۔ ❹ تو یہ بھی اس انتظار میں کھڑے ہیں۔

زندگی بھر انتظار کرنے والی قومیں ہمیشہ سوئی رہتی ہیں

عزیزانِ من! جتنی بھی انتظار کرنے والی قومیں ہیں' ہمیشہ عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہیں۔ آج اپنے اپنے مقام پہ جامد ہو کے کھڑی ہیں' دنیا میں جتنی قومیں آگے بڑھی ہوئی ہیں' وہ سب وہ ہیں' جنہوں نے یہ تصورات چھوڑ دیئے۔ انہوں نے مذہب چھوڑا تو دین بھی چھوڑ دیا' قصہ ہی ختم کر دیا لیکن بہرحال یہ کسی آنے والے مسیحا' یا مہدی یا مجدد کے انتظار میں نہیں رہے۔ چل پڑے' خواہ وہ غلط راستوں پہ ہی سہی' چل تو پڑے۔ کیا کرتے؟ تیرا پتہ نہ پائیں تو لاچار کیا کریں۔ انہوں نے یہ کہا کہ اس کھڑے رہنے سے' انتظار کرنے سے' رونے سے' تو اچھا ہے کہ چل تو پڑو۔ بہرحال' غلط راستہ ہی سہی' صحیح راستہ کبھی مل ہی جائے گا۔ ساری دنیا میں جو قومیں مذہب کو چھوڑ کے چلی ہوئی ہیں' بہرحال چلنے والی تو ہیں۔ اور قرآن نے کہا کہ یاد رکھو! بیٹھا رہنے والا کبھی چلنے والے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ غلط ہی سہی' چل تو پڑا۔ رومی بڑی صحیح بات کہہ گیا ہے۔ وہ بھیسِ مثنوی میں صحیح بات بھی کہہ جاتا ہے: کوشش بیہودہ بہ از خفتگی۔ غلط کوشش ہی سہی' بہرحال سویا رہنے سے تو پھر بھی اچھی ہوتی ہے۔ یہ جتنی انتظار والی قومیں ہیں' سب سوئی ہوئی ہیں۔ ان کو جاگنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ رو رہے ہیں اور اس کے بعد ان کے ہاں یہ ہے کہ جب وہ آئے گا تو وہ خود اٹھا دے گا' تو چل پڑیں گے۔ اس کے بغیر تو ہم نے چلنا ہی نہیں ہے' تو

---

❶ آپ کا تو کوئی آنے والا ہی نہیں ہے' آپ کے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ تف! حیف تم پر۔ وہ جو اچھا بھلا ان کے ساتھ تھا' اُسے کہا کہ چند دنوں کے لیے تم کہیں چلے جاؤ: ابا جی! آپ کہیں چلے جائیں۔ میں اس عمر میں کہاں چلا جاؤں؟ انہوں نے کہا کہ اگر روئے زمین پر کوئی جگہ نہیں ہے تو آسمان پر چلے جاؤ۔

❷ اشارہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین کی طرف ہے۔

❸ یعنی آج کے مسلمان بھی

❹ یہ تو پورے قبیلے ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

جا گیں کا ہے کے لیے' چلیں کا ہے کے لیے؟

عزیزانِ من! اس مقام پر جو قوم کھڑی ہو' وہ تو مذہب پرست قوم ہو جاتی ہے۔ بساطِ زندگی میں یہ قوم ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھاتی۔ کرتی ہی کچھ نہیں۔ راستے میں بیٹھی کہتی ہے کہ ہمیں پتہ نہیں ہے وہ بتانے والا آئے گا۔ اب تماشا یہ ہے کہ ان میں سے جو آگے آتا ہے' تو ہر ایک کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر میں آئے گا۔ دنیا کے آخری حصے میں کلنکی اوتار آئے گا۔ ہر آنے والا اپنے مذہب کو دوسروں کے مذاہب پر غالب کرے گا۔ تو اب آپ ذرا نقشہ ذہن میں رکھیے کہ ویدک دھرم والے کا کلنکی اوتار آئے گا وہ ویدک دھرم کو غالب کرنے کے لیے آئے گا' بدھوں کا مسیحا ''متیا'' آئے گا' وہ بدھ مت ❶ کو غالب کرنے کے لیے آئے گا۔ یہ وہی ہے جنہیں ان کلنکی اوتار والوں نے نکال باہر کیا ہوا ہے۔ جینیوں کا آخری اوتار آئے گا وہ جینیوں ❷ کو غالب کرنے کے لیے آئے گا۔ اس کا اور بدھ مت کا آپس میں سخت ٹکراؤ تھا۔ مجوسیوں کا مصرا (Mithra) یا مترا آئے گا' وہ مجوسیوں کے مذہب کو تمام مذاہب پر غالب کرنے کے لیے آئے گا۔ یہودیوں کا مسیحا آئے گا' وہ یہودیت کو غالب کرنے کے لیے آئے گا۔ عیسائیوں کا مسیحا آئے گا' وہ عیسائیت کو بلند کرنے والا ہوگا۔ آپ کا آنے والا آئے گا' وہ اسلام کو غالب کرنے والا ہوگا۔ جب یہ سارے ایک ہی جگہ' ایک ہی وقت میں اکٹھے ہو جائیں گے' تو پھر کیا ہوگا؟ وہ کہتے یہی ہیں کہ صاحب! یہ قربِ قیامت پر آئیں گے ''قیامت تے آپ ای آ جائے گی۔ اوہدا نتیجہ ای اے ہونا کہ کسے نیں وی نئیں رہنا ایتھے۔ اوایڈے ایڈے سن' سارے اک واری کٹھے ہو جان' تے اپنا اپنا مذہب اوناں نے کرنا ہوئے غالب' تے کی حال ہوے گا۔ قیامت توں پہلے ای قیامت نہ آ جاوے گی ❸۔''

مذہب اور دین کا بنیادی فرق

عزیزانِ من! یہ مذہب ہے اور یہ ہے اس کی تفسیر۔ دراصل آپ کوئی مذہب کہہ دیجیے' وہ ایک ہی مقام پہ ہوتا ہے سوائے اس کے کہ اس کے ہاں صرف نام یا الفاظ بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ❹ دین یہ ہے جس نے بتایا کہ انسان بالغ ہو گیا ہے' اس کی کوئی فطرت

---

❶ یاد رکھیے کہ بدھ مت درحقیقت ردعمل تھا ''برہمنوں کے استبداد اور ان کے رسوم و رواج پر مبنی مذہب کے خلاف''۔ (پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' (ایڈیشن پانچواں)' 1996ء (بلا ترمیم)' ص۔ 117۔

❷ جین مت بھی برہمنیت (ہندو مت) کے خلاف صدائے احتجاج تھا اور اس کی تعلیم بدھ مت کے بھی خلاف تھی۔

❸ یہ سب کچھ تو خود ہی قیامت ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں کوئی بھی نہیں رہے گا۔ وہ اپنی بڑی بڑی قد آور شخصیات تھیں۔ جب وہ سبھی یہاں اکٹھے ہو جائیں گے اور اپنے اپنے مذہب کو غالب کرنے لگیں گے تو قیامت تو خود ہی آ جائے گی۔

❹ مثلاً وید میں جو مفہوم ''منتر'' کا ہے' وہی مفہوم ''اوستا'' میں ''منتھر'' کا ہے۔ اوستا میں جس چیز کو ''ہوما'' کہا گیا ہے اس کو وید میں ''سوما'' کہا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں' 1996' ص۔ 84۔ اور پھر آپ یہ بھی دیکھیے کہ [باقی اگلے صفحے پر]

نہیں' انسان صاحبِ اختیار وارادہ ہے' اس کے بعد اس کو مستقل راہنمائی دی دی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ اب تو جو راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے' اختیار کر لے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ غلطیاں بھی کرے گا' غلط راستے پہ بھی چلے گا لیکن اس کا جو شرفِ انسانیت ہے یہ اس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اب یہاں سے بات سمجھ میں آئے گی۔

میں نے پچھلے درس میں' پچھلی آیت (20:114) میں' یہ کہا تھا کہ قرآنی پروگرام پر عمل کرنے کے سلسلہ میں' اے رسول! اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جب تک (کسی معاملہ کے متعلق) وحی کی رو سے مکمل ہدایات نہ مل جائیں' اس میں عجلت نہیں کرنی چاہیے بلکہ انتظار کرنا چاہیے کہ تمہارے علم میں اضافہ ہو جائے (تو پھر قدم اٹھانا چاہیے)۔ المختصر کہا یہ تھا کہ قرآن کے مطابق اپنا پروگرام متعین کرو۔ وحی کا علم حاصل کیے بغیر یا اس کے حصول کے بعد' اسے چھوڑ کر' اپنے جذبات کے تابع چلنے سے کس قدر نقصان ہوتا ہے' اسے مختلف مقامات پر' قصہ آدم کے تمثیلی انداز و بیان میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہ قصہ کسی فرد کی داستان نہیں بلکہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اب اگلی آیت میں کہا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (20:115)۔ ہم نے آدم سے کہہ دیا تھا کہ وحی کی رہنمائی کو نہ چھوڑنا۔ اصل یہ ہے کہ ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہ پائی۔ یہ انسان کا پہلا کمزور پہلو ہے کہ اس کے عزم میں بالعموم پختگی نہیں پائی جاتی۔ یہ کمزوری ایمان سے رفع ہو سکتی ہے۔ کیا ربط ہے دونوں آیات کے اندر! کہ تمہیں پتہ ہے قرآن کی ضرورت کیوں پڑی تھی؟ اس کے لیے ذرا قصۂ آدم کو سامنے لاؤ۔ یہ با ارادہ و اختیار مخلوق پیدا ہوئی تھی' اس کی کوئی فطرت نہیں تھی' اسکے اندر کوئی راہنمائی نہیں تھی' اسے خارج سے راہنمائی دی جانی تھی' چنانچہ راہنمائی دیتے چلے گئے۔ وہی راہنمائی اب تمہارے پاس آئی ہے۔ لہٰذا آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس قرآن کے نزول کی آیت (20:114) اور قصہ آدم کی آیت (20:115) کے اندر کتنا بڑا گہرا ربط ہے۔ وہ ابتداء کے لیے تھا' یہ انتہا کے لیے ہے۔ کڑی تو وہی ایک ہی ہے' بات تو وہیں سے شروع کی ہے: انسان کا صاحبِ اختیار وارادہ ہونا۔ وحی کی راہنمائی کی' انبیاء کی ضرورت ہی' اس لیے پڑی۔ تو یہ ہے لُم' عزیزانِ من! قصۂ آدم کی۔

قرآن کریم نے کہا کہ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (20:115)۔ چنانچہ کہا یہ گیا ہے

[گزشتہ سے پیوستہ] ہندو مسلمان کی تفریق مٹانے والے ایرانی درویشوں' فقیروں اور صوفیوں کی یلغار بھی ہوئی جو تاتاریوں کے حملے سے بلخ بخارا اور خراسان چھوڑ کر بھاگے تھے اور مسلمان جوگی بن کر سارے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے جسے تصوف کہا جاتا ہے۔ اِن میں ہندو بھی شامل ہو گئے جن میں گرو نانک قابل ذکر ہے۔ یہ غالباً 1292ء میں پیدا ہوا۔ اُس نے ویدوں کی مخالفت کی اور کہا کہ:

ویدپڑہت برہما مرے چاروں وید کہانی سنّت کی مہماوید نہ جانے برہم گیانی آپ پرمیشور

یعنی وید بنانے والے برہما مر گئے اور چارون وید ایک کہانی ہو گئے۔ سنّت (صوفی) کو ویدوں کی ضرورت نہیں وہ تو خود برہم گیان (تصوف) یا ہمہ اوست سیکھ کر خدا بن جاتا ہے اور یہی بات مسلمان صوفی بھی کہتے تھے کہ خدا ان میں حلول کرتا' سماتا ہے اور انا الحق (میں خدا ہوں) کا نعرہ بلند کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی نکتے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: صدیقی' عزیر احمد (مرتب): ہندو مذہب کی تاریخ اور ہندی مسلمان' کراچی' 2000ء۔

کہ آدمی کی سرگزشت ملاحظہ فرمایئے۔ ہم نے اسے راہنمائی بھی دی' اس نے اِسے قبول بھی کرلیا' عہد بھی ہوگیا کہ ٹھیک ہے' ہم اس آدم کی اولاد ہیں جنہوں نے عہد کیا تھا کہ ٹھیک ہے جی ہم نے قبول کرلیا تھا مگر ہوا یہ کہ **فَنَسِيَ** (20:115)۔اس نے اس عہد کو ترک کردیا' اسے چھوڑ دیا۔اس لفظ کے عام معنی تو ''بھول جانا'' کیا کرتے ہیں لیکن بھول جانا تو کوئی معصیت نہیں ہوتی۔یہ تو کوئی اتنا بڑا جرم نہیں ہوتا۔معصیت تو بالارادہ کسی کی خلاف ورزی کرنا ہوتی ہے کہ ہم اسے نہیں مانتے۔بھول جانے پر مواخذہ نہیں ہوسکتا۔نیز یاد رکھنے کے لیے عزم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ❶ اِس لفظ نَسِيَ کا مادہ (Root) ن س ی ❷ ہے۔یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے معنی صرف ''بھول جانا'' ہی نہیں ہوتا' اس کے معنی ''کسی چیز کا ترک کردینا'' بھی ہوتا ہے' ''پیچھے پھینک دینا'' بھی ہوتا ہے۔اب یہاں نَسِيَ کے معنی بُھلا دینا نہیں ہے' بھول جانا نہیں ہے۔اس کے معنی ہیں: ''عمداً کسی چیز کو ترک کردینا' معصیت کرنا' انکار کردینا' سرکشی کرنا۔''

عزیزانِ من! یہ کیسے ہوا؟ اِس کی تائید میں قرآنِ کریم کی دو ہی آیتیں آگے آتی ہے کہ **عَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ** (20:121)۔اس طرح انسان نے اپنے نشو ونما دینے والے سے سرکشی اختیار کی۔تو یہاں نَسِيَ کی تفسیر تو خود قرآن نے عصٰی کہہ کے کردی تو اس طرح یہ معصیت تھی۔کوئی چیز دو طرح سے ترک ہوسکتی ہے: (1) بھول جانے سے بھی ہوسکتی ہے اور (2) ارادے سے اس کو چھوڑ دینے سے بھی ہوسکتی ہے۔یہاں عصٰی کہہ کے یہ بات کہدی کہ یہ بھول جانا نہیں تھا۔بھول جانا ایک ایسی لغزش ہے جسے قرآن نے '' لَــمَــمَ '' ❸ (53:32)۔کہا ہے۔یہاں مومن کی جو Definition یا خصوصیات ہیں' اس میں یہ کہا ہے کہ **يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ** (53:32)۔وہ لوگ بڑی بڑی لغزشوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں۔وہ اس قسم کے جرائم' سرکشی' معصیت سے ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں اور اس کے بعد اسی آیت کا اگلا حصہ استثنا کی بات بتاتا ہے کہ **إِلَّا اللَّمَمَ** (53:32) بجز اُن غلطیوں کے جو انسان سے کبھی کبھار بلا ارادہ سرزد ہوجائیں۔ایسی غلطیاں معصیت نہیں ہوتیں' معصیت کے قریب ضرور لے جاتی ہیں۔لیکن یہ بھول چوک کی چھوٹی چھوٹی لغزشیں ہو ہی جاتی ہیں۔اس لیے ان کی بابت بھی احتیاط برتنی چاہیے کہ بار بار نہ ہوں۔غور کیجیے! قرآن' نفسیاتی اصلاح کے لیے کس قدر تدریجی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ایک دم سختی نہیں کرتا اور پھر کیا بات ہے اس خدا کی! کہ بھول تو وہ

---

❶ دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم (باراول) 1961ء ص۔1617

❷ نِسْيَانٌ کے اصل معنی ''ترک کردینے اور چھوڑ دینے'' کے ہیں۔امام راغب اصفہانی نے اپنے مشہور قرآنی الفاظ کے لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ہوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے نِسْيَانٌ کہتے ہیں۔یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا۔ترک کردینا۔

❸ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی اہم کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ لَمَّهُ يَلُمُّهُ لَمًّا کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے' قریب قریب ہونے اور ملا ہوا ہونے کے ہیں۔''قریب ہونے'' کے اعتبار سے اَلَمَّ الرَّجُلُ کے معنی ہیں: آدمی گناہ کے قریب ہوگیا۔یعنی اس کا مرتکب تو نہیں ہوا البتہ اس کا ارادہ کر لیا تھا۔بعض نے کہا ہے کہ لَمَمْ کے معنی یہ ہیں کے انسان کبھی کبھار کوئی غلطی کر بیٹھے لیکن اس پر اصرار نہ کرے۔اس سے اس کے معنی بھول چوک کرنے کے ہوگئے کیونکہ اس میں کسی کام کا بلا ارادہ ہونا پایا جاتا ہے۔

ہے جس کے لیے ان کی نگاہیں منزلِ مقصود پر اور دل میں مچلتی ہوئی یہ آرزوئیں ہوں کہ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا (2:286)۔ بارِالٰہا! اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے یا نشانہ خطا ہو جائے تو ہماری یہ چیز نشو و نما کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اگر ہم سے بھول چوک سے کوئی بات ہو گئی ہو تو ہم سے اس پر مواخذہ نہ ہو۔ لیکن جو عصٰی کی بات ہے وہ تو معصیت ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ یہاں جو نَسِیَ ہے وہ عَصٰی ہے، وہ بھول چوک نہیں ہے، وہ کسی چیز کا "ترک کر دینا" ہے۔ یہ معصیّت ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عزم کی اہمیت

عزیزانِ من! اب بات یہ ہوئی کہ وَلَقَدۡ عَهِدۡنَاۤ اِلٰٓى اٰدَمَ (20:115)۔ ہم نے آدم سے کہہ دیا تھا کہ وحی کی راہنمائی کو نہ چھوڑنا۔ اس نے اس کا عہد کر لیا تھا، اسے قبول کر لیا تھا۔ فَنَسِیَ (20:115) لیکن اس نے اسے چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نے (عھدنا) عہد تو کر لیا تھا، وعدہ کر لیا تھا، اقرار کر لیا تھا۔ اس اقرار کے باوجود اس نے اسے ترک کر دیا۔ یہ کیوں ہوا؟ کہا کہ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا (20:115)۔ ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔ اس سے نظر آیا کہ اِس عہد و اقرار کے بعد، عزم کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ عزم ساتھ ہو تو آدمی اس پر قائم رہتا ہے۔ وہ جو عربوں نے عمل میں التزامًا کی شرط لگا رکھی تھی، اس میں وہ عزم ہونا چاہیے تو بڑی اہم چیز عزم ہے۔ عزم کی بنیاد تو پختہ یقین پہ ہوتی ہے اور اس کے بعد پختگیٔ عمل اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا ہے کہ شَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ (3:158) اے رسول! اپنے رفقاء کے ساتھ، ان معاملات کے اندر، مشورہ کیا کرو۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا پھر صرف مشورہ ہی کرتے رہا کرو اور اگر مشورے کے بعد کوئی فیصلہ ہو گیا تو کیا اُسے چھوڑ دو، اس پر عمل نہ کرو؟ کہ جی ٹھیک ہے وہ قرارداد پاس ہو گئی جو ہمارے ہاں ہوتا ہے۔ قرارداد پاس ہو گئی تو بس چلے آئے "گھر اں نوں"۔[1] بیسیوں، سینکڑوں، ہزاروں، قراردادیں پاس ہو چکی ہیں۔ تو کیا شَاوِرۡهُمۡ (3:158) کے بعد زیادہ سے زیادہ آپ باہمی مشاورت سے قرارداد پاس کرو گے؟ نہیں، بلکہ آپ فیصلہ کرو گے کہ یہ چیز یوں ہونی چاہیے۔ پھر آگے ہے کہ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ (3:158)۔ پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کر کے، اپنے فیصلے پر کاربند رہو۔ اس طرح بات یہ ہوئی کہ جب اس کے بعد تُو فیصلہ کر لے، تو اس کام کے لیے عزم کر لے، یہاں مشاورت کے بعد صرف فیصلہ ہی نہیں کیا بلکہ عَزَمۡتَ (3:158) کہا ہے یعنی جب اس کے بعد تُو پختہ ارادہ کر لے تو پھر قانون کی محکمیت پر کامل بھروسہ کرتے ہوئے چل پڑ، اس فیصلے کو روبہ عمل لاؤ، یہ عزم کی بات ہے۔

اولوالعزم ہونا انبیاء کرام کا خاصہ تھا

عزیزانِ من! عزم بہت بڑی خصوصیتِ کبریٰ ہے جو قرآنِ کریم نے بتائی ہے۔ انبیاء کرام تو اولوالعزم ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ

---

[1] گھروں کو (چلے آئے)۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ (3:158)۔اے رسول! تمہارا عزم پختہ ہونا چاہیے۔ایسا پختہ کہ جب باہمی مشاورت کے بعد تم کسی بات کا فیصلہ کرلوتو پھر قانونِ خداوندی پر پورا پورا بھروسہ کرکے اپنے فیصلے پر کار بند رہو۔اولوا العزم ہونا قرآنِ کریم نے انبیاء کرام کا خاصہ کہا ہے۔رسول اللہ ﷺ سے فرمایا ہے کہ فَاصْبِرْ (46:35)۔استقامت سے جم کے کھڑے رہو۔کہیں تہاڈی [1] کشتی ڈولنے نہ پائے۔میں نے کہا تھا کہ صبر کے معنی ہوتا ہے: کسی چیز کا ڈول نہ جانا۔صبورٗ اوہ بڑا پتھر ہوتا ہے جو کشتی میں رکھ دیا جاتا ہے تاکہ وہ موجوں کے تلاطم سے کسی بھی طرح ڈانواں ڈول نہ ہوجائے۔صبر کے یہ معنی ہوتے ہیں۔کہا کہ فَاصْبِرْ (46:35)۔استقامت دکھا۔سوال یہ تھا کہ کیسے؟ اس کے لیے کہا کہ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (46:35)۔جس طرح ہمارے دوسرے رسول جو بڑی ہمت اور عزیمت کے مالک تھے اپنے پروگرام پر استقامت سے جمے رہے تھے۔تُو بھی اس طرح کی استقامت دکھا۔یہ ویسی ہی ہے جیسے کہ اولوا العزم رسولوں نے استقامت دکھائی ہے۔تجھے بھی ویسی استقامت دکھانا ہے جم کے کھڑے ہوجانا ہے۔یہ عزم کا لفظ ہے جو قرآن نے کہا ہے۔اصل میں تو جیسے مشاورت کے بعد میں نے کہا ہے کہ یوں کہہ لیجیے کہ صرف ایمان تو ایک قرارداد ہے جو آپ نے پاس کی ہے۔اب اس قرارداد کے بعد عمل کرنا ہے اور عمل کے اندر استقامت ہے یقینِ محکم ہے اور عملِ پیہم ہے۔یہاں آپ عمل کے ساتھ پیہم کا لفظ دیکھتے ہیں۔یقین کے ساتھ محکم ہے عمل کے ساتھ یہ پیہم عزم ہے اور پیہم عمل اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ آپ کا عزم ہو ورنہ یہ دو دو چار چار قدم چلنے والے تو آپ کو سینکڑوں ہزاروں لاکھوں ملیں گے۔ہنگامی طور پہ جو کچھ بھی آپ کے ہاں شورشیں برپا ہوجاتی ہیں اس وقت تو ایسا نظر آتا ہے کہ کل ہی تختہ الٹ کے رکھ دیں گے لیکن یہ جھکڑ کی طرح اٹھتے ہیں اور بگولے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔کیا بات ہے! اس میں عزم نہیں ہوتا۔یہی صبر اور عزم ہے جسے استقامت کہہ کے پکارا گیا ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (41:30)۔جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہوجاتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی۔یہ ہیں وہ لوگ جو اولوا العزم ہیں۔انہیں صاحب عزیمت ہونے سے کیا ملتا ہے؟ کہا کہ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (41:30)۔ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔وہ آ کے کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ ایک نفسیاتی تغیر پیدا کرتے ہیں۔یعنی خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان سے کہتی ہیں کہ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (41:30)۔نہ خارجی قوتوں سے خوف کھاؤ نہ کوئی افسردگی اور درماندگی تمہارے دل کے اندر پیدا ہو۔کیوں یہ خوف و حزن اور افسردگی و درماندگی اور دل گرفتگی نہیں؟ کہا کہ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30) یہ ملائکہ یعنی خدا کی کائناتی قوتیں اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تمہارے لیے اس جنتی

---

[1] آپ کی

معاشرہ کی خوش خبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ وہ ان کے سامنے اس جنت کو لے آتے ہیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ رہی تمہارے سامنے منزل! منزل بھی اتنی حسین اور خوشگوار اور راستہ وہ کہ جس پر کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہے' دل گرفتگی [1] نہیں ہے اور کہتے بھی یہ ہیں کہ اس پہ استقامت سے چلو' یہ صراطِ مستقیم ہے۔

صراط کے ساتھ مستقیم کا لفظ کیوں؟

عزیزانِ من! یہاں لفظ تو ''صراط'' ہی کافی تھا' صراط بھی سیدھے راستے کو کہتے ہیں پھر کہا کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5)۔ یہاں سوال یہ ہے کہ صراط کے ساتھ ''مستقیم'' کیوں ہے؟ ہمارے ہاں اِن دونوں کا ترجمہ ہی یہی ہے کہ ''دکھا ہم کو راہ سیدھی۔'' ارے ٹھیک ہے تو پھر اس صراط کے ساتھ مستقیم کا ہے کے لیے ہے؟ عزیزانِ من! یہ اس لیے ہے تا کہ ہم استقامت سے اس راہ پر چلتے رہیں۔ صراط وہی مستقیم ہوگی جس پہ آپ استقامت سے چلیں گے' ورنہ جو سیدھی راہ ہے وہ ہوا کرے۔ اگر آپ نے چار قدم چلنے کے بعد بیٹھ ہی جانا ہے تو اس صراط کا سیدھا ہونا آپ کے لیے کیا فائدہ مند ہوگا۔ وہ تو اسی صورت میں فائدہ مند ہے کہ راستے میں اِدھر اُدھر پھر کے کوئی آپ کو بہکائے نہیں' وہ منزل تک پہنچنے کی راہ سیدھی تو ہو اور پھر آپ اس پر استقامت سے چلتے چلے جائیں۔ یہ ہے وہ مقدس آرزو اور حسین تمنا جو سکھائی گئی ہے کہ اِهْـدِنَـا الـصِّـرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5)۔ اے بارِ الہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آجائے جو ہمیں بلا خوف و خطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔ بہر حال' حق وصداقت سے انکار کرنے والوں کی بات کے برعکس کہا یہ گیا کہ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (41:30)۔ جو لوگ اپنے اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں پیدا کرتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے (خدا کی کائناتی قوتیں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لیے باعثِ تقویت بنتی ہیں) اور اس طرح ان سے کہتی ہیں کہ تم کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لیے اس جنتی معاشرہ کی خوش خبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ عزیزانِ من! اس طرح انہیں جنت کی بشارت دے دی۔

ہمارے ہاں کے اولیا اللہ

آپ کے ہاں اب جتنے بھی اولیاء اللہ بنتے ہیں' کہتے ہیں کہ ان پر ملائکہ آتے ہیں اور وہی یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہاں تو بھوکے رہو' ننگے رہو' گدڑی پوش رہو' چالیس چالیس دن کے بعد ایک جَو کھایا کرو' پانی کا گھونٹ پیا کرو' تمہاری اس دنیا کی یہ زندگی ذلیل اور خوار و رسوا ہونی چاہیے۔ کیوں؟ کہا کہ جتنا کوئی یہاں ذلیل ہوگا' اتنا ہی قیامت میں مقرب خدا ہوگا۔ مقربین بارگاہِ الٰہی کی

---

[1] غم' رنج

علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ (بقول ان کے) یہاں وہ بڑے مفلس، قلاش، مصیبت زدہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کی اُسی طرح آزمائش کرتا رہتا ہے جس طرح کبھی شبہ گزرنے پر آپ کسی دوست کی دوستی کی آزمائش کرتے ہیں: دیکھیں تو سہی یہ دوستی کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس کے ذمے آپ کوئی ایسا کام لگا دیتے ہیں: کوئی ذرا سخت سا صبر آزما سا کام کہ اسے دیکھتے اور آزماتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں کہ ذرا آزما کے تو دوستوں کو دیکھ لیا کرو۔ دوسرا بھی کہتا ہے کہ صاحب! ایسے کہتے ہو کبھی ہمیں آزما کے بھی دیکھیے۔ جس دوست کی دوستی پہ یقین ہوتا ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ آپ کو کیا آزمانا ہے، آپ کی ساری زندگی آزمائی ہوئی ہے، ہمارے سامنے ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے مقرب بندوں کو آزماتا رہتا ہے: تے ایویں گدڑی پیندے ہیگے نیں۔ ❶ کہا جاتا ہے کہ ہمارے ان لوگوں کی کیا باتیں ہیں صاحب! لیکن اگر آپ انہیں یہ کہو کہ صاحب! یہاں تو آپ ساری دنیا کے اندر ذلیل وخوار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے مقرب بندے تو ایسے ہی ہوتے ہیں؛ پھر اگلی دنیا میں وہاں جا کے دیکھیے گا کہ یہ کتنے مقرب ہوتے ہیں۔

جنت کی کیفیت اور محسوسات

عزیزانِ من! جنہیں قرآنِ کریم جنت کی بشارت دینا کہتا ہے تو سنیے وہ جنت کہاں اور کیسی ہوتی ہے؟ کہا کہ **نَحۡنُ اَوۡلِيٰٓؤُكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ** (41:31)۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اس لیے تمہیں یہ جنتی زندگی اس دنیا میں بھی نصیب ہوگی اور آخرت میں بھی۔ یعنی یوں ہوا کہ اس دنیا میں بھی جنت تمہارے لیے ہے جس کی ہم تمہیں بشارت دے رہے ہیں اور آخرت میں بھی یہی ہوگا۔ آپ دیکھیے کہ اس آیت میں **فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (41:31)۔ پہلے آیا ہے۔ کیا بات ہے اس جنت کی! آپ **فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (41:31)۔ ذہن میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ اس جنت کی خصوصیت کیا ہے۔ عزیزانِ من! ایک کتاب نہیں، اگر اس کے بعد بھی دس کتابیں لکھی جاتیں کہ اس جنت میں کیا ہوگا، تو وہ بات نہ بنتی جو چار لفظوں میں کہی۔ کہا کہ **وَلَـكُمۡ فِيۡهَا مَا تَشۡتَهِىۡۤ اَنۡفُسُكُمۡ** (41:31) اس جنت میں جو چاہو گے ملے گا۔ اس جنتی زندگی میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا۔ جو چاہو گے ملے گا اور مزید کہا کہ **وَلَـكُمۡ فِيۡهَا مَا تَدَّعُوۡنَ** (41:31)۔ جو مانگو کے تمہارے سامنے آئے گا۔ وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔ بات یوں ہوئی کہ جو چاہو گے، ہوگا۔ جو مانگو گے، ملے گا۔ یہ ہوگا نتیجہ تمہارے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا۔ کہیے کتنی جلدیں لکھی جاتیں تو یہ بات نہ کہی جاسکتی۔

عزیزانِ من! شاید آپ کو یاد ہو، یہاں میں ایک بات کہا کرتا ہوں کہ صاحب! پھر تو بڑی موج ہوگئی کہ تم اپنے دل سے جو چاہو گے

---

❶ کہ یہ ایسے ہی گدڑی پہنتے تو نہیں ہوتے۔

وہ ہوگا۔ ہم چاہیں گے کہ شراب ملنی چاہیے تو یہ ہونا چاہیے' ہم چاہیں گے کہ جوّا کھیلنا چاہیے تو یہ ہونا چاہیے کیونکہ یہاں کہا ہے کہ جو ہم چاہیں گے وہ ہوگا۔ عجیب قسم دی اے جنت ہوئے گی پھر ❶ ۔ اگر ہر ایک کے چاہنے پر یہ بات ہوجائے تو چاہنا تو اس قدر مختلف ہوتا ہے۔ پھر پتہ نہیں کہ آدمی کیا کیا چاہتا ہے' یہ چاہتا ہے کہ ساری عزتیں مجھے مل جائیں' جی! تو یہ چاہتا ہے کہ یہ ہوجائے۔ جب یہ صورت ہوجائے گی کہ ''جو جی چاہے گا وہ ملے گا'' تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ تم جانتے نہیں ہو کہ یہ جنت والے کون ہوتے ہیں؟ کہا کہ سنو: وَمَا تَشَآؤُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30)۔ تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشا ہے۔ اس طرح وہ اپنے چاہنے کو قانونِ خداوندی کے مطابق بنالیتے ہیں۔ جنت میں جاتا وہ ہے جو اپنے چاہنے کو اس کے مطابق بنالیتا ہے۔ اسی کو رضی اللہ عنہ ورضوا عنہ کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنی خواہشات کو' اپنے ارادوں کو' اپنے چاہنے کو' اس کے قوانین سے ہم آہنگ کرلیا' اس کے قوانین کے مطابق کرلیا۔ انہوں نے اپنے اعمال کو منشائے خداوندی سے ہم آہنگ کرلیا۔ تو یہ جو چیز ہے کہ ''جو چاہو گے' ملے گا۔ جو مانگو گے' تمہارے ہاں حاضر ہوگا۔ ''اوساڈے ورگے نئیں ہون گے۔'' ❷ وہ چاہنے والے وہ ہونگے جنہوں نے اپنا چاہنا' اس کی مرضی کے تابع کر رکھا ہے' اس کے قانون کے تابع ہے۔ یہاں مرضی کا لفظ صحیح نہیں ہے۔ یہاں یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے قانون کے تابع کرلیا ہے' اگرچہ کہنے کو مرضی کہا جائے گا جبکہ خدا کی مرضی بھی قانونِ خداوندی کا ہی دوسرا نام ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ مشیت وہ نہیں اور مرضی بھی وہ نہیں جس کا تصور ہمارے ہاں رائج ہے۔

خدا کی مشیت اور اس کی مرضی کے متعلق مودودیؒ کی تفسیر

آپ نے شاید پچھلے (مجلّہ) طلوعِ اسلام ❸ میں دیکھا ہوگا کہ مفسرِ قرآن مودودیؒ (1978-1903) نے کہا ہے کہ مشیّت اور مرضی میں فرق ہوتا ہے۔ کیا فرق ہوتا ہے صاحب؟ وہ کہتا ہے کہ جی' وہ لوگ یہ چوریاں کرتے ہیں' زنا کرتے ہیں' فساد کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ کہا کہ یہ چیز مشیّتِ خداوندی کے تو مطابق ہے کیونکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ اس کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا تو یہ

---

❶ پھر تو یہ جنت عجیب قسم کی ہوگی۔

❷ وہ ہم جیسے نہیں ہوں گے۔

❸ یہ ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ لاہور کا ماہانہ مجلّہ جناب غلام احمد پرویزؒ (1985-1903) نے قائداعظم کے ارشاد کے مطابق دہلی سے جاری کیا۔ یہ اپنے پہلے دورِ دہلی میں اپریل 1938ء سے مئی 1942ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور اس کے ذریعے پرویزؒ نے تحریکِ پاکستان کے مخالف نیشنلسٹ علما کے مقابلے میں قلمی جہاد کیا۔ اس دور میں یہ واحد جریدہ تھا جس نے تحریکِ پاکستان کے دینی پہلو کو اجاگر کیا اور بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تحریکِ پاکستان کی صحیح اور مکمل تاریخ طلوعِ اسلام کے اس دور کے فائل کے بغیر مرتب نہیں کی جاسکتی۔ پاکستان بن جانے کے بعد جنوری 1948ء میں آپ نے دوبارہ طلوعِ اسلام شائع کرنا شروع کیا جو باقاعدگی سے تاحال جاری ہے۔

کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے حکم کے بغیر' مشیّت کے بغیر' یہ کچھ کریں۔ تو یہ اس مشیّت کے مطابق تو ہوتا ہے لیکن اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی چور چوری کرتا ہے اس لیے کہ وہ چوری کرنے پہ مجبور ہے کیونکہ اس کا چوری کرنا اس کی مشیّت کا تقاضا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ اس کے خلاف تو کوئی ایک قدم نہیں اٹھا سکتا لہٰذا وہ اس کی مشیت کے مطابق چوری کرنے کے لیے جاتا ہے' لیکن یہ اس کا چوری کرنا خدا کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے۔ خدا کی مرضی کے خلاف کرنے پر یہ شخص مشیّت کے مطابق قادر ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس جرم کی سزا کس بات کی ہے؟ کیا اس کی کہ میری مرضی کے خلاف کیوں کیا؟ جناب کی مشیّت کے مطابق کیا ہے' سیدھی سی بات ہے۔ میں تو آپ کی مشیت کے مطابق چوری کرنے پہ مجبور محض تھا۔ ٹھیک ہے لیکن ہماری مرضی تو یہ نہیں تھی۔ تو وہ پوچھیں گے کہ حضور! یہ بتائیے کہ آپ کی مرضی کے مطابق کرتے تھے تو مشیّت کے خلاف ہوتا تھا' اب مشیّت کے تابع چلے ہیں تو آپ کی مرضی کے خلاف ہے۔ مہاراج رنجیت سنگھ جی! گل تے دسوئی کی منے تہاڈا' تے کی چھڈیے تہاڈا۔ [1]

عزیزانِ من! دیکھیے اور سمجھیے کہ مذہب انسان کو کہاں لاکر کھڑا کرتا ہے! دین کے سلسلہ میں فرمانِ خداوندی تو یہ ہے کہ' وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30)۔ تم ویسا ہی چاہو جیسا قانونِ خداوندی کا منشا ہے۔ یعنی جنت کا مستحق ہی وہ ہوتا ہے جو اپنی خواہشات و آرزوؤں کو قانونِ خداوندی کے قالب میں ڈھال لیتا ہے' اس کے تابع کر لیتا ہے۔ لہٰذا یہ ہوگی جنت' جس میں یہ لوگ ہونگے۔ اب آیت زیرِ نظر جس پہ آج کا یہ درس چل رہا ہے' میں یہ کہا تھا کہ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (20:115)۔ ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ یہ عہد تو کر لیتا ہے مگر اس میں عزم نہیں ہوتا۔ اس تصور میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے کہ کہیں پیر صاحب بھی ناراض نہ ہوجائیں۔ اس لیے ارادے باندھتا ہوں' باندھ کر پھر توڑ دیتا ہوں۔ کیوں توڑ دیتا ہوں؟ اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے۔ یا پھر وہ توبہ اور توبہ کے بعد وہ ریاض خیرآبادی کیا خوب کہہ گیا کہ:

جامِ مے توبہ شکن' توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

توبہ نہ ہوتی تو پہلے دن سے ایک ہی پیالہ کافی تھا' پاویں ٹوٹا ای ہوندا [2] یہاں عزم کا سوال ہی نہیں ہے۔ توبہ آئی' پیالہ توڑ دیا اور اس کے بعد پھر عزم نہیں ہے' پھر پیالہ لیا' ندا آئی' پھر اُسے توڑ دیا۔ ڈھیر لگ گیا مگر جامِ مے سے وابستگی نہیں گئی۔ اس پہ بھی عزم نہیں ہے۔ ارے! کفر پر تو عزم رکھ۔ نہیں' اس پہ بھی توبہ آئی' اس کے بعد پیالہ توڑا' پھر پھینک دیا۔ کتنے پھینکے' کتنے لایا اس کی شہادت میں وہ دیکھو

---

[1] جناب حضور مہاراج رنجیت سنگھ صاحب! یہ تو بتائیے کہ آپ کی کونسی بات مانیں اور کون سی بات چھوڑ دیں۔

[2] بے شک وہ ٹوٹا ہوا ہی ہوتا۔

سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا۔ یہ بڑا خوبصورت شعر ہے۔ قرآن نے یہی کہا کہ **لَمۡ نَجِدۡ لَهٗ عَزۡمًا** (20:115)۔ ہم نے اس میں عزم کی پختگی نہ پائی۔ عزیزانِ من! کہنے کو تو یہ ایک ہی آیت سامنے آئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس ایک آیت کے اندر بہت کچھ سامنے آ گیا۔

ساڑھے نو بج گئے۔ ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 115 پہ ہی رہے ہیں۔ قصہ آدم کی یہ بات اب آگے چلے گی، اسے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّآ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

❀......❀......❀

تیرھواں باب: سورۃ طٰہٰ (آیات 116 تا 130)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ اَبٰی ﴿۱۱۶﴾ فَقُلۡنَا یٰۤاٰدَمُ اِنَّ ہٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ
وَلِزَوۡجِکَ فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی ﴿۱۱۷﴾ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوۡعَ فِیۡہَا وَلَا تَعۡرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّکَ لَا تَظۡمَؤُا
فِیۡہَا وَلَا تَضۡحٰی ﴿۱۱۹﴾ فَوَسۡوَسَ اِلَیۡہِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ ہَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡکٍ لَّا
یَبۡلٰی ﴿۱۲۰﴾ فَاَکَلَا مِنۡہَا فَبَدَتۡ لَہُمَا سَوۡاٰتُہُمَا وَطَفِقَا یَخۡصِفٰنِ عَلَیۡہِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّۃِ ۫ وَعَصٰۤی اٰدَمُ
رَبَّہٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجۡتَبٰہُ رَبُّہٗ فَتَابَ عَلَیۡہِ وَہَدٰی ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اہۡبِطَا مِنۡہَا جَمِیۡعًۢا بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ
عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشۡقٰی ﴿۱۲۳﴾ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ
ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَقَدۡ کُنۡتُ
بَصِیۡرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتۡکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَہَا ۚ وَکَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی ﴿۱۲۶﴾ وَکَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ
اَسۡرَفَ وَلَمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاٰیٰتِ رَبِّہٖ ؕ وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَشَدُّ وَاَبۡقٰی ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمۡ یَہۡدِ لَہُمۡ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ
مِّنَ الۡقُرُوۡنِ یَمۡشُوۡنَ فِیۡ مَسٰکِنِہِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۱۲۸﴾ وَلَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ
لَکَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّی ﴿۱۲۹﴾ فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ
وَقَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾

عزیزانِ من! آج جون 1976 کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 116 سے ہو رہا ہے: (20:116)۔ سابقہ درس قصۂ آدم کی تمہید میں ہی گزر گیا تھا اور میں نے اس میں کائنات کے دو عظیم انقلابات کا ذکر کیا تھا۔ اِن آیات میں بھی وہی قصہ ہے، اس سے پہلے بھی یہ متعدد مقامات پر آ چکا ہے اور اس کے بعد بھی یہ کہیں کہیں آئے گا۔

آدم علیہ السلام اور حوّا کے تصور کی حقیقت

تجدیدِ یادداشت کے لیے میں یہ عرض کردوں کہ یہ قصہ کسی ایک فرد یا کسی ایک جوڑے کا نہیں ہے۔ آدم کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے گوکہ ہمارے ہاں انہیں بابا آدم بھی کہتے ہیں بلکہ ہمارے ہاں تو آدم کو آدم علیہ السلام بطور ایک نبی بھی کہتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کا قصہ نہیں ہے اور نہ ہی اماں حوّا ان کی کوئی بیوی ہیں۔ یہ میاں بیوی کا بھی قصہ نہیں ہے۔ یہ کسی ایک فرد کا قصہ نہیں ہے یہ تو خود انسان کی داستان ہے جسے قرآن نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے کہ آدمی پہ کیا بیتی؟ یہ ہے عنوان اس سرگزشت کا۔ اور حوّا کا تو نام بھی قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ علم انسانی کی پرواز کا ثمر

عزیزانِ من! ہمارے ہی اس دَور میں ایک نئے علم کا اضافہ ہوا ہے۔ اسے انتھروپالوجی Anthropology......علم الانسان...... کہتے ہیں۔ ماہرینِ علم الانسان نے تحقیقات کی ہیں اور کرتے جا رہے ہیں کہ ''شروع سے انسان کی سرگزشت کیا ہے؟'' ایک تو قوموں کی تاریخ ہوتی ہے اور ایک خود انسان کی تاریخ ہے، جس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ سب سے پہلے ہمیں انسان کہاں ملے ہیں؟ کس حالت میں تھے؟ ان کی کیا کیفیت تھی؟ پھر وہ کن کن ادوار سے گزرے؟ یہ حقیقت میں ایک نیا علم ہے۔ اس سے پہلے علمی طور پہ یہ چیز بھی نہیں تھی۔ یہ علم ابھی حال ہی کی تحقیقات پر بنا ہے۔ اس کی تدقیق وتحقیق کی بنیاد پر اس کی کیفیت کا سن کر آپ کو متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تو قرآن پہ ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے ہماری بصیرت میں اضافہ ہونا چاہیے کہ قرآنِ کریم نے قصۂ آدم کی جو چیز تمثیلی انداز میں بیان کی ہے، انتھروپالوجسٹ (Anthropologists) یعنی ماہرینِ علم الانسان کی انسان کی سرگزشت کے متعلق، جو تحقیقات ہوئی ہیں، وہ بعینہٖ وہی ہیں جو یہاں قرآنِ کریم میں چودہ سو سال پیشتر تمثیلی انداز سے بیان ہوئی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے۔

نسلِ آدم میں نسلی امتیاز اور مفادات کی ابتدا کب اور کیوں ہوئی؟

عزیزانِ من! یہ تحقیقات اب وہی کچھ کہہ رہی ہیں، جو قرآن نے کہا ہے کہ ابتدائی دور میں انسان ایک مخصوص آبادی تھی، رزق کی بڑی فراوانی تھی۔ ان ماہرینِ علم الانسان نے جو بڑی چیز کہی ہے، وہ یہی ہے جو قرآن نے کہی ہے کہ اُس دور میں ابھی میری اور تیری کا امتیاز نہیں تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ كُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا (2:35)۔ جہاں بھی کسی کو بھوک لگے، پیٹ بھر کر کھانا مل جائے۔ سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی تھی۔ یہ بڑی عجیب کیفیت ہے۔ یہ انسان کی ابتدائی زندگی کا نقشہ ہے۔ اس کی ضروریاتِ زندگی محدود ہیں اور سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی ہے۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں جو میں نے دہرائے ہیں۔ انتھروپالوجسٹ (ماہرینِ علم الانسان) کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی آبادی کا آغاز اس انداز سے ہوا تھا۔ ابھی ابھی آپ کے پاس الفاظ آئیں گے جو یہ ظاہر کریں گے کہ اسے رزق

کی پریشانی ہی نہیں تھی' معاش کی پریشانی ہی نہیں تھی۔ فطری انداز کا بڑی افراط سے کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ دیگ کا پلاؤ تو نہیں پکا ہوتا تھا لیکن جو کچھ دیگ میں پڑتا ہے وہ سارا کچھ موجود ہوتا تھا اور اس میں ''میری اور تیری'' کا یوں امتیاز نہیں کہ یہ میرا ہے' اس لیے تم بھوکے مرتے ہو تو مرو۔ یہ تمہارا تو نہیں ہو سکتا' جاؤ اپنا کھاؤ۔ ماہرینِ علم الانسان نے بھی یہی کہا کہ اس ابتدائی دور میں یہ امتیاز نہیں تھا اسکے بعد پھر قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کو کہا گیا تھا کہ اس ''شجر'' کے قریب نہ جانا۔ اب جونہی اس ''شجر'' کے پاس جانے کی ممانعت آئی تو ہمارے ہاں افسانے بننے لگے۔

تخلیقِ کائنات کے وقت فطرت کی قوتوں کا ظہور

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے یہ کہا ہوا ہے' ہمیں اس پہ افسوس نہیں ہے کہ اس قسم کی جہالت کی باتیں ہمارے ہاں کیوں آ گئی ہیں۔ اس دَور میں علمِ انسانی بہت محدود تھا۔ اگر یہ بات مفسرین تک رہتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انہیں معلومات نہیں تھیں۔ ہم بھی اس دَور میں ہوتے تو شاید اسی قسم کے افسانے کہتے۔ معاف رکھیے گا! آج جو ہم اس قدر پاٹے خان [1] بنے پھرتے ہیں' وہ اس لیے ہیں کہ خود علمِ انسانی بہت آگے بڑھ گیا ہے اور آج ہم اس دَور میں موجود ہیں۔ یہی ماہرینِ علم الانسان یہ کہتے ہیں کہ پھر ان میں باہمی مفادات پیدا ہو گئے کیونکہ پہلی پوری آبادی (Population) انسانوں کی تھی۔ اس کے بعد ان میں قبائل کی تفریق پیدا ہو گئی۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک قبیلہ بنا یعنی ایک خاندان بنا۔ اس کی جو اولاد تھی' وہ ایک خاندان بن گیا تو گویا اب یہ ہوا کہ یہ میرا بیٹا' وہ اُس کا بیٹا۔ یہ میرا اور وہ اس کا۔ یہ قصہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ روٹی میرے بیٹے کے لیے' وہ روٹی تیرے بیٹے کے لیے۔ بھئی! یہ بھوکا مرتا ہے۔ تو کیا کہ بھئی! تیرا بیٹا بھوکا مرتا ہے' میرا تو نہیں مرتا۔ یہ ماہرینِ علم الانسان کہتے ہیں کہ اس چیز کی یہاں سے پہل ہوئی کہ انسانیت کی بجائے اب نسلی امتیاز شروع ہوا' چھوٹے سے پیمانے سے ہی سہی۔ نسل کے اعتبار سے ایک خاندان بنا حالانکہ اس سے پہلے یہ سب صرف انسان ہی تھے۔ یہ شخص کہ جس کا خاندان یہ بنا اور وہ دوسرا شخص کہ جس کا وہ خاندان بنا' اس سے پیشتر ان دونوں میں کوئی تمیز نہیں تھی۔ دونوں ہی انسان تھے' دونوں ہی آدم تھے۔ اب یہ آدم کے بیٹے بنے اور پہلا ہی وہ ٹکراؤ ہوا جو قرآن نے کہا ہے کہ خون ریزی کی ابتداء ہوگئی۔ اب جب آگے چلے تو جو ذرا زیادہ خاندان والے تھے یعنی ان کے افراد زیادہ تھے' ان کی قوت زیادہ تھی' انہوں نے ذرائع رزق پر زیادہ سے زیادہ اپنا قبضہ جما لیا۔ اب یہ چیز نہ رہی کہ جس کو جہاں بھوک لگے وہاں سے کھا لے۔ یہ تو اس کا باغ ہو گیا' وہ اس کے کھیت ہو گئے۔ جو خاندان کمزور رہ گیا' تعداد میں کم رہ گیا' وہ ان کے مقابلے میں دشواری کی زندگی بسر کرنے لگ گیا۔ آہستہ آہستہ یہ مفلس ہوتے چلے گئے۔ افلاس کی وجہ سے اب یہ ان کے کام کرنے والے بن گئے۔ وہ مالک بن گئے' یہ ان کے کارندے ہو گئے۔ یہ کمّی [2] ہو گئے' کام کرنے والے ہو گئے۔ اس طرح دو طبقے

---

[1] بہادر' تکڑم باز

[2] نیچ ذات کے

وجود میں آ گئے۔ یہ ہے وہ چیز جو آج کی تحقیقاتِ علم الانسان سامنے لا رہی ہیں کہ یہ انسان کی سرگزشت ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے قصۂ آدم کو تمثیلی انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ آج کی علمی تحقیق اس کے ایک ایک جزو کی تائید کرتی چلی جا رہی ہے۔ آپ اُسے ذہن میں رکھیے' ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ کائنات کی تخلیق ہوئی تو فطرت کی قوتیں (Forces of Nature) موجود تھیں: پانی' ہوا' روشنی' زمین اور اس میں زراعت کی صلاحیت۔ یہ تمام چیزیں فطرت کی قوتیں (Forces of Nature) کہلاتی ہیں جنہیں قرآنِ کریم نے ملائکہ کہہ کے پکارا ہے۔ اور دوسری چیز انسان کے اپنے اندر کے جذبات ہیں۔ اِن جذبات سے ذاتی مفادات بنتے ہیں' جن میں یہ ہوتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے' یہ میرا گھر ہے۔ یہ ''میری والی'' بات فطرت کے اندر نہیں ہے۔ یہ انسان کے اپنے اندر کی چیز ہے۔ اب یہ دو متضاد چیزیں آئیں۔ قرآن نے یہ بتایا کہ فطرت کی قوتوں پر قابو پالینا تو اس کے لیے بڑا آسان ہے اور یہ ہو رہا ہے۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ انسان فطرت کی ان قوتوں پر کس زور و شور سے قابو پاتا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو اب مریخ تک پہنچ رہا ہے' چاند سے بھی دو قدم آگے۔ لیکن یہ اپنے آپ پہ کنٹرول نہیں رکھ سکا۔ ''یہ چیز جسے اپنے آپ پہ کنٹرول رکھنا'' کہا گیا ہے' اسے قرآنِ کریم نے ابلیس یا شیطان کہہ کر پکارا ہے۔

میری اور تیری کے قصے کی ابتدا اور اس کا علاج

عزیزانِ من! یہ جسے آپ اپنا مفاد کہتے ہیں' یہ جو ''میری اور تیری'' کا قصہ ہے' باہمی تصادم ''تزاحم'' اختلاف اور افتراق کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے۔ اِس سے یہ انسانی برادری گروہوں میں' خاندانوں میں' نسلوں میں' قبیلوں میں' قوموں میں' بٹ گئی۔ پھر ان کے اندر طبقات پیدا ہو گئے: ایک امیر طبقہ' صاحبِ قوت اور دوسرا غریب طبقہ' کمزور و ناتواں حالانکہ ابتدا میں یہ تمیز' یہ تفریق' کہیں تھی ہی نہیں۔ یہ ہے جی قصہ! اگلی بات پھر وہی آئی جسے میں نے پچھلے درس میں اس کائنات کا پہلا انقلاب کہا تھا۔

جب انسان کو اختیار و ارادہ دے دیا گیا تو اب سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ اس مشکل کا حل کیا ہو۔ یہاں تک تو انسان پہنچ گیا کہ اس نے میری تیری بھی کر لی' قبضے بھی کر لیے' محتاج بھی ہو گئے' امیر بھی ہو گئے' طبقات بھی وجود میں آ گئے۔ اب اس کے بعد کیا اس کا کوئی علاج بھی ہے یا یہ ٹکراؤ اسی طرح سے رہے گا؟ قرآنِ کریم نے بتایا کہ اس چیز کا علاج انسان کے اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اسے خدا کی طرف سے قوانین ملیں۔ اُس خدا سے ملیں گے جو اس ''میری اور تیری'' کے تصور میں انسان کا شریک نہیں۔ وہ تو مالک ہے' ان تمام چیزوں کا خالق ہے اور خود اس کی کیفیت جیسا کہ قرآن نے کہا ہے' یہ ہے کہ ''ہم تمہیں رزق دیتے ہیں' ہم تو کھاتے پیتے ہی نہیں ہیں۔'' عزیزانِ من! کوئی ایسا ہی وہ قانون دے سکتا تھا جو دوسروں کو تو دیتا چلا جائے لیکن اسے خود کچھ لینے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ نہ تو وہ خود کھائے' نہ پیے۔ یہ پہلا قصہ تو یوں ختم ہوا۔ اور اگلا قصہ نسل پرستی کی بنا پہ خاندان اور قبیلوں میں تقسیم ہونے کا ہے۔ جس کے اپنے

اندر یہ قصہ ہی نہ ہوتو ایسا قانون تو وہی دے سکتا تھا۔عزیزانِ من! میں قانون کا کہہ کر چھوٹے پیمانے کی بات کر رہا ہوں۔اس نے کہا کہ تمہیں یہ قانون ہم دیں گے' اگر تم نے ان کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل اور رزق کی تقسیم کر لی تو یہ جو''میری اور تیری'' کے قصے سے تمہارے ہاں فسادانگیزیاں شروع ہوگئی ہیں' مٹ جائیں گی۔اس طرح سے دوبارہ یہ پوری انسانیت انسانی برادری بن جائے گی جیسے کہ پہلے تھی۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10:19)۔نوعِ انسانی کی تمدنی زندگی کی تاریخ یہ ہے کہ سب سے پہلے دَور میں (جب ان کے مفاد میں باہمی تصادم نہیں ہوا تھا) سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔اس کے بعد' انفرادی مفاد پرستیوں نے' اِن میں اختلاف پیدا کرنے شروع کر دیئے۔دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھو کہ الناس کی تو ابتدا یوں ہوئی تھی کہ شروع میں انسانیت کی ایک ہی برادری تھی۔پھر اس مفاد پرستی کی بنا پہ ان میں اختلافات پیدا ہوئے: خاندانی' قبائلی' قومی' نسلی' طبقاتی۔اور اس کے بعد ہے کہ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (2:213)۔اللہ نے انبیا کو اپنی وحی دے کر بھیجا۔وہ انہیں اختلافی زندگی کے نتائج وعواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوش خبری سناتے۔یعنی اختلافات مٹانے کے لیے پھر ہم نے اپنی طرف سے انبیا بھیجے' یعنی وحی بھیجی' یہ انبیا انہیں بتاتے تھے کہ اس فساد انگیزی کا' اس کشمکش کے مٹانے کا' طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاشرے کو ان خطوط پہ متشکل کرلو جنہیں خداوندی اقدار کہا جاتا ہے تاکہ پھر تمہارا معاشرہ وہی عالمگیر انسانیت بن جائے۔دین کا سارا قصہ بس یہی ہے۔

سب سے پہلا مسئلہ تو معیشت کا ہی مسئلہ تھا

عزیزانِ من! پہلی بات تو صرف معیشت کی تھی جہاں سے انسان نے اپنا پہلا......اولین دَور......شروع کیا ہے۔پھر یہ آگے چلا ہے تو اسی معیشت [1] کی بنیادوں پر اس کی سیاست کی دیواریں اٹھیں' تمدن پیدا ہوا' تہذیب پیدا ہوئی۔یہ سارے بکھیڑے بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔اگر انسانیت ایک عالمگیر برادری بن جائے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سارے حدود' یہ تفریقات' یہ امتیازات' یہ فسادانگیزیاں' سب ختم ہو جاتی ہیں۔قرآنِ حکیم کا منتہیٰ اِن تمام تصادمات' تزاحمات' اختلافات اور افتراقات کو ختم کرنا ہے۔آپ اسے ذہن میں رکھیے تو قصۂ آدم نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

---

[1] میکانکی تصورِ حیات کی رو سے نوعِ انسانی کی ساری تاریخ اس معاشی مسئلہ کے حل کی تلاش کی تگ وتاز کی داستان ہے۔اس لحاظ سے جس طریق سے اس مسئلہ کا حل مل جائے وہ طریق اس کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا۔اب ظاہر ہے کہ جب دنیا کی مختلف اقوام اس نظریہ کو تسلیم کر لیں تو ہر قوم کے سامنے مقصد زندگی یہ رہ جائے گا کہ وہ کس طرح معاشی فارغ البالی حاصل کر سکتی ہے۔اس سے اسے کچھ واسطہ نہیں ہوگا کہ یہ فارغ البالی کن طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کا اثر ورسوخ دیگر نوعِ انسانی پہ کیا پڑتا ہے۔ہنری فورڈ کے الفاظ میں ''جو کچھ معاشی طور پر صحیح ہے وہ اخلاقی طور پر بھی صحیح ہے''۔اور آج اقوامِ عالم میں یہی ہو رہا ہے۔

قصۂ آدم کے سلسلہ میں قرآن کا محاکاتی انداز

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا کہ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (2:34)۔سب کائناتی قوتیں (Cosmic Forces) انسان کے سامنے جھک گئیں لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آ جانے سے اس کی عقل وفکر ماؤف ہو جاتی ہے۔عزیزانِ من! قرآن فطرت کی قوتوں کے متعلق بات تمثیل سے' ڈرامائی انداز میں' کہہ رہا ہے۔قرآن کے سمجھانے کا یہ بڑا ابلیغ انداز ہوتا ہے۔ یہ وہی انداز ہے جسے آپ ڈرامائی یا محاکاتی کہتے ہیں۔ ایسے نظر آتا ہے کہ ایک مجلس لگی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ کرسی صدارت پہ براجمان ہیں۔ (معاذ اللہ) بلا تمثیل عرض کرتا ہوں۔ وہ صدارتی کرسی پر تشریف فرما ہیں۔کچھ ایک طرف ملائکہ ہیں۔ پھر وہ آدم آ گیا۔ابلیس ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو ملائکہ سے کہا گیا کہ ''جھک جاؤ آدم کے سامنے۔'' وہ جھک گئے۔ابلیس نے انکار کیا۔عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ آپ اسے اس تمثیل کے انداز میں سمجھتے چلے جایئے کہ خارج کی جتنی بھی قوتیں تھیں' یہ کائناتی قوتیں' یہ فطرت کی قوتیں' وہ تو ساری انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو سکتی ہیں۔ان تمام قوتوں کو مطیع وفرماں بردار بنانے کی صلاحیت بھی انسان کو دیدی۔اس سلسلے میں کہا کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (2:31)۔انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی کہ وہ اُن قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرم عمل ہیں۔اسے محاکاتی انداز میں یوں سمجھیں کہ ہم نے اس کو کہہ دیا کہ اس کا قانون یہ ہے۔ چاند پہ جانے کا راز یہ ہے کہ اس کا یوں کان دباؤ' ایسے کام کرو۔عَلَّمَ (2:31) دے دیا یعنی ہم نے اس کے اندر اس کی صلاحیت رکھ دی کہ وہ یہ کچھ کر دے۔ یہ سارا کچھ تو یہ کر گیا مگر اِلَّآ اِبْلِيْسَ (2:34) ابلیس نے انکار کیا۔اس طرح یہ ''ڈھونڈے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا'' کی کیفیت والا ''اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا۔''[1] یہاں قرآن کریم نے کہا کہ اِلَّآ اِبْلِيْسَ (2:34)۔ یہاں دشواری یہ پیش آئی کہ اس (انسان) کی جو اپنی ذات تھی' وہ قانونِ خداوندی کے سامنے نہ جھکی۔سو یہ ہے ابلیس اور آدم کا وہ قصہ جس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مشہور حدیث بھی ہے' جس میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا تھا کہ کیا حضور ﷺ کا بھی ابلیس ہے' آپ ﷺ نے کہا تھا: میرا بھی ابلیس ہے۔کہنے لگے: کیا کہہ دیا آپ ﷺ نے کہ میرا بھی ایک ابلیس ہے؟ کہنے لگے: ہاں' میرا بھی ابلیس ہے' لیکن میں نے تو اسے مسلمان کر لیا ہوا ہے۔بس بات ساری اتنی ہے' عزیزانِ من!

---

[1] ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع وضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

حضرت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ (1938-1877) نے ''زمانۂ حاضر کا انسان'' کی ابتدا اس شعر سے کی ہے:
'عشق ناپید وخرد میگزدش صورتِ مار' — عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

اس لحاظ سے انسان نے اپنی ذات کو ہی مسلمان کرنا ہے

ابلیس کو مسلمان کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر اپنی ذات کو قوانین واقدارِ خداوندی کے تابع رکھ لیا جائے تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اس پہ کنٹرول ہی تو کرنا ہے۔ یہاں کہا کہ **اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ اَبٰی** (2:34) اِس ذات نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سرکشی اختیار کی۔ عزیزانِ من! **ابٰی** ایک عجیب لفظ ہے۔ اس میں سرکشی ہوتی ہے' اس میں بغاوت ہوتی ہے' اس میں معصیّت ہوتی ہے اور یہی اس نے کیا۔ **فَقُلۡنَا یٰٓاٰدَمُ اِنَّ ھٰذَا عَدُوٌّ لَّکَ وَلِزَوۡجِکَ** (20:117)۔ ہم نے آدم کو بتادیا کہ یہ تیرا اور تیری رفیقہ کا دشمن ہے (یعنی یہ جذبات صرف مرد یا تنہا عورت کے اندر نہیں ہوتے۔ مرد اور عورت دونوں کے اندر ہوتے ہیں)۔ یعنی اس طرح تمثیلی انداز میں یوں سمجھایا کہ باہر تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے' خارج میں تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے' تم اپنے آپ دشمن ہو' خاص طور پہ اس میں "**زوجک**" (20:117) کا ذکر ہے۔ اس لفظ زوج [1] میں عورت اور مرد دونوں شامل ہیں۔ قرآن کو اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ عیسائیت میں تورات جو ابتدا میں خدا کی ہی وحی تھی اور جو مسخ ہو گئی' میں آمیزش ہو گئی۔ یہ جو قصہ آدم وہاں بیان کیا گیا ہے کہ اس جرم کی ذمہ دار عورت تھی' میاں صاحب نہیں تھے۔ اس میں یہ بات آئی ہے کہ عورت شیطان کے بہکاوے میں' فریب میں' آ گئی تو اس نے کہا کہ میں تو اس طرح فریب میں آ گئی' یہ میاں صاحب کیوں پاٹے خاں بنا پھرے ہے تو اس نے اسے بھی فریب دیا' اور میاں صاحب اس کا فریب کھا گئے۔ یعنی میاں صاحب نے شیطان کا فریب نہیں کھایا' عورت کا فریب کھایا۔ بائبل میں تو یہ بات تھی۔ اب آپ قرآنِ کریم دیکھیے کہ یہ اپنے ہاں ایک لفظ کے اندر کیا بیان کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہاں اس کا تو سوال ہی نہیں تھا کہ "عورت فریب میں آئی اور عورت نے اس مرد کو بہکایا۔" مرد اور عورت دونوں انسان ہیں جو خصوصیتیں یا امتیازات ایک کے ہیں' وہ دونوں کے اندر ہیں۔ اس لیے مرد ہو یا عورت' قصہ تو دونوں کا آ رہا ہے۔ اس میں یہ غلط ہے کہ عورت اس کی ذمہ دار تھی اور اس نے بہکایا تھا۔ یہ قصہ مرد اور عورت دونوں کا بیان کیا جا رہا ہے۔ کہا کہ یہ یاد رکھنا کہ باہر سے تمہارا کوئی دشمن نہیں ہے بلکہ تم اپنے دشمن آپ ہو۔ یاد رکھو! اگر تم خود اس کے بہکاوے میں آ گئے تو ہم نے کہا کہ **فَلَا یُخۡرِجَنَّکُمَا مِنَ الۡجَنَّۃِ فَتَشۡقٰی** (20:117)۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنتی زندگی سے نکال باہر کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم زندگی کی ضروریات سے' جو تمہیں اس وقت اس آسانی سے فراواں میسر ہیں' محروم ہو جاؤ گے اور پھر ان کے حصول کے لیے تم جگر پاش مشقتوں میں پڑ جاؤ

---

[1] لین کے اپنے انگریز زبان میں لکھے ہوئے لغت میں لکھا ہے کہ زوج (جمع ازواج) رفیق' ایک دوسرے کے ساتھی کو کہتے ہیں۔ اور احمد بن مصطفیٰ (اللبابیدی (دمشقی) نے اپنی مشہور کتاب "لطائف الغۃ" میں لکھا ہے کہ زوج (جمع ازواج) کے معنی شوہر یا بیوی دونوں کے ہیں۔ شوہر بیوی کا زوج ہوتا ہے اور بیوی شوہر کی زوج۔ یاد رہے کہ "لطائف اللغۃ" میں الفاظ کی لغوی باریکیوں (Lexicological Subtleties) سے بحث کی گئی ہے۔

گے۔اس طرح کھلے الفاظ میں یہ واضح کر دیا کہ تمہارے اپنے مفادِ خویش کی جو خود غرضیاں ہیں' یہ امتیازاتِ من وتُو ہیں' اگر تم ان امتیازات کو قائم رکھو گے تو پھر یاد رکھنا کہ یہ جو تمہاری جنت کی زندگی ہے یہ باقی نہیں رہے گی' اس سے بچ کے رہنا۔ ابھی بتا تا ہوں کہ وہ جنت کی زندگی کیا ہے لیکن یہ سن رکھو کہ اگر وہ جنتی زندگی چھن گئی تو پھر سمجھ لو کہ پھر کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ پھر تو فَتَشْقٰی (20:117) ہو گا۔ یہ ایک لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں: جو کچھ مل رہا ہے اس سے محروم ہو جانا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے جگر پاش مشقتیں اٹھانا۔ اس لیے کہا کہ اگر وہ جنت کی زندگی چھن گئی تو تم ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو جاؤ گے' ان کے حصول کے لیے سخت مشقتوں میں پڑ جاؤ گے۔ اب آگے دیکھیے کہ اس جنت کی کیفیت یہ ہے کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی o وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی (20:118-119)۔اس وقت (جس نہج کی زندگی تم بسر کر رہے ہو' اس میں کیفیت یہ ہے کہ) نہ تمہیں روٹی کی فکر ستاتی ہے' نہ کپڑے کی۔ نہ پیاس کا خوف ہے' نہ سورج کی تپش کا۔ تمہارے لیے کھانے کو روٹی' پینے کو پانی' پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان۔ سب کچھ بلا مشقت موجود ہے۔ یہ تھا وہ معاشرہ جس میں انسان اپنی ابتدائی زندگی کے دَور میں رہتا تھا۔اس جنت کے اندر تمہیں نہ بھوک کی پریشانی' نہ پیاس' نہ لباس' اور نہ مکان کے متعلق کسی قسم کی پریشانی' ان کی احتیاج ہی نہیں۔ عزیزانِ من! جنت کی Definition (تعریفِ حدودِ کار) ہی یہ ہے کہ زمین پہ رہنا ہے تو یہ جو انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں' ان کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ہے جنت کی زندگی۔ کہا کہ اب اس وقت تمہاری یہ کیفیت ہے کہ ضروریاتِ زندگی بافراط میسر ہیں لیکن اگر تم نے وہ ''میری اور تیری'' والی روش اختیار کر لی تو یاد رکھیے کہ پھر تم اس جنت سے محروم ہو جاؤ گے۔ ہم نے آدم سے یہ کہہ دیا۔ عزیزانِ من! اب آپ سمجھتے جا رہے ہیں کہ یہ ڈرامائی انداز میں ایک بات ہو رہی ہے' تمثیلی طور پہ' یہ چیز تھی جو انسان سے کہی گئی ہے۔ اب یہ بات یہیں نہیں ختم ہو گئی۔ اس تمثیلی اندازِ بیان کا ایک پہلو اور بھی ہے اور وہ ہے وساوس![1]

شیطان کی افسوں کاری

عزیزانِ من! اس ابتدائی معاشرتی زندگی کے دَور میں' انفرادی مفاد پرستیوں نے' انسان کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے لیے سب سے بڑا خوف موت کا تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ شیطان یعنی اس کے مفاد پرست جذبات نے' اس کے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور اس طرح فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ (20:120)۔ شیطان نے اس کے کان میں افسوں پھونکا۔ اب یہاں وہی ڈرامائی انداز ہے۔ اصل یہ ہے کہ خود اسکے جو اپنے جذبات تھے وہ بیدار ہوئے تو اس نے کہا کہ قَالَ

---

[1] کان میں چپکے سے کچھ الفاظ کہہ جانا جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ہوں۔

یٰۤـاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّکَ عَلٰی شَجَرَةِ الۡخُلۡدِ وَمُلۡکٍ لَّا یَبۡلٰی (20:120)۔ اُس نے کہا کہ کیا میں تجھے ایک ایسے ''درخت''❶ کا پتہ نشان بتاؤں جس کا پھل کھانے سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور تمہیں ایسی مملکت مل جائے جس پر کبھی زوال نہ آئے۔ انسان پہلے ہی اس کا متمنی اور متلاشی تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا پتہ ونشان ضرور بتاؤ۔ اُس نے کہا کہ یہ اولاد کے ذریعے حاصل ہوگی۔ وہی تمہاری بقا کا ذریعہ بنے گی۔ اور اسی سے تمہارا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا۔ لہٰذا تم نوعِ انسانی کے مفادِ کلی کے خیال کو چھوڑ دو اور اس کی جگہ صرف اپنی اولاد کے مفاد کو پیش نظر رکھو۔ تمہیں دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ یہ محاکاتی انداز ہے۔ اسے پھر سن لو کہ اس سے کہا کہ اب تو تمہاری صورت یہ ہے کہ کھانے پینے کو تو مل جاتا ہے لیکن تم مر جاتے ہو تو تمہارا نام ونشان مٹ جاتا ہے' ختم ہو جاتا ہے تمہارا قصہ؟ بس اتنے کے لیے ہی یہ سارا کچھ ہے۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ تمہارا نام زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ پھر یہ جو تمہیں کھانے پینے کو یوں مل رہا ہے' تو جب تک تم نے کھایا پیا' اس وقت تک تمہاری یہ مملکت ہوئی' اس سے آگے تو تمہاری ریاست باقی نہیں رہتی' جاگیر نہیں رہتی' زمینداری نہیں رہتی' سرداری نہیں رہتی۔ آؤ تمہیں بتاؤں کہ یہ کیسے رہے گی۔ اپنے بعد اپنے بیٹے کے حق میں یہ وراثت کر دیا کرو۔ اب قصہ اپنی ہی ''میری تیری'' کا نہ ہوا۔ اب میری تیری نے منتقل ہونا شروع کر دیا۔ کہا کہ وراثت کے اندر اپنے بیٹے کو یہ دینا' اور یاد رکھ کہ اسے کہیں دوسرے نہ لیجائیں۔ اس طرح یہ جھگڑا دوامی ہو گیا۔ پھر یہ قصہ اس مرنے والے تک نہ رہا۔ یہ جو ہے آؤ تمہیں کچھ بتاؤں یہ وسوسہ ہے۔ وسوسہ کے معنی کیا خوبصورت بات کے ہیں کہ کان ''میں چپکے سے کچھ الفاظ کہنا۔''

لفظ وسوسہ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ آپ قرآنِ حکیم ضرور زیرِ مطالعہ لایا کریں پھر حقائق سمجھ میں آتے ہیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ جب شکاری' شکار کے لیے دبے پاؤں جاتا ہے اور کبھی کبھی کسی سوکھے ہوئے پتے پر یوں اس کا پاؤں آ جاتا ہے کہ اس سے ذرا سی آہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ شکاری نہیں چاہتا کہ یہ ذرا سی آہٹ بھی پیدا ہو کہ اس سے شکار کو پتہ چل جائے' تو اس ہلکی سی آہٹ کو' شکاری کی اس قسم کی آہٹ کو' دبے پاؤں چلنے سے پیدا ہونے والی خفیف سی آہٹ کو' وسوسہ کہتے ہیں۔ چلنے میں زیور کے بجنے کی اس

---

❶ تاج العروس میں لکھا ہے کہ ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر پھر کسی وجہ سے متفرق ہو جائے شجر کہلاتی ہے۔ اسی سے شَجَرَ بَیۡنَهُمۡ کے معنی ہیں: ''باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا۔'' اور شاجر فلان فلانا کے معنی ہیں: ''فلاں نے فلاں سے جھگڑا' فساد' منازعت' دشمنی' مخالف' مخاصمت کی۔'' اور تاج العروس میں ہی لکھا ہے کہ الشجر کے معنی درخت ہیں۔ یہ جمع ہے ایک درخت کو شجرۃ کہیں گے۔ غالباً اس لیے کہ اس کے تنے (Stem) کے ایک ہونے کے باوجود اس کی شاخیں منتشر اور بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ شجر کے بنیادی معنی ہیں۔ تاج العروس میں ہے کہ تشاجر کے معنی میدانِ جنگ میں فوجوں کا باہمی گتھم ہو جاتا ہے۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم میں 2:36 کے حوالے سے لکھا ہے کہ شجر سے مفہوم انسانوں کے باہمی اختلاف (Clash of Interests) ہیں۔ جو ان میں انفرادی مفاد پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ انفرادی مفاد پرستیاں ہیں۔

ہلکی سی آواز کو بھی وسوسہ کہتے ہیں جس سے سننے والے کے دل میں عجیب سے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ دل میں مختلف قسم کے خیالات گزرنے کو بھی وسوسہ کہتے ہیں' نیز ہر غیر واضح کلام کو جس میں مختلف آوازیں مل گئی ہوں اور گفتگو بغیر نظم و ترتیب کے ہو' اسے بھی وسوسہ کہتے ہیں اور راغب ❶ کے نزدیک تو بُرے خیالات کا دل میں گزرنا وسوسہ ہے۔

عزیزانِ من! آپ قرآن کا ڈرامائی انداز دیکھیں۔ شیطان شکار کرنے کو نکلا ہے۔ یہاں کیا الفاظ ہیں قرآن کے! کہ دبے پاؤں چلا ہے تاکہ ذرا سی آہٹ کا بھی پتہ نہ چلے اور وہ چپکے سے کان میں بات ڈالے' شکار قابو کرے اور چلتا بنے۔ وسوسہ کا تو یہ لفظ ہی شکار کھیلنے والوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ آیا ہی شکار کے لیے ہے۔ شیطان نے کہا کہ آؤ میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ اب تو یہ سارا قصہَ زندگی تیری ذات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ آگے تک نہیں چلتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ یہ جو ''تیری'' ہے وہ ''تیری'' رہے اور ابد الآباد تک تیری رہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کیسے ہو؟ اس نے کہا کہ اولاد کے ذریعے تیری ہمیشہ تیری رہے گی۔ آج بھی' عزیزانِ من! اگر کسی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تو وہ بڑھاپے میں مارا مارا پھرتا ہے۔ دوا دارو کے علاوہ تعویذ دھاگوں تک بھی اتر آتا ہے' قبروں تک بھی جاتا ہے' یہ سب کچھ کرتا ہے۔ اوکا ہے کے لیے اب تم کر رہے ہو؟ میاں! نام روشن رہنا چاہیے' بوٹا لگا رہنا چاہیے۔ آ تہانوں یاد اے ناں؟ بوٹا لگا رہنا چاہیے۔ ❷ بعینہٖ یہی بات ہے کہ اگر تُو مر گیا تو تیرا نام و نشان تو مٹ گیا۔ تے بوٹا کٹیا جائے گا۔ آ' تینوں میں دساں' بوٹا قائم رہے گا تیرا۔ دعائیں دیئے دیتے ہیں فقیر: جڑاں ہریاں رین' بوٹے قائم رہن' ناں روشن رئے' دِیوا بلدا رئے ایس کردا۔ اے سن ناں جڑاں ❸! ورنہ اس جنت کی زندگی میں تو میاں تمہیں عمر بھر کھانے پینے کو سب کچھ ملا' کوئی پریشانی نہیں' کوئی تنگی' یعنی کوئی جگر پاش مشقتیں نہیں۔ اب نہیں۔ تو مر رہا ہے' تو 'آگے جا' تجھے یہ پیچھے کی کیوں پڑی ہوئی ہے۔ عزیزانِ من! آپ دیکھیں گے کہ اپنی ذات تک کا قصہ بڑی آسانی سے نپٹ جاتا ہے' لیکن اس کے بعد کا جو قصہ ہے' دراصل سارا طوفان تو وہ برپا کرتا ہے۔ شیطان نے وسوسہ ڈالا۔ وہ خیالات ڈالے جو انسان کے دل میں خود غرضی کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نے اس کو پھنسایا کہ آؤ میں وہ شجر بتاتا ہوں اور یہ وہی شجر ہے جس سے قرآن نے منع کیا تھا۔

---

❶ یہاں حوالہ امام راغب اصفہانی (متوفی 502ھ) کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' کی طرف ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا بڑا ہی مختصر لغت ہے اور بڑا ہی مقبول اور مشہور۔ پرویزؒ (1903-1985) نے اپنی لغات القرآن کی تدوین میں ان کا جو نسخہ استعمال کیا ہے' وہ مطبع میمنیہ (مصر) میں 1324ھ میں چھپا تھا۔

❷ آپ کو کیا یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ''بوٹا'' لگا رہنا چاہیے؟ (یعنی اولاد ہونی چاہیے)

❸ تیرا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔ آ' میں تجھے بتاؤں کہ جس سے تیرا نام و نشان قائم و دائم رہے گا۔ فقیر دعائیں دیئے جاتے ہیں: ''جڑیں'' ہری رہیں' بوٹے قائم رہیں' نام روشن رہے' اس گھر کا ''دیا'' جلتا رہے۔ یہ جڑیں اولاد تھی۔

شجر کا قرآنی مفہوم

اب سوال یہ ہے کہ وہ شجر کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ مگر عجیب اتفاق یہ ہے کہ عربوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں کہ گیہوں کا درخت کیا ہے؟ اور یہ مفسرین ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ شجر گیہوں کا درخت ہے۔ عزیزانِ من! قرآن اس محاکاتی اندازِ بیان میں عجیب الفاظ لاتا ہے۔ عربی زبان میں اختلاف کے لیے بیسیوں نہیں' سینکڑوں الفاظ ہیں لیکن ایک اختلاف ایسا ہے جسے سمجھنے کے لیے آپ یوں ذہن میں لائیے کہ ''نیچے سے جڑ اور تنا ایک ہو' اس کی ابتدا ایک ہو' اور آگے جا کے اس میں اختلافات ہوں''۔ عرب اس قسم کے اختلاف کو مشاجرت کہتے ہیں۔ جو شجر ہی کا Derivative ہے' یعنی شجر سے ہی نکلا ہے۔ آپ کے سامنے درخت نظر آ جاتا ہے۔ اس کی بنیاد' اس کی ابتداء' جس کے سہارے وہ کھڑا ہوتا ہے' واحد ہوتی ہے۔ یہ ایک جڑ ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر پوچھو نہیں کہ اس کی کتنی الگ الگ شاخیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے اسے شجر کہا ہے۔ اُن کے ہاں اسے شجر کہنے کی بنیاد ہی یہ تھی کہ اس کا ایک تنا' ایک جڑ ہے مگر شاخیں الگ الگ ہیں۔ لہٰذا قرآن نے یہ کہا تھا کہ تم کہیں آپس میں یہ کیفیت نہ پیدا کر لینا۔ تمہاری ابتدا یعنی نوعِ انسانی کی ابتدا وحدت کی ایک جڑ ہے' ایک تنا ہے۔ اس لیے اب الگ الگ شاخوں میں یوں نہ بٹ جانا۔ یہ ہے جو اس نے کہا تھا۔ لیکن افسوس کہ یہ حضرتِ انسان فریب کھا گیا۔ اور نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کی جگہ' نسل پرستی کی تشت و افتراق کی کشمکش میں الجھ گیا۔ عزیزانِ من! یہاں وہی تمثیلی انداز ہے جس میں کہا تھا کہ اس سے پرہیز کرنا۔ اس نے وہی کیا جس سے منع کیا تھا کہ ایسے نہ کرنا۔ اسے تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ **فَاَكَلَا مِنْهَا** (20:121)۔ آدم اور اس کی بیوی نے اس ''درخت'' کا ''پھل'' کھا لیا۔ پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ عزیزانِ من! دیکھیے کہ قرآنِ کریم کا کیا حسین انداز ہے۔ ارشاد ہے کہ **فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ** (20:121)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ستر اُن پر کھل گئے اور وہ لگے اِس باغ کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپنے۔

بعض چیزوں کو مہذب انداز میں بیان کرنے کا طریق

عزیزانِ من! آپ تہذیب کے اعتبار سے دیکھیے' آدابِ معاشرت کے اعتبار سے دیکھیے' تو جو باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر انہیں کھلے الفاظ میں کہا جائے تو کچھ معیوب سا نظر آتا ہے۔ سوسائٹی میں اُن الفاظ میں وہ بات نہیں کہی جاتی بلکہ اس کے لیے کچھ مہذب الفاظ ہوتے ہیں۔ یہ جو جنسی اختلاط کا قصہ ہے' یہ مہذب سوسائٹیوں (معاشروں) میں کبھی بھی اس قسم کے برہنہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا۔ اسے ہمیشہ مہذب الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے اور ہمارے ہاں تو کبھی وضع داریوں کی کیفیت عروج پہ ہوا کرتی تھی۔ مثلاً میں نے یہ دیکھا ہے اور آپ کو بھی معلوم ہے کہ حکیموں کے ہاں جو Urine (پیشاب) لے جاتے ہیں تو اُس کے لیے حکیم لفظ ہی یہ استعمال کرتے تھے کہ

میاں! کل قارورہ ❶ لانا' قارورہ سبھی جانتے تھے۔ کبھی کسی کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ قارورہ کیا ہے؟ انہوں نے تو اپنے ہاں سوسائٹی (معاشرے) میں پیشاب کا یہ لفظ کہنا بھی مکروہ سا سمجھا۔ عزیزانِ من! قارورہ اس شیشی کو کہتے ہیں جس میں پیشاب ہوتا ہے۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ مہذب زبانوں میں' مہذب سوسائٹی میں' انداز یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کی بات بھی وہ ذرا ڈھکے چھپے انداز میں کرتے ہیں۔ قرآن نے اپنے ہاں انداز ہی یہ اختیار کیا ہے' جس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ جسے عام طور پہ چھپانا چاہیے مثلاً جنسی تعلق وغیرہ' تو وہ کچھ برہنہ نہ ہو۔ قرآنِ کریم کا اِس قبیل ❷ کی بات کہنے کا یہی انداز ہے اور یہی قصہ آدم وابلیس میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جب ان کے ستر کھل گئے اور وہ اس ''باغ'' کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانپنے لگے تو آگے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی** (20:121)۔ اس طرح انسان نے اپنے نشو ونما دینے والے سے سرکشی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی معیشت خراب ہو گئی۔ اس کی روزی درہم برہم ہوگئی۔ اس کی زندگی برباد ہوگئی۔ وہ غلط راستوں پر چل نکلا اور بُری طرح بھٹک گیا۔

وسوسہ کی تباہ کاریں

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے واضح کر دیا تھا کہ ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے رہنا۔ اب یہ جو تم نے خاندانی امتیاز شروع کیا' تو پھر یہاں سے باہمی تصادم' تزاحم' اختلاف اور افتراق کی ابتدا ہوئی اور پھر ان تصادمات واختلافات کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کے بعد اس مشاجرت کا حدِ حساب ہی نہیں۔ یہ اختلافات کتنے پیدا ہوتے ہیں' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ عالمگیر برادری تو ایک طرف رہی' یہ خود ایک ہی دادا کی اولاد میں' چچا اور تائے ہیں۔ ان کے بعد جو ان کی اگلی اولاد آئی ہے' ان میں کیا ہوتا ہے؟ ہمارے ہاں تو لفظ ''شریک'' کے معنی ہی دشمن کے ہیں۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ جب بھی خاندانی مناقشت ❸ کی بات ہوتی ہے تو جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ساڈا اوناں دا شریکا جو ہویا پئی ❹۔ یعنی حالانکہ وہ شریک تھے' ان کی تو آپس میں شرکت تھی' یہ تو کامن (Common) تھے۔ شراکت کے معنی ہی کامن (مشترکہ) ہونا کہتے ہیں۔ لیکن وہ جو اُس نے کان میں افسوں پھونکا تھا تو اس سے پھر بھائی کی اولاد بھی اپنی نہ رہی چہ

---

❶ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ عموماً یہ لفظ حُقّہ بارود کے لیے استعمال کرتے تھے' جو کہ ایک ڈبہ سا ہوتا تھا جس میں جواہر اور دوائیں وغیرہ رکھی جاتی تھیں۔ لغوی طور پر یہ ایک شیشی ہے' یہ وہ گول شیشی ہے جو بصورت مثانہ بنا کر مریض کا پیشاب (Urire) اس میں رکھ کر طبیب' حکیم کو دکھاتے ہیں اور یہ پیشاب کو قارورہ بولتے ہیں' یہ مجازاً ہے اور اسی کو تسمیۂ حال بہ اسم محل کہتے ہیں۔ (سید تصدق حسین: لغاتِ کشوری' (سالِ اشاعت درج نہیں۔ ویسے مؤلف نے 1872ء میں اس پر کام شروع کیا۔)' ص۔356)

❷ قسم' نوع

❸ جھگڑا' نزاع۔ اس کی جمع مناقشات ہے۔

❹ ہمارا اوران کا ''شریکا'' جو ہوا۔

جائیکہ وہ عالمگیر برادری بنتی، جس کے افراد کی کیفیت یہ ہوتی کہ 'لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں۔ یعنی اگر افریقہ کے صحرا میں کسی حبشی کے پاؤں کے تلوے میں کانٹا چبھے تو یہاں پاکستان کے محلات میں بیٹھے ہوئے انسان کی آنکھ کے اندر آنسو چھلک پڑیں۔ تعلق تو یہ ہونا چاہیے تھا، مگر اب کیفیت یہ ہوگئی کہ سگے بھائی کے جو بیٹے ہیں وہ ''شریک'' ہوگئے۔ یہ ہے شیطان کا وسوسہ! کیا بات ہے! کہ دو ماؤں سے خود ایک باپ کے بیٹے الگ الگ ہو جائیں تو صاحب! ان میں دیکھو کہ کیا کیفیت ہوگئی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مشاجرت کی انتہا کیا ہے۔ کہا: یہ نہ کر لینا۔ یاد رکھو! اگر یہ کچھ کر لیا تو پھر اختلافات اور مشاجرت کے یہ ''شریکے'' تمہارے ہاں سے مٹ نہیں سکیں گے۔ قرآنِ کریم کا بات کہنے کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ عَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی (20:121)۔ اس طرح انسان نے اپنے نشو ونما دینے والے سے سرکشی اختیار کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی معیشت خراب ہوگئی۔ اس کی روزی درہم برہم ہوگئی۔ اس کی زندگی برباد ہوگئی۔ وہ غلط راہوں پہ چل نکلا اور بُری طرح بھٹک گیا۔

تورات یا بائبل کے بیان اور قرآن کی تعلیم میں فرق

عزیزانِ من! انسان نے معصیت کی۔ اس نے سرکشی برتی۔ اس سے کسی کا کیا گیا؟ تباہ تو وہ خود ہو گیا۔ یعنی اس نے ہمارا کیا بگاڑ لینا تھا، وہ خود ہی تباہ ہو گیا۔ لیکن آگے سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا وہ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گیا؟ جی، یہاں پھر بائبل یا تورات (محرف) میں آدم و حوّا کے قصے کی بات آئی۔ تورات اور قرآن میں تخلیقِ آدم کا قصہ چلا آ رہا ہے۔ جہاں جہاں بھی اس قصے میں کوئی آمیزش ہوئی تھی، جس سے تخلیق آدم کا صحیح تصور دوسری پٹڑی پہ جا پڑا تھا، قرآن ایک لفظ کہہ کے اسکو صحیح پٹڑی پہ لے آیا۔ البتہ تورات میں یہ بات ہے کہ وہ، جو لغزش ہوئی، وہ آدم تک ہی نہ رہی، اس کی نسل تک پھیل گئی۔ تورات نے یہ کہا تھا کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے اولیں ماں باپ، آدم اور حوّا، کے گناہ کی کثافت لے کر پیدا ہوتا ہے؛ ہر انسانی بچہ پیدائشی گناہگار ہوتا ہے اور اس آلائش کو دنیا میں کسی عمل، کسی نیکی سے دھویا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ آلائش مستقل طور پر اس سے چمٹی رہتی ہے، اسے کوئی نہیں دھو سکتا۔ میں نے یہ بات کئی دفعہ کہی ہے کہ ان کے ہاں اس آلائشِ گناہ کو دھونے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اِنسان حضرتِ مسیح علیہ السلام کے کفارے پہ ایمان لائے اور یہ کہے کہ میرے گناہوں کا کفارہ ان کا خون ہو گیا جو صلیب پہ چڑھایا گیا۔ بقول ان کے اس سے یہ آلائش دور ہو سکے گی اور اس کے سوا اس آلائش کے دُور کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے آدم کے لیے ابدی مایوسی لکھ دی۔ یعنی وہ گناہ، جسے آدم اور حوّا کا گناہِ ازلی کہتے ہیں، انہوں نے تو بھگتنا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ قیامت تک ان کی اولاد بھی اس گناہ کے عوض جکڑی ہوئی، پھنسی ہوئی، چلی آتی رہے گی۔ یہ تھا وہ قصہ جو بائبل (تورات) نے دیا تھا۔ اس نے انسان کو اس نتیجہ پہ پہنچایا کہ اس میں بڑی مایوسی ہے صاحب! انتہائی مایوسی! قرآن نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اس سے انسان ابدی طور پر محروم و نامراد نہیں ہو گیا۔ اس کے لیے صحیح راستہ پر چلنے اور اس طرح زندگی کی خوشگواریاں حاصل کرنے کے امکانات موجود ہیں چنانچہ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (20:122)۔ آدم سے اس کے نشو ونما دینے والے نے کہہ دیا (کہ اب

تمہاری معاشرت کا نقشہ کچھ اور ہو جائے گا) کیونکہ آدم عالمگیر برادری کی جگہ، نسل پرستی کی، تشتت وافتراق کی، کشمکش میں الجھ گیا۔ تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ آدم اور اس کی بیوی نے اس ''درخت'' کا پھل کھا لیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ستر اُن پر کھل گئے۔ اس پر وہ پکار اٹھا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)۔ بارالٰہا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا کہ تیری بات نہ مانی۔

ابدی طور پر راندۂ درگاہ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! میں نے بتایا ہے کہ قرآنِ کریم نے آدم اور ابلیس کے قصے میں ایک بڑی بنیادی بات کہی ہے۔ ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ہماری معصیّت کیوں کی؟ اس نے کہا کہ سرکار! میں معصیّت کرنے والا کون ہوں، آپ کے حکم کے بغیر تو ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ ہمارا تو اختیار وارادہ ہی نہیں۔ جو کچھ چاہتے ہیں، آپ کراتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے یہ کرایا۔ میں نے کیا انکار کیا، میں تو ذمہ دار ہی نہیں ہوں۔ کہا کہ قیامت تک تیری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جو اپنی ذمہ داری قبول نہیں کرتا، اس کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی۔ ابدی طور پہ راندۂ درگاہ ہونے کی یہ بات ہے: جو اپنی خطا کا اعتراف نہیں کرتا، جو ذمہ داری نہیں لیتا، جو اپنی غلطی کو قبول نہیں کرتا، بلکہ اسے دوسرے کے سر تھوپتا ہے، اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہا کہ تیری اصلاح نہیں ہو سکتی، چلے جاؤ۔ آدم سے پوچھا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ اس نے کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23)۔ بارالٰہا! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ میں اس کا ذمہ دار ہوں، مجھ سے خطا ہوئی، مجھ سے لغزش ہوئی۔ کہا: ٹھیک ہے، تو نے اپنی خطا کا اعتراف کیا، اس لیے: اَجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (20:122)۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر سے گلے لگا لیا:

تُو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے، نگاہِ آئینہ ساز میں [1]

لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسان اشکِ ندامت آنکھوں میں لیے اس کے حضور چلا جائے۔ اپنی لغزش کا، اپنے گناہوں کا، اعتراف کرلے، برملا کہے کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (7:23)۔ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا (کہ تیری بات نہ مانی)۔ اگر تیری طرف سے ہماری حفاظت اور مرحمت کا انتظام نہ ہو تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ اسے یوں بھی کہیے کہ اگر تیرے ہاں سے سامانِ حفاظت نہ ملا تو ہم تباہ ہو جائیں گے، ہم قصوروار ہیں، ہم اعتراف کرتے ہیں۔ اس پر اِجْتَبٰهُ رَبُّهٗ (20:122)۔ اس کے نشوونما دینے والے نے کہا کہ اب تمہاری معاشرت کا نقشہ کچھ اور ہو جائے گا۔ یہاں قرآن کے عجیب الفاظ ہیں۔ کہا کہ فَتَابَ عَلَيْهِ (20:122)۔ ایسے نظر آتا ہے جیسے روٹھ کے اِس نے اِدھر رخ کر لیا اور اُس نے اِدھر رخ کر لیا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ پہلے جو خدا نے اِدھر رخ کیا ہے تو اس لیے کیا ہے کہ اس نے سرکشی برتی۔ اِس نے اِدھر سے

---

[1] اقبالؒ: بانگِ درا، 1996، ص۔ 295۔

کہا کہ حضور! میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں' میں مجرم ہوں' میں قصوروار ہوں تو کہتے ہیں کہ فَتَابَ عَلَيْهِ (20:122) تو جھٹ سے خدا مڑا۔ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ انسان جونہی اپنی غلطی کا اعتراف کرے وہ اس کی طرف توجہ کرتا ہے۔ خدائے کریم اسی لیے یہ کہتا ہے کہ اگر انسان ایک قدم خدا کی طرف آتا ہے تو قدرت دو قدم انسان کی طرف آگے بڑھتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہم نے کیا کیا؟ بس یہ کہ انسان نے خدا تعالیٰ سے یہ کہہ دیا کہ ہاں صاحب! مجھ سے غلطی ہوئی' اعترافِ گناہ کر لیا اور اس کے بعد پھر موج ہو گئی۔ کہنے لگے کہ نہیں' موج نہیں ہو گئی بلکہ وَ هَدٰى (20:122) ہم نے اُسے وہ راستہ دکھا دیا جس پر چلنے سے یہ مصیبت ٹل جائے گی۔ راستہ دکھا دیا' چلنا اس نے آپ ہی ہے۔ یہ ہے عجیب چیز۔ یعنی ساری نوازش جو اس پہ ہوئی ہے' جسے آپ توبہ قبول ہوئی کہتے ہیں' جسے آپ بخشا گیا کہتے ہیں' وہ اتنی ہی بات ہے کہ هَدٰى (20:122) خدا نے اسے وہ راستہ دکھا دیا ہے' جس سے محروم ہو کر' یہ جانکاہ مشقتوں میں پڑے گا۔

مشاجرت کا نتیجہ مقامِ بلند سے پستی کی طرف آنا ہے

عزیزانِ من! خدا نے کہا ہے ہم نے اُسے صحیح راستہ دکھا دیا ہے' اس کے بعد پھر چلنا تو اس نے آپ ہی ہے۔ یہی ہے اس کی کرم نوازی' یہی ہے اس کی عنایت۔ راستہ پر چلنا تو انسان نے خود ہی ہے۔ خدا نے رسول اللہ سے کہا کہ کسی کے ساتھ تیری کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو' اگر وہ اس راستے پہ چلنا ہی نہیں چاہتا تو اس کا کیا علاج! لہٰذا تیرا کام اس کو صرف راستہ بتا دینا ہے' چلا دینا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں جو مغفرت' بخشش' اور نجات وغیرہ کے سارے الفاظ ہیں' وہ بس یہ ہے کہ اس نے راستہ دکھا دیا۔ یہ اس کی عنایت ہے۔ اب چلنا تو تم نے خود ہے۔ خدا نے تو یہ کہہ رکھا ہے کہ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (20:123)۔ کہا کہ تم اس حالت سے نیچے گر جاؤ اور تمہاری انفرادی مفاد پرستیوں نے درمیان میں حائل ہو کر تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ یہ جو تم نے میری اور تیری کا امتیاز پیدا کر لیا ہے' یہ اس کا نتیجہ ہے۔ یہاں اھبطا [1] کا لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کے معنی کسی جگہ سے نکل جانا نہیں ہے۔ نکل جانے کا تصور بائبل وغیرہ کے اندر ہے کہ وہ وہاں سے نکال دیئے گئے۔ قرآن کی کیا بات ہے کہ اس نے اس کے لیے لفظ ''ہبوط'' استعمال کیا ہے۔ ''یہ کسی بلند مقام سے پست مقام پہ آ جانا ہوتا ہے''۔ انسانیت کے لیے بلند مقام تو وہی عالمگیر اخوت ہی ہے۔ اس کے برعکس اس کا مختلف ٹکڑوں کے اندر بٹ جانا پست مقام ہے۔

---

[1] اس لفظ کا مادہ ''ھ ب ط'' ہے۔ اسی سے لفظ ''ھبـــوط'' ہے' جس کے معنی کسی بلند مقام سے پست مقام پر اترنا ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' میں اس لفظ کے معنی ''دب کر مجبوراً اترنا'' لکھے ہیں۔ یہ لکھا ہے کہ جب لفظ ''ھبــوط'' انسان کے لیے بولا جائے تو اس میں استخفاف' خفت' سبکی بے وقری اور حقارت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اور پطرس بستانی نے اپنی مختصر کتاب ''محیط المحیط'' میں لکھا ہے کہ هبط من مَوْضِعٍ اِلٰى مَوْضِعٍ کے معنی ہیں ''وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہو گیا۔''

لفظ عدو کا قرآنی مفہوم

قرآن کریم نے کہا ہے کہ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ (20:123) تم ایک دوسرے کے ''عدوٌ'' ہو۔ اس کا نتیجہ تمہارا مختلف ٹکڑوں میں بٹ جانا ہے۔ ہمارے ہاں تو عدو کے معنی دشمنی ہیں لیکن قرآن میں، عربی زبان میں، دشمن کے لیے تو بڑے لفظ ہیں۔ 'عداوت' کے مفہوم کے لیے آپ یوں سمجھیں کہ ایک بہت بڑی لکڑی ہے، اس میں ایک کلہاڑ ماریں، اس میں ذرا سا چھید پیدا ہوتا ہے، تو اس کے اندر Wedge دیدیتے ہیں جسے آپ پھانا کہتے ہیں۔ یہ عام طور پہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ جس بڑی لکڑی پہ آپ کلہاڑ امار کر چھید کرتے ہیں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لکڑی اپنے زور دروں سے پھر مل جانا چاہتی ہے۔ اُس سے بچنے کے لیے اس کے درمیان ایک چیز یعنی پھانا دیدیتے ہیں تا کہ وہ اسے ملنے نہ دے۔ آپ دیکھیں کہ اس لکڑی کی اندرونی کوشش، جذبہ، خواہش یہ ہوتی ہے کہ میں مل جاؤں۔ یہ لکڑی جو اس حد تک پھٹی ہوئی ہوتی ہے کہ اگر پھانا نکال دیا جائے تو کھٹ سے مل جائے۔ وہ بڑے زور سے ملتی بھی ہے حالانکہ یہ لکڑی اس حالت میں الگ الگ ہو چکی ہوئی ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اس کے اندر یہ ایک چیز Wedge (پھانا) دے دی جاتی ہے۔ یہ جو چیز دی جاتی ہے جو اسے ملنے نہیں دیتی، اسے ''عداوت'' کہتے ہیں۔ یعنی اصل کے اعتبار سے تو وہ پہلے سے آپس میں ملی ہوئی تھی، اب بھی ملنا چاہتی ہے مگر کوئی ایک چیز ہے جو درمیان میں آ گئی ہے، جو اب اسے ملنے نہیں دیتی، یہ ہے وہ چیز جسے قرآن نے بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ کہا ہے۔ یعنی تم تو ایک ہی تھے، درمیان میں کوئی ایک چیز آ گئی ہے۔ اب وہ تمہیں ملنے نہیں دیتی۔ یہ ہے عداوت۔ یہ ہیں مفاد پرستیاں جو تمہارے درمیان حائل ہو کر تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیتی ہیں۔

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ انسان اس حائل شدہ چیز کو درمیان سے کیسے نکالے؟ اس کے لیے کہا کہ اب اس سے نکلنا تمہارے اپنے بس کی بات نہیں ہے، تمہارا اپنا ہی آپ درمیان میں آ گیا ہوا ہے۔ اس قسم کی لکڑی میں اپنا بھی ہاتھ آ گیا ہو تو آدمی نکال ہی نہیں سکتا۔ اس کے لیے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے کہا کہ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقٰى (20:123)۔ اب ہماری طرف سے تمہارے پاس صحیح راستے کی طرف لے جانے والے قوانین زندگی آتے رہیں گے۔ جو کوئی ان قوانین کا اتباع کرے گا تو نہ اس کی محنت رائگاں جائے گی اور نہ ہی وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ کر ان جانکاہ مشقتوں میں پڑے گا۔ اس طرح خدا اپنے الطافِ کریمانہ سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔ کہا کہ اب درمیان میں سے یہ پھانا (Wedge) کیسے نکلے؟ اس کے لیے کہا کہ اب ہماری طرف سے تمہیں راہنمائی ملے گی، جس نے اس راہنمائی کا اتباع کر لیا تو یاد رکھو! نہ تو اس کی محنت رائیگاں جائے گی، نہ وہ جگر پاش مشقتوں میں الجھے گا۔ عزیزانِ من! یہ سارا قصہ نظامِ سرمایہ داری کا ہے۔ میں نے کتنی دفعہ یہ عرض کیا ہے کہ یہ محنت کش کی محنت کا رائیگاں جانا ہے۔ اس محنت کا اسے معاوضہ نہیں ملتا۔ سارا قصہ ہی یہ ہے۔ اِسی سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔

قوموں کی روزی تنگ ہونے کی اصل وجہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا کہ یہ کارخانہ دار جب مزدور کو انگیج (Engage) کرتا ہے یعنی ملازمت پہ رکھتا ہے تو اسے کہتا ہے کہ تمہیں آٹھ گھنٹے کام کرنا ہوگا اور یہ کچھ اس آٹھ گھنٹے کی مزدوری ملے گی۔ دراصل وہ پہلے حساب کر لیتا ہے کہ اس نے آٹھ گھنٹے میں جو پیدا کرنا ہے وہ بیس روپے ہیں چنانچہ اس سے دس روپے مزدوری طے کر لی جائے۔ ٹھیک ہے' اس سے دس روپے مزدوری طے ہوگئی۔ اب دس روپے کا کام تو وہ چار گھنٹے میں کر لے گا۔ یہ جو باقی چار گھنٹے وہ کام کر رہا ہے بظاہر تو یہ فریب ہے کہ اس کو یہ دس روپے آٹھ گھنٹے کے مل رہے ہیں کیونکہ چار گھنٹے میں تو اس نے دس روپے کا کام کر دیا ہے باقی چار گھنٹے جو کام کر رہا ہے تو وہ اس کی محنت رائیگاں جا رہی ہے لیکن قرآنی نظام میں یہ ہے کہ **فَلَا يَضِلُّ** (20:123) تمہاری محنت کا ایک ثانیہ بھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **وَلَا يَشْقٰى** (20:123) اور نہ ہی تمہیں زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ کر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ اور اگر ہماری طرف سے آنے والے قوانین کا اتباع نہ کیا' یعنی **وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ** (20:124) جس نے ہمارے قوانین سے اعراض برتا تو **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ لیکن عزیزانِ من! آج تو ہمارا تصور ہی یہ ہے کہ صاحب! مذہب کا کام تو صرف نماز روزہ وغیرہ پڑھانے کا ہے' اس کا نتیجہ آخرت میں جا کے نکلے گا۔ آپ اندازہ لگائیے کہ قرآن تو یہ کہہ رہا ہے کہ جس نے ہمارے قوانین سے اعراض برتا تو اس کی روزی تنگ ہو جائے گی یعنی **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی۔ آپ کے ہاں معیشت کا یہ لفظ اکانومی (Economy) کے لیے بولا جا رہا ہے' اسے معیشت ہی کہتے ہیں' معاش بھی کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ اس کی روٹی [1] تنگ ہو جائے گی۔ تو پہلی چیز یہ ہے کہ خدا کے قوانین سے کون اعراض برت رہا ہے: فرد یا قوم؟ یہ تو قومی اعتبار سے ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ جس قوم میں بھی افلاس ہے اور وہ روزی تک کے لیے دوسروں کی محتاج ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے قوانین سے اعراض برت رہی ہے' خواہ حج پہ دس لاکھ افراد بھی کیوں نہ چلے جائیں۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ **فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا** (20:124) اس کی معیشت (روزی) تنگ ہو جائے گی۔ یہ کہتے ہیں کہ کوئی بات نہیں۔ چلو جی' چار ہی دن کی تو بات ہے۔ لتھا دیا' لڈو پیا مٹھا [2]۔ سمجھے یہ بات؟ نہیں' میری بیٹیاں نہیں سمجھیں گی۔ بڑی مشکل ہے' پنجابی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ ہماری زبانوں کے بڑے عمدہ محاورے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ ساری چیز جسے آپ لذت کہتے ہیں' صرف اس وقت تک ہے' جب تک کھانے کی چیز منہ میں رہتی ہے۔ کیا یہ دونوں یعنی وہ چیز اور لذت ایک جیسی ہوتی ہیں؟ ہماری بیٹیوں نے کبھی دیکھا ہی نہ ہوگا اب تو وہ چھابیاں ہی نہیں ہوتیں۔ وہ عجیب چیز ہوتی تھی: نہ میٹھا' نہ پھیکا' نہ نمکین مگر لذت ہی لذت۔

---

[1] روزی [2] لذت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک منہ میں کھانے کی چیز رہتی ہے۔

خیر عزیزانِ من! کہنا یہ تھا کہ ٹھیک ہے جی کہ یہاں اس دنیا میں چار دن ذرا تنگی ترشی میں گزار لیے۔ تب کیا ہوگیا؟ بس مر گئے۔ اب ٹھیک ہے صاحب! پھر افسانے بنے۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب اس دنیا میں سکندر جا رہا تھا کہنے لگا کہ جب مجھے دفن کرنے جاؤ میرے ہاتھ کفن سے باہر رکھنا۔ پوچھا کہ جناب وہ کاہے کے لیے؟ کہنے لگا کہ کاہے کے لیے؟ اس لیے کہ دیکھیے میں اتنی بڑی سلطنت کا مالک جا رہا ہوں تو لوگ دیکھ لیں کہ خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ اس لیے یہ کہتے ہیں کہ یہ تو چار دن کی زندگی ہے روزی کی تنگی چہ معنی دارد۔ مگر لذتِ حیات نہیں چھوڑنا چاہتے اور مثال سکندر اعظم (356-323 B.C) کی دیتے ہیں۔

خدا کا مقرب بننے کے سلسلے میں بدحالی کا فریب

عزیزانِ من! اب ایک اور فریب دیا جا رہا ہے کہ کوئی بات نہیں یہاں اس فانی دنیا میں تنگی ترشی میں گزارہ کر لو۔ اللہ کے مقرب بندوں کی تو نشانی ہی یہ ہے کہ اس دنیا میں ان پہ تکالیف پہ تکالیف مصیبتوں پہ مصیبتیں فاقے پہ فاقے آئیں گے۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا نہ رہنے کو مکان ہوگا۔ اِس دنیا میں ان کی کیفیت یہ ہوگی۔ پھر آپ کہیں گے کہ بابا جی [1] نے وہی بات شروع کر لی۔ یہ جو آپ کے ہاں عام طور پہ نقلیے وقلیے [2] ہوتے ہیں یہ بعض اوقات بڑی پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے اندر اللہ کے سامنے سے مختلف قومیں گزریں گی۔ ایک قوم آئے گی۔ جناب! اس نے نہایت اعلیٰ قسم کے ملبوس زیبِ تن کیے ہوں گے۔ دوسری آئے گی۔ اس کے ہاں نہایت اعلیٰ مہذب قسم کے برتن کھانے پینے کی چیزیں ہوں گی سارے کا سارا اعلیٰ لباس پہنا ہوگا اور اس کے بعد صاحب! ایک قوم آئے گی: ننگی دھڑنگی فاقہ زدہ بُرا حال بونگے دیہاڑے۔ [3] پتہ لگے گا کہ کون آئے؟ کہنے لگے کہ یہ اللہ کے محبوب بندے چلے آ رہے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے۔ ان میں سے ایک بھانڈ کہنے لگا کہ جی! ''اے اللہ دے رنگ اچ رنگے ہوئے ہیگے نیں۔ نہ اونوں کھان دی لوڑ اے نہ ایناں نوں کپڑا پان دی لوڑ ہیگی اے۔ نہ اوہدے کول مکان اے نہ ایناں کول کوئی پلاٹ ہیگا۔ اے اللہ دے رنگ اچ رنگی ہوئی ترئی آن ڈئی اے اے قوم۔'' [4] بات تو یہ مذاق کی ہے لیکن ہے حقیقت کی عکاس! کیونکہ عزیزانِ من! آپ کے ہاں مقربینِ بارگاہِ خداوندی کے متعلق جتنی بھی صوفیائے کرام کی کتابیں ہیں انہیں اُٹھا کے دیکھیے ان میں یہی کچھ ہے: جتنا کوئی زیادہ اس رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ مقرب ہوتا ہے۔ یہ ہے خدا کا مقرب بننے کے سلسلے میں بدحالی کا فریب جو یوں دیا جا رہا ہے۔

---

1. دوست احباب چھوٹے بڑے سب پرویزؒ کو بڑے ہونے کے ناطے صاحبِ علم ہونے کے ناطے عزت واحترام کے جذبات سے بابا جی کہتے تھے۔
2. بھانڈ۔ نقال۔ مسخرے۔ جھوٹی تعریف کرنے والے۔
3. بدحالی کے بُرے دن
4. یہ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ نہ اسے (اللہ کو) کھانے کی ضرورت ہے نہ انہیں کپڑا پہننے کی ضرورت۔ نہ اس کے پاس مکان ہے نہ ان کے پاس کوئی پلاٹ۔ جی! یہ ہے وہ قوم جو اللہ کے رنگ میں رنگی ہوئی چلی آ رہی ہے۔

اک پکھ تے سوعیب ❶: ایک ابدی جہنم

عزیزانِ من! چلیے انہوں نے یہاں تک تو یہ کہہ دیا کہ گو دنیا میں اس کی روزی تنگ ہو جائے گی مگر عاقبت تو سنور جائے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا معاملہ کس سے پڑا ہے؟ خدا تو کہتا ہے کہ یہی نہیں کہ اس کی روزی تنگ ہو جائے گی بلکہ **وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى** (20:124)۔ ہم اسے ظہورِ نتائج (قیامت) کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ زندگی کی روشن راہیں اس کے سامنے تاریک ہوں گی۔ اس طرح بات یہ ہے کہ جس کی یہاں کی روزی تنگ ہو جائے گی' قیامت میں بھی وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔ اک پکھ تے سوعیب؛ عیب تو خود ہی سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ اس کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ **بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا** (28:58)۔ یہ جو سامانِ زیست فراوانی سے زیادہ مل جاتا ہے' اس سے بھی بہت سے جرائم پیدا ہوتے ہیں لیکن اس نے کہا ہے کہ جو عذاب بھوک اور خوف سے آتا ہے' اس کے پیدا کردہ جرائم کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ اور دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ **مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى** (17:72)۔ یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا۔ یہاں (20:124) میں جو کہا ہے کہ یہاں جس کی معیشت تنگ ہو جائے گی وہ وہاں اندھا اٹھایا جائے گا۔ اِس سلسلے میں یہ یاد رکھیے کہ کسی حادثے کی وجہ سے' کسی قوم پہ ایسی حالت کا آ جانا' جنگ کی وجہ سے تباہی کا آ جانا' سیلاب سے تباہی کا آ جانا' یا کوئی اور حوادث سے تباہی کا آ جانا' یہ کسی قوم یا فرد پر کسی بھی وقت ہنگامی طور پہ ہو سکتا ہے جس سے اس کی معیشت کی تنگی ہو جائے لیکن اگر مستقل طور پہ معیشت کی تنگی ہو جائے اور وہ قوم یا فرد اس پہ قناعت کر کے بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ یہ تقربِ بارگاہِ الٰہی ہے' تو یہ خود فریبی (Self - Deception) ہے۔ جو قوم اس فریب میں پھنس جاتی ہے اس کے لیے ابدی جہنم ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں بھی جہنم' اگلی دنیا میں بھی جہنم۔ یہ اس کی غلط روش کا انجام ہوتا ہے' نہ صرف اس زندگی میں بلکہ اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس صورتِ حال میں قرآنِ کریم نے اس کا خوب جواب دیا کہ **قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى** (20:125)۔ وہ کہے گا کہ اے میرے نشوونما دینے والے! تو نے میرا یہ "حشر" کیوں کیا' تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم نے کیا بات کی ہے کہ وہ وہاں پوچھے گا کہ یا اللہ! میں تو وہاں اچھا بھلا تھا' مجھے یہاں اندھا کیوں اٹھایا گیا؟ **وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا** (20:125) میں تو اچھا بھلا دیکھنے والا تھا' دیدہ میرا بینا تھا۔ قرآنِ حکیم نے اس کا خوب جواب دیا کہ **قَالَ كَذٰلِكَ** (20:126)۔ کہا کہ یہ تیرا فریب تھا جو یہ کہہ رہا تھا کہ میں وہاں تو اپنے آپ کو چنگا بھلا دیکھ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تُو وہاں بھی اندھا تھا۔ اس لیے کہ **اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا** (20:126)۔ ہمارے قوانین تمہارے پاس پہنچتے رہے لیکن تم نے انہیں ناقابلِ اعتنا ❷ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ یاد رکھو! یہی

---

❶ ایک بھوک سے سینکڑوں عیوب جنم لیتے ہیں۔

❷ ناقابلِ اعتنا: غور و پرداخت کرنے کے ناقابل یعنی ناقابلِ پرواہ۔

آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ وہ آنکھیں اندھی ہوا کرتی ہیں جو سینے کے اندر ہوتی ہیں۔ ہمارے قوانین یعنی اٰیٰتنَا (20:126) تم تک پہنچے۔ یہاں لفظ ہے کہ فَنَسِیْتَهَا (20:126)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ تم نے انہیں بھلا دیا۔ عزیزانِ من! بھول جانا تو کوئی زیادہ جرم نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں نَسِیَ کے معنی بھول جانا ہی نہیں ہوتا بلکہ بقول راغب [1] اگر کوئی شخص اپنے پاس رکھی ہوئی چیز کی حفاظت کرنا چھوڑ دے تو اسے بھی نسیان کہتے ہیں۔ یعنی حفاظت کرنا چھوڑ دینا۔ اس طرح نَسِیَ کے معنی ''ترک کر دینے'' کے ہیں۔ مثلاً نَسُوا اللّٰہَ فَنَسِیَهُمْ کے معنی ہیں: انہوں نے قوانینِ خداوندی کو چھوڑ دیا تو خدا نے ان کی حفاظت کو چھوڑ دیا۔ [2] اب یہاں قرآنِ کریم نے کہا کہ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى (20:126)۔ اس لیے آج تمہیں (زندگی کی روشنی سے) محروم کر دیا گیا ہے اور اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یعنی آج یہی کچھ تیرے ساتھ ہو رہا ہے' تو بھی انسانوں کی صف میں نہیں رہا' تجھے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ آج تجھے ناقابلِ التفات سمجھ کر تیرے اپنے ہی حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

تنسیٰ یعنی خدا کو بھلا دینے کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ جو تُنْسٰی کا لفظ آیا ہے' جسے کہتے ہیں کہ بُھلا دیا گیا' اور جسے اب آپ درس سننے کے بعد کہیں گے ''ترک کر دیا گیا' پسِ پشت ڈال دیا گیا۔'' سوال یہ ہے کہ یہ بات کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ خدا نے تو اسے نہیں بھلا دیا' اس نے خدا کے قوانین کی حفاظت ترک کر دی تو خدا نے اس کی حفاظت کو چھوڑ دیا۔ [3] خدا نے اس پہ خوامخواہ پردہ نہیں ڈال دیا۔ یہ کیا بات ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوا؟ سورۃ حشر میں اس کا جواب دیا کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19)۔ دیکھنا' تم کہیں ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا کہ جنہوں نے خدا کے کہے کو بھلا دیا' فراموش کر دیا' پسِ پشت ڈال دیا' ترک کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19)۔ وہ اپنا آپ ہی بھول گئے' خود ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ان کی زندگی حیوانی سطح کی زندگی بن کر رہ گئی۔ وہ ''میں'' [4] کو بُھلا بیٹھے اور ان کا منتہائے مقصود ''میرا'' رہ گیا: فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (59:19) اس کا عذاب ملاحظہ

---

[1] یہ معانی امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف: ''المفردات فی غریب القرآن'' کے میمینہ مطبع مصر میں 1324ھ میں چھپنے والی قرآنی لغت کے حوالے سے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' 1961' ص۔ 1617

[2] ابن قتیبہ: القرطین' جلد ا' ص۔ 198

[3] ہمارے ہاں بھی یہ کہتے ہیں کہ میں نے تمہیں کتنی باتوں کی تاکید کی لیکن تم نے ان سب کو بُھلا دیا۔ یہاں ''بھلا دیا'' سے مراد یہ نہیں کہ وہ تمہارے حافظے سے محو ہو گئیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم نے ان پر عمل نہیں کیا۔ یا کچھ عرصہ تک عمل کر کے انہیں چھوڑ دیا۔ نیز اس کے معنی ''کسی چیز کو علیٰ حالہٖ رہنے دینا'' کے بھی ہیں۔ اس کی تائید میں صاحبِ غریب القرآن (مرزا ابوالفضل) نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول بھی نقل کیا ہے' جس کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ رہنے دینے کے ہیں۔ ان معانی کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' 1961' ص۔ 1617۔

[4] انسانی شخصیت۔

فرماؤ: خدا کوتم نے بھلا دیا' اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ خدا کو کیا بھلانا' اور کیا یاد رکھنا' یہ تو **فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ** (59:19) یوں ہے کہ ان کی اپنی ذات' ان کی نگاہوں سے اوجھل کر دی گئی' انہوں نے اپنا آپ بھلا دیا۔ اس طرح خدا کے قوانین بھلانے والوں کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اس روٹی کے دھندے میں' صبح سے شام تک' ایسے پھنستے ہیں' عزیزانِ من! کہ بس سرگرداں بھی رہتے ہیں' پریشاں بھی۔ اس درجہ پریشان وسرگرداں رہتے ہیں کہ روٹی سے ورے کسی اونچے مقصد کے لیے دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ یہ ہے اپنے آپ کو بھلا دینا۔ حیوانوں تک میں بھی یہ کیفیت نہیں ہوتی: جنگل میں ہیں تو ان کے لیے فراوانی سے رزق موجود ہے' کھائیں پئیں۔ جنہیں Domestic (گھریلو۔ پالتو) کر دیا تو ان کی کیفیت یہ ہے کہ مثلاً گدھے کو دیکھو کہ گدھے والا اس گدھے کو سارا دن ہانکتا پھرتا ہے۔ آپ اس کے پیچھے اس سے زیادہ پریشاں اور سرگرداں ہوتا ہے۔ گدھا اگر دن میں بیس میل چلتا ہے تو یہ چلانے والا تیس میل چلتا ہے: کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ جب شام کو گھر آتا ہے تو اُسے گدھے کے لیے گھاس کی فکر ہوتی ہے' راستے سے اس کے لیے گھاس لے کر آتا ہے اور اس کے بعد جب وہ گھر آتا ہے تو اگر گھر میں بچوں کے لیے آٹا نہیں ہوتا' تو اسے پریشانی ہوتی ہے۔ گدھے کو یہ پریشانی نہیں آتی جو اس انسان کو آرہی ہے۔ آپ کو یاد ہے وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ **اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡغٰفِلُوۡنَ** (7:179)۔ یہ لوگ انسان نہیں' بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ (اس لیے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلی تقاضوں (Instincts) کے مطابق تو چلتے ہیں۔ اور اس قسم کے انسان ان حدود سے بھی) بے خبر رہتے ہیں۔ اس طرح پہلے کہا کہ یہ انسان نہیں' حیوان ہیں' پھر کہا کہ حیوان نہیں اس سے بھی زیادہ گئے گزرے۔ یوں کہو کہ کھوتے دا مالک' کھوتے نوں پالدا پالدا' اپنا آپ بھی بھلا بیٹھا۔ [1]

محنت اور مشقت میں فرق اور اسراف کا مفہوم

عزیزانِ من! جو قوم فکرِ معاش میں اس قدر پریشان پھر رہی ہو' محنت کرنا تو ایک طرف رہا' اس کے ذہن میں تو فکرِ معاش سے زیادہ اونچی بات آ ہی نہیں سکتی۔ اس بات کے سوچنے کے لیے ان بے چاروں کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ فکرِ معاش سے بلند بات سوچنے کا تو قصہ ہی ختم ہوا۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ **وَکَذٰلِکَ نَجۡزِیۡ مَنۡ اَسۡرَفَ وَلَمۡ یُؤۡمِنۡۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ** (20:127)۔ جو کوئی بھی نشوونما دینے والے کے قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا اور ان سے سرکشی برتتا ہے' اسے ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق اسی قسم کا بدلہ ملتا ہے یعنی اس دنیا میں معیشت کی تنگی اور تباہی۔ یہ **مَنۡ اَسۡرَفَ** کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ''اسراف'' عجیب لفظ ہے۔ آج ہمارے سامنے کھیتی کا' زراعت کا' نظام ہی نہیں آتا' ورنہ پرانے زمانے میں کنوؤں سے محنت کر کے پانی نکالتے تھے۔ اس کے بعد پانی کی چھوٹی سی ندی بہتی تھی۔ اس میں سے پانی کھیت تک جاتا تھا۔ عزیزانِ من! میں وہاں کا رہنے والا ہوں' جہاں زراعت کا یہ نظام تھا اور ہمیں پتہ ہے جو کچھ

---

[1] گدھے کا مالک گدھے کی پرورش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھا۔

ہوتا تھا۔ رات بھر سے پانی کھیت کو لگایا ہوا ہے اور ایک شخص اپنی کَسّی کندھے پہ لیے ساری رات پھر رہا ہے کہ کہیں اس آڑ [1] کے پھٹ جانے سے ذرا سا پانی بھی اِدھر اُدھر نہ چلا جائے اور اس طرح اپنے کھیت میں پہنچنے کی بجائے راستے میں ہی کسی دوسرے کے کھیت میں چلا جائے۔ اس قسم کی آڑیں بنانا جن سے پانی راستے میں لیک (Leak) کر کے تمہارے کھیت میں پہنچنے کی بجائے راستے کے کھیتوں میں جا پہنچے، یعنی اُن کے کھیتوں میں چلا جائے جو اس کے لیے کچھ محنت ہی نہیں کر رہے، اسے عربی زبان میں اسراف کہتے تھے۔ جس معاشرے میں ''اسراف'' کی یہ کیفیت ہو جائے، اس میں ہوتا یہ ہے کہ کھیت والے کے کھیت تک پانی کی بوند تک نہیں پہنچتی، راستے ہی میں، یہ پانی بہہ جاتا ہے۔ اس لیے اَلسَّرَفُ کے معنی ہیں: ''جو حد مقرر کی گئی ہو اس سے آگے بڑھ جانا، زیادتی کرنا، کسی چیز کا اس طرح ضائع ہو جانا کہ جو فائدہ اس سے حاصل ہونا تھا وہ حاصل نہ ہو۔ اس لیے کسی چیز کو اس مقام پہ نہ رکھنا جس کے لیے وہ بنی ہے، اسراف کہلاتا ہے''۔ [2] اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ (20:127)۔ جو کوئی بھی اپنے نشو و نما دینے والے کے قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا، ان سے سرکشی برتتا ہے، اس کے ساتھ معیشت کی تنگی ہوتی ہے۔

قرآنی قوانین پر عمل پیرائی کا نتیجہ: نہ خوف نہ حزن

قوانینِ خداوندی پہ ایمان نہ لانے کا نتیجہ معیشت کی تنگی ہو جاتا ہے۔ عزیزانِ من! اس قسم کا غلط معاشرہ قائم کرنا اور اس کے بعد یہ کہنا کہ صاحب! خدا پر ہمارا ایمان ہے تو قرآن کہتا ہے کہ یہ ایمان ہے ہی نہیں۔ ایمان کا نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** (2:38)۔ نہ بیرونی خطروں کا کوئی خوف، نہ اندرونی افسردگی اور ملال کیونکہ قرآن نے ایمان کا یہ نتیجہ بتایا تھا۔ اس لیے اگر خوف بھی ہے، اور حزن بھی ہے تو یہ کہنا کہ ''ہمارے ہاں ایمان'' ہے، سرے سے غلط ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ (20:127)۔ وہ اپنے نشو و نما دینے والے کے قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا۔ اب رہی ان کی یہ بات کہ ہاں صاحب! یہ کوئی بات نہیں ہے، یہ سارا کچھ جو قرآن نے کہا ہے، یہ صرف قیامت تک کی بات ہے، تو سنیے! قرآن اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے؟ کہ **وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى** (20:127)۔ اور مستقبل کی زندگی میں اس دنیا کی تنگیِ معیشت سے بھی زیادہ شدید اور دیرپا عذاب ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ یہ کچھ تو یہاں ہو گا اور وہاں جا کے اس سے بھی زیادہ شدید ترین عذاب ہو گا۔ تو اب دیکھ لیا کہ بقول ان کے یہ عذاب تو یہاں ہی ہوتا ہے، قرآن نے تو کہا ہے کہ یہ یہاں ہو گا اور اس کے بعد کی زندگی میں اس سے بھی زیادہ شدید اور دیرپا عذاب ہو گا۔

---

1. پانی کی چھوٹی سی ندی، اوٹ، حفاظت۔
2. اس نکتے کے لیے مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960ء ص۔ 870

تاریخ ایک سائنس ہے اور علم الانسان کے لیے تاریخی حقائق کا ثبوت

عزیزانِ من! اس محاکاتی قصۂ آدم کو یہاں تک لاکر فوری کہا کہ اے علم الانسان کی تحقیق کرنے والو! اب تاریخ کی طرف آؤ۔ یہ ہمارا دوسرا شعبہ ہے کہ وہ مختلف اقوام جنہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کی تھی' ان کی تاریخ کو سامنے لاکر دیکھو کہ ان پر کیا بیتی۔ اب یہ ہسٹری (تاریخ) کی بات آ گئی۔ ایک ہسٹری (تاریخ) تو وہ ہے جس میں صرف قوموں کی نوشتیں ہیں' مثلاً اکبر (1542-1605) فلاں سن (1556) میں تخت نشین ہوا' فلاں سن میں فلاں کے ساتھ جنگ کی' فلاں سن (1605) میں مر گیا۔ یہ دراصل وقائع نگاری ہے' یہ ہسٹری (تاریخ) نہیں ہے۔ عزیزانِ من! قرآن نے ایک دوسری چیز پیش کی ہے۔ میں پھر عرض کرونگا کہ چودہ سو سال پیشتر اس نے یہ چیز پیش کی اور اب اس دَور میں آ کے اِس نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر لی۔ وہ ہے فلاسفی آف ہسٹری' یعنی تاریخ کا فلسفہ' ورنہ تاریخ تو ان واقعات کی صرف یاداشتوں کا نام تھا۔ فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History) کو جب اس انداز سے پیش کیا ہے تو اس وقت سے دنیا میں اس کی بڑی شہرت ہوئی ہے۔

نتائج کے لحاظ سے تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے

عزیزانِ من! اسے یاد رکھیے کہ قرآن فلسفہ تاریخ پیش کرتا ہے۔ قرآن صرف واقعات ہی نہیں پیش کرتا بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ میرا اس سے کیا واسطہ! وہ کہتا یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کیا' تو اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ اس کے برعکس' فلاں قوم نے ہمارے قوانین کے مطابق اپنا معاشرہ متعین کیا' تو اس کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا۔ اسے یاد رکھیے کہ اسے تاریخ کا فلسفہ کہتے ہیں۔ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے واقعات نہیں دہراتے' اکبر پھر پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ اس کے ساتھ ہمایوں وغیرہ کی جنگ دوبارہ نہیں دہراتی۔ یہ تاریخ کا فلسفہ ہے جو اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب اور جہاں بھی کوئی قوم یہ کچھ کرے گی یا جس قوم نے یہ کچھ کیا تو اس کا وہ نتیجہ نکلا۔ اب جب کبھی بھی کوئی قوم وہی کچھ کرے گی تو اُس کا یہاں بھی وہی نتیجہ نکلے گا۔ یہ ہے تاریخ کا فلسفہ۔ قرآنِ کریم نے فلسفۂ تاریخ بیان کرنے کے بعد علم الانسان (Anthropology) کے واقعات بیان کیے' انسان کی تاریخ بیان کی۔ اور کہا کہ اجڑی ہوئی بستیوں کی ٹھیکریوں سے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنے والوں کا انجام پڑھو۔

اجڑی ہوئی بستیوں کی ایک ایک ٹھیکری اپنے اندر ایک سبق رکھتی ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ جو کوئی بھی اپنے رب کے قوانین کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا' اس کے لیے دنیا میں بھی روزی کی تنگی ہے اور مستقبل کی زندگی میں بھی اس سے زیادہ شدید اور دیرپا عذاب ہے۔ اس کے بعد کہا کہ **اَفَلَمۡ یَهۡدِ لَهُمۡ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ يَمۡشُوۡنَ فِىۡ مَسٰكِنِهِمۡ** (20:128)۔ (اے رسول! کیا ان مخالفین پر) یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی

کہ ہم نے ان سے پہلے (اسی قانون مکافات کی رو سے) کتنی قوموں کو تباہ کر دیا (جنہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کی تھی) اور جن کی بستیوں میں اب یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یوں کہا کہ کیا ہم نے یہ بات بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھول کر نہیں رکھ دی کہ یہ قومیں جن کی اجڑی ہوئی بستیوں میں سے تم دن رات گزرتے ہو' کیا ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کی ٹھیکریوں پر یہ داستان نہیں لکھی ہوئی کہ اس قوم نے اس طرح خدا کے قوانین سے اعراض برتا' تو یوں تباہ ہوگئی اللہ اکبر! کیا لفظ ہیں قرآنِ کریم کے! کہ **یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰکِنِهِمْ** (20:128)۔ ارے' ان کی اجڑی ہوئی بستیوں میں تم چلتے پھرتے ہو' بستیاں جواب ٹھیکریاں اور کھنڈرات بنے نظر آتے ہیں' ان میں اب کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا۔ یہ ہوا کرتا ہے نتیجہ اس کا جو کہا تھا کہ **مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا** (20:125)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتا ہے تو اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے۔ **اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی** (20:128)۔ یقیناً (ان تاریخی شواہد میں) ان لوگوں کے لیے (حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں) جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ یہ جو واقعات ہم بیان کر رہے ہیں' ان میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ کس کے لیے یہ نشانیاں ہیں؟ کیا بات ہے! ایک ہی لفظ میں جواب دے دیا کہ صاحب! وہ **اَلنُّهٰی** [1] (20:128) ہیں' جن کے لیے یہ نشانیاں ہیں۔ عزیزانِ من! **اَلنُّهٰی** کے معنی یہ ہیں کہ ''جو جانتا ہے کہ مجھے کہاں رک جانا چاہیے''۔ اس کے لیے یہ کہا گیا ہے۔ ساری بات ہی یہ ہے۔

حدودِ انسانیت کا فارمولہ

عزیزانِ من! جسے آپ ''تباہی اور فساد'' کہتے ہیں وہ ''حد سے تجاوز کر جانے'' کا نام ہوتا ہے۔ حد کے اندر رہتے ہوئے تو ان تمام چیزوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ تو انسانیت کا فریضہ ہے' یہ مومن کا فریضہ ہے۔ پیٹ بھر کر کھانا تو سب کے لیے ہے۔ کھانے کے بعد پھر حد سے تجاوز کر جانا کہ دوسروں کا بھی اپنے ہاں سمیٹ کے رکھ لینا یہ حد سے گزر جانا ہے۔ یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں اس کے لیے ہیں جو **اُولِی النُّهٰی** (20:128) ہے یعنی ''جو جانتا ہے کہ مجھے کہاں رک جانا چاہیے''۔ ایک لفظ کے اندر کتنا بڑا راز ہے کہ ''جو جانتا ہے کہ مجھے کہاں رک جانا چاہیے۔'' اب آگے بات آتی ہے کہ یہی چیز نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں پیش آ رہی ہے۔ مقابلے میں وہی اسی قسم کے قریش ہیں' وہی پرانا نظام ہے۔ کہا کہ انہیں یہ چیزیں بتا دیں کہ یہ تھی سرگزشتِ آدم۔ اور اس کے بعد ان

---

[1] اَلنُّهْيَةُ کسی چیز کی انتہا اور آخری حد کو کہتے ہیں۔ اَلنِّهَايَةُ کے بھی یہی معنی ہیں۔ ابن فارس (التوفی 395ھ) نے اپنی کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ یہ اس مادہ (Root) کے بنیادی معنی ہیں۔ یعنی انتہا تک پہنچ جانا۔ انتہا تک پہنچ کر ہر بات رک جاتی ہے۔ اس لیے اس کے معنی ''رک جانے'' کے آتے ہیں۔ اَلنُّهْيَةُ عقل (Intellect) کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کو بعض اُمور سے روکتی ہے۔ اس کی جمع اَلنُّهٰی ہے۔ اس نکتے کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' 1961' ص۔ 1679۔

اہل عرب نے بھی اپنے آپ کو نسل کی بنیادوں پر کس طرح سے ایک قبیلہ ایک قوم بنالیا' وہ قریش تو بہت بڑی نسل پرست قوم تھی' پھر اپنے اندر طبقات پیدا کر لیے اور دولت کے انبار جمع کر کے بیٹھ گئے جبکہ دوسرے انسان اور ان کے بچے بھوکے مرتے رہے ہیں۔ تو اس قوم کے ساتھ رسول اللہ کا یہ ٹکراؤ ہورہا تھا۔ ورنہ عزیزانِ من! اگر یہ اتنی سی ہی بات ہوتی کہ صاحب! تم اپنے بتوں کی پرستش گھنٹیاں بجا کے کرتے ہو' میں خدا کی پوجا نماز روزے سے کر لیتا ہوں تو اس میں تو کوئی تعرض ہی نہیں کرتا۔ وہ تو نظامِ انسانیت کا مسئلہ تھا۔ نسلی امتیاز تو اس زمانے میں' عزیزانِ من! قریش کا طرۂ امتیاز تھا۔ نسل کے اعتبار سے ان کا عربی النسل ہونا اور پھر اس میں بھی قریش ہونا امتیازی نشان تھا۔ ان عربوں کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہ نسلی امتیاز کوئی شے نہیں مگر یہاں اصل مسئلہ تو نظامِ انسانیت کا مسئلہ تھا۔

نظامِ انسانیت میں ساری بات تو نظام کی تبدیلی کی ہے

عزیزانِ من! آج بھی کیفیت یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ نسل کے اعتبار سے وہ ہم میں ہیں بھی یا نہیں اور یہ کہ سید سید بھی ہے یا کہ نہیں' پٹھان پٹھان بھی ہے یا نہیں لیکن آج بھی اگر کسی سے کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ سید نہ لکھے تو آپ دیکھیے کہ وہ تڑپ جاتا ہے۔ ٹکا کے ناں لکھیا ہوندا سید داناں'[1] خواہ وہ مفسرِ قرآن ہی کیوں نہ ہو۔ آج بھی انسان اس امتیاز کو چھوڑنے پہ تیار نہیں۔ چودہ سو سال پیشتر' اور قریش' پھر کعبے کی تولیت! اللہ اکبر! صاحب' اللہ اکبر! چھوٹے چھوٹے مزاروں کی تولیت کوئی نہیں چھوڑتا' معاف رکھیے گا' اتنا بڑا مقام' اتنا بڑا عہدہ پھر بھلا' اس کعبے کی تولیت کون چھوڑتا تھا۔ اس کے ساتھ قریش کی نسبت کعبے سے تھی۔ اس نسبت سے قرآن بتا رہا ہے[2] کہ ان کی کیفیت یہ تھی کہ باقی لوگوں کے قافلے دن دیہاڑے ہر موسم میں لٹتے تھے۔ قریش کی کیفیت یہ تھی کہ کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے ان کے قافلے کیطرف کوئی انگلی اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا۔ یہ سرداری' یہ کیفیت' اور اسکے بعد یہ نظام' کہ جس میں کہا گیا کہ نہ عربی کو عجمی پر' نہ عجمی کو عربی پر' کوئی فضیلت ہے' نہ گورے کو کالے پہ' نہ کالے کو گورے پہ' نہ عرب کو عجم پہ' نہ عجم کو عرب پر۔ تمام نسلی

---

[1] خوب ظاہر کر کے سید کا نام لکھا ہوتا ہے۔

[2] لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ o اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ (106:1-2)۔ قریش کعبے کے متولی ہیں' اس لیے لوگوں کے دلوں میں ان کی بڑی عزت و عظمت ہے۔ اسی عظمت و احترام کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ قبائل اور ممالک نے ان سے عہد و پیمان کر رکھے ہیں کہ ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لُوٹے گا۔ چنانچہ یہ سردی اور گرمی' سال بھر' اپنے تجارتی قافلے مسلسل اِدھر اُدھر بھیجتے رہتے ہیں اور وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ (پرویزؔ: مفہوم القرآن' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' ص۔ 1485)

امتیازات آج میرے پاؤں کے نیچے ہیں یہاں تک کہ دولت کے امتیازات بھی نہیں۔ آخری وقت میں، [1] مرگ الموت میں یہ پوچھا کہ گھر میں کوئی پیسہ تو نہیں رکھا ہوا۔ کہا کہ آج ہی صبح یہ سات دینار آئے ہیں۔ کہا کہ ان کو فوراً بیت المال میں داخل کر دو، میں خدا کے ہاں جا رہا ہوں اور باتوں سے تو خیر چھوٹ جاؤں گا، اگر وہاں یہ چیز کہی گئی کہ محمد ﷺ (570-632) تُو اس حالت میں دنیا سے آیا ہے کہ تیرے گھر میں سات دینار رکھے تھے۔ کہا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا! اس کا جواب میرے پاس نہیں ہوگا۔ یہ تھا وہ نظام جس کے لیے یہ اٹھ کے کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ انہوں نے بیاسی جنگیں لڑیں۔ کیوں؟ کہ یہ نظام نہیں قائم ہونے دیں گے، تو کیا یہ کوئی بات چھوٹی سی تھی؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

مہلت کا وقفہ بھی ایک رحمت ہے

عزیزانِ من! بات یہ چلی آ رہی تھی کہ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی زندگی میں زیادہ شدید اور دیرپا عذاب آتا ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب ان پر وہ تباہی کیوں نہیں آتی؟ کہا کہ اس کے جواب میں یہ **وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى** (20:129) اگر تیرے نشو ونما دینے والے کے قانونِ مہلت کے مطابق، ظہورِ نتائج کا وقت مقرر نہ ہو چکا ہوتا (جس طرح تخم ریزی کے بعد فصل پکنے کا وقت مقرر ہوتا ہے) تو ہلاکت کا عذاب، جس کا فیصلہ ہو چکا ہے، ان کے ساتھ کبھی کا چپک گیا ہوتا۔ بات ساری یہ ہے کہ ہم بیج بونے اور فصل پکنے تک کا درمیان کا ایک وقفہ رکھتے ہیں اور یہ وقفہ ہماری رحیمی کی علامت ہے۔ اگر جونہی کسی سے قصور ہو، ٹینٹوا دبا دیا جائے، توبہ کا، مہلت کا، وقفہ ہی نہ دیا جائے کہ وہ اصلاح کر لے تو قرآن کہتا ہے کہ کرۂ ارض پہ ایک انسان بھی باقی نہ رہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ کون ہے جس سے لغزش نہیں ہوتی؟ کہا کہ یہ ہمارا مہلت کا وقفہ ہے کہ ہم چاہتے یہ ہیں کہ لغزش ہو، اس سے متنبہ کیا جائے: لغزش ہو گئی تو اپنی خطا کا، اپنی ذمہ داری کا، اعتراف کرو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، پھر اُن حسنات سے جو اس کا نقصان ہوا ہے، اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ اس نقصان کے ازالے کے لیے مہلت کا وقفہ دینا ضروری ہے۔ کہا کہ یہ ہمارا قانونِ عدل ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کوئی بات ہی نہیں تھی کہ جب یہ قریش پہلے دن اٹھے تھے، اسی دن ہم انہیں تباہ کر دیتے۔ تیرہ سال کا عرصہ، مکے کی زندگی، کاہے کے لیے تھا؟ اندازہ لگایئے کہ خاتم النبیین ﷺ (570-632) کہ جن کی نبوت، رسالت،

---

[1] علالت کے تیرھویں روز (یکم ربیع الاول 11ھ۔ مئی 632ء) صبح کے وقت طبیعت میں کچھ سکون تھا لیکن نقاہت زیادہ تھی۔ جوں جوں دن چڑھتا گیا، مرض کی شدت بڑھتی گئی۔ نقاہت سے غشی طاری ہو جاتی تھی لیکن جب ہوش آتا تو زبان مبارک پر یہ الفاظ ہوتے۔ مع الذین انعم اللہ علیھم۔ ''ان سعادت مند روحوں کی معیت جنہیں اللہ نے اپنے انعامات سے نوازا۔'' اور کبھی یہ کہ اللھم فی الرفیق الاعلی۔ ''سب سے بڑی رفاقت خدائے بزرگ و برتر کی ہے۔'' سہ پہر کے قریب تین مرتبہ فرمایا: بل الرفیق الاعلی۔ قلب کا سکون واطمینان ایک ہلکے سے تبسم جاں نواز کی صورت میں چہرہ پر نکہت پاش ونور افشاں ہوا۔ نگہہ فطرت کو یہ معصومانہ انداز ایسا خوش آیا کہ اس نے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا۔ اور اس طرح اس پُر بہار زندگی کی جوئے رواں دامنِ صحرا سے صحنِ گلستان میں داخل ہو گئی۔ (پرویزؒ کی مشہور ومعروف کتاب ''معراج انسانیت'' سے ماخوذ)

قیامت تک کے لیے رہنی تھی' اس میں نبوت کا تئیس سال سارا عرصہ ہے۔ اس میں تیرہ سال مکے کی زندگی کے اندر بسر ہو گئے: مار کھاتے' گالیاں کھاتے' اور وہ چڑھتے چلے گئے۔ اس کے بعد یہ مدنی زندگی جو شروع ہوئی ہے' اس میں انہوں نے لڑائیوں کا قصہ شروع کر دیا۔ یہ کیفیت تھی۔ کہا کہ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ (20:129)۔ اگر ہم نے پہلے سے یہ قانونِ مہلت نہ بنا دیا ہوتا کہ ہم بیج اور اس کے پکنے کے درمیان مہلت کا عرصہ رکھتے ہیں تو یہ ہمارے لیے کون سی بات تھی جو پہلے ہی دن عذاب آ تا اور ایسا چپکتا کہ پھر اس کے چھڑائے بھی نہ چھوٹتا' لیکن یہ بات نہیں ہے۔ اِس مہلت کے عرصے میں یہ کشمکش ہوتی ہے' یہ ٹکراؤ نا گزیر ہے۔

نبوت کا عزمِ بلند اور منتہائے مقصود

عزیزانِ من! ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مہلت کے عرصے کے اندر ان کی رسی دراز ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس لیے کہا کہ اے رسول ﷺ! یہ تیرے لیے بڑا ہی صبر آزما مرحلہ ہے۔ اس لیے فَاصْبِرْ (20:130) استقامت سے کام لے' اس میدانِ جنگ کے اندر جم کے رہ۔ عزیزانِ من! اس میدانِ جنگ میں ہوتا ہے کہ انسان تو اس کا آسانی سے مقابلہ کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ جو باہر زبانی پروپیگنڈہ ہوتا ہے' یہ جو آج میں کہہ رہا ہوں' یہ جو تیر نشتر ہیں' بڑے سخت آزما ہیں۔ پتہ نہیں کہ وہ کیا کیا کہتے ہیں۔ اس لیے کہا کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ (20:130)۔ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں' اس سے تنگ نہ پڑ' نہ ہی حوصلہ ہار۔ یہ جو کچھ تیرے متعلق کہتے ہیں' باتیں کرتے ہیں' انہیں تحمل سے برداشت کر جایا کرو۔ اُف! یہ بڑی چیز ہے۔ پھر یہ اپنی ذات کے لیے بھی کچھ نہیں کرتا۔ یہ جو ہمارے ہاں روز آج کی سیاسی لڑائیاں لڑی جاتی ہیں' جنگیں لڑی جاتی ہیں' کوئی اپنی وزارت کے لیے لڑتا ہے' کوئی امارت کے لیے لڑتا ہے' ان چیزوں کے اپنے مفادات کے لیے لڑتا ہے' تو ان سب میں جو لڑنے والا ہے وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے لڑتا ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں برداشت بھی کرتا ہے' گالیاں بھی سہتا ہے کیونکہ اپنا مفاد ہوتا ہے' اس لیے جنگ ہوتی ہے لیکن ایک شخص ایسا ہے کہ جس کے لیے نہ ذاتی مفاد ہے' نہ وہ کوئی قومی مفاد لے کر اٹھا ہوا ہے صاحب! انسانیت کے لیے ایک صحیح نظام کی تشکیل اس کا مقصد ہے اور اس کے لیے کیفیت یہ ہے کہ جنگوں کے اندر جو کچھ اس کے ساتھ بیتی ہے وہ تو ایک طرف رہا' یہاں کہا کہ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ (20:130) جو کچھ یہ کہتے ہیں' فَاصْبِرْ (20:131) ان سے دل برداشتہ نہ ہو' ہمت نہ ہار۔ یہ بہت بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔

نبوت کا بسیرا حجروں اور خلوت کدوں میں ہوتا ہی نہیں

عزیزانِ من! ''جو کچھ یہ کہتے ہیں'' قرآن یہاں اس کی تفصیل نہیں بتاتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ تو اتنا ہی صبر آزما ہوگا کہ خدا کو یہ کہنا پڑا کہ اسے برداشت کر جا' برداشت کر جا۔ تو کیا پھر برداشت کے معنی یہ ہیں کہ خلوت میں چلا جا' اپنے

حجرے میں چلا جا۔ وہاں جا کے' مصلیٰ بچھا کے' تسبیح لے کے' بیٹھ جا کہ بابا! میں تے تہانوں کجھ نئیں کیندا ہیگا۔ جان چھڈ و میری۔ [1] وہاں یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ برداشت کے معنی ہیں: سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (20:130)۔ اپنے مشن پر نہایت استقلال سے قائم رہو' اس پروگرام کی تکمیل میں سرگرداں رہو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دیکھنے کی تمہیں فرصت ہی نہ ہو کہ یہ تمہارے خلاف کیا کہتے ہیں۔ 'تینوں بوجھا ای نہ لگے اس کم واسطے۔ [2] سَبِّحَ کے معنی یہ ہوتے ہیں: اس طرح سے کسی مقصد کے حصول میں سرگرداں رہنا۔ مگر آپ کے ہاں تسبیح کے معنی اس طرح ہیں کہ وہ تسبیح یوں چلتی ہے: دانے پہ دانا' دانے پہ دانا' دانے پہ دانا۔ کہا یوں مصروف رہے کہ تجھے اس کے دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملے کہ وہ تیرے خلاف کیا کہتے ہیں۔ برداشت کرنے کا طریقہ دیکھ لیا کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر قرآن نے کہا کہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (20:130)۔ دن رات' صبح شام' ایک کر دے۔ رات دن ایک کر دے۔ اس کے اندر سرگرداں رہو' کیا یہ کوئی چھوٹا پروگرام تھا؟ نہیں' عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ آج نام نہاد اقامتِ دین کی جا رہی ہے۔ کس طریق سے کی جا رہی ہے؟ صرف الیکشن میں ووٹ لینے کے لیے۔ اندازہ لگایئے کہ وہ الیکشن جیتنے کی مہم یوں کی جاتی ہے۔ یہ اس الیکشن کے مشن کو جیتنے کے لیے رات دن ایک کر دیتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی شب وروز کی معروف زندگی

عزیزانِ من! اِدھر آپ ﷺ کے سامنے بھی ایک پروگرام تھا۔ اس کے لیے کہا تھا کہ دن رات' اس پروگرام کی تنفیذ کے لیے' ایک کر دے۔ اور جب آپ ﷺ نے' اِس دن رات ایک کرنے والے نے' اپنا پروگرام شروع کیا تو اُسے یعنی خدا تعالیٰ کو کہنا پڑا کہ بابا! ساری ساری رات نہ بیٹھا رہا کر۔ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا (73:7)۔ دن میں تجھے مخالفتوں کے ہجوم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس سلسلے میں تیرے سامنے اتنے کام ہوتے ہیں کہ تجھے سارا سارا دن سرگرداں رہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا جن امور کے لیے قدرے سکون کی ضرورت ہو' ان کے لیے دن میں وقت ہی نہیں مل سکتا۔ تیرے لیے دن میں بھی تو بڑے لمبے پروگرام ہیں۔ اس لیے خدا کو یہ کہنا پڑا کہ اے رسول! تھوڑا سوں وی جایا کر۔ [3] یہ رسول ﷺ کاہے کے لیے یہ کچھ کر رہا تھا؟ آپ کو معلوم ہے کہ پہلے دن اس نے آواز دی تھی کہ مَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ (25:57)۔ میں جو تمہیں صحیح راستے کی طرف دعوت دیتا ہوں تو اس میں میری کوئی ذاتی غرض پنہاں نہیں ہے۔ میں تم سے اس کے معاوضے میں کچھ نہیں چاہتا۔ میں اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہتا۔ اُس ﷺ کی کیفیت یہ ہے کہ دن

---

[1] ارے بابا! میں تو آپ کو کچھ بھی نہیں کہتا' میری جاں بخشی کرو۔

[2] اس کام کے لیے تجھے بوجھ ہی محسوس نہ ہو۔

[3] تھوڑا سا سو بھی لیا کرو۔

رات اس کے اندر لگا ہوا ہے' گالیاں کھا رہا ہے' طعنے جھیل رہا ہے' طعن و تشنیع کے نشتر سینے پہ لے رہا ہے' جنگ کے میدانوں میں چلا جا رہا ہے' راتوں کو ساری ساری رات جاگ رہا ہے۔ اس لیے خدا کو یہ کہنا پڑا کہ تُو اس پروگرام میں اس قدر مشغول ہو جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ تیرے جو ساتھی ہیں ان میں بیچارے کمزور بھی ہیں' بوڑھے بھی ہیں' مریض بھی ہیں۔ انہوں نے کچھ روٹی بھی کمانی ہے۔ اس کے لیے انہیں کچھ وقت چاہیے۔ اس لیے کہا کہ وَاِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7)۔ تیرے لیے دن میں بھی بڑے لمبے پروگرام ہوتے ہیں۔ اگر رات ہی کا پروگرام ہوتا تو ہم کہتے کہ چلو رات کو جاگ لیا کرو' سارا دن سو جایا کرو' ملاں وانگر۔ [1] دن بھر تیرے لیے اتنا لمبا پروگرام ہے۔ وَمِنۡ اٰنَآئِ الَّیۡلِ (20:130) اور رات کی گھڑیوں میں بھی کام ہوتا ہے۔ وَاَطۡرَافَ النَّھَارِ (20:130) اور دن کے اطراف میں بھی اس پروگرام کا کام ہوتا ہے۔ وہ بھی تو تُو نے سرانجام دینا ہے۔ اس لیے کہ تھوڑا حصہ سو بھی جایا کر۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیوں؟ یہ سارا کچھ کاہے کے لیے؟ کہا اس لیے لَعَلَّکَ تَرۡضٰی (20:130) تاکہ جو کچھ تُو کرنا چاہتا ہے' وہ ہو جائے اور پھر تُو راضی ہو جائے۔ یہ جو رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوا عنہ ہے یہ رضی اللہ تعالیٰ ایسے ہی نہیں ہے کہ وہ رضی اللہ ہو گئے تھے۔ یہ ایک پروگرام تھا۔ اس مشن کی تکمیل کے لیے دن رات سرگرداں رہنا تھا۔ راتوں کو سونا تک نہیں تھا۔ کہا کہ تُو یہ سب کچھ کرتا ہے کہ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی (20:130) تاکہ نظامِ خداوندی' اس کی حمد و ستائش کی زندہ شہادت بن کر دنیا کے سامنے آ جائے۔ اس طرح تمہاری تمام آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ اس پروگرام کی کڑیاں ابھی باقی ہیں' ابھی پوری نہیں ہونگی۔ اس لیے' عزیزانِ من! مجھے اس حصے کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔

ہمارے ہاں پیش کیے جانے والے مروجہ اسلام کے خدوخال

عزیزانِ من! یہاں ضمناً ایک بات کہہ دوں۔ قصۂ آدم آپ کے سامنے آ گیا۔ اب آپ کے سامنے جو اسلام پیش کیا جاتا ہے' وہ کس قسم کا ہے؟ سب سے بڑی چیز جو ہمارے اولیاء کرام کے متعلق کہی جاتی ہے' وہ یہ ہے کہ انہوں نے بڑا اسلام پھیلایا۔ اس کے بعد ان کی کرامات بتائی جاتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر کئی لاکھ آدمی مسلمان ہو گئے' گاؤں کے گاؤں اسلام لے آئے۔ میں تاریخ میں نہیں جانا چاہتا کہ انہوں نے کتنے مسلمان کیے اور کتنا اسلام پھیلایا۔ آپ یہ دیکھیے کہ اگر انہوں نے اسلام پھیلایا تھا تو وہ کس قسم کا تھا؟ اتفاق سے آج 25 [2] جون کا روزنامہ نوائے وقت سامنے آ گیا۔ ابھی دو ہی دن پہلے اس کے پہلے رنگین صفحے پر ایک مضمون تھا' جس کا عنوان تو یہ ہے کہ ''جنات کا وجود ہے۔''

---

[1] جس طرح ملا سوتا ہے۔

[2] 25 جون 1976ء

بہر حال' مجھے اس سے کیا غرض ہے۔ میں قصۂ آدم کی بات کہہ رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ارشاداتِ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ [1] کو قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ نے قلمبند کیا تھا۔ یہ قاضی ناگوری صاحب بھی اولا العزم اولیاء کرام میں گنے جاتے ہیں اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تو آپ کو معلوم ہی ہے' خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات اور انہی کے پائے کے قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ' جنہوں نے یہ ارشادات قلمبند کیے تو اس بیان میں دونوں شامل ہو گئے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرتِ آدم علیہ السلام اس زمین پر وارد ہونے سے قبل اپنے اصلی وجود میں سکونت پذیر تھے۔ اس وقت ان کو یہ طاقت حاصل نہیں تھی کہ جب چاہیں پرندہ بن جائیں' جانور بن جائیں' سانپ بن جائیں' یا ہوا میں اڑ جائیں' یا ہوا بن جائیں۔ یہ طاقت حق تعالیٰ نے ان کو تب عطا کی جب ان کو اس کرہ ارضی پر بھیجا گیا تھا۔ جنوں کو حکم دیا گیا کہ اب وہ پہاڑوں' غاروں اور جنگلات کو اپنا مسکن بنالیں۔ اس لیے ان کو صرف یہ طاقت عطا کر دی گئی کہ جو انسانی یا حیوانی شکل چاہیں اختیار کر سکتے ہیں بلکہ ان کی اوسط عمر بھی ڈیڑھ سو سال کے بجائے پندرہ سو سال کر دی۔ ان انعاماتِ الٰہیہ پر وہ خوش ہو گئے اور انہیں پھر کوئی شکوہ نہ رہا کہ انہیں کیوں پہاڑوں اور غاروں کی طرف جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کے ارشادات' خواجہ ناگوری رحمۃ اللہ علیہ' جو ان کے مرید تھے' نے قلمبند فرمائے۔ یہ تو ہوا ہمارے ہاں کا تصوف یا طریقت سے اسلام جو چلا آ رہا ہے۔

قصۂ آدم کی کہانی ریڈیو پاکستان کراچی سے مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی زبانی

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں' مجھے تشریح کی ضرورت نہیں کہ شریعت کی طرف سے کس قسم کا اسلام پھیلایا جا رہا ہے۔ میں صرف قصۂ آدم کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کے ریڈیو پاکستان سے جو اسلام کی خدمات جلیلہ پیش کی جاتی ہیں' ان میں ایک یہ بھی بات ہے کہ ریڈیو سے ہر روز صبح درسِ قرآنِ مجید چلتا ہے' وہ درسِ قرآنِ مجید کراچی [2] سے ہے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی درسِ قرآنِ کریم دیتے ہیں۔ ساری دنیا ریڈیو پر کان لگا کے سنتی ہے کہ ایک اسلامی مملکت سے قرآن کا جو درس ہے وہ کس قسم کا ہو رہا ہے۔ اب یہ قرآن آپ کی اسلامی مملکت کے کراچی ریڈیو سے پیش ہو رہا ہے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرتِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق کے بعد حضرتِ آدم نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو انہیں ہر قسم کی مخلوق نظر آئی' طرح طرح کے جانور پرندے نظر آئے لیکن ایسی کوئی مخلوق جو اپنی ہم جنس ہو اور جس سے انہیں سکون حاصل ہو' نظر نہ آئی۔ حضرتِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بڑی وحشت سی ہوئی اور دل ہی

---

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ سیستان کے رہنے والے تھے۔ ایک بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ پھر سمرقند چلے گئے۔ سیر و سیاحت کرتے برصغیر پاک و ہند میں داخل ہوئے اور اجمیر میں مقیم ہوئے۔

[2] یہ 1976ء کا زمانہ ہے۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے کوئی ایسی مخلوق نصیب ہو جائے جس کی رفاقت اور معیت سے مجھے چین اور سکون ملے۔ چنانچہ دوسرے جمعہ کو جبکہ حضرتِ آدمؑ عالمِ خواب میں تھے، اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ''چھیتی کرواوئے'' ❶ آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت عورت پیدا کرو، جو آدم علیہ السلام کے لیے موجبِ تسکین ہو۔ عورت اس لیے وجود میں لائی گئی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے حوّا کو حضرتِ آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا۔ بہرحال حضرت آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر بی بی حوّا کو پیدا کیا گیا ہو یا بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں حضرتِ آدم کو کوئی تکلیف اور کوئی درد محسوس نہیں ہوا، اور بغیر تکلیف کے اللہ تعالیٰ نے حضرتِ حوّا کو پیدا فرما دیا۔ جب حضرتِ آدم نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انہی کی جنس سے ایک مخلوق، عورت کی شکل میں، ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔ حضرتِ آدم نے پوچھا کہ تُو کون ہے؟ بی بی! تُو کون ایں؟ ❷ تُو کون ہے؟ ریڈیو پہ ساری دنیا نے قرآن کا درس سنا کہ پوچھا جا رہا ہے کہ کون ہے۔ غیب سے آواز آئی۔ ''او گونگی ہیگی سی، آپ نہ بولی، لیکن چُنڈ کڈیا ہویا ہونا اے ناں، او بولی نئیں آپ۔'' ❸ غیب سے آواز آئی۔ اندازہ لگایئے یہ لوگ بھی کچھ کم ڈرامائی نہیں ہیں۔ کہا کہ غیب سے آواز آئی کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے۔ غیب سے آواز آئی!! یعنی خدا نے کہا کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے، اس کا نام حوّا ہے، اسے ہم نے تمہاری رفاقت اور انس کے لیے پیدا کیا ہے۔ حضرتِ آدم علیہ السلام نے اس کو چھونے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے نہیں چھو سکتے جب تک کہ اس کا مہر ادا نہ کر دیں۔ حضرتِ آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ اے پروردگار! اس کا مہر کیا ہے؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا مہر یہ ہے کہ محمد ﷺ اور آلِ محمد ﷺ پر دس بار درود بھیجا جائے۔

حضرتِ آدم علیہ السلام نے دریافت کیا کہ اے اللہ! محمد ﷺ کون ہیں؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ محمد ﷺ آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تمہیں یعنی آدم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ حضرتِ آدم علیہ السلام نے دس مرتبہ محمد ﷺ اور آلِ محمد ﷺ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین عقدِ نکاح قائم ہوا۔ دسیا نئیں کہ پڑھایا کی۔ ❹ یہ مولانا بہت بڑے نکاح خواں ہیں، درمیان میں شہادت کے لیے ملائکہ بھی ہیں، مہر بھی درمیان میں آ گیا۔ عقدِ نکاح قائم ہوا اور اس جمعہ کے آخری حصہ میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباسِ زینت سے حضرتِ حوّا کو آراستہ کر کے ''ڈولی ٹور دو۔'' ❺ دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔ عزیزانِ من! آپ کے ہاں ریڈیو پہ درسِ قرآن نشر ہو رہا

---

❶ ارے جلدی کرو۔

❷ بی بی! تم کون ہو؟

❸ وہ گونگی تھی، خود نہ بولی۔ چہرے پر نقاب ڈالا ہو گا۔ وہ نہیں بولی۔

❹ یہ نہیں بتایا کہ نکاح میں پڑھایا کیا گیا تھا۔

❺ ڈولی بٹھاؤ اور رخصتی کر دو۔

ہے' سند موجود ہے۔ طلوعِ اسلام کا جولائی 1968ء کا پرچہ ہے۔ اس میں دیا ہوا ہے کہ وہ درس کہاں چھپا تھا۔ [1] آپ کے ہاں جو دروس اولیاء کرام کی طرف سے ہیں یا جو آپ کے ہاں شریعت کے مزار ہیں' ان پہ دیئے گئے دروس اسی قبیل کے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ صاحب! یہ تو مولویوں کی باتیں ہیں' کسی ذمہ دار آدمی کی بات کیجیے۔ جی' یہ حکومتِ پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر' مولانا کوثر نیازی صاحب' [2] جمعۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ دے رہے ہیں' جمعہ کے فضائل بیان کیے جا رہے ہیں۔ اب یہ تو نہ کوئی فقیر ہیں' نہ کسی مسجد کے ملا ہیں۔ بہرحال' یہ آپ کے ہاں کی مملکت اسلامیہ کے ایک وزیر ہیں جو خطبہ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ جمعۃ الوداع کا خطبہ ہے۔ آپ یہ ذہن میں رکھیے گا۔ انہوں نے جمعہ کے فضائل کے سلسلے میں فرمایا کہ یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول' آدم علیہ السلام کو پیدا کیا' یہی وہ دن ہے جس میں انہیں جنت میں داخل کیا گیا۔ ٹھیک ہے' بڑا بابرکت دن ہے۔ لیکن یہی وہ دن ہے جس میں انہیں جنت سے نکل کر زمین میں بسنے کا حکم ملا' اور یہی وہ دن ہوگا جس دن قیامت قائم ہوگی۔ اور جمعہ کا وہ دن ہے جس میں وہ ایسی گھڑی آتی ہے کہ بندہ اس میں حرام چیز کے سوا اپنے پروردگار سے جو کچھ طلب کرے' وہ اسے عطا فرما دیتا ہے۔ یہ جمعہ کی فضیلت ہے۔ آدم علیہ السلام کو پیدا ابھی جمعہ کو کیا' وقت نہیں' دسیا اینا ں نیں۔ کمال اے' جمعہ دا دن ای دسیا اے صرف۔ [3]

ہمارے ہاں سلسلہ اسلام کے تین گوشے اور تعلیم یافتہ طبقہ

عزیزانِ من! معاف رکھیے' میں یہ چیزیں' کچھ مذاق کے لیے نہیں کہا کرتا۔ میں کہا یہ کرتا ہوں کہ آپ کے ہاں اسلام کے سلسلہ میں یہ تینوں گوشے ہی ہو سکتے تھے' جہاں سے اسلام دنیا کے سامنے آتا: (1) اہلِ تصوف کے ہاں سے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم براہِ راست خدا سے علم حاصل کرتے ہیں۔ ان کا حاصل کیا ہوا علم جیسا ہم تک پہنچا ہے' وہ میں نے آپ کو سنا دیا۔ (2) وسائل نشر و اشاعت سے۔ یہ آپ کے ہاں' 25 جون 1976ء کو' بہت زیادہ کثیر التعداد میں چھپنے والے روزنامہ نوائے وقت کے پہلے صفحے پہ شائع ہو رہا ہے جو میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ آدم کو پھر یہ طاقت دی گئی کہ وہ جانور بن جائیں' پرندے بن جائیں' چرندے بن جائیں' ہوا میں اڑ جائیں اور یہ کچھ ہو جائے۔ یہ اسلام ان کی طرف سے آیا۔ (3) درسِ قرآن ایک عالمِ دین کی زبان سے۔ یہ ریڈیو پہ نشر ہو رہا ہے۔ اس میں یہ بتایا

---

1. کراچی کے ''حضرتِ مولانا احتشام الحق تھانوی'' کا ایک درسِ قرآن' کے عنوان سے یہ درس اخبار سیرت لاہور کی 30 مئی 1968ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے مجلّہ طلوعِ اسلام نے اپنی جولائی 1968ء کی اشاعت میں ''مولوی صاحب کا درسِ قرآن'' کے عنوان سے صفحات 31 تا 32 پر شائع کیا تھا۔
2. یہ اس وقت کی بات ہے جب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو 14 اگست 1973 تا 5 جولائی 1977 پاکستان کے وزیراعظم تھے۔
3. کمال یہ ہے کہ انہوں نے (حضرت آدم کی پیدائش کا) وقت نہیں بتایا۔ صرف جمعہ کا دن ہی بتایا ہے۔

جارہا ہے' امورِ مذہبیہ کے وزیر یہ فضائل بتارہے ہیں اور اس کے بعد باقی اور کیا چیز رہ جاتی ہے اور پھر آپ کو گلہ یہ ہوتا ہے کہ نئی نسل کا ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بیگانہ نہیں بلکہ متنفر ہوکے' رسے تڑا کے' بھاگ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ان میں سے کوئی چھڑا کے نہ بھاگے تو اور کیا کرے۔ یہ جو کچھ آپ ان کے سامنے اور پھر ساری دنیا کے سامنے' قرآن کا نام لے کر دین پیش کررہے ہیں' کہیں رسول اللہ کی احادیث کا نام لے کر' آپ دنیا کے سامنے پیش کررہے ہیں' کوئی انہیں روکنے والا نہیں۔ اگر ان کے خلاف آواز اٹھایئے تو اس پر زندگی حرام کردیتے ہیں۔ کہتے ہیں: ملحد ہے' بے دین ہے' کافر ہے' منکرِ حدیث ہے' منکرِ شانِ رسالت ہے' اس کی بات نہ سننا۔ یہ' عزیزانِ من! آپ کے ساتھ ہورہا ہے۔ بہرحال یہ تھا قرآن میں بیان کردہ قصۂ آدم اور یہ ہے جو آپ کے ہاں اسلام کی رو سے پڑھایا جارہا ہے۔ ❶

عزیزانِ من! ہم سورۃ طٰہٰ کی آیت 130 تک آ گئے' 131 سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❶ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر کہیں آپ کا اتفاق دیہات میں جانے کا ہو تو وہاں آپ کو ہر طرف بیماری' جہالت اور افلاس کے گھناؤنے بادل چھائے دکھائی دیں گے اور اگر آپ شہری زندگی کی طرف رخ کریں گے تو وہاں آپ کو منافقت' آوارگی' بددیانتی اور اقربا نوازی کا دَور دَورہ نظر آئے گا۔ یہی وہ بھیانک مناظر ہیں جن سے گھبرا کر ایک شاعر پکار اٹھتا ہے کہ:

تن ڈھانپ پہن کر ٹاٹ' بھلے دن آئیں گے — دم سادھ' زمانہ کاٹ' بھلے دن آئیں گے
من جلے پھپولے پھوڑ ، زمانہ نازک ہے — رکھ منہ کو لگا کر ڈاٹ' بھلے دن آئیں گے
مر کر تو قبر الاٹ کوئی ہو جائے گی — مت ڈھونڈ ابھی گھر گھاٹ' بھلے دن آئیں گے
آئی ہو جس دم نیند' زمین کیا' سولی کیا — سونے کو ڈھونڈ نہ کھاٹ' بھلے دن آئیں گے

(غزالہ خان: آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی' طلوعِ اسلام' جنوری 1968ء ص ص۔ 52-49)

چودھواں باب: سورۃ طٰہٰ (آیات 131: تا اختتام)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیۡنَیۡکَ اِلٰی مَا مَتَّعۡنَا بِہٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡہُمۡ زَہۡرَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۬ۙ لِنَفۡتِنَہُمۡ فِیۡہِ ؕ وَرِزۡقُ رَبِّکَ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی ﴿۱۳۱﴾ وَاۡمُرۡ اَہۡلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَیۡہَا ؕ لَا نَسۡـَٔلُکَ رِزۡقًا ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُکَ ؕ وَالۡعَاقِبَۃُ لِلتَّقۡوٰی ﴿۱۳۲﴾ وَقَالُوۡا لَوۡلَا یَاۡتِیۡنَا بِاٰیَۃٍ مِّنۡ رَّبِّہٖ ؕ اَوَلَمۡ تَاۡتِہِمۡ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰی ﴿۱۳۳﴾ وَلَوۡ اَنَّاۤ اَہۡلَکۡنٰہُمۡ بِعَذَابٍ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَقَالُوۡا رَبَّنَا لَوۡلَاۤ اَرۡسَلۡتَ اِلَیۡنَا رَسُوۡلًا فَنَتَّبِعَ اٰیٰتِکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّذِلَّ وَنَخۡزٰی ﴿۱۳۴﴾ قُلۡ کُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوۡا ۚ فَسَتَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اہۡتَدٰی ﴿۱۳۵﴾

عزیزان من! آج جولائی 1976 کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت 131 سے ہو رہا ہے: (20:131)۔

تقویٰ اور متقی کا مفہوم

سابقہ آیات میں حضور نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا تھا کہ جو کچھ یہ لوگ آپ کے خلاف کہتے ہیں، اسے ہمت اور استقلال سے برداشت کیجیے۔ اور آپ ﷺ اپنے پروگرام کی تکمیل میں اور زیادہ سرگرمِ عمل ہو جائیے، صبح شام رات دن ایک کر دیجیے۔ یہ پرواہ نہ کیجیے کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ یہ تو راستے کی خاردار جھاڑیاں ہیں۔ ان کا مشن ہی یہ ہے کہ تمہارے دامن کو اپنے کانٹوں میں الجھائے رکھیں تاکہ تم سفر میں آگے نہ بڑھ پاؤ۔ عزیزانِ من! اپنے دامن کو ان جھاڑیوں سے بچائے رکھنے کو عربی زبان میں تقویٰ کہتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو متقی کہتے ہیں۔ کہا کہ اپنے آپ کو ان کی اس قسم کی چہ میگوئیوں میں نہ الجھاؤ۔ ان لوگوں کا تو مشن ہی یہ ہے۔ انہیں برداشت کرتے چلے جاؤ۔ ان کا کوئی بھی اثر مت لو۔ تمہاری طرف سے کوئی بھی ردِعمل ایسا نہ ہو اور اپنے پروگرام کی تکمیل میں سرگرداں رہو۔ اب یہاں ایک اور اگلی چیز کہی۔ یہ چیز قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ آئی ہے۔ یہ چیز ہے: ایک انقلابی کی زندگی کے ابتدائی مراحل۔

ایک انقلابی کی زندگی کے ابتدائی مراحل

عزیزانِ من! ایک انقلابی کی زندگی میں، اور داعیٔ انقلاب بھی وہ جو آسمانی انقلاب کو زمین پر برپا کرنا چاہتا ہے، ابتدائی مرحلہ بڑا ہی

صبر آزما اور جاں گسل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہنے والا سب سے پہلا طبقہ یا گروہ وہ آئے گا جو مصیبت زدہ ہوگا۔ یہ مستبد، سرکش اور استیصال [1] کرنے والوں کے مظالم سے ستایا ہوا، غریب، محنت کش، مفلس طبقہ ہوگا۔ اس انقلابی کی آواز تو یہ ہوگی کہ میں انسانیت میں عدل وانصاف پھیلانے کو آیا ہوں، مظلوموں کی دست گیری کے لیے آیا ہوں، استیصال کرنے والے کے خلاف سب سے پہلی آواز ہوگی کہ تمہارے ہاتھ سے یہ تمام چیزیں چھین لی جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ استیصال کرنے والے یہ لوگ تو اس آواز پہ لبیک نہیں کہیں گے۔ وہی طبقہ لبیک کہے گا، جو مظلوم ہوگا، غریب ہوگا، محنت کش ہوگا، ستایا ہوا ہوگا۔ اب اس میں ایک تو یہ پہلے ہی مصیبت زدہ طبقہ آیا اور جب اس طبقے نے اس انقلابی کا ساتھ دیا تو ان کے خلاف جو پہلے جبر وتشدد ہوتا تھا، اس میں اور زیادہ سختی آ گئی۔ یعنی وہ جو اوپر کا طبقہ (High- ups) ہے اُس نے دیکھا کہ یہ شخص تنہا تھا، اب یہ لوگ اس کے ساتھ ہو گئے ہیں تو وہ اس مظلوم طبقے پر جبر وتشدد بڑھا دیتے ہیں۔ اُدھر وہ جو داعئ انقلاب ہوتا تھا، اس کا تعلق بلند خاندان سے ہوتا تھا۔ عام طور پر نبیوں کے متعلق دیکھا یہ گیا ہے اور قرآنِ کریم نے بتایا بھی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بلند خاندان سے متعلق ہوتے تھے۔ ان پہ تو یہ ہاتھ نہیں ڈالتے تھے۔ یہ چیز قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے خاص طور پہ حضرتِ ہود علیہ السلام سے کہا گیا کہ اگر ہمیں تمہاری برادری کا خیال نہ ہوتا تو ہم تمہیں گاؤں سے نکال دیتے۔ اس کا جواب تو ان لوگوں کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے، میری برادری کا خیال تو تمہیں ہے مگر برادری بنانے والے کا تمہیں کوئی خیال نہیں ہے، تو یہ چیز تھی کہ اس مظلوم طبقے پر یہ مظالم اور شدید ہو جاتے تھے اور وہ استیصال کرنے والا طبقہ من مانیاں کرتا چلا جاتا تھا، پھولتا پھلتا چلا جاتا، دولت میں اور عیش وعشرت میں آگے بڑھتا چلا جاتا، اُسے اور زیادہ کثرت سے سامان میسر آتا چلا جاتا۔ تو یہ جو غریب ساتھی تھے، فطرتاً ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ پہلے بھی ان لوگوں کے ہاتھوں ہم ہی ستائے گئے۔ اب جو ان کے خلاف، اس کا ساتھ دینے کے لیے، ہم اٹھے ہیں، انہیں اتنا کچھ میسر ہے، ہماری حالت اس سے بھی زیادہ مظلومیت کی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں یہ ایک چیز آتی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ایسا نظر آتا ہے کہ یا تو یہ مظلوم طبقہ کچھ تھک جاتا ہے یا ویسے ہی اس کے ذہن میں آتا ہے کہ اگر حق وصداقت یہ تھی جس کیطرف ہم آئے ہیں تو پھر اس حق وصداقت کے بدلے میں ہمیں یہ سب کچھ کیوں میسر نہیں آ رہا۔ ہماری حالت ویسی کی ویسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مصیبت زدہ کیوں ہو رہی ہے۔ ہر دَور میں یہ چیز آئے گی اور یہ چیز انبیاء کرام جو سب سے بڑے انقلابی ہوتے تھے، کے دَور میں تو آتی ہی ہے۔ بعض اوقات تو یہ اعلیٰ طبقہ مخالفت ہی اس بنا پہ کرتا تھا کہ ان کے ساتھ نچلے طبقے کے لوگ آ گئے ہیں۔

---

[1] بیخ کنی، جڑ سے اکھیڑنا

بالا طبقے کی ذہنیت

عزیزانِ من! حضرتِ نوح علیہ السلام ❶ کے قصے کی ابتدا ہی اس سے ہوتی ہے۔ بالا طبقے کے لوگ ان سے کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ آنے کے لیے' تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن ہم یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ یہ لوگ' جو ہمارے گاؤں کے کمی اور کمین تھے اور اب تک ویسے ہی ہیں' ہم اور وہ دونوں ایک ہی صف پہ ایک ہی جگہ بیٹھ جائیں۔ تم تو ان میں مساوات قائم کر رہے ہو' ہم یہ نہیں کر سکتے۔ انہیں نکال دو تو دیکھو' ہم تمہارے ساتھ آتے ہیں۔ ان کی طرف سے پہلا اعتراض ہی یہ کیا جاتا تھا۔ یہ اعتراض نہ بھی ہو تو بھی یہ چیز ہے کہ باطل پر چلنے والوں کو جن کے خلاف ہم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' یہ ساری دولت وثروت وحشمت وشوکت میسر آتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے حصے میں وہی تکالیف' وہی مصائب' وہی مشکلات ہیں۔ یہ ہے وہ چیز جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے کہ **وَلَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ زَهۡرَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (20:131)۔ اور جو کچھ ہم نے ان لوگوں کے مختلف طبقات کو' دنیاوی زندگی کی آرائش وزیبائش کا سامان عطا کر رکھا ہے' اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ اور اس بات کا خیال تک بھی نہ کرو کہ غلط روش پر چلنے والے اس قدر خوش حال ہیں اور ہم صحیح راستے پر چلنے والے مشقتیں جھیل رہے ہیں۔

عزیزانِ من! یہ چیزیں پہلے بھی آ چکی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کو اس قدر دنیا کی نمائشی چیزیں' زیبائشی چیزیں' آرائشی چیزیں میسر ہیں' ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ یہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ چیزیں قابلِ نفرت ہیں۔ یہ تو تم نے حاصل کرنی ہی ہیں' یہ سارے ذرائع ان سے چھیننے ہیں' چھیننے کے بعد تم نے مساواتِ انسانیہ قائم کرنی ہے لیکن اس وقت کہیں یہ خیال تمہارے گلوگیر نہ ہو جائے کہ نہیں صاحب! یہ تو پھلتے پھولتے جاتے ہیں۔ اگر حق کے اندر کامیاب ہونے کی سکت ہوتی تو ہم کیوں نہ اس طرح' آج ہی' اس دولت وثروت کے مالک بن جاتے۔ یہ دلیل عام طور پہ کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسوسہ سا ذہنوں میں پیدا ہوتا تھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی یہی چیز کہی گئی۔ تورات میں ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہہ بھی دیا تھا کہ عجیب بات ہے کہ فرعون کی غلامی کے زمانے میں بھی ہم مصیبتیں جھیلتے رہے؛ تم نے ہم سے کہا تھا کہ ہم تمہیں ان مصائب سے نجات دلانے کے لیے آئے ہیں' ہمارا ساتھ دو۔ ہم نے ساتھ دیا' اتنی مشکلات جھیلیں اور اب بھی ہم انہی مشکلات کے اندر پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورۃ یونس میں آیا ہے کہ **وَقَالَ مُوۡسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ زِيۡنَةً وَّاَمۡوَالًا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (10:88)۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا'

---

❶ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ کوئی پانچ ہزار سال قبل مسیح (یا آج سے سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ یہ قیاس وتخمین ہے جس کی بنیاد علمائے تاریخ واثریات کی تحقیقات پر ہے۔ قرآنِ کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسانی کے لیے ضابطۂ حیات ہے اور قوموں کے عروج وزوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے چنانچہ اس میں اقوام وملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن میں آیا ہے۔ (پرویزؒ: جوئے نور' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1994' ص ص۔ 6-5 ,2)

اے ہمارے نشوونما دینے والے! تُو نے اس فرعون کو' اس کی قوم اور اس کے سرداروں کو اس قدر فراوانی سے یہ مال و دولت اور فراوانی سے متاعِ زیست کی خوش حالیاں دے رکھی ہیں کہ رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ (10:88)۔اس کے بل بوتے پر وہ لوگوں کو' خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔تو کیا تُو نے انہیں یہ فراوانیاں اس لیے دے رکھی ہیں کہ یہ لوگوں کو تیرے راستے پہ آنے سے روکیں۔اسی دولت وثروت کی بنا پر انہیں شوکت وقوت حاصل ہے۔اسی بنا پہ تو یہ لوگوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو تیری طرف آنے نہیں دیتے اور تو ہے کہ انہیں یہ زیب وزینت کا سامان اور متاعِ زیست فراوانی سے دیئے چلا جا رہا ہے۔اصل میں بنی اسرائیل کی طرف سے یہ چیز تھی جو اس دعا کی شکل میں یا استدعا کی صورت میں سامنے آئی ہے کہ رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِكَ (10:88)۔اے ہمارے نشوونما دینے والے! کیا یہ اس لیے دیا جا رہا ہے کہ تیری طرف آنے والوں کے راستے میں یہ سنگ گراں بن کر کھڑے ہو جائیں۔ان کو ادھر آنے ہی نہ دیں۔اس لیے رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (10:88)۔اے ہمارے نشوونما دینے والے! ان کی دولتوں کو چھین لے' جس عقل وفہم سے یہ اس قسم کی انسانیت سوز تدابیر سوچتے ہیں' اسے بھسم کر دے' انہیں خاک میں ملا دے' تب یہ ایمان لائیں گے۔یعنی یہ وہ چیز ہے جو حق کا ساتھ دینے والوں میں سے اکثر کے دل میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔یہاں نبی اکرم ﷺ کے متعلق اس آیت میں بھی یہ کہا۔اس سے پہلے بھی یہ آیا ہے کہ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (15:88)۔زندگی کی جس قدر خوشحالیاں اور آرائشیں انہیں میسر ہیں' تم ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔(اقوامِ سابقہ کو اِن سے کہیں زیادہ ساز وسامانِ زیست حاصل تھا۔) نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھلاتے رہو کہ یہ لوگ صحیح راہ کی طرف آ کر' زندگی کی تباہیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے! (نہ اقوامِ سابقہ نے اپنے پیغمبروں کی بات پہ کان دھرا' نہ یہ تمہاری بات سنیں گے)۔تم اب (ان مخالفین کا خیال چھوڑ کر) اُن لوگوں کو' جو اس پیغام کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں' اپنے بازوؤں کے نیچے سمیٹتے چلے جاؤ۔

مخالفتوں کے برعکس نبی اکرمؐ کا ردِعمل

عزیزانِ من! ''تم طبعی زندگی کے اس ساز وسامان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو'' کہنے کے بعد اگلی بات یہ کہی کہ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ (15:88) نہ ہی تم اپنے آپ کو اس غم میں گھائل کرتے رہو کہ یہ لوگ صحیح راستے کی طرف آ کر زندگی کی بربادیوں سے کیوں نہیں بچ جاتے! یعنی اس انقلابی رسول کے دل میں ان کی طرف سے اس قدر سختیوں کا' اس قدر مخالفتوں کا' ردِعمل یہ تھا کہ ان کی اس روش سے ان پر تباہی آنے والی ہے' تو یہ اس سے بچتے کیوں نہیں! تو اس ردِعمل پر خدا کہتا ہے کہ تُو ان کی آنے والی تباہی کی وجہ سے اپنے دل میں بڑی غمگساری اور ہمدردی محسوس کر رہا ہے' تُو افسردگی محسوس کر رہا ہے کہ ان کا یہ انجام ہونے والا ہے۔یعنی ان کی طرف سے اس قدر

مخالفتوں کا ہجوم آ رہا ہے اور ادھر سے اس نبی' اس داعیِ انقلاب کے دل میں یہ ردِ عمل پیدا ہو رہا ہے کہ یا اللہ! یہ تباہ ہو جائیں گے' ان کو صحیح راستے پہ لے آ۔ کہا کہ تُو ان کے متعلق غم نہ کھا۔ تیرے کرنے کا کام یہ ہے کہ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (15:88)۔ یہ جو جماعتِ مومنین ہے' یہ چھوٹے چھوٹے چوزے ہیں' یہ جو تیری طرف آ گئے ہیں' یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' انہیں اپنے پروں کے نیچے سنبھال کے رکھ' ان کی حفاظت کا سامان کرتا چلا جا' ان مخالفین کی اس کثرتِ دولت وشوکت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھ اور اپنے آپ کو خواہ مخواہ اس غم میں نہ ڈال کہ یہ تباہ ہو جائیں گے' یہ برباد ہو جائیں گے۔ تیرا کام یہ ہے کہ قُلْ اِنِّیْٓ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ (15:89) ان مخالفین سے یہ کہے جاؤ کہ میرا کام یہ ہے کہ میں تمہیں آگاہ کرتا چلا جاؤں کہ جس روش پہ تم چل رہے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ ان کی کس قدر کشادہ ظرفی اور وسعتِ نگاہ تھی! یہ جو آسمانی انقلاب کے داعی آتے تھے' وہ اس قدر ہمدرد اور غمگسار قلب پاتے تھے کہ بدترین قسم کے دشمن کی تباہی کا احساس کرتے ہوئے' اندر ہی اندر' کس قدر قلبِ حساس لیے ہوتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو تمہارے ساتھ آئے ہیں تو انہیں اپنے پروں کے نیچے لیے رکھ اور نہ گھبرا' ان سے کہتا چلا جا کہ بھئی! میں تو صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ تمہاری یہ روش تمہیں تباہ کر کے رکھ دے گی' اس سے باز آ جاؤ۔ یہاں بھی یہی کہا اور کہا اس لیے گیا ہے کہ تباہی آنے سے پہلے یہ مہلت کا وقفہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ (20:131) یہ زیبائش وآرائش کا سامان ایک کٹھالی ہے' جس میں ان لوگوں کو ڈال رکھا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ (104:6-7)۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے' جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور اس طرح یہ اپنی آگ میں خود جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ یہی تو ایک فتنہ ہے' یہی تو ایک کٹھالی ہے' جس سے یہ گزر رہے ہیں اور اسی میں انہوں نے بھسم ہو کے رہ جانا ہے۔ یہی دولت جو ان لوگوں کے ہاتھ آتی ہے' اگر یہ اسے خداوندی اقدار کے تابع سرف کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے جنت کا موجب بن جاتی ہے لیکن جب وہی دولت وقوت ان لوگوں کے ہاتھ میں جاتی ہے جو ان اقدار وقوانین کی طرف سے سرکشی برتتے ہیں تو ان کے لیے وہ جہنم بن جاتی ہے۔ کہا کہ یہ جو دولت وثروت ہے' یہ ان کے لیے کٹھالیاں بن رہی ہے' جہنم بن رہی ہے۔ اس لیے ان کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور یہ خود بھی یاد رکھو' اور اپنی اس غریبوں کی جماعت کو جو واقعی بڑے مفلس ہیں سمجھا دو کہ رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (20:131) جو کچھ خدا کے نظامِ ربوبیت کی رو سے ملتا ہے' اُس میں ہر طرح کی خوشگواری ہوتی ہے اور اُسی کے لیے بقا ہوتی ہے۔

رزقِ طیب کی تعریف

عزیزانِ من! اس آیت میں ''خیر'' اور ''باقی'' رہنا' دو چیزیں کہیں۔ خیر وبرکت اور بقا وپائندگی اس رزق میں ہے جو خدا کے قانون کی رو سے حاصل ہوتا ہے۔ انہیں ان کے پاس بہت رزق نظر آتا ہے' ڈاکوؤں کے پاس بھی بڑی دولت ہوتی ہے' یہ جو اپنی عزتیں' اپنی غیرتیں اور اپنی عصمتیں بیچتے ہیں' ان کے پاس بھی دولت ہوتی ہے' یہ جو استیصال کرنے والے مستبد ہوتے ہیں' ان کے پاس بھی

دولت ہوتی ہے۔ کہا کہ صرف دولت کو نہ دیکھو؛ دیکھو یہ کہ وہ رزق کونسا ہے جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہے؛ وہ رزق اس قابل نہیں کہ اس کی طرف رشک کی نگاہ سے دیکھا جائے' اس کی طرف دیکھ کے تو تاسف ہونا چاہیے کہ اوہو! یہ آگ ان کے گھروں کی طرف بڑھتی جارہی ہے' کیسے انہیں بھسم کر کے رکھ دے گی۔ رزق وہی رزقِ خیر ہے' رزقِ طیّب ہے اور وہی رزقِ ابقٰی ہے' باقی رہنے والا ہے' جو خدا کے قوانین کے مطابق حاصل کیا جائے۔ اسی کو قرآن نے کہیں رزقِ کریم کہا ہے یعنی عزت کی روٹی' کہیں رزقِ حسنا کہا ہے' کہیں رزقِ خیر کہا' کہیں رزقِ طیب کہا ہے۔ محض رزق کوئی شئے نہیں ہے۔ رزق اور رزق کے اندر بھی ایک امتیاز ہے اور اس رزقِ طیب کی طرف نگاہ رکھنی چاہیے۔ حق کی تائید وحمایت میں اگر کچھ وقت کے لیے مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے' تنگی بھی آتی ہے تو اسے یہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیے کہ اس کے نتیجے میں جو رزق ملنے والا ہے وہی خیر اور اَبْقٰی ہے۔ لہٰذا یہی کچھ کرتا رہ۔ مزید کہا کہ **وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا** (20:132)۔ تو اپنی جماعت کے لوگوں کو اس کی تاکید کرتا رہ کہ وہ فرائض خداوندی کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل رہیں۔ اور خود بھی اپنے اِس پروگرام پر استقامت سے جما رہ' اپنے اس پروگرام کی تکمیل میں دن رات سرگرداں رہ۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اہل کا مفہوم

عزیزانِ من! اس آیت **وَاْمُرْ اَهْلَکَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا** (20:132) کا اب عام ترجمہ تو یہی ہوگا کہ تُو اپنے اہل کو نماز کا حکم دیتا رہ' اور خود بھی اس پر کاربند رہ۔ ایک تو یہ چیز ہے کہ اہل کے معنی میں اس کام کی ابتدا تو اہلِ خانہ سے بھی ہوتی ہے لیکن قرآن کی اصطلاح میں اہل وہی جماعت ہوتی ہے جو رسول پر ایمان لاتی ہے اور اس طرح اس کے اہل میں سے بن جاتی ہے۔ یہ تفریق و امتیاز سب سے پہلے داعیٔ انقلاب حضرتِ نوح علیہ السلام کے وقت میں سامنے آیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ یا اللہ! تُو نے وعدہ کیا تھا کہ تیرے اہل کو میں محفوظ رکھونگا مگر میرا بیٹا پھر بھی ڈوب گیا۔ بیٹے سے زیادہ قریب تر اہل اور کون ہوسکتا ہے۔ کہا کہ نہیں' اے نوح! یہ تمہارے معیار کی غلطی ہے۔ اہل وہی ہے جو ایمان کے نکتۂ نظر سے تمہارا ساتھ دینے والا ہو' ایمان میں تمہارے ساتھ ہو' اس کے اعمال صالحہ ہوں' وہ تمہارے اہل میں سے ہے۔ محض تمہارے گھر والے بیوی بچے یا بیٹا یا رشتہ دار یا نسبت رکھنے والا ہونا انہیں تمہارا اہل نہیں بنا سکتے۔ قرآنِ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا کہ **يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِکَ** (11:46)۔ اے نوح علیہ السلام! (تُو نے اہل کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ وہ بے شک تیرا بیٹا تھا) لیکن تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ تیرے اہل میں سے وہی ہوسکتے ہیں جن کے اعمال صالح ہوں۔ یہ بیٹے کے متعلق کہا گیا ہے اور اس کے بعد حضرتِ نوح علیہ السلام کی بیوی کے متعلق یہ کہا گیا کہ وہ بھی تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ عام زبان میں اہلِ خانہ تو کہا ہی بیوی کو جاتا ہے مگر یہاں کہا کہ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ ایمان نہیں لائی۔ عزیزانِ من! حضرتِ لوط علیہ السلام کی بیوی کے متعلق یہ کہا کہ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ اس لیے محض کسی کو رشتہ داری کی بنا پہ سمجھ لینا کہ وہ قرآن کی رو سے اہل میں آجائے گا' سراسر غلط ہے۔

صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم

اب یہاں اسی آیت میں دوسرا لفظ صلوٰۃ کا آیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ** (20:132) تُو صلوٰۃ کا حکم دیتا چلا جا' صلوٰۃ کی تاکید کرتا چلا جا۔ اس میں گھر والے بھی ہونگے جو ایمان لے آئے ہوئے ہونگے' باہر والے بھی ہونگے جو اس داعی کا ساتھ دینے والے ہونگے۔ یہ سارے اہل کے اندر آئیں گے۔ یہاں کہا کہ انہیں صلوٰۃ کا حکم دیتا رہ۔ ظاہر ہے کہ یہ صلوٰۃ کوئی ایسی چیز ہے جس کے لیے کہا کہ **وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا** (20:132) اور تُو استقامت سے اس پر جما رہ۔ نظر آتا ہے کہ یہ صلوٰۃ کوئی ایسا فریضہ ہے کہ جو بڑا ہی صبر آزما' بڑا ہی ہمت شکن ہے جس کے لیے خدا اس کی تاکید کر رہا ہے کہ استقامت سے اس پر جما رہ۔ یہ ٹھیک ہے' عزیزانِ من! جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ دین کے نظام میں' ان اجتماعات کو جنہیں ہم نماز کے اجتماعات کہتے ہیں' بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن محض اس شکل کے اندر جو اجتماعات آج ہم منعقد کرتے ہیں یہ قرآن کے اس فریضہ کی ادائیگی نہیں ہے' یہ صرف رسم کی ادائیگی ہے جو ہم کر رہے ہیں اور یہ جو چیز ہوتی ہے کہ جی' فلاں صاحب نے یہ چیز بڑے ناز سے کہی ہے کہ ہماری آج تک کبھی ایک نماز بھی باجماعت ضائع نہیں ہوئی تو گو بظاہر یہ چیز بڑی اہمیت والی ہوئی کہ اس پر اس قدر استقامت ہے۔ عزیزانِ من! یہ چیز ایک عادت بھی ہو جاتی ہے۔ عادتاً بھی انسان بعض چیزیں کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس کے متعلق قرآن' رسول سے' اپنے اہل کو صلوٰۃ کا حکم دے رہا ہے اور ساتھ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ اس پر استقامت سے' جم کر کھڑے رہو تو یہ اس سے کوئی بڑی چیز ہے۔ عزیزانِ من! وسیع معنوں کے اعتبار سے اور زبان کے اعتبار سے بھی اس کے معنی ''فرائض منصبی''[1] ہیں۔ دین کسی پر جتنے فرائض عائد کرتا ہے اس کے لیے صلوٰۃ ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس میں ''تمام فرائضِ منصبی'' آ جاتے ہیں۔ یہ بھی جسے آپ نماز کا اجتماع کہتے ہیں' اس میں فریضہ منصبی ہو جائے گا۔ لیکن صرف یہی نماز کا اجتماع صلوٰۃ نہیں ہوگی۔ قرآن فرائضِ منصبی' جو دین کی رو سے عائد ہوتے ہیں' پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کرتا ہے اور پھر یہ چیز جسے میں نے پچھلی دفعہ' شاید اس سے پہلے بھی' کہا تھا کہ اس کے ساتھ تاکید بھی ہے اور تاکید نہ بھی ہو تو بھی عربی زبان میں عمل کہتے ہی اسے ہیں جو بالارادہ کام کیا جائے اور استقامت سے کیا جائے۔ کسی ہنگامی کام کو یا جو کام عادتاً کیا جائے' زبان کی رو سے اسے عمل کہتے ہی نہیں ہیں' اسے فعل[2] کہتے ہیں' اور قرآن میں یہاں الحمد سے لے کر والناس تک ''اعملوا'' ہی آیا ہے۔ مومنین کے لیے ''اعملوا الصّٰلحٰت'' ہی آیا ہے۔ ان کے لیے تو وہ عمل ہونا چاہیے' تو خود عمل کے اندر استقامت موجود ہے۔ کوئی چیز جو رسمًا یا عادتاً ہنگامی طور پہ کی جائے عربی زبان کی رو سے اس کے لیے عمل کا لفظ نہیں بولا جا سکتا تھا۔ اس طرح صلوٰۃ یعنی فرائضِ منصبی کے لیے تو استقامت کی بڑی ضرورت ہے۔ کہا کہ **ان الذین**

---

1. صلوٰۃ سے مراد کہاں اجتماعاتِ صلوٰۃ ہے اور کہاں فرائضِ منصبی اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' 1961' ص ص۔ 1034-1047 عنوانِ مادہ: ص ل (ی)
2. اس نکتہ کی مزید تصریح کے لیے دیکھیے: اسی کتاب کا بارھواں باب' اس کا عنوان ہے ''فعل اور عمل کا قرآنی مفہوم''۔

قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا (41:30)۔ جولوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونماد دینے والا' اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا کر سکتی تو تَتَنَزَّلُ عَلَیۡھِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ (41:30) ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے' خدا کی کائناتی قوتیں (ملائکہ) ان کا ساتھ دیتی ہیں اور ان کے لیے باعثِ تقویت بنتی ہیں۔ یہاں صلوٰۃ کیساتھ کہا گیا ہے کہ وَاصۡطَبِرۡ عَلَیۡھَا (20:132) تُو خود بھی اس پر کاربند رہ۔

نظامِ ربوبیت کی بنیاد

عزیزانِ من! اب صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ہے کہ مخالفین کے پاس اتنی دولت ہے' ثروت ہے' شوکت وحشمت ہے اور دوسری طرف غریبوں کی یہ ایک جماعت ہے' مفلسوں کی جماعت ہے۔ یہ انقلابی پروگرام کا پہلا دَور ہے۔ اس دَور کے اندر بہر حال کچھ مالی قربانیاں بھی دینا ہوں گی۔ اِن کے بغیر تو کوئی بھی پروگرام آگے نہیں چل سکتا۔ اب ایک تو یہ کہ پہلے ہی یہ بیچارے غریب اور مفلس تھے اور دوسرا یہ کہ اس کے بعد اس پروگرام کے لیے یہ لا یئے اور وہ کیجئے' یہ کیجئے' کی صورت بنی۔ اس کے لیے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ لَا نَسۡـَٔلُکَ رِزۡقًا نَحۡنُ نَرۡزُقُکَ (20:132)۔ یہ نظامِ خداوندی تم سے کھانے کے لیے کچھ نہیں مانگے گا۔ اگر چہ اس وقت یہی نظر آتا ہے کہ یہ تمہارا سب کچھ لیے جا رہا ہے۔ تم اپنے ذہن میں یہ خیال نہ لاؤ کہ ہم تم سے کھانے کے لیے رزق مانگتے ہیں۔ یاد رکھو' یہ جو کچھ تم سے مانگا جاتا ہے' یہ ہم اپنے لیے نہیں مانگتے بلکہ نَحۡنُ نَرۡزُقُکَ (20:132) یہ نظام تمہارے سامانِ زیست کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے گا۔ کہا کہ یہ ہم اس لیے لے رہے ہیں کہ کسی ترتیب و تنظیم سے تمہاری نمود کا سامان کریں۔

عزیزانِ من! خدا کے متعلق پہلی چیز یہ ہے کہ وہ جو کچھ تم سے لیتا ہے' اس میں سے وہ اپنے رزق کے لیے کچھ نہیں لیتا۔ ٹھیک ہے' اس انتہائی پیمانے پر تو وہ خدا ہی ہو سکتا ہے جو کھانے پینے سے بے نیاز ہے لیکن جن کے بھی ہاتھوں میں یہ پروگرام ہوگا' یہ ربوبیت کا نظام ہوگا' قرآن کا یہ معاشی نظام ہوگا' وہ بھی یہ چیز کہیں گے کہ یہ یاد رکھو! یہ جو کچھ لیا جا رہا ہے' یہ اپنی ذات کے لیے نہیں لیا جا رہا۔ یہ تمہارے ہی لیے لیا جا رہا ہے۔ اور پھر قرآن کے الفاظ میں تو اس کا بدلہ (Return) یہ ہے کہ تمہیں ایک ایک دانے کے بدلے سات سات سو دانے دیئے جائیں گے۔

خیرات کے سلسلہ میں مروجہ مذہبی سوچ کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہ جو خیرات کے طور پہ بانٹا جاتا ہے' وہ نہ تو اسکے لیے کوئی خیر کا موجب ہوتا ہے' نہ ابقٰی ہوتا ہے' نہ دینے والے کے لیے ہی اس کا کوئی Return (معاوضہ) ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابتدائی دَور میں انفرادی طور پر یہ چیزیں بھی ہیں لیکن یہی جو آج آپ کے ہاں یہ قوم' خیرات کے سلسلہ میں مروجہ مذہبی سوچ کا نتیجہ یہ پوری ملت' اپنے ہاں مذہب کے نام پہ دیتی ہے اگر اتنا ہی یہ دین کے

معاشی نظام پر ہوجائے' زیادہ نہ دیں' اگر اتنا ہی دیں' تو ایک بھی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ یہ تو اِس قوم کے سوچنے کے سارے سوچ (Switches: بٹن) آف (Off: بند) ہوگئے ہوئے ہیں' کبھی بیٹھ کے اس قوم نے اکنامیکلی (معاشی طور پر) سوچا ہی نہیں کہ مذہب کے نام پر اس قوم کی کتنی دولت ضائع ہورہی ہے۔ اگر یہ کبھی سوچ کے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ یہ جو دنیا کی بڑی سے بڑی مملکتیں ہیں' ان کے بجٹ سے زیادہ یہ بجٹ بن جاتا ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حَبِطَتْ اَعْـمَالُهُمْ (2:217)۔ ان کے اعمال ان کے کسی کام نہیں آتے' ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس جاتی ہیں' وہاں اگتا ہی کچھ نہیں۔ انہیں اس پر کہا کہ نَـحْـنُ نَـرْزُقُکَ (20:132)۔ یہ نظامِ ربوبیت تمہارے سامانِ زیست کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لے گا۔ اس لیے کہا کہ اطمینان دلاتے جاؤ اور علی الاعلان کہہ دو کہ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی (20:132)۔ جو لوگ اس نظام کی نگہداشت کریں گے' انجام کار ہر قسم کی خوشگواریاں انہی کے لیے ہوں گی۔ یقین کرو کہ انجام کار تو یہ سب کچھ انہی کے لیے ہوگا۔ اس لیے ان مشقتوں کے چند دن کاٹ لو پھر اس قسم کا رزق مل جائے گا۔ یہاں آ کے پھسل نہ جاؤ کہ نہیں صاحب! ہم نے تو یہ چار دن کسی نہ کسی طرح سے کاٹ لیے تھے' اب ساری عمر تو یوں نہیں کٹ سکتی۔ کہا کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔

کثیر اور کثرت کے بعد کوثر کا اضافہ

عزیزانِ من! یہاں وَالْـعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی (20:132) کہہ کر واضح کر دیا کہ یاد رکھیے! انجام کار انہی کے لیے ہے جو اس قسم کی کششوں سے اور جاذبیتوں سے اپنے دامن کو بچالیتے ہیں۔ وَاصْـطَـبِـرْ (20:132) اور استقامت سے اپنی بات پہ' حق پہ' کھڑے رہتے ہیں تو پھر اس کے بعد دیکھو کہ انجام کار انہیں کیا کچھ نہیں ملتا۔ یہ یاد رکھو کہ انہیں اتنا ملے گا کہ اس کے لیے کثرت اور کثیر کے الفاظ تو تھے ہی لیکن یہاں خاص طور پر عربی زبان میں ''اَلْـکَـوْثَر'' ایک نئی اصطلاح آئی۔ کہا کہ اِنَّآ اَعْـطَیْنٰـکَ الْـکَوْثَرَ (108:1)۔ اے رسول! ہم نے تجھے قرآن جیسی نعمت عطا کی ہے جو دنیا بھر کی بھلائیوں اور خوشگواریوں کا سرچشمہ ہے۔ اس میں حکمت اور بھلائی کی لامتناہی باتیں ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرتی اور سامنے آتی چلی جائیں گے۔ اس خیر کثیر میں کبھی کمی واقع نہیں ہوگی (13:35; 14:25)۔

عزیزانِ من! عربی زبان میں اس ''کوثر'' کے لفظ کا بڑا گراں قدر اضافہ ہے۔ ''یہ ایک ایسی کثرت ہے جس کی انتہا نہ ہو''۔ یہاں کہا کہ اس کثرت سے یہ کچھ ملے گا۔ اور واقعی جب یہ نظام قائم ہوا ہے تو ثابت ہوگیا کہ یہ محض یونہی دعویٰ نظری Academic نہیں تھا۔ تاریخ سے پوچھیے۔ جب یہ نظام قائم ہوا ہے تو یہ ''کوثریت'' ایسی تھی کہ ان سے یہ سب کچھ سنبھالا ہی نہیں جاتا تھا۔ اتنا کچھ آ رہا تھا کہ یہ کہتے تھے کہ اس کا کیا کریں۔ یہ سب اس لیے تھا کہ وَالْـعَـاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی (20:132)۔ انہوں نے اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں

میں الجھنے سے محفوظ رکھا تھا' اور نہ ہی ان کے پاؤں میں لغزش آئی تھی۔ یہ تھی **وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا** (20:132)۔ یہ صلوٰۃ پہ استقامت کا نتیجہ تھا۔ لہٰذا کہا کہ اپنے ہاں ان سے یہ کچھ کہو' اور خدا کا نبی ان سے یہی ایک بات کہے چلا جا رہا ہے۔ اب یہیں آیا ہے کہ **وَقَالُوۡا لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ** (20:133)۔ اور یہ مخالفین کہتے ہیں کہ یہ رسول اپنے رب کی طرف سے کوئی واضح نشانی کیوں نہیں لے آتا (تا کہ اسے دیکھ کر سب ایمان لے آئیں۔ ان سے کہو کہ سچائی کو اس قسم کی نشانیاں دکھا کر نہیں منوایا جاتا۔ اسے دلیل و برہان سے تسلیم کرایا جاتا ہے)۔ عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب آیت ہے' بھلا کونسی آیت عجیب نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات میں تو مطالب و معانی کا ایک بحرِ زخار [1] موجزن ہے' کوتاہی ہمارے فہم و ادراک کی ہے۔

دین کی ساری عمارت دلائل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم تو پہلے لفظ سے آخری لفظ تک اپنے اندر مطالب و معانی کی پوری جاذبیتیں رکھتا ہے لیکن بعض اوقات' بعض چیزیں' ابھر کر آ جاتی ہیں۔ یہاں کہا گیا ہے کہ **لَوۡلَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ** (20:132)۔ یہ رسول اپنے رب کی طرف سے کوئی واضح نشانی کیوں نہیں لے آتا۔ اکثر تقاضا وہی ہوتا ہے کہ معجزہ دکھاؤ' کرامات دکھاؤ۔ عزیزانِ من! یہاں تقابل میں دو لفظ آئے ہیں: آیات [2] اور بینات [3]۔ قرآن کا اعلان یہ ہے کہ اے مخالفت کرنے والو! تم یہ بتاؤ کہ **اَوَلَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى** (20:132)۔ علم و برہان کی وہ کون سی بات ہے جو انبیائے سابقہ کے صحیفوں میں آئی تھی اور قرآن میں نہیں آ چکی (5:48)۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ ہم دلائل دیتے ہیں اور کون سی دلیل ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ تم کرامات مانگتے ہو' اور ہم دلائل دیتے ہیں۔ یہاں قرآن تضاد میں دو چیزیں سامنے لے آیا۔ بڑی عجیب سی چیز آ گئی۔ اہلِ مذہب کی نگاہ ہمیشہ کرامات اور معجزات پر جاتی ہے جبکہ دین نام ہی ''بینات'' کا ہے' دلائل کا ہے' براہین کا ہے۔ یہ عقل و فکر کو اپیل کرتا ہے اور غور و تدبر کی تعلیم دیتا ہے۔ کہا کہ تم معجزہ مانگ رہے ہو' ہم دلیل دے رہے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہ چیز پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ پہلے انبیا کو معجزات ملتے تھے' میں بتاؤں گا کہ وہ جنہیں معجزات کہا جاتا ہے قرآن ان کے متعلق کیا کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى** (20:132) پہلی جتنی بھی آسمانی کتابیں آئی تھیں' ان میں بھی دلائل ہی دیئے گئے تھے۔ اور پوچھتا ہے کہ وہ کونسی ایسی دلیل ہے جو وہاں دی گئی تھی اور یہاں قرآنِ کریم میں نہیں آئی۔ پھر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ کچھ بھی ہو لیکن آئے گی دلیل ہی۔ یہ ہے مذہب اور دین میں فرق۔

---

[1] زخار یا ذخار: لمبا چوڑا جس میں بہت کچھ سما سکے۔

[2] آیات: بمعنی معجزات و کرامات

[3] بینات: بمعنی دلائل و براہین

روزِ اول سے مذہب اور دین میں فرق رہا ہے

عزیزانِ من! مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب میں جو تصور ہے وہ Supra- natural ہوتا ہے' ہمیشہ فوق الفطرت سی چیز ہوتا ہے۔ اس لیے مذہبی پیشوا یہی چاہتے ہیں کہ مذہب کا لانے والا یعنی رسول ما فوق الفطرت ہونا چاہیے۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ صاحب! یہ رسول تو ہمارے جیسا انسان ہے' کھاتا پیتا ہے' بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ ایک تو اس کے متعلق تصور یہ ہے۔ اگلی چیز یہ ہے کہ یہ جو کچھ دے رہا ہے اس میں کوئی کرامت نہیں' کوئی معجزہ نہیں اور اس سے مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ کوئی کرامت دکھاؤ' کوئی شعبدہ دکھاؤ۔ ان چیزوں کی تحقیق تو عزیزانِ من! یہ ہمارے ہاں کے علم الانسان (Anthropology)' اور علم النفس (Psychology) کے علماء (Scholars) کر رہے ہیں کہ انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اگر یہ خارج کی اس آسمانی (Divine) راہنمائی کے پیچھے نہ چلے تو جو تصورات پہلے کے انسانوں کے ذہن کے اندر تھے' وہی وراثتاً منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس طرح ان کے الفاظ بدل جاتے ہیں۔ آج کے دور کا انسان ان کے لیے اصطلاحات دوسری استعمال کرتا ہے مگر تصورات وہی ہیں جو پہلے دن کے تھے بجز اس کے کہ کہیں وحی نے آ کے ان تصورات کی اصلاح کر دی ہو' ورنہ یہ تصورات وراثتاً آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے بھی ایک جگہ کہا ہے کہ یوں نظر آتا ہے جیسے ''جانے والی قوم' آنے والی قوم کے کان میں کہہ گئی ہو کہ یہ کچھ کرنا۔'' کیا انداز ہے قرآن کا! آج مغرب کے بڑے بڑے محقق یہ کہہ رہے ہیں کہ بظاہر نظر نہیں آتا کہ یہ پہلے دَور کے انسان سے لے کر آج اس دور کے انسان تک' جو اتنی بڑی بڑی منزلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے' اس کے لیے کسی نے واقعی ایک مدرسہ قائم کر کے کہہ دیا ہو کہ ''ہم یہ کرتے ہیں' تم بھی یہ کرو' لیکن حقیقت یہ ہے کہ تصورات کی یہ چیز منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ عزیزانِ من! قرآن کا انداز ایسے نظر آتا ہے جیسے جانے والی قوم' آنے والی قوم کے کان میں وصیت کر گئی ہو کہ یہ کچھ کرنا۔ وہی چیز قرآن پہلے دن سے کہتا چلا آیا ہے کہ تم یہ بتاؤ تو سہی کہ **اَوَلَمْ يَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى** (20:132)۔ علم و برہان کی وہ کون سی بات ہے جو انبیائے سابقہ کے صحیفوں میں آئی تھی اور قرآنِ کریم میں نہیں آ چکی (5:48)۔

قرآن کریم کو بنیادی طور پر مھیمن کہا گیا ہے

عزیزانِ من! بات یوں نہیں ہے کہ پہلے دَور کے اندر ہم آیات دکھایا کرتے تھے' آیات یعنی معجزات دکھاتے تھے اور اس دَور میں ہم دلیل دے رہے ہیں۔ کہا کہ پہلے ہی دن سے یہی صورت رہی ہے کہ ہم دلیل و برہان دے رہے ہیں **فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى** (20:132)۔ سابقہ انبیائے کرام کے صحیفوں میں بھی یہی بات تھی۔ آج وہ مسخ شدہ صحف ہیں جنہیں تم دکھاتے ہو کہ انہوں نے یوں کیا تو وہ ہو گیا اور یہ کیا تو وہ ہو گیا۔ انہیں تم ان کے معجزات و کرامات بتاتے ہو حالانکہ صحف الاولیٰ میں بھی ہم بیّنٰت ہی دیتے تھے' دلائل ہی دیتے

تھے' واضح قوانین ہی دیتے تھے اور وہ تھے کہ اُن سے اس قسم کے معجزات مانگتے تھے۔ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے مُهَيْـمِـنٌ (5:48) کہا ہے۔ مُهَيْمِنٌ ❶ کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ پہلے متفرق طور پر آتا رہا ہے' وہ الگ الگ پھول تھے۔ یہ ان سب کا گلدستہ بن گیا ہوا ہے اور ان تمام کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس لیے یہ مھیمن ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس کا مہیمن ہے؟ کہا کہ جتنے بھی دلائل پہلے صحف کے اندر آیا کرتے تھے' وہ تمام اس کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ میں دلائل دیتا ہوں لیکن تم معجزات مانگتے ہو۔

بزرگوں کے ہاں بھی دلائل کی بجائے کرامتوں کا ہی ذکر ہے

عزیزانِ من! سابقہ ادیان کی یا مذاہب کی تاریخ تو چھوڑیئے' آج اپنی حالت کو دیکھیے۔ آپ کے ہاں دین مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس ساری تاریخ میں آپ مسلمانوں کے بزرگوں کو ذہن میں لاتے ہیں۔ یہ تمام بڑے بڑے بزرگ جو آپ کے ذہنوں کے اندر ہی نہیں بلکہ آپ کے قلوب پر بھی مسلط ہیں' وہ وہی ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی بڑی کرامتیں دکھائیں' شعبدے دکھائے۔ ان کے تو تذکرے ہی کرامتوں کے ہیں۔ ❷ ان تمام بزرگوں میں سے کسی کے ہاں بھی کبھی آپ نے سنا ہے کہ

---

❶ مہیمن کا مادہ ''ھ ی م ن'' ہے۔ هَيْمَنَ لَطَائِرُ عَلٰى فِرَاخِهٖ کے معنی ہوتے ہیں۔ ''پرندے نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے ان کے اوپر پروں کو پھیلا دیا' اور لٹکایا۔'' هَيْـمَـنَ عَلٰى كَذَا کے معنی ہیں: ''وہ اس کا محافظ و نگران ہوا'' یہ معانی ''تاج العروس'' نے دیئے ہیں۔ یہ لغت قاموس کی شرح ہے اور لسان العرب کے بعد مرتب ہوئی ہے اس لحاظ سے یہ آخری مفصل اور مستند لغت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو تمام کتبِ سابقہ کا مُهَيْـمِـنٌ کہا ہے (5:48)۔ یعنی ان تمام صداقتوں کا محافظ جو کتبِ سابقہ میں بیان ہوئی تھیں۔ خود اللہ تعالیٰ بھی اَلْمُهَيْمِنُ (59:23) ہے۔ یعنی جو کائنات کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جس طرح بچوں کی ماں بچوں کی حفاظت کرتی ہے۔ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''ھ م ن'' کوئی مادہ (Root) نہیں ہے۔ اَلْمُهَيْمِنُ دراصل اَمِنٌ سے ہے' جس کا ہمزہ ھ سے بدل گیا ہے۔۔

❷ مثلاً (۱) انیس الارواح یعنی خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ارشادات کا مجموعہ جسے خواجہ معین اجمیریؒ نے مرتب کیا۔ (2) دلیل العارفین جس میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات ہیں اور جنہیں خواجہ قطب عالمؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ (3) فوائد السالکین جو خواجہ قطب الدین بختیاری اوشی کا کیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے اور جنہیں ان کے خلیفہ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے مرتب فرمایا تھا۔ (4) راحت القلوب۔ اس میں خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے ملفوظات ہیں جنہیں خواجہ نظام الدین اولیاء نے مرتب فرمایا تھا۔ (5) راحت المحبین جو خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات ہیں جنہیں امیر خسرو نے مرتب کیا تھا۔ یہ تمام ملفوظات ہیں۔ ان کی صورت یوں ہے کہ ایک پیر کے ملفوظات ان کے خلیفہ قلمبند کرتے ہیں۔ یہ تمام مجموعے طبع شدہ ہیں۔ ان کی عقیدت واحترام کا اندازہ اس سے لگایئے کہ چشتیہ خاندان کے متوسلین ان مجموعوں کو ورد وظائف کی طرح یاد کرتے ہیں اور دہراتے رہتے ہیں۔ یہ مجموعے فارسی زبان میں ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ مسلم پریس دہلی کا چھپا ہوا ہے۔ نمونے کے طور پر ایک حوالہ دیکھیے کہ انیس الارواح میں ہے کہ خواجہ عثمان ہارونیؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ''اگر خاوند کے جسم سے پیپ اور خون رواں ہو اور عورت اسے صاف کرنے کے لیے اپنے منہ سے چاٹے تو بھی خاوند کا حق کما حقہ ادا نہ ہوگا۔''
[مزید وضاحت و صراحت کے لیے ملاحظہ کیجیے: پرویزؒ: سلیم کے نام جلد سوم' بتیسواں خط (صوفیائے کرام)' 1986' ص ص۔ 62-46 اور اسی کتاب کا ''اکتیسواں خط'' (تصوف)' ص ص۔ 45-21]

انہوں نے یہ دلیل دی' یہ Reason دیا؟ نہیں' بلکہ ان کے ہاں کی تو کسی کتاب میں بھی یہ بات نہیں ہے۔ اس کے برعکس' کتابیں ان کی کرامات سے بھری ہوئی ہیں۔ قرآن تو پہلا فرق ہی یہ بتا رہا ہے کہ وہ معجزہ طلبی کر رہے ہیں جبکہ وہ نوع انسانی کو تَـــاْتِهِـــمْ بَيِّـــنَةُ (20:132) دلیل و برہان کی دعوت دیتا ہے۔ دین کو مذہب میں تبدیل کرنے کے بعد آپ کے ہاں جو سازش ہوئی ہے وہ محض ہنگامی بات نہیں تھی۔ یہ جتنے آپ کے ہاں کے بڑے بڑے بزرگ ہیں ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کرامات دکھائیں۔ جتنا کوئی بڑا قطب سے غوث اور غوث سے ولی اور ولی سے اوتاد بنتا چلا جا رہا ہے' اتنی ہی بڑی اس کی کرامات ہیں' دلیل کسی کے ہاں سے بھی پیش نہیں کی جا رہی اور یہی نہیں کہ پیش نہیں کی جا رہی' دلیل دینے والوں کے پیچھے لٹھ لے کے پھر رہے ہیں۔

عزیزانِ من! آپ کے ہاں کی ساری تاریخ ہی یہ ہے کہ یہ لوگ عقل و فکر اور دلیل و برہان کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سارے تصوف میں صداقت کی شہادت وجدان (Intuition) ہے' نہ اس کے Source (منبہ و مخرج) کا کوئی پتہ' نہ سرچشمے کا علم اور نہ ہی اس سرچشمہ کے سمجھنے کی کوئی ضرورت۔ یہ اس کے لیے کہ اس میں کوئی نہ کوئی کرامت کام کر رہی ہوتی ہے۔ آپ کے ہاں یہ ساری جنگ ان آیات [1] و بینات [2] کی جنگ ہے۔ میں نے کہا کہ آج بھی آپ کے ہاں یہ کیفیت ہے کہ دلائل و براہین کی رو سے آپ عمر بھر یہ کچھ سنتے رہیے' اس کے باوجود اگر معلوم ہو جائے کہ ٹینکی کے پیچھے ایک نئے سائیں بیٹھے ہیں' بالوں کو نچوڑتے ہیں تو دودھ نکلتا ہے' آپ سارے وہاں جا کھڑے ہونگے۔ عزیزانِ من! یہ تو گوسالے کی محبت دل کی گہرائیوں کے اندر پیوست ہو چکی ہوتی ہے۔ قرآن یہاں دین اور مذہب میں تقابل کر رہا ہے۔ بہرحال' جو دین نہیں جانتے تھے' کافر تھے کہ وہ معجزہ مانگتے تھے لیکن خدا کے رسول دلیل دیتے تھے۔ آپ کی ساری تاریخ اسی کشمکش کی تاریخ ہے۔ اور جب شاعری آئی ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔ اس میں کرامات و کشف کے گیت گائے جانے لگے۔ یہ بڑی گہری سازش ہے۔ یہ اتفاقی چیزیں نہیں ہیں۔ الناس کو قرآن سے دُور کرنے کا طریق ہی ایک تھا کہ ان کی سمجھنے سوچنے اور غور و فکر کی صلاحیتیں مسلوب کر دی جائیں اور ان کے دلائل کو بے وزن بنا دیا جائے۔ یہ حضرات دلیل دینے والے کا مضحکہ انگیز طریق سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ تو وقت نہیں' کہیں نصاب (Curriculum) کی باتیں ہوتیں تو میں آپ بیتیاں سناتا۔ میری تو آدھی عمر اسی میں گزری تھی۔ ہم دلائل کے خلاف لٹھ لیے پھرا کرتے تھے صاحب! اور ہمیں اس کے متعلق اتنا کچھ سکھایا گیا تھا کہ پوچھو نہیں۔ وہ تو بعد میں بات سمجھ میں آئی کہ یہ حضرات عقل کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں کے جو بڑے بڑے صوفیا کرام ہیں' ان کی کتابیں ثابت کرتی ہیں کہ عقل ناقص ہے' قابلِ اعتماد نہیں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔

---

[1] معجزات و کرامات۔

[2] دلیل و برہان

عقل کی تنقیص اور فلسفہ امام غزالی

عزیزانِ من! پہلی بات جو ذہن میں کھٹکتی ہے' وہ یہ ہے (جو میرے ساتھ ناقدانہ واقعہ ہوا تھا) کہ سرکار! اگر عقل کی کیفیت یہ ہے کہ جو کچھ اس کے ذریعے ثابت ہو وہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتا تو آپ تو عقلی دلائل کی رو سے ثابت کر رہے ہیں کہ عقل نا قابلِ اعتماد ہے تو آپ کا یہ نتیجہ کیسے قابلِ اعتماد ہو گیا۔ اس لیے عقلی دلائل دینے پڑتے تھے' مقابل والا تو یہ مانتا ہی نہیں تھا۔ وہ اگر کہتے کہ بھئی! میں کہتا ہوں کہ یہ جو کچھ ہے باطل ہے تو اسے تو بہرحال عقلی طور پر یہ ثابت کرتے ہیں۔ تو جتنا کچھ ان کے ہاں عقل کے متعلق ہے وہ عقل کی تنقیص وتحقیر کے متعلق ہی ہے کہ یہ نا قابلِ اعتماد ہے۔ غزالی ❶ نے فلسفہ لکھتے آدھی عمر گزار دی۔ بڑی بلندیوں پر پہنچے۔ فلسفے میں ان کا بڑا مقام ہے۔ تو آدھی عمر تو اس میں گزر گئی اور اس کے بعد کی جو آدھی عمر تھی وہ جتنا کچھ پہلے کیا تھا اُسے ادھیڑنے میں گزر گئی یعنی اس فلسفہ کے رد کرنے میں جو اپنا ہی پہلے پیش کیا ہوا تھا۔ غزالی (1111-1059) جب آپکے ہاں امام بنے ہیں تو وہ ان کی عمر کا آخری حصہ تھا جو انہوں نے اسے رد کرنے میں گزارا جو وہ عقل کی تنقیص وتحقیر کے سلسلے میں پہلے ثابت کر چکے تھے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے ہاں کے فلسفے کو اس طرح سے رد کیا' انہدام کیا' منہدم کر دیا' مسمار کر دیا۔ یہ ہے فلسفہ امام غزالی کا کارنامہ۔

ہمارے ہاں عُرسوں اور مقبروں کی شہرت کی وجہ جواز

عزیزانِ من! عقل کی تحقیر کرنا کہ یہ نا قابلِ اعتماد ہے' کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ یاد رکھیے! یہ دین کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی۔ اس سازش میں دین کے خلاف ہر طرف سے یورش کر کے آئے۔ اس کے پیچھے ساری سرمایہ داری اور ربوبیت کی قوتیں تھیں جن کی وجہ سے انہیں شہرت کے دربار میں جگہ ملی۔ اگر سرمایہ داری اور ان کی ربوبیت کی یہ قوتیں ان کے پیچھے نہ ہوتیں' تو ان' ترکِ دنیا کا سبق دینے والوں کو' کوئی بھی نہ پوچھتا۔ یہ کیا تھا کہ ان ننگ دھڑنگ کے مقبرے پر لاکھوں روپے لگ جاتے' چاندی اور سونے کے دروازے کھڑے ہو جاتے۔ یہ کہاں سے کھڑے ہو جاتے؟ پوچھو تو سہی کسی اہلِ علم سے کہ کیا علم وبصیرت پر مبنی دلائل دینے والوں کی قبر کے متعلق بھی کہیں کوئی شہرت نظر آئی؟ آج اگر کہیں کوئی عرس بھی ہوتا ہے تو اس کے متعلق Quiz (سوال جواب) کے طور پہ جسے آپ

---

❶ امام محمد الغزالی (1111-1059) ایران کے ضلع طوس میں پیدا ہوئے۔ وہیں فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے جرجان کا رخ کیا اور امام ابونصر اسماعیلی سے تعلیم حاصل کی۔ پھر امام الحرمین سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیشاپور گئے۔ چار سال مدرسہ نظامیہ بغداد میں ملازمت کی۔ اسی دوران انہیں دنیوی زندگی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ نوکری پر لات مار کر ایک کمبل کندھے پر ڈالا اور بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ دس سال صحرا نوردی' گوشہ نشینی' ریاضت' مراقبے میں کاٹ کر اپنے بیوی بچوں میں واپس پہنچ گئے۔ یہ ان کی زندگی کا پہلا حصہ ہے۔ اگلے اور آخری حصے میں بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ بچوں کی چار جبلتوں کا فلسفہِ تعلیم پیش کیا: (1) غضب' (2) شہوت' (3) شیطنت اور (4) حکمت۔ یہ حصہ ان کی زندگی کے پہلے حصے کی تنقیح ہے۔ (شبیر احمد: تعلیم کی کہانی' 1974' ص ص۔ 218-211)

کہتے ہیں کہیں یہ سوال پوچھ لیا جائے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہٗ کا مزار یا ان کی قبر کہاں ہے' تو معلوم نہیں کہ ایک فیصد بھی مسلمان کو اس کا پتہ ہے یا نہیں اور اگر یہ پوچھا جائے کہ ان کا یومِ شہادت یا یومِ وفات کونسا ہے تو وہ تو شاید ہزاروں میں سے کوئی ایک ہو جس کو معلوم ہو مگر اس کے برعکس اگر ہر گھوڑے شاہ کے متعلق آپ یہی پوچھیے تو تفاصیل تک وہاں موجود ہوتی ہیں۔ یہ بڑی سازش ہے۔ عزیزانِ من! زندگی کے آخری دور میں مجھے یہ چیزیں کہنے دیجیے۔ یہ اتفاقی چیزیں نہیں ہیں۔ پتہ نہیں فرصت ملے یا نہ ملے مگر تاریخ اسلام ❶ لکھنے کا خیال ہے۔ اگر تاریخِ اسلام مرتب کرنے کا وقت آ گیا تو میں بتاؤں گا کہ ''بینات'' کے خلاف ''آیات'' کے مطالبے کی پوری ایک گہری سازش تھی۔ ❶ قرآن بینۃ اور بینۃ کہے جا رہا ہے مگر وہ ہیں کہ معجزہ (آیات) مانگ رہے ہیں جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111)۔ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو اِس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کرو۔ ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر علم و بصیرت کی رو سے بات کرو۔ دلیل لاؤ۔ آج یہی ہے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ دلیل نہیں' کرامات دکھایئے۔ پھر وہی بات آ گئی کہ انہیں' ان عرسوں اور مقبروں میں یہ سب کچھ ملتا چلا جاتا ہے۔ یہی تو ان کی وجۂ شہرت ہے۔

اقبال کی نظر میں ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی وجہ

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے کہ میں نے اس درس کے شروع میں کہا تھا کہ ایک داعیٔ انقلاب کو اس زمین پر آسمانی انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے۔ اس کی دعوت پر لبیک کہنے والا وہ طبقہ ہوتا ہے جو مصیبت زدہ ہوتا ہے' مفلس ہوتا ہے' محنت کش ہوتا ہے۔ اس کے مقابل وہ طبقہ ہوتا ہے جس کے پاس دنیاوی زندگی کی آرائش و آسائش کا سامان ہوتا ہے۔ اس وقت میں نے یہ کہا تھا کہ اس مصیبت زدہ' داعیٔ انقلاب کی آواز پر لبیک کہنے والے طبقے کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ یہ جتنے لوگ ہیں جو تیرے نام سے بیزار بھی ہیں' کافر ہیں' مجرم ہیں' دہریئے ہیں اور ملحد ہیں' انہیں تو اتنا کچھ ملتا چلا جاتا ہے لیکن جو مسلمان ہیں' وہ یوں بھی غریب ہیں۔ یہ تو میں نے کہا ہے اور یہ چیز تو پہلے دن سے چلی آ رہی ہے۔ میں کبھی بتاؤں گا کہ اگرچہ ہمارے دَور میں اقبالؒ (1938-1877) نے جو شکوہ لکھا ہے' وہ درحقیقت اپنا شکوہ نہیں ہے بلکہ یہ ذہنیت ہے جسے اس نے شکوے کے رنگ میں بیان کیا ہے کہ:

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہ گار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں' مستِ مئے پندار بھی ہیں

---

❶ سورج کی شعاعوں سے وقت کشید کرنے والی یہ شخصیت اور فکرِ قرآنی کا یہ روشن چراغ' 26 فروری 1985 کی شام' ملت اسلامیہ کو قندیل آسمانی کے علم سے مالا مال کرتا ہوا جہانِ فردا کی پُرنور اور حسین وجمیل وادیوں کی جانب اپنی زیست کے اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس کی طبعی زندگی میں تاریخِ اسلام مرتب کرنے کا وقت نہ آ سکا۔ تاہم اس کی ہلکی سی جھلک اِن کی کتاب ''شاہکارِ رسالت'' کے آخری باب ''شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد'' میں ملتی ہے۔

ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر ❶

بات تو یہاں یہ کہنی مقصود ہے کہ آج بھی یہی شکوہ ہوتا ہے، آج بھی یہی اعتراض اٹھتا ہے کہ ہاں! اگر خدا واقعی منصف ہے تو یہ جو ظلم کرنے کے لیے ہاتھ اٹھتا ہے خدا اسے وہیں پتھر کیوں نہیں کر دیتا، اس کی تلوار کند ہو کے کیوں نہیں رہ جاتی، خدا خود یہ کیوں نہیں کر دیتا۔ آج بھی یہی سوچ کارفرما ہے اور قرآن کا اس سلسلہ میں کہنا یہ ہے کہ **وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی** (20:132)۔ جو لوگ اس نظام کی نگہداشت کریں گے، انجام کار ہر قسم کی خوش گواریاں انہی کے لیے ہوں گی۔ دراصل یہ ایک کشمکش کی جنگ ہے۔ خدا کہتا ہے کہ اس میں ہمارا ایک قانونِ مہلت (Law of Respite) ہے اور یہ اس لیے ہے کہ ہم تمہارے ہی رب نہیں ہیں، چوٹھے دے وی تے رب اسیں ہیگے اں۔ ❷ اور ہم کسی کے لیے بھی سوتیلے نہیں ہیں، ہمارے لیے کوئی سوتیلی اولاد نہیں۔ کافر اور مومن دونوں کے لیے مہلت کا وقفہ رکھا ہے۔ زمینداروں کے لیے بھی وہی وقفہ ہے۔ کافر ہوں یا مومن، دونوں ایک ہی وقت میں گیہوں بوتے ہیں اور ان دونوں کی فصل پکنے کا وقت بھی ایک ہی لیتی ہے۔ ان میں سے کسی ایک کے بچے بھوکے مرتے رہیں، چھ مہینے مرتے رہیں، ہم اس کے گیہوں کو قبل از وقت نہیں پکاتے۔ نہ ایہدے نال کوئی دشمنی ہوندی ہیگی۔ اوہدی کنک وی اوسے اصول نال پکدی آ۔ ❸ اسی لیے کہا کہ **وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی** (20:134) اگر ہم انہیں (اس قرآن کے نازل کرنے سے) پہلے ہی ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ کہتے کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تا کہ ہم تیرے احکام کا اتباع کرتے۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو پھر ہمیں بے شک ذلیل و خوار کر دیا جاتا (5:19)۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ اگرچہ ان کے مظالم سرکشیاں اور جرائم ایسے ہو چکے تھے کہ اگر ہم انہیں سنبھل جانے کی وارننگ (تنبیہ) دینے کے بغیر ہی تباہ کر دیتے تو یہ کہتے کہ بغیر مطلع کیے ہمیں ہلاک کر دیا گو کہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ (Natural Consquence of their Actions) تباہی ہوتا مگر پھر بھی ہم نے انہیں سنبھلنے کا وقفہ دیا۔ لہٰذا انہیں بار بار کہا گیا کہ اپنی اصلاح کرلو، راستہ بدل لو۔ اگر اس تنبیہ کے بغیر ہی ہم انہیں تباہ و برباد کر دیتے تو انہیں اعتراض کا موقع مل سکتا تھا کہ اے ہمارے

---

❶ اقبالؒ: بانگ درا، 1996، ص۔ 176
❷ جھوٹوں کے بھی تو ہم ہی رب ہیں۔
❸ نہ اس کے ساتھ کوئی دشمنی ہوتی ہے، اس کی گندم بھی اُسی اصول کے مطابق پک کر تیار ہوتی ہے۔

پرودگار! ہمیں بتانے والا کوئی کیوں نہ بھیجا جو کہہ دیتا کہ میاں! غلط راستے پہ چل رہے ہو۔ اگر اس کے بعد بھی ہم غلط راستے پہ چلتے تو پھر تو یہ ٹھیک تھا کہ ہم موردِ عذاب ہوتے لیکن یہ بات تو نہیں ہے کہ بتایا ہی نہ جائے اور پھر آپ نے انسان کے اندر تو یہ بات رکھی نہیں ہے کہ اُسے از خود معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط راستہ کونسا ؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم غلط راستے پہ چل رہے تھے مگر اپنی دانست میں اسے صحیح سمجھ رہے تھے۔ کوئی راستے میں بتانے والا ہوتا جو کہتا کہ میاں! غلط راستہ ہے' تم اس راستے پہ چل کے منزل پہ نہیں پہنچ سکتے' اگر اس کے باوجود ہم اس راستے پہ چلتے تو پھر تو یہ ٹھیک تھا کہ ہمیں برباد کر دیا جاتا مگر اس کے بغیر تو یہ کچھ کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے اعمال اور ان کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آنے تک مہلت کا وقفہ رکھا ہے۔ اس وقفے میں باز آفرینی کا امکان ہوتا ہے۔

قانونِ خداوندی کا طریق کار

عزیزانِ من! سارے قرآن میں جا بجا یہ چیز ہے کہ جب تک پہلے کوئی آگاہ کرنے والا نہ آ جائے اور وہ آگاہ نہ کر دے' اس وقت تک ہم کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتے۔ یہ ہے خدا! اور خدا بننا سجتا ہی اُسے ہے۔ یہی چیز میں نے اپنی ایک کتاب ''جہانِ فردا'' کے ایک باب میں پیش کی ہے [1] اور وہ یہ کہ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! وہ لوگ جن کی طرف کوئی ہدایت ہی نہیں پہنچی' وہ اسی طرح جہالت میں زندگی بسر کرتے ہیں مثلاً یہ Permitted Tribes (مجاز قبائل) جو آسٹریلیا اور افریقہ میں بستے ہیں یا یہاں بھی ایسی قومیں ہیں جن تک وحی کی رہنمائی کی کوئی بات پہنچتی نہیں ہے' ان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جہنم میں ہونگے خدا انہیں یہ عذاب کرے گا۔ عزیزانِ من! سارے قرآن میں یہ چیز ہے کہ یہ ذمہ داری ہم صرف اس کے سر ڈالتے ہیں جسے پہلے آگاہ کر دیتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ ہے اور یہ غلط راستہ ہے اور اس کے برعکس جو بھی اس طرح سے آگاہ نہیں ہوتا' اس کی کوئی بھی وجہ کیوں نہ ہو' ہم اس پہ یہ ذمہ داری نہیں ڈالتے' ہم اسے Accountable (قابلِ مؤاخذہ) Responsible (ذمہ دار) قرار ہی نہیں دیتے۔ یہ بڑی چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عدل کا بنیادی اصول ہے۔ اس بنیادی اصول کی پہلی چیز یہ ہے کہ کوئی قانون بننے سے پہلے کے جتنے اعمال یا اعتقادات ہوں اور ان پر قانون بننے سے پہلے عمل ہو چکا ہو' تو ان پہ قطعاً کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ ان پر وہ قانون کسی طرح سے لاگو ہی نہیں ہوتا۔ اُس قانون کا نفاذ ان پہلے سے کیے گئے اعمال پر کرنا انصاف کے خلاف ہے' اور قانون کے نفاذ کے بعد بھی درمیان میں ایک وقت دینا چاہیے کہ اتنے میں جو کوئی اپنی اصلاح کرنا چاہے وہ کر لے۔ پھر اس کے بعد اس کے مواخذے کی گھڑی آئے گی۔ یہ خدا کا پہلا قانونِ عدل ہے۔

---

[1] پرویزؒ: جہانِ فردا' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1969' عنوانات: جن قوموں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت نہ ہو یا جن تک خدا کا پیغام نہ پہنچا ہو' وہ قابل مؤاخذہ نہیں۔ ص ص۔ 176-174 اور جہنم ان لوگوں کے لیے ہے جن میں غلط اور صحیح کے امتیازی خطوط کو سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وحی کی تعلیم ان کے سامنے آ چکی ہو' ص ص۔ 221 -218۔

عزیزانِ من! خدا خود کہہ رہا ہے کہ اگر ہم اس قرآن کے نازل کرنے سے پہلے ان کی گرفت کر لیتے تو گو کہ ان کے جرائم تو تھے لیکن انہیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ اے ہمارے نشو ونما دینے والے! تُو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تا کہ ہم تیرے احکام کا اتباع کرتے اور ان کا یہ اعتراض بجا ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ فوراً ہی ان کا ٹینٹوا نہیں دبا دیا جاتا۔

عزیزانِ من! اب اس سورۃ کی آخری آیت آ گئی اور میں نے کہا ہے کہ آخری آیت یا آیتوں میں تو اس پورے موضوع کا، جو اس باب میں دیا ہوتا ہے، نچوڑ آ جایا کرتا ہے۔ اب یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ قُلْ (20:135)۔ تم ان سے کہہ دو کہ ان بے کار باتوں سے کیا حاصل ہے۔ تم اپنی راہ پر چلتے رہو، میں اپنی راہ پر چلتا ہوں۔ اس کے بعد كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا (20:135) میں اپنے پروگرام کے نتائج کا انتظار کرتا ہوں، تم بھی انتظار کرو۔ اس طرح کہہ دیا کہ ان کو بتا دو جن کے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ ان ظالموں کی رسی کیوں دراز رکھی جا رہی ہے اور جلدی سے ان کا ٹینٹوا کیوں نہیں دبایا جا رہا۔ کہا کہ یاد رکھو! تم ہر طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لو ہمارا قانون یہ ہے کہ بیج بونے میں اور پھل پکنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ [1] (20:135)۔ میں اپنے پروگرام کے نتائج کا انتظار کرتا ہوں، تم بھی انتظار کرو۔ کائنات میں ہر چیز اس پر گامزن ہے۔ نظامِ کائنات میں ہر جگہ ہمارا یہ قانونِ امہال، جو مہلت کا قانون ہے، کارفرما ہے۔ اس لیے فَتَرَبَّصُوْا (20:135) تم بھی انتظار کرو، اتنے بے صبرے نہ ہو جاؤ۔ تمہاری خاطر ہم اپنا قانون نہیں توڑیں گے۔

حقائق کو سچ کر کے دکھانے کا آخری طریق

عزیزانِ من! نظامِ کائنات میں اس قانونِ امہال کو کتنا جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ کہا کہ فَتَرَبَّصُوْا (20:135) تم بھی انتظار کرو، میں اپنے پروگرام کے نتائج کا انتظار کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد کہا کہ اب آخری چیز یہ باقی رہ گئی ہے کہ اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (6:136)۔ تم اپنے پروگرام پہ عمل کرتے چلے جاؤ، میں دخل نہیں دوں گا۔ مجھے میرے اپنے پروگرام پہ عمل کرنے دو، اس کے راستے میں کھڑے نہ ہو جاؤ، عزیزانِ من! یہ کتنا فیئر پلے (Fair Play: غیر جانبدارانہ کھیل) ہے، کتنا منصفانہ پروگرام ہے اور اپنے اس پروگرام کی حقانیت پر کتنا اعتماد ہے! اس طریق سے حقیقی نتائج سامنے آ جائیں گے اور اس طرح پوری دنیا واضح طور پر دیکھ لے گی کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا ہے۔ یہ جو بات ان سے کہی جا رہی ہے کہ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (20:132) جو لوگ اس نظامِ ربوبیت کی نگہداشت کریں گے، انجام کار ہر قسم کی خوشگواریاں انہی کے حصے میں آئیں گی۔ یہ بڑا دعویٰ ہے کہ انجام کار تم دیکھو گے کہ کامرانیاں اور کامیابیاں ان کے نصیب میں ہونگی لیکن اس کے لیے فَتَرَبَّصُوْا (20:132) انتظار کرنا پڑے گا، اس کے لیے انتظار کرو۔

---

[2] تَرَبَّص: انتظار کرنا۔ کسی پر خیر یا شر کا واقع ہونے کا انتظار کرنا۔ کسی بات کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار کرنا۔ مُتَرَبِّصٌ: انتظار کرنے والا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، 1960، ص ص۔ 718 -717

لہٰذا' عزیزانِ من! باطل کے معاشرے میں آج بھی اگر کوئی شخص جو صحیح نظام کے لیے قرآن کو لے کر اٹھے گا' یہ سارا کچھ اس کے سامنے آئے گا' ان تمام مراحل میں سے اسے گزرنا پڑے گا۔ وہ ''عاشقی صبر طلب''❶ بڑی ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ''بے تابی تمنا'' اپنے مقام پہ ہے لیکن ''عاشقی صبر طلب'' لازم ہے اور یہ اس لیے ہے کہ خدا قانون والا واقع ہوا ہے۔ خدا نہ کسی کی رعایت کرتا ہے' نہ بے جا کسی پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اس کے ہاں تو قانونِ کائنات ہی یہ ہے کہ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ (20:135) کائنات میں ہر چیز اپنے کیے کے انتظار میں ہے' یہاں قانونِ مہلت کارفرما ہے۔ کیا بات ہے قرآن کی! یہاں ہر گوشے میں تم دیکھو گے کہ وقت لگے گا۔ اس لیے فَتَرَبَّصُوْا (20:135) تم بھی اسی کے مطابق اطمینان سے بیٹھو۔ فَسَتَعْلَمُوْنَ (20:135) عنقریب تم جان لو گے' زیادہ وقت نہیں لگے گا' بہت جلد تم دیکھ لو گے کہ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اهْتَدٰی (20:135) ہم میں سے کون ہے جو ہموار اور سیدھی راہ پر چل رہا ہے اور وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح بہت جلد نہیں واضح ہو جائے گا کہ وہ کون تھا جو اس راستہ پہ چل رہا تھا جو ہموار اور سیدھا ہے۔ تو عزیزانِ من! دو چیزیں ہو گئیں: ایک تو یہ کہ خالصتاً قانونِ خداوندی ہے' اور پھر دوسرا یہ کہ اس کے بعد ایں و آں سے آنکھیں بند کر کے اس راستے پہ استقامت کے ساتھ چلتا جائے' جلدی سے ہمت نہ ہار لے' جو صبر طلبی' عشق ہے اس پر چلتا چلا جائے' اس بات کا یقین رکھے کہ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی (20:132) انجام کار ہر قسم کی خوشگواریاں انہی کے لیے ہوں گی جو اس نظام کی نگہداشت کریں گے' اس نظام پر استقامت کے ساتھ چلیں گے تو یہ شادکام و بامراد ہوں گے اور کہا کہ یہ تو خدا کا وعدہ ہے جس کے وعدے میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ عزیزانِ من! یہاں سورۃ طٰہٰ ختم ہو گئی۔ اگلے درس میں ہم سورۃ الانبیاء لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀......❀......❀

---

❶ عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک [غالب]

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں
ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن
فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی
کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان
ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح
نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور
جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے
ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔ معراجِ انسانیت)